باہمی امداد

اور

روپیہ کی حفاظت

صرف بنک ہی کر سکتے ہیں

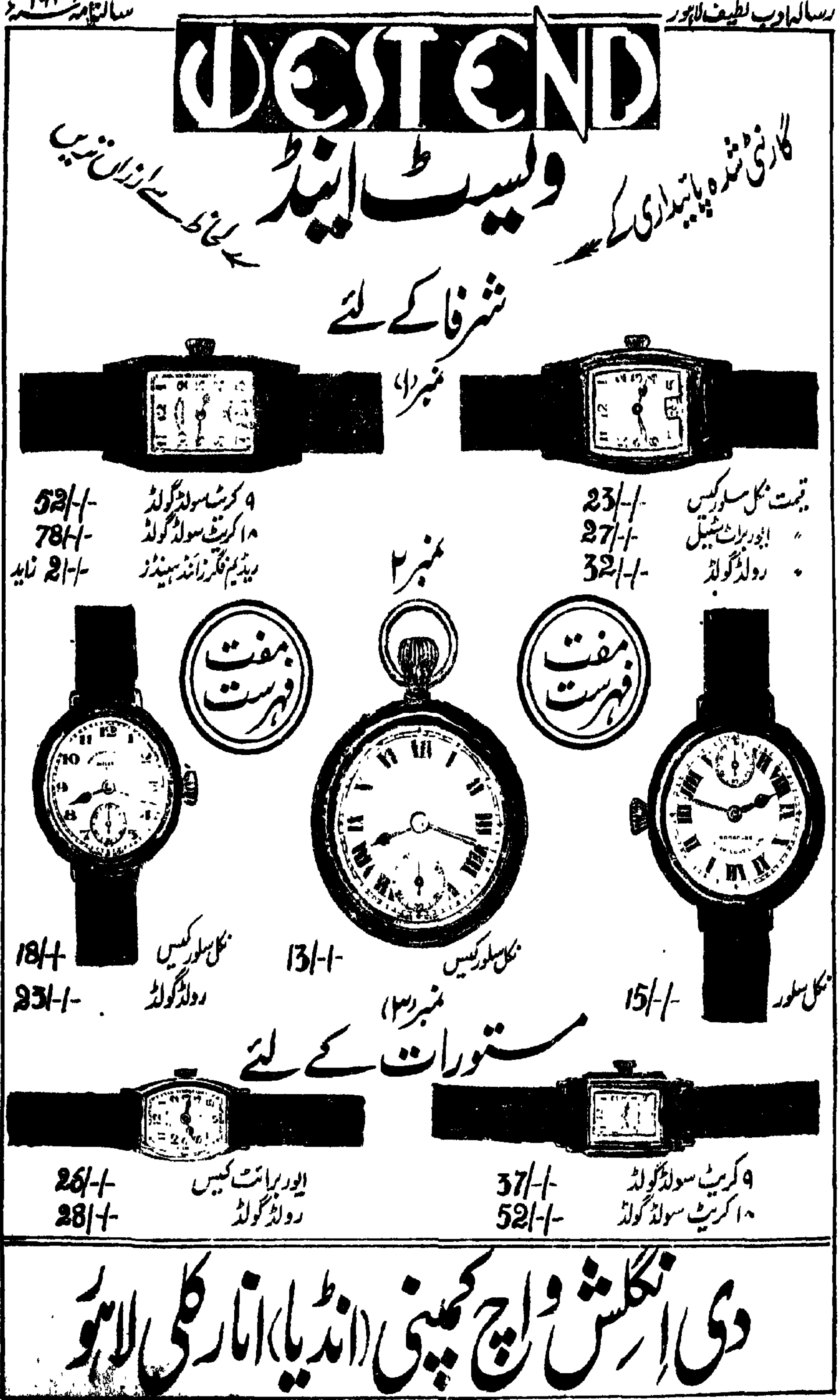
لہذا اپنے روپیہ کو اپنے کامیاب بنک سنٹرل ایکسچینج بنک لمیٹڈ انارکلی لاہور میں جمع کرائیں جہاں علاوہ معقول منافع کے آپ کا روپیہ محفوظ رہیگا۔ اور

باہمی امداد کا موجب ہوگا

منافع حصہ جات پانچ فی صدی سالانہ

مزید معلومات کے لئے بنک کو لکھیں!

میاں احسان الٰہی بی اے مینجنگ ڈائریکٹر


WEST END
گارنٹی شدہ پائیداری کے
ویسٹ اینڈ
لحاظ سے ارزاں ترین
شرفا کے لئے
نمبر (۱)
قیمت نکل سلور کیس 23/-/-
ایور برائٹ سٹیل 27/-/-
رولڈ گولڈ 32/-/-
۹ کریٹ سولڈ گولڈ 52/-/-
۱۸ کریٹ سولڈ گولڈ 78/-/-
ریڈیم فگرز اینڈ ہینڈز 2/-/- زاید
نمبر ۲
مفت فہرست
مفت فہرست
نکل سلور 15/-/-
نکل سلور کیس 13/-/-
نکل سلور کیس 18/-/-
رولڈ گولڈ 23/-/-
نمبر (۳)
مستورات کے لئے
۹ کریٹ سولڈ گولڈ 37/-/-
۱۸ کریٹ سولڈ گولڈ 52/-/-
ایور برائٹ کیس 26/-/-
رولڈ گولڈ 28/-/-
دی انگلش واچ کمپنی (انڈیا) انار کلی لاہور

برائے ریویو

ماہنامہ

ادب لطیف

کا

سالنامہ ۱۹۳۹ء

ادارۂ تحریر

چودھری برکت علی بی، اے

میرزا ادیب بی، اے

مقام اشاعت

مکتبہ اردو لاہور

منیجنگ پروپرائٹر
چودھری نذیر احمد

منیجر
چودھری نشاط احمد

قیمت سالنامہ ایک روپیہ

محمد شریف عباسی خوشنویس لاہور

چودھری برکت علی بی اے ایڈیٹر پرنٹر پبلشر نے برانچ کوآپریٹو کیپٹل پریس وطن بلڈنگ لاہور سے چھپوا کر دفتر رسالہ ادب لطیف سے شائع کیا

فہرس اسمائے ادبا بہ ترتیب حروف تہجی

جلد ۸ نمبر ۴

ادارہ

اشارات

لیجئے "ادب لطیف" کا سالنامہ کتابت طباعت اور اپنی تعمیر تشکیل سے متعلق دیگر منازل مختلفہ طے کرتا ہوا آپکی خدمت میں پہنچ گیا سالنامے اور رسایل و جراید کے بھی شائع ہوتے رہتے ہیں مگر آپ محسوس کریں گے کہ ادب لطیف کا سالنامہ دیگر سالناموں سے کئی امور میں مختلف ہے اور اس کی "مخصوص انفرادیت" اس کے ہر پہلو سے نمایاں!

ان تمہیدی سطور کے بعد ہم سالنامے کے دونوں تشکیلی پہلوؤں کے متعلق کچھ عرض کرتے ہیں اس میں کوئی شک نہیں کہ کسی کتاب یا رسالے کی صوری حیثیت بھی اہمیت رکھتی ہے، مگر یہ ایک مسلمہ امر ہے کہ معنوی حیثیت تصنیف و تالیف کی جان ہوتی ہے اس لئے سب سے پہلے ہم اسی پہلو پر روشنی ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں۔

مقالات: جو حضرات "ادب لطیف" کو شرف مطالعہ بخشتے رہتے ہیں وہ ضرور اس حقیقت کا اعتراف کریں گے کہ ادارہ ادب لطیف ٹھوس پر مغز اور محققانہ مقالات کی اشاعت کی طرف خاص توجہ دیتا ہے زیر نظر سالنامے میں جتنے مقالات شائع ہو رہے ہیں وہ تمام کے تمام اپنے موضوعات کے لحاظ سے بے حد مفید اور افادی لحاظ سے بہت کامیاب ہیں!

حالی مرحوم۔ ہمارے سالنامے کا یہ سب سے پہلا مقالہ ہے اور ہے بھی اردو کے ایک متجر عالم کے قلم سے! علامہ کیفی ہمارے ان مخلص محسنین ادب میں سے ہیں جن کی ذات پر ہمیں ناز ہے اور بجا طور پر ناز..... اس اس مقالے میں حالی کی مختلف خصوصیات پر روشنی ڈالی گئی ہے!

دنیا کا بہترین بت تراش تمدن:۔ فنون لطیفہ پر روشنی ڈالتے ہوئے کئی اہل قلم نے ضمناً بت تراشی اور اس کے ارتقائی ادوار کے باب میں بھی کچھ نہ کچھ لکھا ہے۔ مگر خاص فن بت تراشی پر اردو میں بہت کم لکھا گیا ہے۔ اس لحاظ سے یہ مقالہ غنیمت ہے!

مختصر افسانے اور ان کی اہم خصوصیات:۔ اردو کے موجودہ دور کو افسانہ نگاری کا دور کہنا چاہیئے۔ افسانہ نگاری سے متعلق یہ مقالہ بہت کامیاب اور مفید مطالعہ ہے۔!

لیل و نہار:۔ گذشتہ سالنامے میں تاج صاحب کے قلم سے "اندر سبھا" کے متعلق ایک کامیاب مقالہ درج ہوا تھا، اب انکے قلم سے "لیل و نہار" پر دلچسپ و مفید مضمون شائع ہو رہا ہے، مضمون اگرچہ مختصر ہے، مگر اس کے باوجود اس کی جامعیت و افادیت میں کوئی کمی نہیں آتی

ہندوستان کی حرفتی ناقابلیت کے اسباب:۔ ہمارا یہ غلام ملک جہاں اور حیثیتوں سے بدنصیب واقع ہوا ہے وہاں اس کی حرفتی پستی بھی اس کی غلامی کی زنجیروں کو اور مضبوط کرتی جا رہی ہے۔ کسی ملک کی حرفتی ناقابلیت موجودہ "مشینی دور" میں بدنصیبی کا ایک بہت بڑا عنصر غلامی کی ایک بہت بڑی وجہ اور اقتصادی پستی کا ایک نہایت نمایاں سبب ہے اس محققانہ مقالے میں صاحب مقالہ نے ہندوستان کی ناقابلیت کے مختلف اسباب پر روشنی ڈالی ہے! مقالہ بے حد کامیاب ہے!

پشکن۔ پشکن گہوارۂ اشتراکیت یعنی سرزمین روس کا ایک آتش نوا شاعر تھا، یہی وہ انقلاب پسند شاعر تھا، جس نے دم واپسیں تک زاریت کے مظالم کا مقابلہ کیا۔ اور جسکے شعلہ بداماں کلام کی آتشیں لہروں نے آخر زاریت کے دامن اقتدار کو جلا کر راکھ کر دیا، ہمارے محترم اشتراکی ادیب حضرت باری علیگ نے اس انقلابی شاعر کی زندگی کے چند اہم واقعات اپنے مخصوص خطیبانہ انداز میں بیان کئے ہیں۔

آغا حشر:۔ اس قلا دیر مقالے میں اردو کے مشہور و مقبول ادیب جناب فضل حق قریشی دہلوی نے آغا حشر کے متعلق اپنے ذاتی تاثرات کا اظہار نہایت کامیابی کے ساتھ کیا ہے!

نوٹ:۔ صفحوں کی ترتیب غلط ہے۔ نمبر دیکھ کر پڑھیئے

نے نظم کو بہت بلند کر دیا ہے۔

حقائق :۔ جناب امین حزیں اردو کے ایک شہرہ آفاق فلسفی شاعر ہیں۔ ان کا مخصوص پیغام خودی قریباً قریباً ان کی ہر نظم میں آیا ہے! یہ نظم بھی ان کے پیغام سے تہی دامن نہیں۔

مزدور کا چالان۔ حضرت احسان کی یہ نظم ان کا مخصوص رنگ لئے ہوئے ہے۔

شگفتِ فکر و نظر۔ مدیر شاعر کی ایک نہایت دلآویز نظم ہے۔

گاؤں کا ایک منظر۔ صحیح معنوں میں ایک نیچرل اور دلپذیر نظم ہے۔

کیفِ جاوداں۔ جناب اثر صہبائی کی ایک نہایت کامیاب نظم ہے۔

دھوپ چھاؤں۔ جناب مقبول حسین احمد پوری کی ایک نہایت شیریں اور پیاری نظم ہے۔

اقبال کا پیغام۔ اس نظم میں اردو کے مایہ ناز شاعر جناب الطاف مشہدی نے اقبال کے پیغام کو بڑی کامیابی سے پیش کیا ہے۔

میری دنیا حسین دنیا ہے۔ وجد آور اور دلکش نظم ہے

ندی کنارے ۔۔۔۔ بے حد دلآویز نظم ہے۔

نگہت :۔ راجہ مہدی علی خاں کی یہ نظم اپنی شیرینی لطافت اور حلاوت کے لحاظ سے بے حد دلآویز نظم ہے۔

بیتابی :۔ مدیر شاہکار جناب گوپال متل کی یہ نظم جہاں ہندوستانی دل و دماغ کی بیتابی کی مظہر ہے وہاں شاعرانہ حیثیت سے بھی استحکام رتبہ بہت بلند ہے۔

ان کے علاوہ ہم فراق، امید، اثر چکوالی، کیفی چاندپوری، جلیل، اختر ہوشیارپوری، محترمہ انور خانم، محترمہ خیر النساء، محترمہ لطیف حفیظ ہوشیارپوری، تاجور سامری، محترمہ زیب عثمانیہ، ضمیر جعفری، ضیا فتح آبادی، عادل، تنویر، محترمہ حور، رضا نقوی، حکیم آزاد انصاری، علی احمد، نظیر، احسان، مضطر، ڈاکٹر خالد محمود اسرائیلی، سراج الدین ظفر کا بھی بصمیم قلب شکریہ ادا کرتے ہیں۔

صوری پہلو۔ معنوی پہلو کے بعد ہم سالنامے کے صوری پہلو کی طرف توجہ دیتے ہیں۔

ٹائیٹل پیج۔ ملک کے نامی گرامی آرٹسٹ جناب ایم اسمٰعیل کے موقلم کا نتیجہ ہے، ٹائیٹل پیج کا ہر گوشہ ہر کونہ اور ہر پہلو اتنا حسین اور اس قدر جاذبِ نظر ہے کہ بے اختیار زبان سے نکل جاتا ہے: "کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا اینجاست"!

کتابت :۔ ادب لطیف کی کتابت ہمیشہ شاندار رہی ہے زیر نظر سالنامے کی کتابت بھی کافی خوشگوار ہے، ہمیں افسوس ہے کہ علالت کی وجہ سے ہمارے مستقل کاتب محمد شریف عباسی جو فن کتابت میں خاص حیثیت کے مالک ہیں سالنامے کی کتابت نہ کر سکے، سالنامے کی سب سے زیادہ کاپیاں حکیم حامد حسین نے لکھی ہیں حکیم صاحب کتابت کے فن میں خاص رنگ رکھتے ہیں حکیم صاحب کے علاوہ ہم منشی محمد صدیق عباسی کے بھی ممنونِ احسان ہیں۔

پریس۔ سالنامہ کوآپریٹو کیپیٹل پریس میں چھپا ہے، ادارہ کارکنانِ پریس کی سرگرمی کا ممنون ہے۔

رنگین تصویر۔ جو حضرات ادب لطیف کا مطالعہ کرتے رہتے ہیں وہ اس حقیقت سے آگاہ ہونگے کہ ہم بیہودہ تصویروں کے بہت خلاف ہیں یہی وجہ ہے کہ ادب لطیف میں کم تصویریں شائع ہوتی ہیں مگر اہلِ ذوق جانتے ہیں کہ ہمارے ہاں جو تصویر بھی شائع ہوتی ہے، وہ فنِ مصوری کے لحاظ سے بہت کامیاب ہوتی ہے، سالنامے میں صرف ایک رنگین تصویر دی جا رہی ہے، مگر یہ ایسی تصویر ہے جو آرٹ کا بلند ترین نمونہ ہے، تصویر کے مصور ہندوستان کے نامور آرٹسٹ جناب ماسٹر اللہ بخش ہیں۔ ماسٹر صاحب پنجاب کی معاشرت کو پیش کرنے میں جو حیثیت رکھتے ہیں، وہ ملک کے کسی اور مصور کو حاصل نہیں، اسی تصویر میں دیکھئے رنگوں کے صحیح ترین امتزاج، خطوط کی ہم آہنگی اور پھر جذبات کی عکاسی نے تصویر کو کس قدر بلند کر دیا ہے۔

معذرت۔ ہم ان تمام محترم اہلِ قلم سے معذرت خواہ

افسانے :-

ویکسی نیبٹر :- صاحب طلسم خیال اب اردو افسانہ نگاروں کی پہلی صف میں شمار ہوتے ہیں۔ یہ افسانہ آپ کا خاص رنگ لئے ہوئے ہے۔ بظاہر یہ افسانہ اپنے دامن میں ایک ویکسی نیٹر کی ناکام جیات معاشقہ کی روداد لئے ہوئے ہے۔ مگر عمق پسند نگاہوں کو افسانے کی گہرائیوں میں ایک چبھن سی واقعات کی تہوں میں ایک خلش سی اور الفاظ کے پردوں میں ایک کسک سی نظر آئے گی۔ ناکام محب اپنی ناکامی کو پرچوں ہی کی ستم طرازی کا ایک کرشمہ سمجھتا ہے۔ اور یہ برج کیا ہیں؟ جاگیردارانہ نظام کے انسانیت آزاکولہو

ظالم محبت :- یہ دلآویز افسانہ اردو کی مایہ ناز رومان نویس محترمہ حجاب امتیاز علی کے قلم سے ہے! محترمہ موصوفہ کی مخصوص رنگینی نگارش اس افسانے میں بدرجہ اتم نمایاں ہے!

کسی کی یاد۔ اس افسانے کے مصنف اردو کے جلیل القدر افسانہ نویس جناب پروفیسر سید فیاض محمود ہیں۔ پروفیسر صاحب پنجابی معاشرت کے اظہار میں مہارت تامہ رکھتے ہیں۔ اور کردار نگاری کے فن میں انکا پایہ بہت بلند ہے۔ اس افسانے میں دیکھئے "راشدہ" کا کردار کسقدر نیچرل ہے

افسانہ کیونکر بنتا ہے :- ملک میں پریم پجاری کی پیاری پیاری کہانیوں کو جو وقعت و اہمیت حاصل ہے اس سے بہت کم لوگ ناواقف ہونگے۔ شیرینی حلاوت اور واقعیت ان کی کہانیوں کی جان ہے۔ یہ کہانی بھی ان کی دوسری کہانیوں کی طرح بہت دلآویز ہے۔

خودداری۔ اس افسانے کا مصنف اردو کا ایک کہنہ مشق افسانہ نویس ہے۔ اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ یہ افسانہ کامیاب نہ ہو!

اس نے کہا تھا۔ صاحب افسانہ نے اس افسانے میں ایک ناکام آرزو اور ستم رسیدہ عورت کے آتشیں و منتقمانہ جذبات کو ایسے شاعرانہ انداز میں پیش کیا ہے کہ انسان متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا

داغ معصیت۔ اردو کی نامور رومان نویس خاتون محترمہ مسز عبدالقادر کا یہ رومان دلچسپی و دلآویزی کے لحاظ سے بہت کامیاب اور بہت بلند پایہ ہے۔

شکستہ آئینہ۔ اس افسانے کے مصنف انور کمال صاحب ہیں۔ انور صاحب کو میدان ادب میں آتے ابھی بہت کم عرصہ گذرا ہے، مگر اس کے باوجود آپ نے کافی ترقی حاصل کی ہے! امید ہے مستقبل میں آپ اردو کے ایک مایہ ناز ادیب ثابت ہونگے۔

دفینہ :- منشی پریم چند آنجہانی کا افسانہ ہے جو ہمیں اپنے محترم بزرگ جناب حکیم احمد شجاع کی وساطت سے حاصل ہوا ہے اس افسانے میں منشی مرحوم اپنی تمام خصوصیات کے ساتھ جلوہ گر ہیں۔

دیدۂ تر :- ہمارے محترم و مکرم افسانہ نویس جناب صادق الخیری صاحب ایک عرصے سے ایسے افسانے لکھ رہے ہیں جو بیک وقت دلچسپ بھی ہوتے ہیں اور سبق آموز بھی۔ استدلالات قرآنیہ کی روشنی میں انسانی معاشرت کے ایک اہم پہلو کو افسانوی رنگ میں پیش کرنا آپ ہی کا کام ہے۔

محبوبۂ ابلیس :- یہ افسانہ اردو کے شہرۂ آفاق ادیب حضرت ایم اسلم کے قلم سے ہے۔ میاں صاحب موصوف اردو کے خاص محسن ہیں اور آپ کی تصانیف بڑے شوق و دلچسپی سے پڑھی جاتی ہیں۔ حال ہی میں گورنمنٹ نے ازراہ قدردانی آپ کو افسانوں کے ایک مقبول عام مجموعہ "تفسیر حیات" پر ساڑھے سات سو روپے کی رقم بطور انعام دی ہے۔

سڑک۔ یہ ایک مشاہدہ ہے اور روزمرہ کی زندگی سے کس قدر نزدیک! آپ بھی سڑکوں پر سے گذرتے ہیں مگر آپ نے یہ سب کچھ دیکھتے ہوئے کبھی ہماری معاشرت کے گھناؤنے پہلوؤں پر غور کیا ہے، ممکن ہے ایک حساس دل کا یہ مشاہدہ آپ کو غور کرنے پر۔

پاپ شاپ۔ فنی نقطہ نظر سے بیدی صاحب کا یہ افسانہ نہایت کامیاب ہے

مقبرہ۔ ایک کامیاب افسانے کا کامیاب ترجمہ ہے!

ناگ دیوی۔ ایف ڈبلیو بین کے دو طویل رومان ادب لطیف میں شائع ہو کر بیحد مقبول ہو چکے ہیں۔ یہ تیسرا رومان ہے، ایک تو رومان ہی بے حد دلچسپ و دلآویز ہوتا ہے اس پر جناب سراج الدین احمد نظامی کی مترجمانہ صلاحیت سونے پر سہاگہ کا کام کرتی ہے۔

ٹیڑھی لکیر۔ اس افسانے میں ایک ایسے انسان کے دل و دماغ کی کیفیت بتائی گئی ہے جسے عام ذہن انسانی مجنوں یا پاگل کہکر پکارتا ہے۔ سماج نے ہمارے لئے بزعم خویش ایک سیدھی راہ بنادی ہے

کہ ہم اس پر چلتے جائیں، خاموشی کے ساتھ چلتے جائیں اس یقین کے ساتھ چلتے جائیں کہ یہ راہ بالکل سیدھی، بالکل صحیح راہ ہے اگر ہم میں سے کوئی نہ کوئی ایسا انسان نکل ہی آتا ہے جو اس سیدھی راہ کو چھوڑ کر اپنی راہ آپ بناتا ہے اور اس پر چلتا ہے، سوسائٹی کے قوانین کی زبان اسے پاگل کہتی ہے کیا وہ واقعی پاگل ہے؟؟ ہمارے محترم افسانہ نویس جناب سعادت حسن منٹو کا یہ افسانہ فنی نقطہ نظر سے بہت بلند پایہ ہے۔

گرمیوں کی ایک دوپہر۔ افسانہ ہے اردو کے نامور ترقی پسند ادیب حضرت اختر انصاری کا، اختر صاحب کا مخصوص رنگ اس میں جا بجا نظر آتا ہے۔

ماں۔ ایک روسی افسانہ ہے جسے محترمہ کے احمد شجاع نے اردو میں منتقل کیا ہے امید ہے محترمہ موصوفہ مستقبل میں بہت ترقی کریں گی۔

مزاحیہ ——— !

چینی شاعری۔ پروفیسر کنہیا لال صاحب کا یہ مزاحیہ مضمون طنز لطیف کا ایک نہایت کامیاب نمونہ ہے۔

منگیتر:۔ یہ مضمون ہمارے مشہور مزاح نویس جناب شوکت تھانوی کے قلم مزاح رقم سے ہے، محترم مضمون نگار کی تمام خصوصیات اس میں نظر آ رہی ہیں۔

بیوی سے پہلی جھڑپ۔ ہمارے سالنامہ ۱۹۳۶ء میں علامہ ظریف کا ایک لاجواب مزاحیہ مضمون ہماری بے زبان بیوی شائع ہو کر بہت مقبول ہوا تھا۔ ہمارے محترم علامہ صاحب کا یہ دوسرا مزاحیہ مضمون ہے، اور امید ہے پہلے سے بھی زیادہ مقبول ہوگا ۔۔۔!

میں کون ہوں؟ بظاہر یہ ایک مزاحیہ مضمون ہے۔ مگر حقیقتاً مزاح کے پردے میں ملک کی موجودہ ماتم طلب حالت بیان کی گئی ہے

ڈرامے:۔

لکشمی کا سواگت!۔ یہ ڈراما ہے ہمارے محترم ادیب جناب اوپندر ناتھ اشک کے قلم سے! اشک صاحب اپنی تمام اشک ساماں خصوصیات کے ساتھ اس میں نظر آ رہے ہیں:

سپوت:۔ یہ ایک منظوم ڈراما ہے جسے اردو کے نامور ادیب جناب احمد ندیم قاسمی نے لکھا ہے، قاسمی کا یہ ادبی کارنامہ یقیناً بڑی وقعت کی نگاہوں سے دیکھا جائیگا۔

عدالت:۔ یہ ڈراما ہمارے ایک محترم نووارد کے قلم سے ہے، ڈراما نویس نے جس باریک بینی اور وسعتِ مشاہدہ کا ثبوت دیا ہے، وہ بہت قابلِ تعریف ہے۔

نئی روشنی:۔ یہ طنزیہ ڈراما اردو کے جلیل القدر اور مسلم الثبوت ادیب حکیم احمد شجاع کے قلم سے ہے۔ ڈرامے کا مکالمہ بے حد کامیاب ہے، اس ڈرامے کو "مولیئرانی طنز" کا ایک نہایت کامیاب نمونہ سمجھنا چاہئے۔

زوالِ کینیش:۔ اس ڈرامے میں ڈراما نویس نے چینی ذہن کے موجودہ اضطراب و انتشار کو ڈرامائی انداز میں پیش کیا ہے، ڈراما بہت کامیاب ہے۔

قارئین یہ سنکر بہت مسرور ہونگے کہ اس ڈرامے کے مصنف اور اردو کے جلیل القدر نقاد جناب سید اختر اور ینٹل کالج میں پروفیسر مقرر ہو گئے ہیں۔ ہم اس کامیابی پر اپنی طرف سے اور اپنے قارئین کرام کی طرف سے اختر صاحب کی خدمت میں مبارکباد پیش کرتے ہیں!

تقاضائے عمر۔ یہ ایک ریڈیائی ڈراما ہے۔ جسے اردو کے شہرہ آفاق شاعر حضرت بہزاد لکھنوی نے لکھا ہے!

منظومات:۔

جذباتِ پریشاں:۔ نہایت بلند پایہ نظم ہے، شاعر انقلاب حضرت جوش ملیح آبادی کے قلم سے! ہم اس نظم کے لئے جہاں شاعرِ انقلاب کے ممنون ہیں وہاں حکیم آزاد انصاری کا بھی شکریہ ادا کرتے ہیں کہ ان کی وساطت سے ہمیں یہ نظم حاصل ہوئی ہے

اے جہلم:۔ حضرت روش صدیقی کی ایک نہایت دلآویز نظم ہے۔

میرا مذہب:۔ علامہ سیماب کی یہ نظم جہاں بے حد دلآویز ہے وہاں ایک اہم پیغام لئے ہوئے بھی ہے

کنارے کنارے چلا جا رہا ہوں:۔ خندان صاحب کی یہ بہترین نظموں میں سے ہے۔ ترنم ریزی، روانی اور جذبات کی شدت

ہیں جن کے مضامین نظم و نثر تاخیر کی وجہ سے درج سالنامہ نہ ہو سکے امید ہے ہمارے معاونین کرام ہماری مجبوریوں کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے اس معذرت کو قبول فرمائیں گے!

مکتبۂ اردو ۔اس سال سے کارکنانِ مکتبۂ اردو نے جس سرگرمی جوش اور مستعدی سے اپنے فرائض کو انجام دیا ہے وہ اظہر من الشمس ہے اتنی مختصر سی مدت میں اتنی ضخیم کامیاب اور پھر سب سے بڑھکر یہ کہ صوری محاسن سے آراستہ و پیراستہ کتابوں کا شائع کر دینا معمولی کام نہیں اور اب کارکنانِ مکتبۂ اردو نے مصمم ارادہ کیا ہے کہ وہ آئندہ سال ہر ماہ کم از کم ایک کتاب ملک کے سامنے پیش کر دیں گے یہ عدیم النظیر اشاعتی لائحہ عمل اس وقت تک بروئے کار نہیں آسکتا جب تک ہمارے معاونین کرام کرم فرمائی سے کام نہ لیں ہمیں امید ہے ہمارے محبانِ گرامی اس طرف خاص توجہ دیں گے۔

ایک اہم اعلان ۔اشارات کے تحت میں منیجر صاحب کیطرف سے یہ اعلان کیا جاتا ہے کہ مکتبہ اردو کی جدید کتاب "صحرانورد کے خطوط" جو آٹھ طویل رومانوں پر مشتمل ہے خریدارانِ ادبِ لطیف کو نصف قیمت پر دیجائیگی یعنی صرف ایک روپے میں۔ "ادبِ لطیف" کے خریدار حضرات جو اس کتاب کو حاصل کرنا چاہتے ہیں ایک روپیہ بذریعہ منی آرڈر بھیجدیں جو حضرات ادبِ لطیف کے خریدار نہیں وہ سوا چار روپے بذریعہ منی آرڈر بھیجدیں اس رقم میں ایک تو ادبِ لطیف کے تمام پرچے معہ سالنامہ و افسانہ نمبر انکی خدمت میں ایک سال تک پہنچتے رہیں گے اور دوسرے انکو "صحرانورد کے رومان" بھی مل جائیں گے۔

محمد اقبال سلیم صاحب کی سرگرمیاں ۔ہم اپنے معاونِ خاص جناب محمد اقبال سلیم صاحب کا بصمیم قلب شکریہ ادا کرتے ہیں جناب سلیم گاہندری صاحب ادبِ لطیف کے محسنِ خاص ہیں اور "ادبِ لطیف" کی ترقی و فروغ میں جو دلچسپی لیتے ہیں وہ صرف انہی کا حصہ ہے! ہم پبلک کی خدمت میں درخواست کرتے ہیں کہ وہ ادبِ لطیف کی نشر و اشاعت کے سلسلے میں ہمارے محترم رفیق کا ہاتھ بٹائیں۔۔۔!

مکتبۂ اردو کی ہر لعزیز مطبوعات

پیغمبرِ صحرا ۔مشہور نومسلم بیرسٹر علامہ شیخ خالد لطیف نے پیغمبرِ کائنات کے حالات نہایت دلکش اور سلجھے ہوئے پیرایہ میں لکھے ہیں ہر لفظ سے عشقِ رسالت کی خوشبو آتی ہے اردو ترجمہ "پرافٹ آف دی ڈیزرٹ" مجلد و مطلا قیمت دو روپے

طلسمِ خیال :۔میخانۂ حسن و عشق کا وہ لبریز ساغر ہے جس کے قطرے قطرے میں محبت کی دنیا لہرا رہی ہے۔ کرشن چندر ایم اے۔ قیمت عہ

کمپنی کی حکومت ۔داستان ہے اس صد سالہ دورِ پرآشوب کی جب ہندوستان کو سیاسی طور پر محکوم اور اقتصادی لحاظ سے غلام بنایا جا رہا تھا۔
اشتراکی ادیب باری مجلد عمر

چاند کا گناہ اور دیگر افسانے :۔اس مجموعہ میں دنیا بھر کے نقادانِ ادب کے بہترین تسلیم شدہ افسانے شامل ہیں جو اب تک اردو میں منتقل نہیں ہوئے تھے۔ راجہ مہدی علی خاں مجلد مطلا دو روپے

دنیا کی حور ۔اور دیگر افسانے :۔یہ کتاب خاص طور پر لڑکیوں اور عورتوں کیلئے لکھی گئی ہے اسکا پلاٹ بالکل ہماری معاشرت اور تمدن کیمطابق ہے طبیعت خود بخود الفاظ کا اثر قبول کرتی ہے کوثر چاندپوری مجلد عہ

حاجی لق لق کے افسانے :۔ملک کے مشہور مزاح نگار حاجی لق لق کے بہترین مزاحیہ مضامین کا مجموعہ جس کے پڑھنے سے آپ کا دل کشتِ زعفران بن بن جائیگا۔ حاجی لق لق ایک روپیہ

صحرانورد کے خطوط ۔رومان انگیز دنیا میں بھٹکنے والے صحرانورد کی کتاب زندگی کے ہیجان خیز اوراق جنکا ایک ایک لفظ آپ کو قعرِ حیرت میں گم کر دے گا۔ میرزا ادیب۔ بی اے دو روپے

شہنشاہِ حبشہ :۔دنیا کی سٹیج پر ابھی ابھی ایک نہایت دلدوز لرزہ خیز اور وحشتناک ڈرامہ تمثیل ہوا ہے جسکا ہولناک نتیجہ دنیا کبھی نہیں بھول سکتی۔ اختر ادرینوی ایم اے آٹھ آنے

تین پیسے کی چھوکری ۔اور دیگر افسانے :۔افسانہ نگاری کے شائق اور افسانوں میں حقیقی روح دیکھنے والوں کے لئے ان افسانوں کا مطالعہ ازبس ضروری ہے۔ قاضی عبدالغفار خاں (مصنف لیلےٰ کے خطوط) مجلد ڈیڑھ روپیہ

آہنگِ رزم ۔ وقار انبالوی مجلد آٹھ آنے

علامہ برجموہن کیفی وتاتریہ

خواجہ حالی مرحوم

کہا گیا ہے کہ بڑی بڑی جنگوں سے جہاں ہزاروں لاکھوں آدمی موت کی جاتی ہیں۔ اور بیشمار مالی نقصان ہوتے ہیں۔ وہاں یہ بھی ہوتا ہے کہ لڑنے والی اور دوسری قوموں میں خونریزی اور بربریت کا حیوانی جذبہ خاصی لمبی مدت کیلئے ٹھنڈا پڑ جاتا ہے اور قوموں کو اپنی اور دوسروں کی طاقت کا زیادہ صحیح اندازہ ہو جاتا ہے اور اصلاح و ترقی کے نئے راستے اُن پر کھل جاتے ہیں ایسا ہی نتیجہ دو مختلف کلچروں یا تہذیبوں کے تصادم سے پیدا ہوتا ہے گزشتہ تاریخ میں یونان اور روما کی تہذیبوں کا تصادم اس کی کلاسیکل نظیر ہے۔ ہندوستان میں ۱۸۵۷ء کے بعد جو تاریخی تصادم ہندوستانی اور مغربی کلچروں اور تہذیبوں میں ہوا وہ اس ذیل میں زندہ مثال کہی جا سکتی ہے اس بارے میں ہمارا روئے سخن تہذیب کے ایک شعبہ یعنی ادب اور شاعری کی طرف ہے۔

زمانہ کی جو حد اوپر قائم کی گئی ہے اسکے دوران میں ہماری شاعری اور لٹریچر کی جو حالت تھی۔ اس کا نقشہ آزاد مرحوم نے اپنے متعدد لیکچروں میں خوب اُتارا ہے۔ اس لئے یہاں اسکی تشریح محض طوالت ہے۔ جس حالت کا ابھی ذکر ہوا اس کی چھان بین ہو چکی تھی۔ اصلاح و ترقی کے نسخے تحریر ہو چکے تھے۔ انجمن پنجاب لاہور میں کام کر رہی تھی۔ اور نئے طرز کے مشاعرے جن کو میں مناظمہ کہتا ہوں آزاد مرحوم کی جدت آفریں کوششوں سے قائم ہو چکے تھے اس بارے میں خواجہ حالی اپنے مجموعہ نظم کے دیباچہ میں اس طرح اشارہ کرتے ہیں۔

"۱۸۷۴ء میں جب راقم پنجاب بک ڈپو سے متعلق لاہور میں مقیم تھا تو مولوی محمد حسین آزاد کی تحریک اور کرنل ہالرائڈ ڈائرکٹر سررشتہ تعلیم پنجاب کی تائید سے انجمن پنجاب نے ایک مشاعرہ کیا تھا جو ہر مہینہ ایک بار انجمن کے مکان میں منعقد ہوتا تھا۔ اس مشاعرہ کا مقصد یہ تھا کہ ایشیائی شاعری جو کہ دروبست عشق اور مبالغہ کی جاگیر ہو گئی ہے اس کو جہاں تک ممکن ہو وسعت دی جائے۔ چار مثنویاں یعنی برکھا رت۔ نشاط امید۔ حب الوطن اور مناظرۂ رحم و انصاف اس مشاعرے کی نظمیں ہیں[1]"

صورت حال یہ تھی کہ خواجہ حالی کا لاہور میں آنا ہوا۔ وہ دن تو مبارک تھا ہی جس دن آزاد مرحوم نے نیچرل یا نئی شاعری کی بنیاد ڈالی لیکن وُہ دن بھی اردو کے لئے کم مبارک نہ تھا جب ماسٹر پیارے کیورٹر گورنمنٹ بک ڈپو کی نظر انتخاب دہلی کے اینگلو عربی سکول کے استاد پر پڑی۔ اور اسے لاہور میں کھینچ لائی۔ میں ابھی یہ کہہ دینا چاہتا ہوں۔ کہ حالی نے جو مفید کام اردو شاعری سے لیا۔ وُہ اُردو دنیا میں بے نظیر ہے ہندی میں اس کی نظیر تلسی داس اور سُورداس کی معزز ہستیاں پیش کرتی ہیں

حالی نے جو کام اُردو شاعری سے لیا اسکے عنصر ان کے ذہن میں پہلے سے موجود تھے جب وہ لاہور میں چار برس کے قیام کے بعد دہلی واپس گئے تو سر سید احمد خاں کی اصلاحی تحریک علی گڑھ میں شروع ہو گئی تھی طبیعت کی افتاد کہیئے یا ماحول کا مقناطیسی اثر۔ وہ اس تحریک میں ہمہ تن غرق ہو گئے۔ شاید بعضوں کو یہ معلوم نہ ہو کہ حالی کون تھے۔ اور کیا تھے ماسلئے ضروری ہے کہ پہلے ان کے ذاتی اور سوانحی حالات مختصر بیان کر دئے جائیں۔ خواجہ الطاف حسین حالی پانی پت میں ۱۸۳۷ء میں پیدا ہوئے ان کے مورث اعلیٰ خواجہ مالک علی جو علم و فضل اور تقدس میں مشہور تھے۔ غیاث الدین بلبن کے عہد میں ہرات سے ہندوستان آئے اور پانی پت میں رہنے لگے۔ اس زمانے کے شرفاء کے دستور کے مطابق حالی کو ابتدا میں مذہبی تعلیم دی گئی۔ اس سے بہت جلد فراغت پا کر وہ ۱۸۵۴ء میں

[1] مجموعہ نظم حالی۔ دوسرا ایڈیشن۔ دیباچہ صفحہ ۳۱

دہلی چلے گئے جہاں انہوں نے مشہور معلم میر نوازش علی کے مدرسہ میں عربی پڑھنی شروع کی جب ۱۸۵۷ء کی شورش شروع ہوئی تو وہ پانی پت چلے آئے وہاں جا کر تعلیم کا سلسلہ پھر شروع کیا اور منطق اور فلسفہ وغیرہ کی اکثر کتابیں دیکھیں ۱۸۶۳ء میں وہ نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ رئیس جہانگیر آباد کے صاحبزادہ نقشبند خاں کے اتالیق مقرر ہوئے۔ جہانگیر آباد اگرچہ میرٹھ کے ضلع میں ہے لیکن نواب شیفتہ زیادہ تر دہلی ہی میں رہتے تھے۔ نواب شیفتہ اعلےٰ درجہ کے عالم اور ادیب اور فارسی اور اردو کے نہایت شستہ مذاق شاعر تھے۔ وہ فارسی نظم میں مرزا غالبؔ کے شاگرد تھے اور مومن کے انتقال کے بعد اردو کلام بھی مرزا ہی کو دکھانے لگے انہیں دنوں میں حالی کا مرزا غالبؔ سے تعارف ہوا۔ اور وہ مرزا کے شاگرد ہو گئے۔ یہ ایک سوال ہے۔ کہ خواجہ حالی نے آیا نواب شیفتہ کی صحبت سے زیادہ فائدہ اٹھایا یا مرزا غالب کی شاگردی سے؟ غدر کے بعد دہلی ادبی تنگدستی کا شکار ہو گئی تھی۔ لیکن ہاتھی گئے گذرے بھی تو کہاں تک ہ مرزا غالب اور نواب شیفتہ کے علاوہ نواب ضیاء الدین احمد خاں نیرؔ رخشاں اور حالی کے پیر بھائی مرزا سالک۔ میر مجروح اور سید ذکی وغیرہ اہل علم موجود تھے شیفتہ کے انتقال کے بعد خواجہ حالی دہلی کے اینگلو عربک سکول میں عربی کے معلم ہو گئے۔ وہ اسی سکول سے لاہور سے واپسی کے بعد بھی متعلق رہے چونکہ نہایت قانع مزاج تھے۔ اس کے بعد ۱۸۸۸ء میں جب حیدر آباد سے پچھتر روپیہ ماہانہ ان کا وظیفہ مقرر ہو گیا تو وہ سکول کی نوکری چھوڑ کر پانی پت چلے گئے۔ آخر ستر برس کی عمر پا کر ۳۱ دسمبر ۱۹۱۴ء کو جنت سدھارے

حالی نے مرنجاں مرنج طبیعت پائی تھی۔ ہمدردی اور رحم ان کے مزاج کے حاوی عنصر تھے مجھے کئی برس ان کی صحبت سے مستفید ہونے کا موقعہ ملا یہ وہ زمانہ تھا کہ وہ لاہور سے واپس آ گئے تھے اور ۱۸۷۹ء میں مشہور مسدس تصنیف ہو چکی تھی۔ اسپوشن کے ابتدائی حصہ کا ذکر ہے کہ وہ اور میں دہلی کے بیگم کے باغ میں سے جسے اب کمپنی باغ کہتے ہیں گزر رہے تھے۔ شروع برسات کا موسم تھا اور شام کا وقت۔ میں نے ایک جگنو پکڑ کر اپنی ٹوپی میں رکھ لیا۔ ٹوپی دہلی کے فیشن کی تن زیب تھی جگنو کی جھلملاہٹ پر ان کی نظر گئی ہوگی۔ کہنے لگے تم تو برہمن ہو اور برہمن دیا والے اور اہنسا کے پیرو ہوتے ہیں۔ عرض کیا کہ میں کچھ نہ سمجھا فرمایا تمہاری ٹوپی میں کیا ہے؟ اب میں انکا مطلب سمجھا اور ٹوپی کا کونہ اٹھا کر جگنو کو آزاد کر دیا۔ کئی برس تک معمول رہا کہ شام کو میں ان کی خدمت میں حاضر ہوتا اور ہم دونوں ننھے خاں صاحب شیدا کے ہاں مٹیا محل میں جاتے جہاں پرانے زمانے کی باتیں اور ادبی گفتگو ہوا کرتی۔ حالی کی طبیعت میں ثقاہت اور متانت حد درجہ کی تھی۔ بولتے کم تھے۔ میر مہدی مجروح کبھی کبھی شام کو آتے۔ ایک دفعہ ڈپٹی نذیر احمد تشریف لائے میں موجود تھا۔ ڈپٹی صاحب کی ظرافت اور مزاح سب جانتے ہیں۔ حالی نے مسکرا کر مجھے رخصت کر دیا۔ جب سر سید ڈپٹی صاحب منشی ذکاء اللہ اور حالی تخلیہ میں ہوتے تو یہ بزرگ بالکل بے تکلف ہو جاتے یہ مجھے معلوم تھا کہ حالی ایسی صحبت میں بھی کسی سے ہیٹے نہیں تھے۔ میں بھی مسکرایا اور چلا گیا۔ ایسی باتیں بہت سی ہیں۔ جو خواجہ مرحوم کی خصلت اور عادات پر روشنی ڈالتی ہیں۔ ان کا مفصل ذکر طوالت چاہتا ہے۔ اب اس بارے میں کچھ بتانا چاہتا ہوں۔ کہ ادیب اور شاعر کی حیثیت سے حالی کا درجہ کیا تھا؟

ادب میں کسی کا درجہ قرار دینا ٹیڑھی کھیر ہے۔ حالی کے کلام کا تجزیہ ان کی تحلیلِ نفسی کی طرف رہبری کرتا ہے۔ ان کی طبیعت کی افتاد کا ذکر آگے آچکا ہے۔ حیاتِ سعدی، یادگارِ غالب اور سب سے بڑھ کر مقدمہ شعر و شاعری لکھ کر انہوں نے ادب میں نقد و نظر کا نیا سکول قائم کیا جس کی پیروی اس وقت بہترین نقادوں کا مذہب ہے۔ مقدمہ سے پہلے کوئی کتاب اردو یا فارسی میں اس جامعیت اور دقتِ نظر کی نہ تھی۔ جو مقدمہ کا مابہ الامتیاز ہے۔ پھر ان کے مکاتیب اور مضامین کا درجہ ہے۔ شاعر کی حیثیت کے متعلق یہ کہنا صحیح ہے کہ اپنے زمانہ میں جو شہرت اور مقبولیت حالی اور داغ کو نصیب ہوئی وہ ان کے کسی معاصر کو نہ ملی۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ حالی کی شہرت کا راز مسدسِ مدوجزرِ اسلام ہے۔ میں اس کو نہیں مانتا۔ دیوانِ حالی میں جن غزلوں پر حق لکھا ہے وہ مسدس اور طرزِ قدیم کے ترک کرنے سے پیشتر کی ہیں اور ان میں غالب کی جدتِ تخیل اور شیفتہ کے حسنِ ادا کا ستھرا اور نکھرا رنگ دکھائی دیتا ہے۔ اسی ذیل کے کچھ شعر سنئے اور دیکھئے کہ کس طرح دل میں کھُبے جاتے ہیں ۔

سچ ہے کہ پاسِ خاطرِ نازک عذاب ہے
تھا دل کو جب فراغ کہ وہ مہرباں نہ تھا

تھی ہر نظر نہ محرمِ اسرار ورنہ یاں
ہر خار نخلِ ایمن و ہر سنگ طور تھا

تم کو ہزار شرم سہی مجھ کو لاکھ ضبط
الفت وہ راز ہے کہ چھپایا نہ جائے گا

قلق اور دل میں سوا ہو گیا　دلاسا تمہارا بلا ہو گیا
وہ امید کیا جس کی ہو انتہا　وہ وعدہ نہیں جو وفا ہو گیا

آنے لگا تھا اس کی تمنا میں کچھ مزا
کہتے ہیں لوگ جان کا اس میں زیاں ہے اب
اک جرعۂ شراب نے سب کچھ بھلا دیا
ہم ہیں اور آستانۂ پیرِ مغاں ہے اب

یقیں ہے کہ ہم جس کو سمجھے ہیں مرنا　یہی ہو تو ہو زندگانی کی صورت
سمجھ کر کرو قتل حالی کو دیکھو　مٹا دو نہ عشق و جوانی کی صورت

اک عمر چاہیئے کہ گوارا ہو نیشِ عشق
رکھی ہے آج لذتِ زخمِ جگر کہاں

ٹھیرتے ٹھیرتے دل یوں ہی ٹھہر جائیگا
بات جو آج ہے وہ کل غمِ ہجراں میں نہیں

کوئی محرم نہیں ملتا جہاں میں　مجھے کہنا ہے کچھ اپنی زباں میں

اہلِ معنی کو ہے لازم سخن آرائی بھی
بزم میں اہلِ نظر بھی ہیں تماشائی بھی

زیادہ شعر دینا طولِ کلام ہے۔ کہ ایک قطعہ اور ایک غزل کہہ کر حالی نے پرانے طرز کو ترک کر دیا۔ قطعہ مشہور ہے جسکا ایک شعر یہ ہے:۔

گو غزل لکھیئے تو کیا لکھیئے غزل میں آخر
نہ رہی بات وہ مضمون سجھانے والی

اور اس غزل کا مقطع یہ ہے:۔

حالی اب آؤ پیروئ مغربی کریں
بس اقتدائے مصحفی و میر کر چکے

زبان اور اسلوب موضوع کے پیچھے چلا کرتے ہیں جسطرح وہبی شاعر اپنی زبان آپ پیدا کرتا ہے اسی طرح مصلح شاعر مادے کے ساتھ اس کی تشکیل کی طرز کو بھی بدل دیتا ہے اول تو پانی پت اور دلی کی زبان میں بعد المشرقین نہیں۔ پھر حالی کا قدیم کلام دیکھئے اور اس کی زبان اور اسلوب کا مومن غالب اور شیفتہ کے کلام کی زبان اور اسلوب سے مقابلہ کیجئے تو کہیں فرق نہ پائیگا اگر متاخرین میں غالب تخیلی صناعی میں فرد تھا تو حالی معنوی صناعی میں اپنی مثال آپ تھے۔ کہتے ہیں۔

آنے لگا تھا اس کی تمنا میں کچھ مزا
کہتے ہیں لوگ جان کا اس میں زیاں ہے اب

اور کوئی ہوتا تو تمنا کے بدلے محبت کا لفظ لکھ دیتا اور معنوی نفریح کا بھانڈا پھوڑ دیتا۔ ایسے بہت سے نکتے حالی کے کلام میں بھرے پڑے ہیں۔ سادگی پسند طبیعت ہونے اور کام کی باتیں بتانے کے شغف کے باوجود وہ دلفریبی کے ساتھ نظر افروزی کے بھی قائل تھے۔ فرمایا ہے:۔

اہلِ معنی کو ہے لازم سخن آرائی بھی
بزم میں اہلِ نظر بھی ہیں تماشائی بھی

اقبال مرحوم نے اس ہدایت سے پورا فائدہ اٹھایا:۔

میں پھر کہوں گا کہ ادبی دنیا میں حالی کی شہرت کا جھنڈا مسدس کی تصنیف سے پہلے گڑ چکا تھا۔ مرزا غالب کے انتقال پر ان کے تین چوٹی کے شاگردوں نے مرثیے کہے۔ یہ تینوں ترکیب بند تھے اور ایک ہی بحر میں۔ موضوع بھی ایک تھا۔ یہ لکھنے والے مرزا قربان علی بیگ سالک۔ میر مہدی مجروح۔ اور خواجہ حالی تھے دہلی کے اس فیصلہ کو تمام ملک نے قبول کیا کہ حالی کا نوحہ سب میں اول تھا۔ قدامت پرستوں اور علیگڑھ کے مخالفوں کی طرف سے مسدس کی تردید بھی ہوئی۔ جیسے مولوی تعلیم الدین تسلیم کا جوابی مسدس۔ لیکن کسی کو فروغ نصیب

ہوا وہ مسدس حالی تھا کہ میلاد کی مجلسوں سے لیکر رقص و سرود کی محفلوں تک میں سنایا جاتا تھا۔ کئی زبانوں میں اس کے ترجمے ہوئے۔ پنجابی میں مسدس کو منتقل کرنے کا سہرا پنجاب کے سپیکر سر شہاب الدین کے سر ہے۔ حالی نے شعر کے اور اصناف کی طرف بھی خاص توجہ کی۔ ان سے پہلے اردو میں صرف ایک ترکیب بند ذکر کے قابل تھا۔ یعنی مومن کا نوحہ۔ حالی نے ترکیب بند کو خوب چمکایا۔ قصیدوں کا موضوع مدح و ذم کے علاوہ شہر آشوب کے محبس میں قید تھا۔ حالی نے قصیدہ غیاثیہ لکھکر قصیدے کی نئی راہیں کھولیں۔ عجب نہیں یہ قصیدہ شکوہ اور جواب شکوہ کا ملہم ہوا ہو۔ بیوہ کی مناجات اپنی وضع اور زبان کے لحاظ سے بینظیر مثنوی ہے۔ ایک پاکباز غمزدہ کے زخمی احساس اور مجروح جذبات کی عکاسی میں کمال کر دکھایا ہے۔ لوگ اس موضوع پر لکھتے ہوئے نفسانیت کے گڑھے میں گر پڑتے ہیں۔ مگر اس میں یہ بات نہیں حالی اگرچہ انگریزی نہیں جانتے تھے۔ لیکن انہوں نے انگریزی لٹریچر اور مغربی معاشر کے محاسن کو اپنی مشرقی گرمجوشی میں خوب سمویا تھا۔ چنانچہ جیب کی داد کے سوا ایک نثر کی کتاب مجالس النسا بھی ان کے قلم سے نکلی جس کی اپنے وقت میں بہت قدر ہوئی۔

مثنویوں کے بعد رباعی کو بھی انہوں نے خاص وقعت بخشی یہانتک کہ اب لوگوں کے رباعیوں کے مجموعے نکل رہے ہیں۔ آجکل اردو شاعری میں وطنیت اور اشتراکیت چلتے ہوئے موضوع ہیں۔ حالی کا کلام ان سے خالی نہیں۔ وطن سے خطاب کرتے ہیں:۔

تیری اک مشتِ خاک کے بدلے — لوں نہ ہرگز اگر بہشت ملے
جان جب تک نہ ہو بدن سے جدا — کوئی دشمن نہ ہو وطن سے جدا

اور فرمایا ہے:۔

مرد ہو تو کسی کے کام آؤ — ورنہ کھاؤ پیو چلے جاؤ
جب کوئی زندگی کا لطف اٹھاؤ — دل کو دکھ بھائیوں کے یاد دلاؤ
کتنے بھائی تمہارے ہیں نادار — زندگی سے ہے جنکا دل بیزار

رواداری کی نصیحت ملاحظہ ہو:۔

تم اگر چاہتے ہو ملک کی خیر — نہ کسی ہموطن کو سمجھو غیر
ہو مسلمان اس میں یا ہندو — بودھ مذہب ہو یا کہ ہو برہمو

سب کو میٹھی نگاہ سے دیکھو — سمجھو آنکھوں کی پتلیاں سب کو

اس میں تو کسی کو کلام نہیں کہ حالی سے ملی شاعری کی ابتدا ہوئی پر ملک میں اس کی مخالفت کی گئی ہے کہ شاعری سے فرقہ بندی کا کام لیا جائے یعنے پروپگنڈا کے لئے استعمال کیا جائے۔ مسدس اس ضمن میں آتا ہے میں حیران ہوں کہ ملٹن اور ڈانٹے کے شاہکار مثنوی مولوی معنوی۔ گوسائیں جی کی رامائن اور سورداس کی شاعری کی نسبت کیا کہا جائیگا۔ بائرن نے جو احسان سقراط اور افلاطون کے وطن پر کیا۔ وہی حالی نے اپنے مسدس سے ہندوستان کی کئی کروڑ آبادی کے ساتھ کیا۔ قصہ مختصر ہر مہذب قوم نے شعر سے قومی مفاد اور انسانی خدمت کا کام لیا ہے۔ جو کام شعر سے حالی نے لیا وہ ہر ایک کے بس کا نہیں۔ یہ تبحر یہ قدرتِ نگارش یہ خلوص اور دلسوزی ہر ایک کو ودیعت نہیں ہوا کرتی۔ اور اس پر علیگڑھ کی صحبت اور شرکت کاری حالی کا ذہن قوم اور وطن کی فکر سے کب خالی رہتا تھا۔ کہ وہ خیالی گلزار کی گلگشت کرتا۔ ٹھیک کہا ہے۔

اب سنو حالی کے نوحے عمر بھر — ہو چکا ہنگامۂ مدح و غزل

شعر و شاعری کی نسبت انکا دستور العمل کیا تھا یہ اس قطعہ سے ظاہر ہے جو اس طرح ظاہر ہوتا ہے:۔

اے شعر دلفریب نہ ہو تو تو غم نہیں
پر تجھ پہ حیف ہے جو نہ ہو دل گداز تو
صنعت پہ ہو فریفتہ عالم اگر تمام
ہاں سادگی سے آئیو اپنی نہ باز تو
جوہر ہے راستی کا اگر تیری ذات میں
تحسینِ روزگار سے ہے بے نیاز تو

ممکن ہے یہ رموز اور نکتے اوروں کے ذہن میں بھی گشت کرتے ہوں لیکن انکا اعلان اور ان پر عمل بڑی اخلاقی جرأت اور جدت عمل چاہتا ہے امید رکھنی چاہیئے کہ یہ جرأت اور جدت ہمیں اپنے ہموطنوں میں کبھی ضرور دکھائی دے گی۔

سنیں گے نہ حالی کی کب تک صدا
یہی ایک دن کام کر جائے گی

جوش ملیح آبادی

خیالاتِ پریشاں

تخت کی مجھ کو تمنّا ہے نہ ذوقِ دیہیم　　میری ہر سانس میں ہے دولتِ صد ہفت اقلیم
عقلِ اوّل جسے کہتے ہیں زمانے والے　　میرے حلقے میں ہے منجملۂ یارانِ قدیم
شوقِ دیدار کی وہ آگ ہے میرے دل میں　　جسکے ایک ایک شرر میں ہیں نہاں لاکھ کلیم

اوجِ افلاک پہ ہیں فاقہ کشوں کی آہیں　　کون کہتا ہے کہ رزّاق نہیں ربِّ کریم
کونسا دل ہے کہ زخموں سی نہیں ہے خونبار　　مرحبا اے کرمِ عام وزہے فیضِ عمیم

کتنے شمشاد خراماں ہیں مری نظروں میں　　اسقدر لوچ نہ دکھلا مجھے اے موجِ نسیم

تو مرے لمحۂ الہام میں اے روحِ حیات!　　آخر آہی گئی تسلیم، ادھر آ تسلیم

تجھسے کتنے مرے آغوشِ بصیرت میں ہیں دیکھ　　مجھسے بھی عربدہ، کونین کے اے رازِ عظیم

جناب کرشن چندر ایم۔ اے

وکسی نیٹر

جب میں ایف۔ اے میں فیل ہو کر اس گاؤں میں وکسی نیٹر بن کر آیا تو وہ چیز جس کی کشش نے مجھے سب سے زیادہ اپنی طرف کھینچا۔ وہ ریشماں تھی۔ ریشماں کے حسن وجمال کا چرچا تو میں اس سے پہلے بھی بہتوں سے سن چکا تھا۔ اور خاصکر راستے میں ایک پولیس سارجنٹ نے جب اسے معلوم ہوا کہ میں پنڈور کے گاؤں میں وکسی نیٹر بنکر جارہا ہوں۔ مجھے بتایا۔ کہ "پنڈور کی دلکش وادی میں یوں تو بہت سی چیزیں اور جگہیں دیکھنے کے قابل ہیں۔ بکشمن جی کا کنڈ جسکی گہرائی کا پتہ آجتک کوئی انگریز بھی نہیں لگا سکا۔ جاگیر دار صاحب کا پرانا محل جسکے چوکور برج دھوپ میں سونے کی طرح چمکتے ہیں۔ اور جو آجکل بالکل ویران پڑا ہے۔ اور محض اسی وقت استعمال کیا جاتا ہے۔ کہ جب جاگیر دار صاحب یا اُن کے مہمان یا لڑکے بالے کبھی پنڈور کی وادی میں شکار کھیلنے کی غرض سے تشریف لاتے ہیں۔ کھٹے اناروں کا جنگل جو پنڈور کے مغربی پہاڑیوں پر پھیلا ہوا ہے اور جہاں جنگلی ڈھنگ، سیب، آلوچے، بہی، اور املوک کے درخت بھی پائے جاتے ہیں۔ جہاں جنگلی گلاب کی بیلیں محبوب کی باہوں کی طرح ان پھلدار درختوں سے ہر وقت لپٹی رہتی ہیں۔ اور جن کی ٹھنڈی آغوش میں بنفشے کے پھول ہر لحظہ مسکراتے ہیں اور شرماتے ہیں۔ ہاں، پنڈور کی وادی میں بہت سی چیزیں دیکھنے کے لائق ہیں۔ لیکن وہاں اگر تم نے ریشماں کو نہ دیکھا تو سمجھ لینا کہ تم نے پنڈور میں کچھ نہیں دیکھا۔"

"سچ مچ" میں نے آہستہ سے پوچھا۔

"خدا کی قسم ——!" پولیس سارجنٹ نے ایک لمبی آہ بھر کر کہا اور گھوڑے پر سوار ہو کر چلا گیا۔

اگرچہ مجھے یقین تو اب بھی نہ ہوا، لیکن ریشماں کو دیکھنے کا شوق دل میں گھر کر گیا، آخر، وہ بھی ایسی کیا حسین پری ہوگی؟ ان پولیس والوں کی باتوں پر اعتبار کم ہی کرنا چاہئے، اور پھر عورتوں کے متعلق تو ان کا یہ عقیدہ ہے کہ ہر عورت حسین ہوتی ہے، چاہے وہ عورت مٹی ہی کی کیوں نہ ہو۔

اب تو میری حالت اس بوڑھے مرغ کی سی ہے، جو شباب گزر جانے پر بھی اپنے آپ کو جوان ہی سمجھتا ہے، لیکن ان دنوں جب میں نیا نیا وکسی نیٹر بنکر یہاں آیا تھا، تو میری شکل و شباہت، جسمانی صورت بہت سے لوگوں کیلئے قابل رشک تھی، اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ان دنوں گاؤں بھر میں میں ہی اپنے ڈھنگ کا ایک سجیلا جوان تھا۔ اور پھر انٹرنس پاس اور سفید لٹھے کی شلواریں پہننے والا گیارہ روپے تنخواہ تھی، کلاہ پر طرّے دار لنگی، پاؤں میں طلا جوتی، اور چہرے پر مونچھیں سائیکل کے ہینڈل کی طرح مڑی ہوئی، ہاں، وہ زمانہ تھا میرے بانکپن کا، اب تو جوانی کی بہاریں خزاں میں تبدیل ہو چکی ہیں،

آہ، دوست، وہ بھی کیا دن تھے، کاش تم نے مجھے جوانی میں دیکھا ہوتا، دیوان غالب میں ایک شعر مجھے بہت پسند ہے، وہ ہے، وہ، ہے ...... آہ، اسوقت کمبخت یاد نہیں آرہا، دماغ چکرا رہا ہے، زبان پر پھر رہا ہے، لیکن —— اچھا

ہاں تو میں ریشماں کے متعلق کہہ رہا تھا، لیکن میں ریشماں کے متعلق کیا کہوں،

ریشماں کی آنکھیں، ان نیلی پتلیوں کی اتھاہ گہرائیاں، وہ آنکھیں ان دو پاک وصاف جھیلوں کی مانند تھیں، جو کسی اونچے پہاڑ کی چوٹی پر واقع ہوں جہاں کسی انسان کے قدم بھی نہ پہنچے ہوں، ریشماں کے نازک لب، شرمسار، محجوب سے لب، جیسے وہ اپنی خوبصورتی پر خود ہی پشیمان ہوں، اُسکے نازک ہاتھ، مرمریں انگلیوں کی پوریں جنگلی گلاب کی کلیوں طرح حسین، اس کی چال، جیسے دوشیزۂ بہار اپنی تمام تر لطافتوں اور رعنائیوں کو لئے ہوا کے دوش پر اٹھلاتی ہوئی آگئی ہو، اس کی آواز

صنوبر کے جنگلوں میں گھومتے ہوئے گڈریے کی بنسری کی طرح میٹھی اور بہتے ہوئے ٹھنڈے چشموں کے ترنم کی طرح وجدار، اس کا قد، فارسی کا ایک شعر ہے، ایک نہایت ہی موزوں شعر ہے، لیکن... کمبخت یاد نہیں آرہا، بالکل زبان پہ پھر رہا ہے، آہ، کیا خوب شعر تھا، نظیری کا شعر، نہیں عرفی کا، آہ، اب حافظہ کسقدر کمزور ہو گیا ہے، کچھ یاد نہیں رہتا — کچھ یاد نہیں رہتا، مجھے اب تو اپنا کلام بھی یاد نہیں، حیرت ہے، ان دنوں میرا حافظہ کس قدر تیز تھا،

تو یہ تھی ریشماں، بنڈور کی وادی کی حسینہ، بے شک ایک نایاب چیز تھی، اور دور سے لوگ اُسے دیکھنے کے لئے آیا کرتے تھے، اسکے باپ کو ہر روز ریشماں کے لئے ناطے کے پیغام آیا کرتے، کوئی پانچسو روپے کوئی ایک ہزار، کوئی ڈیڑھ ہزار، کوئی منچلا تین ہزار روپے تک دینے کو تیار تھا، لیکن اس کا باپ شاید صرف نفی میں ہی جواب دینا جانتا تھا، کم از کم میں نے تو اُسے کسی کے لئے ہامی بھرتے نہیں دیکھا، نہ سنا، خدا جانے اس کے دل میں کیا تھا، شاید وُہ اپنی لڑکی کسی بادشاہ کے ہاں دینا چاہتا تھا، اور یوں بھی تو ریشماں کسی بادشاہ کے گھر کے لائق ہی تھی

لیکن، جیسا کہ میں نے کہا، جوانی بُری بلا ہے، اور جوانی کی محبت اس سے بھی زیادہ خطرناک، میں نے ریشماں کو دیکھتے ہی سمجھ لیا، کہ دنیا میں ریشماں صرف میرے لئے ہے، اور میں اُس کے لئے، اور یہ ٹھان لی کہ چاہے اس کے باپ کو قتل ہی کیوں نہ کرنا پڑے، اُسے اغوا ہی کیوں نہ کرنا پڑے، لیکن اگر شادی ہو گی، تو صرف ریشماں سے، نہیں تو جان پر کھیل جاؤنگا، اس کے سارے خاندان کو تہ تیغ کر دونگا سارے گاؤں کو آگ لگا دونگا، اس کے سامنے پہاڑی پر سے نیچے نالے میں کود کر مر جاؤنگا، لیکن یہ کبھی گوارا نہ ہوگا، کہ میرے جیتے جی میری ریشماں کو کوئی اور شخص چاہے وہ جاگیردار کا بھائی کیوں نہ ہو بیاہ کر لے جائے، جوانی میں آدمی کیسی کیسی عجیب باتیں کرتا ہے، بیوقوفوں کی سی باتیں، فضول، خطرناک، ناعاقبت اندیشیاں،

تو صاحب! میں نے ریشماں کی محبت میں سر دھڑ کی بازی لگا دی، لوگوں کو ٹیکہ ویکہ لگانا کیسا؟ ہر وقت ریشماں کے پیچھے پیچھے پھرنے لگا، پاگل کُتے کی طرح، وہ چشمے پہ پانی بھرنے جاتی، تو مجھے پہلے ہی موجود پاتی، جو ہوا ہونکے ساتھ جنگل جاتی، تو میں بھی اپنی توڑے دار بندوق لئے ہوئے جنگل میں آموجود ہوتا، میں ان دنوں گانا بھی اچھا جانتا تھا، میرا مطلب ہے کہ میں ماہیا بہت مزے سے گایا کرتا تھا، اور اکثر لوگ میرے ماہیا گانے پر بہت خوش ہوتے تھے، کہتے تھے کہ کوئی مراثی بھی اتنا اچھا ماہیا نہیں گا سکتا۔ لیکن اب وہ دن کہاں، اب تو دن میں مجھے دس بار کھانسی کی شکایت ہوتی ہے، تم شہر میں رہتے ہو، کبھی کوئی اچھی سی دوائی ہی بھیج دیا کرو، ورنہ تمہارے شہر میں رہنے سہنے کا ہمیں کیا فائدہ، کیوں؟ ....

خیر..... ایکدن کی بات ہے، میں کسی قریب کے موضع سے چیچک کے ٹیکے لگا کر واپس آرہا تھا، شام ہو چکی تھی، اور مغرب سے ہلکی ہلکی ہوا چل رہی تھی، میں بہت مغموم تھا، کیونکہ دن بھر میں گاؤں سے باہر رہنے کی وجہ سے ریشماں کا دیدار کرنے سے محروم رہا، چنانچہ بہت ہی حزیں لہجہ میں آہستہ آہستہ

"فراقِ جاناں میں ہم نے ساقی لہو پیا ہے شراب کر کے"

گاتا ہوا چلا جا رہا تھا، میں اس وقت بہت اُداس تھا، میری آنکھیں شاید اسوقت آنسوؤں سے چھلک رہی تھیں، اور مجھے اپنے آپ پر بہت ترس آ رہا تھا، گاؤں کے حدود میں داخل ہونے سے پہلے راستے میں ایک خوبانی کا درخت آتا ہے، چنانچہ جب میں اس خوبانی کے درخت کے قریب پہنچا تو کیا دیکھتا ہوں، کہ تنے کا سہارا لئے، اپنی سنہری کاکلوں کو اپنے نازک شانوں پہ پریشاں کئے، ریشماں کھڑی میری راہ تک رہی ہے، میں ٹھٹھک کر کھڑا ہو گیا،

چند لمحے چند صدیوں کی طرح گذرے، پھر ریشماں بولی اپنی نرم میٹھی آواز میں "جی آپ مجھے کیوں تنگ کرتے ہیں؟" میں نے کہا "اسلئے کہ میں تمہیں چاہتا ہوں، اور تمہیں دیکھے بنا نہیں رہ سکتا"۔

ریشماں بولی "جی، مجھے سب سہیلیاں طعنے دیتی ہیں، اور پھر اس طرح آپ کا میرے پیچھے پیچھے پھرنا ٹھیک نہیں، میں آپ کو گالیاں دونگی، تو پھر آپ ......"

میں نے کہا "تو میں نے کب منع کیا ہے؟ آپ شوق سے گالیاں دیں، میں انہیں سنتا جاؤنگا، اور پھر انہیں اکٹھا کرونگا، پھولوں کی طرح، پھر انکا ہار بنا کر اپنے دل میں چھپا لونگا۔"

ریشماں بولی "ہم اَن پڑھ جو ہوئیں، ہمیں آپ کی طرح باتیں بنانا کیسے آئیں، لیکن میں آپ سے پھر کہتی ہوں، خدا کیلئے آپ میرا پیچھا کرنا چھوڑ دیں، ابّا آپ کی جان کے لاگو ہو رہے ہیں کہتے تھے کہ اگر وہ لڑکا باز نہ آیا تو اُسے قتل کر ڈالیں گے۔"

میں نے سر جھکا کر کہا "یہ سر حاضر ہے، ابھی گردن اڑا دیجئے، اگر اُف کر جاؤں تو.....؟"

ریشماں نے اک عجب ادا سے سر ہلا کر کہا "ہائے، میں یہ کب کہتی ہوں، کہ آپ مر جائیں، لیکن آخر..... آپ چاہتے کیا ہیں؟"

"میں کچھ نہیں چاہتا" میں نے اپنا ہاتھ اپنے سینے پر رکھ کر کہا "ہاں صرف یہ چاہتا ہوں کہ جب تم یہاں سے چلی جاؤ، تو تمہارے پاک قدموں کی خاک اپنے ماتھے سے لگالوں، اور تمہارا نام لیتا ہوا اسی دم اس دنیا سے رخصت ہو جاؤں۔"

ریشماں مسکرائی، ایک لڑکی کی طرح نہیں بلکہ ایک عورت کی طرح مسکرائی، اس نے پلکیں اٹھا کر ایک لمحہ بھر کیلئے مجھے دیکھا، پھر وہ پلکیں گلاب کے پھولوں کی طرح سبک اور نازک، گالوں پر جھک گئیں، دوسرے لمحہ میں ہنستے ہوئے وہ وہاں سے بھاگ کھڑی ہوئی، اور بھاگتی ہوئی جا رہی تھی، اور مڑ مڑ کر میری طرف دیکھتی جاتی تھی،

چند لمحے تو میں چپ چاپ پتھر کے بت کی طرح ساکن کھڑا رہا، پھر میں نے بھی تیزی سے ریشماں کی سمت بھاگنا شروع کر دیا، وہ ایک ہرنی کی طرح تیز بھاگ رہی تھی، اُسکے منہ سے ہنسی کی چیخیں بلند ہو رہی تھیں، آہستہ لیکن یقینی طور پر ہم دونوں کے درمیان فاصلہ کم ہو رہا تھا،

اب میں اس کے بالکل قریب آگیا تھا، لیکن ابھی اُسے چھو نہ سکتا تھا،

وہ اب زیادہ تیزی سے بھاگنے لگی،

لیکن میں اب اور بھی قریب آگیا تھا، اور ہمارے درمیان بالکل تھوڑا سا فاصلہ رہ گیا تھا،

"دیکھو، ہمیں..... ہمارا تعاقب مت کرو..... میں کہتی ہوں یہ اچھا نہیں.....؟"

ایک چھلانگ لگا کر میں نے اُسے دبوچ کر آغوش میں اٹھا لیا،

"اب کدھر جاؤ گی"؟

"مجھے چھوڑ دو..... مجھے چھوڑ دو..... میں گھر جاؤں گی" اس نے کمزور آواز میں کہا،

میں ایک چنار کے درخت کے قریب جا کر رک گیا، اور اُسے سبز روش پر آہستہ سے گرا دیا، اور پھر اس کے قریب ہی سستانے کیلئے بیٹھ گیا،

"دیکھا تم نے؟ تم مجھ سے بھاگ کر کہیں نہیں جا سکتیں" میں نے ہنس کر کہا۔

وہ خاموش بیٹھی رہی اور اپنے پریشان بال درست کرتی رہی۔

ہم گاؤں سے بہت دور نکل آئے تھے، شفق گم ہو چکی تھی، لیکن پھر بھی ندی کا پانی ایک چاندی کی تار کی طرح چمک رہا تھا، ہاں پہاڑوں پر اب جنگل دکھائی نہ دیتے تھے، اندھیرے کے لبادے میں غائب ہو چکے تھے، کہیں کہیں تارے بھی نکل آئے تھے،

میں نے ریشماں سے پوچھا "تم مجھ سے کب نکاح کرو گی؟"

"کبھی نہیں"

"وہ کیوں"؟

"تم تیلی ہو، ہم مغل ہیں" ریشماں نے شوخی سے کہا،

"اس سے کیا ہوتا ہے؟" میں نے ریشماں کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہا "کیا تمہیں مجھ سے محبت نہیں"؟

"ہرگز نہیں"

"تو پھر تم میرے پاس کیوں بیٹھی ہو، جی!"

جواب میں ریشماں نے میری طرف پیار بھری نگاہوں سے دیکھا، پھر یکا یک کسی خیال کے زیر اثر وہ کانپ اٹھی، آہستہ سے کہنے لگی "میں آج خوب پٹونگی، ابا مجھے ڈھونڈ رہے ہونگے، لیکن یہ کہہ تو آئی تھی کہ میں خالہ کے ہاں جا رہی ہوں، لیکن اب دیر بھی تو بہت......"

میں نے قطع کلام کر کے کہا "تمہارے جیسی شریر لڑکی اسی لائق ہے کہ اُسے خوب پیٹا جائے۔"

ریشماں بولی "میں جانتی ہوں، تم مجھے کبھی نہیں پیٹو گے۔"

میں نے اداس کر کہا، "ہاں، کیونکہ میں ایک تیلی ہوں اور تم مغلانی ہو"

ریشماں نے اپنا نازک ہاتھ میرے کندھے سے چھوا، پھر بے اختیار اپنا سر میرے کندھے سے لگا دیا،

"تم کتنے ناشکرے ہو" اُسنے اک آہ بھر کر کہا،

اور مجھے ایسا معلوم ہُوا کہ یکایک آسمان کے ستارے کھلکھلا کر ہنس پڑے ہیں، اور چاند کے رخِ زیبا پر سفید سفید بادلوں کے کانپتے ہوئے نازک سائے کسی نامعلوم خوشی کے زیرِ اثر ناچنے لگے ہیں، اور مغربی ہوا کے جھونکے چنار کے پتوں میں چھپ چھپ کر غیر فانی زندگی کے گیت گا رہے ہیں، میں نے ریشماں کے لانبی لانبی کاکلوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے محسوس کیا کہ یہ خوشی میرے لئے ناقابلِ برداشت ہوگی، اور جب میں نے وفورِ شوق سے بے اختیار ہو کر اپنے لب اس کے لبوں پر رکھ دئے تو مجھے معلوم ہُوا کہ ان ہونٹوں میں پہاڑی شہد کی سی مٹھاس ہے۔ اور دہکتے ہوئے انگاروں کی سی گرمی اور جلن، دونوں ہی احساس تھے، ایک تکلیف دہ خوشی اور ایک جاں بخش اذیت۔

اسکے بعد آٹھ دس دنوں کے کوائف میں تمہیں اچھی طرح نہیں بتا سکتا، کچھ یاد نہیں آتا، زندگی ایک دلخوش خواب کی طرح گزر رہی تھی جسمیں میں اور ریشماں ہی تھے، کچھ عجب سی حالت تھی، شراب کا سا نشہ، دلفریب نغموں کا سا سرور، سارا گاؤں جنت نظر آتا تھا، اور دُور سے جاگیردار صاحب کے پرانے محل کے بُرج سونے کے کلسوں کی طرح چمکتے تھے، عجیب اور پراسرار مجھے ایسا معلوم ہوتا کہ یہ تمام دنیا، قدرت کی رعنائیاں، پرندوں کے چہچہے، بے فکر گڈریوں کے قہقہے، ہمارے لئے ہی پیدا کئے گئے تھے، میرے اور ریشماں کیلئے، تاکہ شام کے جھٹپٹے میں ہم دونوں چھپ کر اور باہوں میں باہیں ڈال کر گاؤں سے باہر کسی ننھے سے مرغزار میں جا بیٹھیں، اور ان نظاروں سے لطف اندوز ہوں۔

لیکن یہ سب کچھ آٹھ دس دن کیلئے تھا، اسکے بعد ایک ظالم وحشی ہاتھ نے ایک پر زور جھٹکے کے ساتھ میرے دلفریب خواب کو پارہ پارہ کر دیا، عین اُس دن کہ جب ہم دونوں نے گاؤں سے بھاگ جانے کی صلاح کی تھی، ریشماں کے ظالم باپ نے اُسے جاگیردار صاحب کے بڑے لڑکے کے حوالے کر دیا، یہ تو مجھے بعد میں معلوم ہُوا، کہ بہت دیر سے در پردہ مشورے ہو رہے تھے، جاگیردار صاحب کا بڑا لڑکا بڑا اوباش ہے، جس طرح بڑے آدمیوں کا خاصہ ہی ہے، وہ ریشماں پر لٹو تھا، کہیں شکار کھیلتے آتے جاتے دیکھ لیا ہوگا، بس ریشماں کے باپ پر ڈورے ڈالنے شروع کر دئے، ادھر میری بے خبری کا یہ عالم کہ مجھے اس وقت پتہ چلا کہ جب ریشماں شہر میں جاگیردار صاحب کے محل میں پہنچائی جا چکی تھی.....

یہ چوٹ اتنی کاری اور ناگہانی تھی، کہ میں اپنے حواس برقرار نہ رکھ سکا، لوگ کہتے ہیں، کہ اس واقعہ کے بعد دو سال تک میں پاگل رہا، سوکھ کر بالکل لکڑی ہو گیا تھا، دربدر گھومتا تھا، اور لوگوں کو کہتا تھا "مجھے بچاؤ، مجھے بچاؤ، وُہ مجھے کاٹنے کو آ رہی ہے" بس یہی دو کلمات تھے جو ہر وقت میرے لب پر جاری رہتے، سنا ہے کہ ایک دن جب میں جاگیردار صاحب کے شہر میں گھوم رہا تھا، انہوں نے مجھے کہیں دیکھ لیا اور جب کسی مددگار صاحب سے انہوں نے میری رام کہانی سنی، تو مجھ پر بہت ترس کیا، اور علاج کیلئے شکارپور کے پاگل خانے میں بھیج دیا، اور جب میں دو سال کے بعد تندرست ہو گیا، تو پھر مجھے اپنے پرانے عہدے پر اسی وادی میں تعینات کر دیا، لیکن اس گاؤں میں نہیں بلکہ درادر کے گاؤں میں جو یہاں سے دس میل کے فاصلے پر ہے"

اتنا کہہ کر وہ کسی قدر چپ ہو گیا، اور حقہ گڑگڑانے لگا، رشید نے آہستہ سے پوچھا،

"اور ریشماں؟ ...... تم نے اُسے پھر کبھی دیکھا؟"

"ریشماں جاگیردار صاحب کے بڑے لڑکے کے حرم میں ہے اگرچہ وہاں عورتیں تو بہت ہیں، لیکن ریشماں کو اپنے مالک کی چہیتی ہونے کا فخر ضرور حاصل ہے، اُسکے دو لڑکے بھی ہیں...... میں نے اُسے آٹھ نو سال ہوئے اُسکے باپ کے گھر اسی گاؤں میں دیکھا تھا، جب وُہ اپنے بھائی کی شادی پر یہاں آئی تھی، اس کا باپ، اب کیا یہ بھی بتلانے کی ضرورت ہے کہ اس گاؤں کا نمبردار ہے اور علاقے کا ذیلدار اسکا مکان پتھروں سے بنا ہے تم نے راستے میں دیکھا تو ہوگا، وہ جس پر ٹین کی چھت ہے اور جسکے عقب میں ایک بڑا سا باغیچہ ہے،... میں نے اسے اس باغیچہ میں دیکھا تھا، وہ خوبصورت ریشمیں لباس پہنے ٹہل رہی تھی، اسکے ساتھ اسکے دونوں چھوٹے چھوٹے لڑکے تھے، وہ اب بھی بیحد خوبصورت تھی اسکی چال میں شاہانہ پن تھا، میں دیر تک باڑ کی اوٹ میں کھڑا اسے دیکھتا رہا، ریشماں جو کبھی میری منکوحہ ہوتی، ریشمیں کپڑوں کی بجائے وہ سُرخ سوسی کی بھاری شلوار اور چھینٹ کی قمیص پہنکر وہ کبھی میرے اپنے بچوں کو لیکر یوں ٹہلا کرتی یہ جان کر میری آنکھوں میں بے اختیار آنسو بھر آئے۔

اور انہیں پوچھنے کی کوشش کئے بغیر ہی میں باڑ کی لاٹ سے باہر نکل آیا اور اُسے گالیاں دینے لگا، میں نے اسے سخت فحش کلمات کہے، اُسکے ماں باپ کو گالیاں دیں، اسکے سارے خاندان کو جی بھر کر اور چیخ چیخ کر کوسا۔ اور اس وقت تک وہاں سے نہ ٹلا کہ جب تک لوگ مجھے وہاں سے کھینچکر اور گھسیٹ کر پرے نہ لے گئے،،

"اور رشماں نے تمہیں کچھ نہ کہا" رشید نے پوچھا،

"نہیں، مجھے دیکھ کر وہ ٹھٹھک کر کھڑی ہوگئی، پھر اس نے گردن جھکالی، اور چپ چاپ گالیاں سنتی رہی، اس کی آنکھوں کی نیلی جھیلوں سے آنسوؤں کے چشمے بہہ نکلے، اور اُسنے اپنے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اپنے دونوں لڑکوں کو اپنے ساتھ چمٹا لیا...... بعد میں جب وہ اپنے گاؤں سے چلی گئی، اسکی ایک پرانی سہیلی نے مجھے بتایا، کہ اسکے سوال پر "تم نے وہاں باغیچہ میں کھڑی رہکر اسکی گالیاں کیوں سنیں؟" رشماں نے جواب دیا "اُسوقت وہ اگر مجھے پیٹ ڈالتا، یا جان سے مار دیتا پھر بھی میں وہاں سے نہ ہلتی،...... پھر اس نے کہا، اے میری جان سہیلی وہ گالیاں نہ تھیں، پھول تھے، میرے محبوب کے جنہیں میں نے چن چن کر آنسوؤں کے تار میں پرو لیا، اور اپنے دل کے مزار پر چڑھا دیا، تاکہ محبت کی قبر سونی نہ رہے۔ ...."

"لیکن" ویکسی نیٹر نے غمناک آواز میں داستان ختم کرتے ہوئے کہا "مجھے اب کسی پر غصہ نہیں، کسی سے محبت نہیں، میں اب کسی کا لحاظ نہیں رکھتا، پہلے چیچک کے ٹیکے مفت لگاتا تھا، اب دو آنے لئے بغیر کسی کے بازو کو ہاتھ تک نہیں لگاتا، مجھے کسی کی پرواہ نہیں، میں اب اپنا روپیہ ڈیوڑھی فیس پر قرض دیتا ہوں، اس گاؤں میں سوائے رشماں کے باپ کے سب میرے قرضدار ہیں، وہ مجھے کنجوس اور ظالم کہتے ہیں لیکن انہوں نے کب میرا بھلا چاہا، ان کا بس چلے تو مجھے آج قتل کر دیں لیکن مجھے کسی کی پرواہ نہیں، میرے پاس روپیہ ہے، زمین ہے، بال بچے ہیں، تین نکاح کر چکا ہوں، مجھے کسی کی پرواہ نہیں، کسی سے محبت نہیں، کسی پر غصہ نہیں، میں جاگیردار صاحب کی وفادار رعایا ہوں، اُن کا غلام ہوں"

"کیا سچ مچ تمہیں کسی پر غصہ نہیں آتا؟" رشید نے تیز نگاہوں سے ویکسی نیٹر کی طرف دیکھ کر پوچھا،

"ویکسی نیٹر گھبرا سا گیا، آنکھیں نیچی کر کے بولا "نہیں، ہرگز نہیں میرا دل صاف ہے، لیکن درست ....." اب ویکسی نیٹر نے اپنی نگاہیں اوپر اٹھا لیں، اور رشید کی طرف مجوب نگاہوں سے دیکھ کر کہنے لگا... "میں ایک بات تم سے کہنا چاہتا ہوں، اور اسے کہنے کو میرا سینہ پھٹا جاتا ہے، اور میں یہ بات تم سے کہے بغیر نہیں رہ سکتا، اور وہ بات جاگیردار صاحب کے اس پرانے محل کے برجوں کے متعلق ہے،.... میں انہیں دھوپ میں سونے کی طرح چمکتے ہوئے دیکھ کر بارہا پاگل ہو جاتا ہوں، مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ مجھ پر ہنس رہے ہیں، میرا منہ چڑا رہے ہیں، میں انہیں صاف صاف کہتے ہوئے سن سکتا ہوں، تم کتنے بیوقوف ہو تم ہمیں نہیں جانتے ہم اب بھی تمہاری دنیاؤں کو تباہ و برباد کر سکتے ہیں، تمہارے امن و سکون کو خس و خاشاک میں ملا سکتے ہیں، تمہاری زندگی کی خوشیوں کو پاؤں تلے روند سکتے ہیں، تم ہمیں نہیں پہچانتے! ہا ہا ہا"

اور میں پاگل ہو جاتا ہوں، اور سوچتا ہوں کہ جب تک یہ چمکتے ہوئے برج موجود ہیں میرے دل کو اطمینان نصیب نہیں ہو سکتا، بارہا میرے دل میں خیال آیا ہے، کہ ایک دو پیسے کا بارود لے لیکر میں رات کے وقت اس پرانے محل کے قریب جاؤں، اور بارود لگا بھک سے ان برجوں کو اڑا دوں تو... تو ... لیکن میں نے ہر بار اس موذی خیال کو دل میں زور سے دبا دیا ہے،،

اور ویکسی نیٹر نے رازدارانہ لہجہ میں رشید کی طرف جھک کر کہا "لیکن ایک دن میں اس کام کو ضرور پورا کر کے چھوڑونگا......؟"

رُباعی

یہ سلسلۂ ذوقِ نگاہ اور سہی * ہاں! نامۂ اعمال سیاہ اور سہی
مایوسیٔ رحمت نہیں دیکھی جاتی * رحمت کے لئے ایک گناہ اور سہی

جناب روش صدیقی

اے جہلم

(وادیٔ کشمیر کے محبوب دریا جہلم سے)

تری موجوں میں ہے وہ آتشِ شاداب اے جہلم!
کہ پروانہ ہے جس کا مہرِ عالمتاب اے جہلم!

دلِ کشمیر ہے صبحِ ازل سے رازداں تیرا
یہ گردونِ کہن مدّت سے ہے افسانہ خواں تیرا

کیا کرتی ہیں اکثر ذکر حورانِ جناں تیرا
خدا جانے کہاں سے آ رہا ہے کارواں تیرا

ہمالہ بھی تری منزل کا ہے اک باب اے جہلم!

کسی خوابِ حسیں کا جلوۂ تعبیر میں آنا
جمالِ خودنما کا، عالمِ تصویر میں آنا

لبِ رازِ شعر کا الفاظِ پرتاثیر میں آنا
پہاڑوں سے، ترا وہ وادیٔ کشمیر میں آنا

کسی بربط کو جیسے چھیڑ دے مضراب اے جہلم!

وہ انوارِ سحر میں طور کا عالم چناروں پر
وہ سنجابِ حریرِ سبز، عنابی کناروں پر

شفق کے آتشیں نغمات خاموشی کے تاروں پر
تری موجوں کے چھینٹے، وہ دہکتے لالہ زاروں پر

وہ بزمِ گل رخاں، بر مسندِ کمخواب اے جہلم!

وہ دلکش کشتیاں، وہ جلوہ ہائے زہرہ و پرویں
وہ فردوسِ خراماں، وہ نمودِ حسنِ بانمکیں

حجابِ نورافشاں میں جمالِ لیلےٰ و شیریں ترے آغوش میں وہ سیلِ انوارِ شبِ زرّیں

شرابِ ناب در پیمانۂ نایاب اے جہلم!

وہ موجوں کی طلسمی راگنی، وہ سوزِ خاموشی! وہ بزمِ خواب، وہ لیلائے شب کی خودفراموشی!

بہشت آرا مناظر سے نگاہوں کی ہم آغوشی! وہ جنت، وہ فضا، وہ کیف، وہ احساسِ مدہوشی!

وہ سیرِ ماہتاب و کشتیٔ مہتاب اے جہلم!

وہ شمشاد و صنوبر کی قطاریں، رقص آمادہ چناروں کی نشیلی چھاؤں میں وہ محفلِ سادہ

وہ خوبانِ ارم افروز، بزم آرا سرِ جادہ وہ آنکھیں بے نیازِ صد جہانِ ساغر و بادہ

وہ ابرو، خالقِ صد کعبہ و محراب اے جہلم!

نگاہوں کی وہ جنت، سرمگیں راتوں کے دامن میں وہ تکتی بجلیاں، روشن جبیں راتوں کے دامن میں

جمالِ نازنیں، نازآفریں راتوں کے دامن میں وہ حسنِ دل نشیں، تیری حسیں راتوں کے دامن میں

بھلائے جس نے فردوسِ بریں کے خواب اے جہلم!

سلیم و مہرِ حسنِ شاہدِ قدرت کے پروانے! زرافشاں تھے ترے ساحل پہ اک دن جنکے کاشانے!

جنہیں چھپ چھپ کے دیکھا تھا تری چشمِ تمنا نے! نہیں بھولے ہیں ابتک ماہ و انجم جن کے افسانے!

تری موجیں ہیں جن کی یاد میں بے تاب اے جہلم!

نظامِ ملک، خوش اسلوب تھا، اس عہدِ زرّیں میں وطن، اک جنتِ مرغوب تھا اس عہدِ زرّیں میں

ہر اک لمحہ، بہت ہی خوب تھا اُس عہدِ زرّیں میں زمانہ کس قدر محبوب تھا اس عہدِ زرّیں میں

کھلے تھے ہر طرف خلدِ بریں کے باب اے جہلم!

جبینِ ایشیا کا نور تھی، کشمیر کی وادی! کبھی گہوارۂ صد طور تھی، کشمیر کی وادی!

حوادث سے بہت ہی دور تھی کشمیر کی وادی! نشاطِ خلد سے معمور تھی، کشمیر کی وادی!

کبھی دیکھا نہ تھا جس نے خزاں کا خواب اے جہلم!

وہی کشمیر، اک معمورۂ ناشادماں ہے اب بہت افسردہ و پژمردہ روئے گلستاں ہے اب

چراغِ خانہ، کچھ غمناک آہوں کا دھواں ہے اب زبوں تر، حالتِ مظلومیٔ کشمیریاں ہے اب

دُرِ شہوار ہیں زندانیٔ "گرداب" اے جہلم!

غرورِ شہریاری، رفتۂ ذوقِ جفا کاری غریبانِ وطن وابستۂ زنجیرِ ناچاری

تباہی، بیکسی، فاقہ کشی، افلاس برداری مگر کب تک حریمِ نازِ بیداد و ستمکاری؟

بھڑک اٹھنے کو ہے اک آتشِ بیتاب اے جہلم!

بہت ہی سخت، دَورِ انتقامِ آسماں ہوگا حصارِ ساحرانِ غرب بے نام و نشاں ہوگا

جہادِ صبر و استقلالِ مشرق کامراں ہوگا ترے کشمیر پر پھر ابرِ رحمت دُرفشاں ہوگا

طلسمِ اہرمن ہو جائے گا غرقاب اے جہلم!

محترمہ حجاب امتیاز علی

ظالم محبت

مکرمی محترمی!

میں آج کل اپنے افسانے "ظالم محبت" کی تکمیل میں مصروف ہوں۔ اس سے پہلے بھی اس کا اک باب کسی رسالے کے سالنامے میں شائع ہو چکا ہے اب آپ کی تعمیل حکم میں حسب وعدہ اس کا اک اور باب ارسال ہے۔ جو بجائے خود اک افسانہ ہے ؂

حجاب

منیر کی بیماری کو ایک ہفتہ گذر چکا تھا۔ مگر زخم ابھی مندمل نہیں ہوئے تھے۔ ڈاکٹروں کی رائے خطرناک تھی۔

دادی زبیدہ جنکی زندگی کا مقصد صرف تفریح اور تبدیل لباس تھا۔ اب رات رات بھر منیر کی پٹی سے لگی رہتی تھیں۔ انہوں نے ڈاکٹروں کا ناک میں دم کر رکھا تھا۔ بیماری نے اپنی حالت تباہ کر رکھی تھی۔

اُدھر حبشی صاحب نے تیمارداری کے وہ جوہر دکھائے کہ سند یافتہ نرس بھی کیا دکھائے گی۔

باقی رہی میں ——— منیر میرا منسوب تھا۔ مزید براں منیر سے میرا وہی افسانوی رشتہ تھا جسے "بنت عم" کہتے ہیں۔ اسلئے میں پریشان ضرور تھی۔ مگر اس کا کیا علاج ——— کہ جو روگ مجھے اندر ہی اندر گھلائے جا رہا تھا۔ جس کی حرارت نے میرے کاہیدہ جسم کو لوہے کی طرح تپا رکھا تھا جس کے شعلوں نے میری ہستی کو جلا کر خاک کر دیا تھا۔ وہ میرے لئے منیر کی بیماری کی پریشانی سے کہیں زیادہ تھا۔

اک دن منیر کو صبح سے تیز بخار رہا۔ اور پھر یکا یک نارمل سے نیچے ہو گیا۔ اُس دن کی پریشانی نہ پوچھئے۔ دن بھر گھر کی فضا ایسی رہی جیسے قبروں کے قریب کی ہوتی ہے۔ ہم سب گھبرائے ہوئے چپ چاپ اس طرح چل پھر رہے تھے۔ جیسے لاشیں چل پھر رہی ہیں۔

اسی شام کو جب ذرا سکون ہوا تو میں منیر کے کمرے میں گئی۔ دادی جان نچلی منزل میں جا چکی تھیں۔ منیر کی ابھی آنکھ لگی تھی۔ حبشی گرم پانی کی بوتل لئے منیر پر جھکے ہوئے تھے سامنے دریچہ کھلا ہوا تھا۔ اور ڈوبنے والے آفتاب کی کرنیں انکے چہرے پر کچھ اس طرح پڑ رہی تھیں کہ ان کا چہرہ نہایت زرد نظر آ رہا تھا۔ میں نے ذرا غور سے ان کی طرف دیکھا تو وہ بیحد مضمحل نظر آئے۔ بلاشبہ وہ بیمار تھے۔

میں دبے پاؤں منیر کی چارپائی کے پاس چلی آئی۔ جہاں وہ کھڑے تھے "حبشی صاحب!" میں نے نہایت آہستہ کہا۔

یہ سنکر وہ خاموشی سے دریچے کے پاس آ گئے "کیا بات ہے خاتون روحی؟"

"آپ زرد نظر آ رہے ہیں۔ خوفناک طور پر زرد۔ کہیں خدانخواستہ بیمار تو نہیں؟ بخدا اتنی محنت نہ کیا کیجئے۔"

یہ سنکر حبشی دو لمحے خاموش رہے۔ پھر ذرا خشکی سے بولے "خاتون روحی! منیر جیسے بیمار کے کمرے میں کسی دوسرے کی بیماری کا ذکر کرنا نہایت نامناسب ہے۔ خدا جانے آپ کو یہ خیال کیوں آتا رہتا ہے کہ میں بہت زیادہ محنت کرتا ہوں؟ اگر میں بیمار بھی ہو گیا تو کیا ہوا؟ مر تو نہ جاؤنگا۔ آپ کو چاہیئے کہ منیر کی صحت یابی کے لئے خدا سے دعا کریں نہ کہ دوسروں کی صحت کا فکر....."

یہ سنکر میں نے ایک ٹھنڈا سانس لیا۔ اور باغ کی راہ سے باغیچے میں نکل آئی۔ بے ارادہ نہر کی طرف گئی۔ ہری ہری دوب پر ماہ مارچ کی گرم دھوپ لہریں لے رہی تھی۔ وہاں کھڑی ہو کر سوچنے لگی۔ کیا سوچنے لگی؟ یہ مجھے خود نہیں معلوم۔

آہ۔ میں جب سے کیباس آئی تھی۔ کچھ خوش نہ تھی۔ اللہ جانے

مجھے کیا ہو گیا تھا۔ میری خودداری کو کیا ہو گیا تھا۔ میں وہی تھی جو ذرا ذرا سی باتوں میں اپنی توہین محسوس کرتی تھی۔ یا آج یہ حال ہے کہ اک مرد کی ان دلخراش باتوں کو سنکر بھی برا نہیں مانتی! ہائے! مجھے کیا ہو گیا۔ میری عقل و ہوش کو کیا ہو گیا۔ کسی کام میں دل نہ لگتا تھا۔ کتاب کا اک صفحہ اطمینان سے نہ پڑھتی تھی۔ ستار مجھ سے نہ بجائی جاتی تھی۔ نہ کسی سے دلجمعی سے بات کر سکتی تھی۔

اسی دوپہر دادی زبیدہ نے مجھے ٹوکا بھی تھا۔ کہ "روحی تم نامناسب طور پر کھوئی ہوئی سی رہتی ہو۔ کیا بات ہے؟"

واقعی زندگی میں کبھی ایسی کیفیت مجھ پر طاری نہ ہوئی تھی جیسی ان ایام میں کوہ کیباآس پر ہوئی تھی۔

میں نے کہا "مجھے نہیں معلوم دادی جان! کیا بات ہے۔"

"مجھے اندیشہ ہے" دادی زبیدہ نے روکھے پن سے کہا "تمہارے یہ انداز کہیں منیر کو صدمہ نہ پہنچائیں۔ اس کی ایسی حالت میں اسے خوش رکھنا ہم سب کا فرض ہے۔ کیا تم میں اتنی عقل نہیں؟ پرسوں غریب نے تم سے ستار کی فرمائش کی تھی۔ اُس دن اس کی طبیعت بہتر تھی۔ مگر تم ٹال گئیں آخر بات کیا ہے؟"

یہ سنکر مجھے بے حد رنج ہوا۔ غریب منیر! میں نے اسی وقت عہد کر لیا تھا کہ اب حتے الامکان دن کا بیشتر حصہ منیر کے کمرے میں صرف کیا کروں گی۔

جب میں باغ میں آئی۔ تو دادی جان کو دوپہر کی گفتگو اور اپنا عہد یکلخت یاد آ گیا۔ واپس جانے کے لئے مڑ ہی رہی تھی کہ سامنے باغیچے میں بیمار کے کمرے کا جو دریچہ کھلتا تھا۔ وہ یکایک کھلا۔

"منیر جاگ گئے ہیں۔ اور آپ کو دیکھنا چاہتے ہیں" جیتھی نے دریچہ سے جھانک کر کہا۔

میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ فوارے کے قریب کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔

ایک لمحہ بعد باغ کا دروازہ کھول کر جیتھی باہر نکل آئے۔

نجانے کیوں نہایت تلخ لہجے میں بولے "خاتون روحی! آپ یہاں اکیلی کیا کر رہی ہیں؟ اُداس معلوم ہوتی ہیں۔ چلئے اندر چلئے۔ منیر آپ کو دیکھنا چاہتے ہیں۔ میں آپ کو لے چلوں؟" اُسنے سہارے کے لئے اپنا ہاتھ میری طرف بڑھا دیا۔

مگر میں اپنی جگہ کھڑی رہی۔ "اچھا منیر جاگ گئے؟" میں نے فوارے کے قطروں پر نظر جما کر کہا۔ "آپ چلئے۔ میں ابھی آتی ہوں"۔

اسی وقت پاس والے زیتون کے درخت پر سبز پروں والی ایک بلبل نے راگ چھیڑ دیا۔

"کتنا پیارا راگ ہے ———— ! کیوں؟" میری زبان سے نکلا۔ پھر اک لمحے کے توقف کے بعد بولی۔

"منیر مجھے کیوں بُلا رہے ہیں؟ وہ مجھ سے کیا کہنا چاہتے ہیں؟"

"کیا کہنا چاہتے ہیں؟" جیتھی نے دھرایا۔ "خاتون روحی۔ منیر کے اشتیاق آمیز انتظار کے لئے آپ کا یہ فقرہ بیحد خشک ہے۔ وہ آپ سے ہزاروں باتیں کرنا چاہتے ہوں گے۔"

"ہزاروں باتیں!" اک خشک ہنسی کے ساتھ میں نے کہا "یہاں اس وقت اک بات کے لئے بھی میری طبیعت حاضر نہیں۔" خبر نہیں عالم بےخبری میں یہ نامناسب فقرہ کس طرح میری زبان سے نکل گیا۔ پھر یکلخت مجھے اسکا احساس ہوا۔ چنانچہ کہنے لگی۔ "اچھا تو چلئے۔"

یہ کہتے ہی میں تیز گامی سے چلنے لگی ابھی باغ کی دھوپ تک نہ پہنچی تھی۔ کہ جیتھی نے آکر میرا شانہ چھوا۔ اور خلاف امید نہایت شیریں لہجے میں التجا کرنے لگے۔ "پیاری خاتون! بیمار کے کمرے میں جانے سے پہلے میری التجا ہے کہ آپ اپنے انداز ———" اتنا کہہ کر رک گئے پھر بولے۔ "ہاں اس میں کچھ ترمیم کریں۔ مناسب ترمیم"

"ترمیم؟" میں نے خشک مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ "اچھی بات ہے۔ مگر کس قسم کی ترمیم چاہتے ہیں۔ آپ؟"

"جیسی آپ کے لئے ضروری ہے۔ کچھ اشتیاق ملا ہوا ہو۔ کچھ مٹھاس۔ کچھ مسکراہٹ ہو۔ اور کچھ ——"

یہ سنکر میں ہنسی۔ مگر کس قسم کی ہنسی؟ .... وہ جو دکھی کی پکار سے زیادہ تلخ ہوتی ہے۔ بولی "جو آپ کی خواہش ہے۔ میں اسے پورا کئے دیتی ہوں۔"

یہ سنکر وہ بولے "میری خواہش کیسی؟ ان باتوں میں میری

ہدایات کی ضرورت تھوڑا ہی ہے؟ منیر کو آپ جس قسم کی توقعات ہیں۔ وہ اظہر من الشمس ہیں۔"

میں نے گردن نیچی کر لی" ہاں مجھے یاد آگیا۔ مجھے منیر کے کمرے میں جیسا ایکٹنگ کرنا چاہیئے اسکے لئے میں تیار ہوں۔"

یہ کہتے ہی میں زینے طے کر کے منیر کے کمرے میں پہونچ گئی۔ باوجود مصمم ارادے کے میں محسوس کر رہی تھی۔ کہ میں اپنا فرض بخوبی ادا نہیں کر رہی ہوں۔

منیر کے سوال کا جواب مسکرا کر دیتے ہوئے مجھے محسوس ہوا کہ مسکراہٹ میں فطری انداز بہت کم ہیں حشمی نے چند منٹ میری حرکات کا جائزہ لیا۔ پھر وہ کمرے سے باہر چلے گئے۔

"منیر!" میں نے کہا" دیکھو تم بہت تکلیف کرتے ہو۔ میرے ہوتے ہوئے تم اپنی تیمارداری کی ذمہ داری اک غیر شخص کے سپرد کرتے ہو! یہ کس قدر نامناسب ہے؟ کیا میں کیلاش اس لئے آئی ہوں۔ کہ محض تماشائی کی حیثیت سے تمہاری بیماری دیکھوں؟ کل سے تمہاری تیماردار میں ہوں گی۔ حشمی نہیں۔"

یہ سنکر منیر کا چہرہ گلاب کی طرح کھل گیا" روحی!" اس نے مرتعش لہجے میں کہا" یہہ مجھے معلوم نہ تھا۔ کہ درحقیقت میری تیمارداری تم کرو گی؟ تم؟ لیکن یہ کاہیدہ جسم۔ اور یہ —"

دیکھو حشمی ...... منیر ایسی باتیں نہ کرو۔ مجھے رنج ہوتا ہے میں حشمی کو ہرگز تمہاری تیمارداری کی اجازت نہ دوں گی۔ کل سے میں خود یہاں رہوں گی۔ حشمی سے کہہ دو۔"

"بہت اچھا روحی"

اس رات میں اپنی خوابگاہ میں کچھ دیر سے گئی۔ بستر پر لیٹی۔ مگر نیند کہاں آتی تھی — ! دل افسردہ تھا۔ اور روح پریشان مگر خیالات جاگ رہے تھے۔

تھوڑی دیر اندھیرے کمرے میں بستر پر چپ چاپ لیٹی رہی اور دریچے کے باہر رات کے سناٹے میں خاموش کھڑے ہوئے درختوں کو دیکھتی رہی دور — بہت دور۔ افق میں کہیں چاند طلوع ہو رہا تھا۔ اور قریب ہی کھڑکی کے باہر حنا کی اک ٹہنی پر کوئی چڑیا سریلی سیٹی بجا رہی تھی۔

کروٹیں بدل بدل کر تھک گئی تو دبے پاؤں بستر سے اٹھی۔ موم بتی ہاتھ میں لی اور دروازہ کھول کر کوئی کتاب لینے کی نیت سے منیر کے کتب خانے کی طرف چلی۔

رات گرم تھی۔ اور گرم ہوا کے جھونکے آرہے تھے۔ موم بتی کے شعلے کو ہوا سے بچاتی ہوئی نشستگاہ کے زینے سے گذر رہی تھی کہ شہ نشین کی سبز جالی کے پاس کسی کو ٹہلتے ہوئے دیکھا۔ یہ اتنی رات گئے باغ میں کون ہے؟ میں لمحے بھر کے لئے رک گئی۔

"کیا بات ہے خاتون روحی؟" حشمی کی آواز آئی۔

موم بتی کے شعلے پر میں نے ہاتھ کا پردہ کر لیا کہ کہیں بجھ نہ جائے بولی" کچھ نہیں۔ اک کتاب لینے لائبریری کی طرف جا رہی تھی۔ کیا آپ اب تک نہیں سوئے؟"

"جی نہیں ——" انہوں نے نجانے کیا سوچتے ہوئے مغموم لہجے میں کہا" نیند کہاں!" پھر کچھ دیر بعد بولے" میں آپ کا ممنون ہوں خاتون روحی! آپ نے میری التجا پر اپنے انداز میں تبدیلی پیدا کر لی منیر آج بیحد خوش رہے"

میں بے دلی سے موم بتی کے لرزاں شعلے کو دیکھتے ہوئے بولی۔ "کیوں خوش ہیں؟"

حشمی نے زینے سے ٹیک لگا کر کہا" بار بار کہہ رہے تھے کہ دیکھو روحی کو مجھ سے کس درجہ محبت ہے۔ روحی چاہتی ہیں کل سے میری تیمارداری خود کریں ...... واقعی خاتون روحی۔ آپ کے یہاں تشریف لانے سے پہلے میرا بھی یہی خیال تھا"

"کیا خیال تھا؟" میں نے بیدلی سے پوچھا۔

"یہی — کہ منیر کے تمام خیالات درست ہیں۔ اور آپ اُن سے محبت کرتی ہیں"

"اور اب آپ کا کیا خیال ہے؟" میں نے دھڑکتے ہوئے دل سے پوچھا

"میرا وہ خیال اب تعجب اور افسوس سے بدل چکا ہے" حشمی نے جواب دیا۔

"کیا اسکے لئے آپ کو افسوس بھی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"خاتون روحی!" حشمی کہنے لگے" کیونکر افسوس نہ ہوتا؟ منیر نے مجھ

پر بیحد احسان کئے ہیں۔ میں زندگی بھر ان کے احسانات نہیں بھول سکتا۔ ایسی حالت میں یہ کیونکر ممکن ہے کہ ان کی ناکامی کو دیکھ کر میں مسکراؤں؟ میں اک شریف شخص ہوں خاتون روحی !

"بلاشبہ" میں نے کہا۔

"اس لئے" وہ کہنے لگے "میں یہ چاہتا ہوں۔ کہ آپ دونو کے تعلقات ویسے ہی ہو جائیں۔ جیسے کہ ہونے چاہئیں۔ کیا آپ اسکی کوشش نہیں کر سکتیں"؟

میری آنکھوں میں دو موٹے موٹے آنسو بھر آئے۔ میں نے اک دفعہ نظریں اٹھائیں۔ اور پھر جھکا لیں۔ میں محسوس کر رہی تھی۔ کہ یہ گریہ ضبط سے باہر ہو رہا ہے۔ چنانچہ میں موم بتی لئے ہوئے خاموش پلٹ گئی چار قدم جا کر شہ نشین کی جالی کے پاس باغیچے کی طرف منہ کر کے کھڑی ہو گئی۔

تاریک باغ کے تناور تاڑ کے درختوں پر پیلا چاند چمک رہا تھا۔ باغ کے آخری حصے سے ناشاد بلبل کی میٹھی نغمہ سرائی سنائی دے رہی تھی۔ ہواؤں میں زرد لیمو کی کلیوں کی خوشبو ملفوف تھی۔ اور آسمان پر سیارے بڑی تیزی سے جگمگا رہے تھے۔

چند منٹوں بعد میں نے دیکھا حبشی میرے قریب آئے ہیں: "میں آپ کی کوئی خدمت کر سکتا ہوں"؟

نہ جانے انہوں نے کیا سوچ کر اور ترس کھا کر مجھ سے یہ سوال کیا تھا۔ یہ سنکر میں نے پوری توجہ سے اس دراز قد انسان کو دیکھا۔ جو رات کے سائے میں باغ کے زینے پر کیوپڈ کی حسین روح کی طرح ساکت کھڑا تھا۔ نیلے ڈریسنگ گون کے کھلے ہوئے گریبان میں سے اس کی براق سی سفید گردن کا بالائی حصہ نظر آ رہا تھا۔

"میں آپ کی کوئی خدمت کر سکتا ہوں"؟ اس نے دوبارہ سوال کیا۔

"یقیناً" میرے ہونٹوں سے آہ کی طرح آہستہ سے یہ لفظ نکلا۔

شاید میرے اس جواب کے لئے وہ تیار نہ تھا۔ تاہم اس نے فوراً کہا "بتایئے"؟

"کیا آپ واقعی ——— ؟ تو کیا آپ درحقیقت مجھ پر کوئی احسان کرنا چاہتے ہیں۔ حبشی صاحب"؟

وہ کچھ گھبرا سا گیا "حتے الامکان میں ہر خدمت کیلئے تیار ہوں"

میں نے ڈرتے ڈرتے اپنا اک ہاتھ کمزور انداز میں اسکے کندھے پر رکھ دیا اور لرزتے ہوئے بولی "تو۔ تو میرا اک پیام منیر تک پہنچا دیجئے گا۔ کیوں؟ پہنچا دیں گے نا"؟

وہ کچھ حیران اور بوکھلائے ہوئے لہجے میں بولا۔ "پیام ——— ؟ منیر تک"؟

میں بولی "ہاں۔ آپ ہی نے تو مجھ سے سوال کیا تھا۔ اب پریشان کیوں ہو گئے؟ اچھا مجھ سے غلطی ہوئی۔ آپ شاید نہیں پہنچانا چاہتے"؟

یہ کہہ کر میں نے موم بتی ذرا اوپر کو اٹھائی۔ اور اسکا چہرہ دیکھا وہ غالباً مجھے پاگل سمجھ رہا تھا۔ فی الحقیقت میں پاگل ہو گئی تھی۔ کبھی کاہے کو میں نے ایسی حرکتیں کی تھیں! آہ

"پیام؟" بڑی دیر بعد اسنے کہا "میں سوچ رہا تھا۔ کہ منیر کی ایسی نازک حالت میں آپ اس ناچیز کے ذریعہ کونسا پیام پہنچانا چاہتی ہیں؟ کیا یہ عجیب نہیں معلوم ہوتا"؟

"تو پھر جانے دیجئے" میں نے مایوس لہجے میں کہا۔

"اس پیام کے بھیجنے میں مجھے جلدی نہیں کرنی چاہئے۔ منیر بیمار ہیں اس کا خیال نہ رہا تھا"

حبشی کہنے لگا "خاتون میں آپ کے اور منیر کے درمیان کسی پیام کی ضرورت محسوس نہیں ہونی چاہئے"

"کیوں؟" میں نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ میری آنکھیں محبت کے سرمہ سے لبریز تھیں۔ اور میری نگاہ اس کے سفید چہرے پر جمی ہوئی تھی

"کیونکہ۔ نیک بانو۔ آپ جانتی ہیں یہ بات نامناسب سی ہے۔ دو محبت کرنے والوں کے درمیان تیسرے کی پیامبری کی عموماً ضرورت نہیں ہوتی"

"یہ آپ کو کیسے معلوم ہوا؟" کیا آپ نے بھی کبھی محبت کی ہے؟ میں نے ہمت کر کے پوچھا۔

"نہیں! ——— مجھے نہیں معلوم" حبشی نے اکھڑی سی کہا۔

"آپ کس قدر ——— بچوں کی سی فطرت رکھتے ہیں" میں نے دبی زبان سے کہا۔

"بات یہ ہے خاتون! میں لڑکیوں کی محبت سے محروم رہا ہوں"

اسلئے وحشی ہوں"

"وحشی!" میں نے کہا "بہادر لوگ وحشی ہوتے ہیں۔ مجھے بڑے اچھے لگتے ہیں۔ اس لئے تو میں جنگلی اقوام کی کہانیاں شوق سے پڑھتی ہوں"

اسنے مڑ کر میری طرف دیکھا۔ پھر چہرہ چاند کی طرف کر لیا بولا "اچھا تو فرمائیے۔ وہ کیا پیام تھا؟"

"آپ پونچادینگے؟"

"جی ——"

"تو —— تو —— منیر سے کہہ دیجئے.... کہ وہ دہوکا کھا رہے ہیں۔ انہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔ ان سے کہہ دیجئے جیتمی صاحب...... مجھے ان سے محبت نہیں ہے .... مجھے مجھے ......"

یہ کہتے ہوئے میں موم بتی لیکر مڑ گئی اور اک سایہ کی طرح باغ کے زینے سے اتر کر تاریکی میں غائب ہو گئی۔

جیتمی بدستور اندھیرے زینے پر کھڑا چاند کی طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھ رہا تھا۔

نیچے نہر کے پانی میں ہوا سرسراہٹ پیدا کر رہی تھی۔ اور چاند کی نورانی شعاعیں اس میں منعکس ہو رہی تھیں۔

جناب محمود اسرائیلی

عالم وَمافی العالم

قطرۂ آب میں ہے سطوتِ قلزم مستور
تخمِ کم مایہ میں پنہاں ہے شجر کی تصویر
یوں تو کہنے کو بنا اسکی مگر خاک سے ہے
بحرِ آتش متلاطم ہے کسی تارے میں
بزمِ خورشید میں رقصاں نظر آتا ہے کوئی
عالم اس میں ہیں کئی مہر کئی ماہ کئی
قوتِ ثقل سے ہے ہستیِ اشیاء کو قرار
جسم ہر شے کا حرارت سے سوا ہوتا ہے
سمت قطبین نہ ہو گر کششِ مقناطیس

برق کی موج ہے جھونکے میں ہوا کے معمور
ابرِ نیساں میں نمایاں ہے گہر کی تنویر
منسلک اپنا کرہ عالمِ افلاک سے ہے
اور آباد ہے دنیا کسی سیارے میں
مثلِ فانوس درخشاں نظر آتا ہے کوئی
سینکڑوں سال کیا کرتے ہیں طے راہ کئی
کشش مہرِ درخشاں پہ ہے عالم کا مدار
اس کی تاثیر سے پانی بھی ہوا ہوتا ہے
اہلِ کشتی کو سمندر میں ملے کون انیس

وصل ذرات سے شیرازۂ عالم ہے بہم
ان حقایق میں بصیرت ہے اگر سوچیں ہم

علامہ سیماب اکبرآبادی

میرا مذہب

(علامہ موصوف کے عنقریب شائع ہونے والے مجموعۂ "سازو آہنگ" کی ایک تازہ ترین نظم)

یہ جو انگڑائی سی صبح و شام لے لیتا ہوں میں
عرش کو چھو کر خدا کا نام لے لیتا ہوں میں

ذکر کرتا ہوں مگر خاموش بے شور و خروش
سانس سے اپنی زباں کا کام لے لیتا ہوں میں

ذرّوں کی پاکیزگی پر اعتبارِ نور ہے
خاک سے بھی جامۂ احرام لے لیتا ہوں میں

جلوۂ خورشید سے لیتا ہوں میں تعلیمِ صبح
چاند اور تاروں سے درسِ شام لے لیتا ہوں میں

رقص کر کے، وجد کر کے، اہتزازِ روح پہ
انتقامِ گردشِ ایّام لے لیتا ہوں میں

جب نہیں ملتا مصلّےٰ، جب نہیں ہوتا وضو
دامنِ صحرا سے دونوں کام لے لیتا ہوں میں

مُہر بر لب، سوز در دل، گوش بر آوازِ دوست
لذّتِ خاموشیٔ اصنام لے لیتا ہوں میں

ہاتھ پھیلانے کی مطلق مجھ کو عادت ہی نہیں
جامِ دل میں بادۂ الہام لے لیتا ہوں میں

مسجد اور مندر کی شورش سے ہوں دل برداشتہ
خلوتِ دل سے بھی ایسے کام لے لیتا ہوں میں

الغرض ہوں بے نیازِ رسم و راہِ بندگی
جسطرح ہوتا ہے اس کا نام لے لیتا ہوں میں

اُس سے دِل غافل نہ ہو، مذہب کا مطلب ہے یہی
یاد کر لیتا ہوں اس کو میرا مذہب ہے یہی

بپروفیسر سید فیاض محمود، ایم اے

کسی کی یاد

راشدہ کے ماں باپ مر چکے تھے۔ اور وہ اپنے بڑے بھائی کے
س رہتی تھی۔ سوائے نانی کے دنیا میں اس کا کوئی اور قریبی رشتہ دار
تھا۔ نانی۔ نانا البتہ زندہ تھے۔ اور فارغ البال بھی تھے۔ مگر راشدہ کے
سوں اور خالہ کے لڑکے لڑکیوں سے ہی نانا کا گھر ایسا بھرا رہتا تھا۔ کہ
شدہ امرتسر جانے سے ہچکچاتی۔ یہ نہیں کہ وہاں اسکی آؤ بھگت کم ہوتی۔ بلکہ
کی نانی تو راشدہ کے ساتھ بہت محبت سے پیش آتیں، کیونکہ راشدہ کی
ل ان کی سب سے بڑی بیٹی تھی۔ اور سب ہی اسے بہت چاہتے تھے۔ مگر
شدہ کی طبیعت کچھ ایسی حساس، خاموش، اور تنہائی پسند واقع ہوئی
تی۔ کہ وہ اپنے نانا کے بڑے گھر میں جہاں بہت سے بچے اور لوگ
ہتے تھے ا رہنا پسند نہ کرتی تھی۔

راشدہ کے بھائی گوجرانوالہ میں ڈپٹی کمشنر کے دفتر میں ناظر تھے
ن کی عمر تو فقط چھبیس سال کی تھی۔ مگر وہ دو بچوں کے باپ تھے۔ ان
ی شادی چھ سال ہوئے ان کی والدہ نے بہت تزک و احتشام سے
ی تھی۔ اسوقت انکے والد بھی زندہ تھے۔ ان کی گوجرانوالہ ہی میں چینی کے
برتنوں کی بہت بڑی دوکان تھی۔ جب راشدہ کی والدہ تپ محرقہ میں مبتلا
ہو کر اس جہاں سے رحلت کر گئیں۔ تو ان کے والد جن کی عمر پچاس سے زیادہ
نہ ہوگی۔ اس صدمہ سے ایسے بیمار ہوئے۔ کہ پھر چارپائی سے نہ اٹھے۔ چار ماہ
بیمار رہ کر وہ بھی گذر گئے۔ اس دلخراش واقعہ کو اب تین سال گذر چکے
تھے۔ اور جب سے راشدہ اپنے بھائی رشید احمد کے پاس ہی رہتی تھی۔ اس عرصہ
میں وہ فقط دو دفعہ ایک ایک مہینے کے لئے امرتسر اپنی نانی سے ملنے
گئی تھی۔

راشدہ کی عمر اب اٹھارہ سال کی تھی۔ بھائی رشید اور اسکے درمیان
دو بھائی اور تھے۔ مگر وہ راشدہ کی ہوش سے پہلے ہی فوت ہو چکے تھے اس
کے والد کو تعلیم نسواں سے کوئی لگاؤ نہ تھا۔ اسلئے انہوں نے راشدہ کو
ایک دن کیلئے بھی کسی سکول میں نہیں بھیجا تھا گھر میں ہی اُسے قرآن شریف
اور اردو فارسی کی ابتدائی کتابیں پڑھوا دی تھیں۔ مگر ان کی وفات کے بعد
یہ سلسلہ بھی منقطع ہو گیا۔ راشدہ کے بھائی کو بھی کوئی ایسا پڑھانے کا شوق نہ
تھا۔ اور نہ ہی اس گھر میں کتابیں تھیں۔ جو راشدہ پڑھتی۔ پھر بھی اگر کوئی
رسالہ یا کتاب اس کے ہاتھ آجاتی۔ تو وہ اسے پڑھ کر ہی چھوڑتی۔

اسکے لئے گھر میں کچھ ایسا کام نہ تھا۔ کھانا پکانے کیلئے ماما موجود تھی
بچوں کو کھلانے اور سودا سلف لانے کے لئے ایک لڑکا تھا۔ چنانچہ راشدہ
کے لئے سوائے اپنے کپڑے سینے، دو ایک سہیلیوں سے خط و کتابت کرنے،
کھڑکیوں میں سے پڑوسنوں کے ساتھ باتیں کرنے اور کبھی کبھی اپنے بڑے
بھتیجے کے ساتھ کھیلنے کے اور کوئی کام نہ تھا۔ اسکے والد کی بہت بڑی جائداد
تو نہ تھی۔ مگر دوکان کا سامان بیچنے پر جو روپیہ بھائی رشید نے وصول کیا
تھا۔ اس کا ایک تہائی شرع کے مطابق انہوں نے راشدہ کے نام ڈاکخانہ
میں داخل کرا دیا تھا۔ جس مکان میں وہ رہتے تھے۔ وہ ان کا جدی مکان
تھا۔ دو ایک مکان اور بھی تھے۔ جو راشدہ کے والد اپنی علالت کے زمانہ ہی
میں ان دونوں میں تقسیم کر گئے تھے۔ راشدہ کے حصہ میں جو مکان آیا تھا۔
اس کا کرایہ بیس روپیہ ماہوار آتا تھا۔ جو اسکے جیب خرچ کے لئے کافی
تھا۔ والدہ مرحومہ نے اپنا زیور کچھ تو اپنی زندگی ہی میں رشید احمد کی شادی
پر اس کی بیوی مجیدہ کو پہنا دیا تھا۔ اور باقی ان کی وفات کے بعد راشدہ
کے حصہ میں آیا تھا۔ اور چونکہ وہ بھی راشدہ کے والد اپنی وفات سے پہلے
ہی راشدہ کے سپرد کر گئے تھے۔ اسلئے مجیدہ کو اس پر کسی اعتراض کا موقع
نہ مل سکتا تھا۔ مشین بھی راشدہ کی اپنی تھی۔ یعنی اسکی اماں کی تھی۔ اس لئے
وہ سارا دن جو چاہتی سیتی اور جو چاہتی خریدتی۔ مگر اس کی بھاوج کی طبیعت
نرالی تھی۔ یہ نہیں کہ اسے راشدہ کو کچھ دینا پڑتا تھا۔ بلکہ راشدہ ہی اپنے
بھتیجوں کے لئے آئے دن کچھ نہ کچھ خرید لیتی تھی۔ سردیوں میں وہ انکے

سویٹر بنتی رہتی تو گرمیوں میں ننھے فراک۔ مگر مجیدہ ان عورتوں میں سے تھی۔ جنہیں اپنے سوا اور جوان خوش شکل اور بے فکر عورتوں سے رغبت ہو ہی نہیں سکتی۔ اور کچھ نہیں تو وُہ راشدہ کے پڑوسنوں سے جو تعلقات تھے۔ ان کے خلاف ہی بڑبڑاتی رہتی۔ اگر راشدہ سے کچھ کہتی تو جواب ملتا۔ کہ یہ لوگ تو ہمارے جدی پڑوسی ہیں۔ ان سے ہم ملنا چھوڑ سکتے ہیں؟ اور اگر رشید سے کہتی تو وہ کہہ دیتے کہ راشدہ اور کیا کرے۔ بیاہی جائے گی۔ تو یہ سب کچھ خود بخود دور ہو جائیگا۔ مگر جس چیز سے مجیدہ کو سب سے زیادہ الجھن ہوتی وُہ راشدہ کی خاموشی اور عزلت گزینی کی عادت تھی۔ اگر اسے کوئی کتاب مل جاتی۔ یا رسالہ تو پہروں کسی سے نہ بولتی۔ اپنے کمرے میں بیٹھی یا لیٹی پڑھتی رہتی۔

دراصل یہ عادت اسے بچپن سے تھی۔ اگرچہ ماں کی زندگی میں اسے علیحدگی کا موقع کم ملتا۔ مگر ان ایام میں بھی ایسے موقع ضرور میسّر آتے جب اس کے پاس گفتگو کرنے کا کوئی موضوع نہ ہوتا۔ مگر اس کی اماں راشدہ کی اس عادت سے واقف تھیں اور اگر وُہ ان کے پاس فقط بیٹھی رہتی۔ اور کچھ نہ بولتی تو انہیں کوئی اعتراض نہ ہوتا۔ مگر مجیدہ کے نزدیک تو علیحدگی گویا اسکے راشدہ کے ساتھ سلوک پر حرف تھا۔ وُہ یہ چاہتی تھی کہ راشدہ جب کبھی پڑھنے پڑھانے سے فارغ ہو اس کے پاس بیٹھے اور اگر ہو سکے تو اس کے اپنے کام میں ہاتھ بٹائے۔ وُہ علانیہ یا صاف الفاظ میں راشدہ کو کچھ نہ کہتی۔ اور نہ ہی وُہ اپنے خاوند سے شکایت کرتی۔ مگر اشارتاً یا کنایتاً وُہ راشدہ پر ظاہر کر دیتی کہ اسے راشدہ کی کونسی عادت پسند نہیں۔

اب کچھ دنوں سے وہ محسوس کر رہی تھی۔ کہ راشدہ کی طبیعت معمول سے بھی زیادہ غیر حاضر ہے۔ وُہ دیکھتی کہ بعض دفعہ تو راشدہ پڑھتے پڑھتے کتاب چھوڑ کر کسی سوچ میں پڑ جاتی۔ اور بعض دفعہ اگر اسے کسی کام کے لئے کہا جاتا۔ تو کام ادھورا ہی پڑا رہتا۔ اور راشدہ اپنے خیال میں غرق ہو جاتی۔ اگر کسی دن ماما کو کسی کام پر جانا پڑتا۔ اور راشدہ سے کہا جاتا۔ کہ سبزی بنا دے تو پندرہ منٹ کے کام کو وہ ایک گھنٹہ لگا کر ختم کرتی۔ مجیدہ کو تو یقین ہو جاتا۔ کہ اس آہستگی اور مردہ دلی کے ساتھ وہ تمام دن سبزی کاٹنے میں صرف کر دیگی۔ راشدہ کی یہ حالت یکدم ہی نہیں ظاہر ہوئی۔ بلکہ مجیدہ اس کی بڑھتی ہوئی بے توجہی کا مطالعہ کچھ عرصے سے کر رہی تھی۔ جہاں تک اس کا اندازہ کام کرتا تھا۔ وُہ گرمیوں کے ایام سے راشدہ کی طبیعت میں کچھ نہ کچھ تبدیلی محسوس کر رہی تھی۔ پہلے راشدہ کی عزلت پسندی بڑھ گئی۔ اور پھر کچھ اُداسی اور اب یہ پریشانی کسی وقت بے حسی کی حد تک پہنچ جاتی۔

مگر چونکہ وُہ شروع سے ہی راشدہ کی ہم راز نہ تھی اور نہ ان میں کبھی گہرا بہناپا ہی قائم ہوا۔ اسلئے راشدہ کی طبیعت سے اُسے ایسا مس بھی نہ تھا۔ وہ یہی سمجھا کرتی۔ کہ راشدہ ہے ہی خاموش اور خلوت نشیں اور چونکہ وہ خود راشدہ سے فقط پانچ سال ہی بڑی تھی۔ اس لئے اپنے آپ میں کچھ ایسا اختیار بھی نہ پاتی تھی۔ کہ راشدہ کے معمولات میں دخل دے۔ یا اس کے مشاغل سے تعرض کرے۔ وُہ یہ دیکھتی کہ راشدہ فقط یہ کہہ کر کہ "بھابی میں خالہ اعجاز کے ہاں جاتی ہوں" نیچے اتر جاتی۔ اور چونکہ خالہ اعجاز اس کی ساس مرحومہ کی بہت پرانی سہیلی۔ نہ صرف پرانی سہیلی۔ بلکہ انتہائی محبت کی بنا پر سگی بہن بھی تھی۔ اسلئے وہ راشدہ کو نہ روک سکتی اور نہ اُسے منع کرنے کی وُہ ضرورت ہی سمجھتی۔ اُسے معلوم تھا۔ کہ خالہ اعجاز کے لڑکے لڑکیاں جوان ہیں۔ اور یہ بھی ایک ان میں کالج میں بھی پڑھتا ہے۔ مگر چونکہ وُہ اعجاز کے ساتھ بچپن سے کھیلے ہوئے تھے۔ اور آپس میں ایک دوسرے کو بھائی اور آپا کہہ کر پکارتے تھے، وہ اس ملنے ملانے میں بھی کوئی قباحت محسوس نہ کر سکی۔

اب سردیاں تھیں اور وُہ دیکھتی کہ راشدہ نہ زیادہ خالہ اعجاز کے ہاں جاتی۔ اور نہ اپنی کسی اور سہیلی کو اپنے ہاں بلاتی۔ ورنہ یوں آئے دن کوئی نہ کوئی سہیلی آئی ہی رہتی تھی۔ دو ایک دفعہ اس کی سہیلی شفیقہ آئی اور ایک دفعہ راشدہ بھی اسکے ہاں گئی۔ مگر اس اصرار کے بعد کہ خود مجیدہ کو کہنا پڑا۔ شفیقہ اتنا کہتی ہے ہو آؤ۔ کپڑے وُہ اب بھی سیتی اور اپنے بھتیجے ارشد کو اب بھی پیار کرتی، مگر اکثر کھوئی کھوئی سی رہتی۔

اول تو مجیدہ کو اپنے ننھے سے ہی فرصت کم ہوتی۔ کبھی اسے دودھ پلاتی۔ تو کبھی اُسکے کپڑے بدلتی۔ کبھی خاوند کے کپڑے نکالتی۔ تو کبھی کچھ اور کام کرنے کو موجود ہوتا۔ راشدہ یوں ہی گھر کے کام کاج میں اسکا ہاتھ کم بٹاتی۔ اور اَب تو اُسے کہنا ہی بے سود معلوم ہوتا۔ بلکہ مجیدہ کو تو خیال ہوا کہ کہیں راشدہ بیمار نہ ہو گئی ہو۔ اور اگرچہ اُسے راشدہ سے کوئی [illegible]

تھا۔ مگر خاوند کے خیال سے جو راشدہ کا بہت پاس کرتے تھے۔ اُسے اُن
کی توجہ راشدہ کی طرف مبذول کرانا پڑی۔

ایک اور بات بھی اُسے مشوش کرتی اور وہ یہ کہ اوپر چھت پر
جو برساتی تھی۔ اور جہاں اکثر اب راشدہ دھوپ میں کپڑے والی آرام
کرسی پر لیٹی دھوپ سینکا کرتی۔ اس کی دیواروں پر اس نے دیکھا۔ کہ
کبھی سُرخ اور کبھی سیاہ پنسل سے بشیر احمد، بشیر احمد، لکھا ہوتا۔ کبھی اُردو
حروف میں۔ کبھی عربی خط میں۔ مگر جب کبھی اُسے اُوپر جانا ہوتا، وُہ یہی
دیکھتی۔ چونکہ اوپر سوائے راشدہ کے اور کوئی کم ہی جاتا۔ اور چونکہ گھر میں
سوائے راشدہ کے کوئی لڑکی یا لڑکا نہ تھا۔ اسلئے اُسے یہی خیال ہُوا کہ
یہ نام راشدہ کا لکھا ہُوا ہے۔ مگر اس کے علم میں کوئی ایسا بشیر احمد نہ تھا
جسے راشدہ نے کہیں دیکھا ہو۔ خالہ اعجاز کے لڑکوں کا نام تو اکرم افضل
اور چھوٹے کا اسلم تھا۔ شفیقہ کے بھائی کا نام اشفاق احمد تھا۔ اور راشدہ
کی اور سہیلیوں کے بھائیوں میں سے کسی کا نام بشیر احمد نہ تھا۔

پہلے پہل یہ نام اس نے نومبر کے آخر میں دیکھے۔ جب وُہ ایکدن
نہا کر اوپر دھوپ میں بال سکھانے چڑھی تھی۔ دھوپ زیادہ ہوگئی۔ تو
ننھے کی کھٹولی اُسنے محراب کے اندر گھسیٹ لی۔ مگر پوری طور پر اندر نہ
کی۔ آدھی اندر اور آدھی باہر جب ننھے کو دودھ پلانے لیٹی۔ تو سامنے
دیوار پر اس کی نظر اُٹھ گئی۔ یونہی اچٹتی ہوئی نظر تھی۔ مگر جب اس نے
وہاں کوئی غیر نام لکھا ہُوا دیکھا تو حیران ہوگئی۔ پھر جو ذرا اوپر دیکھا۔
وہاں بھی بشیر احمد لکھا ہُوا تھا۔ دودھ پلا کر اٹھی تو دیکھا کہ اس کی پشت
پر بھی یہی نام کئی جگہ لکھا ہُوا تھا۔ بہت خوشخط، بہت خوشنما۔ مگر بشیر احمد
اور کچھ نہیں!

اسکے کچھ دن بعد ایسا اتفاق ہُوا کہ مجیدہ نے گھر میں پھرتی پھراتی
کہیں سے بلا قصد ایک رسالہ جو راشدہ پڑھ چکی تھی، اٹھا لیا۔ یونہی اُسکے
ورق اُلٹے ہوئے اسنے دیکھا۔ جگہ جگہ بشیر احمد کا نام لکھا ہُوا ہے۔ اب تو اُسے
یقین ہوگیا۔ کہ یہ نام راشدہ ہی لکھتی ہے۔ پہلے تو تھوڑا سا شک تھا کہ شاید
خالہ اعجاز کا کوئی لڑکا کھیلتا کھیلتا اُدھر آیا ہو۔ اور اپنے کسی دوست کا
نام لکھ گیا ہو۔ مگر راشدہ سے پوچھنے میں وُہ ہچکچاتی۔ بہت غور کرتی مگر کچھ
پتہ نہ چلتا۔ کہ یہ کون شخص ہے۔ آخر راشدہ کی افسردگی اور اضمحلال سے

تنگ آکر اُسنے اپنے خاوند سے سارا قصہ کہہ ڈالا۔ مگر اس بات پر زور دیا
کہ راشدہ بیمار معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ اُسے معلوم تھا۔ کہ اس کا خاوند راشدہ
کے خلاف بہت کم بات سننے کو طیار ہے۔ مگر اس بات کو تو وُہ کسی طرح نہ
چھپا سکتی تھی۔ کہ راشدہ کسی غیر مرد کا نام دیواروں پر اور اپنی پڑھنے والی
کتابوں پر لکھتی رہتی ہے۔ اُسکا خاوند یہ سنکر بہت پریشان ہُوا۔ پہلے تو
اسکی سمجھ میں ہی نہ آیا۔ کہ وہ کیا کرے۔ راشدہ جوان ہو چکی تھی۔ نہ بیوقوف
تھی نہ بدشکل رشتہ داری کافی وسیع تھی۔ کئی رشتے آچکے تھے۔ مگر وُہ اسے
کسی حسب پسند جگہ دینا چاہتا تھا۔ جہاں روپیہ بھی کافی نہ ہو۔ آدمی بھی
اچھے ہوں۔ اسلئے وہ عجلت سے کام نہیں لینا چاہتا تھا۔ مگر اب تو اُسے
ایسا معلوم ہُوا۔ کہ جیسے کسی نے ایک بھاری پتھر کی چٹان اسکے کندھوں
پر رکھ دی ہے۔ اور یہ سنکر کہ راشدہ ایسی بے بس ہو رہی ہے کہ کسی
غیر مرد کا نام دیواروں پر لکھتی رہتی ہے۔ اُسے بہت صدمہ ہُوا۔ راشدہ
شریف زادی تھی۔ کبھی اسکے متعلق نہ اُسے نہ والدہ مرحومہ کو کوئی شکایت
کا موقع ملا تھا۔ اور اب وُہ نہ خاموش ہی تھی۔ بلکہ یوں بے اختیار
ہو رہی تھی!

مگر اُسنے خود راشدہ سے پوچھنا مناسب نہ سمجھا۔ مجیدہ سے تاکید
کی۔ کہ وُہ راشدہ سے پوچھے۔ مگر جب دوسرے دن دفتر سے واپس
آکر اُس نے مجیدہ سے دریافت کیا۔ تو مجیدہ نے اُسے کوئی تسلّی بخش
جواب نہ دیا۔ اُسنے یہی کہا کہ راشدہ سنکر چپ ہوگئی تھی۔ اور اگرچہ اُس
نے تین چار دفعہ دُہرا کر بھی پوچھا۔ مگر اُسنے کوئی جواب نہ دیا۔ البتہ سہ پہر
کو اُسے چھت پر جانے کا اتفاق ہُوا۔ تو اُسنے دیکھا کہ دیواریں بالکل صاف
ہیں۔ غالباً راشدہ نے کسی وقت جا کر انہیں اچھی طرح پونچھ ڈالا تھا۔ مجبور
ہو کر رشید نے اپنی بہن سے اس شام کو خود پوچھا۔ مگر راشدہ نے شرمندگی
میں اپنا سر نیچے کر لیا۔ جب تک بھائی پاس بیٹھا اس سے پوچھتا رہا، پھر
سر نہیں اٹھایا۔ سوائے "کچھ نہیں۔ غلطی ہوگئی۔ کچھ نہیں"۔ کے اور جواب
نہ دیا۔ رشید نے بہت پوچھا کہ یہ بشیر کون ہے۔ مگر راشدہ چپ ہی رہی۔
جب رشید پوچھتا وہ شرمندگی سے سر اور جھکا لیتی۔ اور تنگ آکر جو رشید
نے سخت لہجہ میں پوچھا تو وُہ رونے لگی۔ پہلے آہستہ اور پھر سسکیوں کیساتھ
حتےٰ کہ رشید عاجز آگیا۔ اور وہاں سے اُٹھ آیا۔

والدہ کی وفات کے بعد جب کبھی برادری کے معاملہ میں کبھی مشورہ کی ضرورت پیش آتی۔ تو وہ اپنی چچی سے جنکا گھر بھی گوجرانوالہ میں ہی تھا۔ پوچھ لیتا تھا۔ اور یوں اسکی بیوی ہی ان معاملات کو نباہ لیتی۔ چھوٹی موٹی باتوں میں سبھی خالہ اعجاز سے پوچھتے۔ مگر اس امر سے وُہ کسی سے کیا مشورہ کرتا۔ اسے راشدہ سے یہ توقع تو نہ تھی کہ وہ کوئی ایسی حرکت کر بیٹھے گی۔ جس سے اُنکے خاندان کی آبرو پر حرف آئے۔ مگر بہن کا معاملہ تھا۔ دن رات پریشان رہتا۔ راشدہ سے ایک دفعہ پھر پوچھا۔ مگر پھر اُسے سوائے رونے کے اور کوئی جواب نہ ملا۔ دسمبر کے اوائل میں اُسنے مجیدہ سے صلاح کر کے مناسب سمجھا کہ راشدہ کو امرتسر اپنی نانی کے ہاں بھیجدینا چاہیئے۔ ایک تو وہاں اسکا دل بہل جائیگا۔ دوسرے اگر بشیر احمد کوئی شخص ہوگا۔ تو گوجرانوالہ میں ہی ہوگا امرتسر میں اپنے خالہ اور ماموں زاد بہن بھائیوں سے ملکر راشدہ کے خیالات درست ہو جائینگے۔ پھر کرسمس کی چھٹیوں میں وہاں رونق بھی کافی ہوگی۔ اور شاید کچھ دنوں کیلئے وُہ خود بھی امرتسر ہو آئیں۔ نانی اماں نے کئی دفعہ دعوت دی تھی۔ مگر چھٹیاں نہ ملنے کی وجہ سے وہ جا ہی نہ سکے تھے۔ چنانچہ خالہ اعجاز کا چھوٹا لڑکا افضل راشدہ کو امرتسر چھوڑ آیا۔

کرسمس کے دنوں میں وُہ خود بھی امرتسر گئے۔ وہاں جا کر انہوں نے دیکھا۔ کہ پندرہ بیس دنوں میں ہی راشدہ کی طبیعت کچھ بہتر ہو گئی ہے۔ اب اس میں کبھی کبھی بشاشت کے آثار بھی دکھائی دیتے تھے اور وہ دوسروں کی باتوں اور کھیلوں میں حصّہ بھی لے لیتی۔ دسمبر کی ستائیس کو خالہ اعجاز کا بڑا لڑکا اکرم انہیں امرتسر میں ملنے آیا۔ وُہ بی۔ اے میں پڑھتا تھا۔ اور راشدہ سے دو سال بڑا تھا۔ رشید نے پوچھا "اکرم تم امرتسر کیسے آئے ہو" کہا "میرے ایک دوست کی شادی تھی۔ اسپر آیا ہوُا تھا۔ کل ولیمہ کی دعوت ہے۔ اسلئے اپنے دوست کی طرف سے آپ کو دعوت دینے آیا ہوں"۔ رشید نے کہا "بھائی مجھے جانے میں تو کوئی اعتراض نہیں۔ مگر میں تمہارے دوست سے واقف نہیں۔ کون ہے؟" اکرم نے کہا "وُہ تو گرمیوں کی چھٹیوں میں گوجرانوالہ مجھے ملنے بھی آیا تھا۔ پندرہ دن رہا تھا۔ مگر کچھ ایسا اتفاق ہو گیا کہ آپ سے تعارف نہ کروا سکا۔ خیر کوئی مضائقہ نہیں۔ وُہ تو آپ کو جانتا ہے آپ ضرور چلیں۔ اسکا نام بشیر احمد ہے"۔

راشدہ کو نہ کسی نے بتایا اور نہ اسے کبھی معلوم ہوُا۔ کہ بھائی اکرم کسی تقریب پر امرتسر آئے ہوئے تھے۔ اسکے دماغ میں اور دل کی تہوں میں ایک یاد مدت تک ٹمٹماتی رہی۔ گرمیوں کی تعطیلات میں جب بھائی اکرم کے دوست اُنسے ملنے آئے ہوئے تھے۔ تو ایک شام خالہ اعجاز کی ڈیوڑھی میں جلدی سے نکلتے ہوئے اسکی کسی سے ٹکر ہو گئی تھی اور اچانک مٹھ بھیڑ ہونے کی وجہ سے وہ گرنے کو تھی۔ کہ اس دھندلکے میں کسی کے مضبوط ہاتھ نے اسے سہارا دیکر گرنے سے بچا لیا تھا۔ انہیں ایام میں دو دفعہ اور اُسنے بھائی اکرم کے دوست کو دیکھا تھا۔ ایک دفعہ دن کے وقت جب ایک طویل لمحے کے لئے وہ دونوں ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہے تھے۔ بشیر کو شاید یاد بھی نہ رہا ہو۔ مگر راشدہ کے دل میں بہت دیر تک وہ بڑی بڑی شوخ آنکھیں انگاروں کی طرح دہکتی رہیں۔

رُباعیات

جناب خلیق قریشی

آغازِ محبت کی کہانی سُن لو
رومانِ غم انگیزِ جوانی سُن لو
آلامِ وفا کی داستانِ جانسوز
آلامِ مجسم کی زبانی سُن لو

اس دہر میں لطفِ زندگانی توبہ!
اس دارِ محن میں شادمانی۔ توبہ!
دل اور سراپائے مصائب۔ اللہ
پابندیٔ غم اور جوانی۔ توبہ!

جناب سراج الدین ظفر بی۔ اے۔ ایل ایل۔ بی۔

غزل

تنہائیوں میں یاد کسی رشکِ حور کی
ہلکی سی ایک رَو ہے نشاط و سرور کی

ساری تجلیاں یہ شہود و ظہور کی
آئینہ داریاں ہیں محبت کے نور کی

ذوقِ نیازِ عشق رسا ہے جہاں جہاں
فطرت بھی رازدار نہیں اُن امور کی

بے تابیٔ فراق میں میری ہر ایک سانس
اِک عرضِ شوق تھی جو کسی کے حضور کی

زندہ ہوں ایک نالۂ شب گیر کیلئے
آواز ہوں کسی کے دِل ناصبور کی

بھولی ہوئی وصال کی راتوں کو کرکے یاد
فطرت سے بھیک مانگ رہا ہوں سرور کی

کیا تھی حدیثِ دوست کہ لب پر مرے ہنوز
اِک رَو ہے سلسبیل و شرابِ طہور کی

اُف رے وقارِ خاک نشینانِ کوئے عشق
حالِ خراب میں بھی ادا ہے غرور کی

تیری نظر کے فیض سے ہوں کامگارِ زیست
بنیاد بے خودی پہ ہے میرے شعور کی

اے حسن کشتگانِ محبت کو خود پکار
آواز سازگار نہیں ان کو صور کی

مژدہ کہ حسنِ دوست نے پاکر حریفِ عشق
رکھ دی دلِ حزیں میں بنا کوہِ طور کی

اس کے سوا کسی کے تبسم کو کیا کہوں
ہے اِک پھوار سی مہ و انجم کے نور کی

پائی ہے بے خودی میں وہ لذت کہ تا ابد
اب آرزو نہیں ہے جہانِ شعور کی

سرزد ہوئی خطا نہ کوئی بے خودی میں اور
ہاں اِک خطائے عرضِ محبت ضرور کی

حاصل ہے میرے ذوقِ محبت کو اے ظفر
پاکیزگی کہیں جسے دامانِ حور کی

از پریم پجاری

افسانہ کیوں کر بنتا ہے؟

یہ چودہ پندرہ برس کی بات ہے۔

چھوٹے ماموں جان کی شادی تھی۔ دیسی پردیسی مہمان بہت آئے تھے۔ زنانہ میں عورتیں کھچاکھچ بھری ہوئی تھیں۔ اور اپنی باتوں میں ایسی مشغول کہ قیامت گذر جائے اور انہیں خبر نہ ہو۔ کسی نہ کسی ضرورت سے مجھے بار بار زنانخانہ کے دروازہ پر جانا پڑتا تھا۔ دس۔ دس۔ پندرہ پندرہ منٹ چیختا تو اندر خبر پہنچتی۔ کبھی کبھی مجبور ہو کر میں دو قدم اندر گھس جاتا۔ جن بیبیوں کو اپنے پردے کا زیادہ خیال ہوتا۔ وہ یا تو سامنے سے ہٹ جاتیں یا منہ پر دوپٹہ کا آنچل ڈال لیتیں۔ بعض کو اپنی باتوں میں خبر بھی نہ ہوتی۔ کہ کون آیا اور کون گیا۔ بعض دیکھ کر بے پروائی کے ساتھ منہ پھیر لیتیں۔ اور بعض آنکھیں چار ہو جانے کے باوجود اسطرح اطمینان سے بیٹھی رہتیں۔ جیسے ہم کوئی گائے بیل ہیں۔ ظاہر ہے کہ گائے بیل سے کون پردہ کرتا ہے۔

ایک مرتبہ میں پردہ اٹھا کر اندر قدم رکھنا ہی چاہتا تھا کہ سامنے سے ایک نازک اندام لڑکی اچانک بالکل میرے قریب آگئی۔ سامنا ہوتے ہی وہ گھبرا کر پیچھے ہٹی۔ اور دوڑ کر دالان میں چلی گئی۔ میں ہکا بکا جہاں تھا۔ وہیں رہ گیا۔ کاش میں بیان کر سکتا کہ میں نے کیا دیکھا۔ یا جو کچھ میں نے دیکھا کاش دوسروں کو دکھا سکتا۔ بھولی بھالی صورت۔ پیارا پیارا نقشہ گوری گوری رنگت۔ کالی کالی آنکھیں۔ نازک نازک جسم لچکتی ہوئی اس طرح سامنے سے گذر گئی۔ جیسے پھولوں کی ڈالی تیز ہوا سے جھوم جائے۔ غالباً کوئی تین چار منٹ تک میں بالکل مبہوت جہاں تھا۔ وہیں کھڑا رہا۔ آخر سنبھلا اور واپس آیا۔ یہ بالکل بھول گیا۔ کہ میں وہاں کس کام سے گیا تھا جلد ہی مجھے ایسا محسوس ہونے لگا۔ جیسے میری کوئی قیمتی چیز گم ہو گئی ہے شاید اسی کیفیت کو شاعروں کی زبان میں "دل آنا" یا "دل ہاتھ سے جانا" کہتے ہیں۔

میں نے اپنے تصوّر کی مدد سے پھر اُس تصویر کو ایک بار دیکھ[ا] مگر خدا جانے کیوں ایک بہت ہی دھندلا سا خاکہ میرے سامنے آیا۔ ا[...] چیز البتہ نمایاں تھی۔ دو بڑی بڑی سیاہ آنکھیں۔ کس قدر خوبصورت قدر روشن۔ سیاہی کتنی سیاہ۔ سفیدی کتنی سفید۔ خدا جانے قدرت نے ا[...] کہربا سے بنایا تھا۔ یا مقناطیس سے۔ تصوّر میں بھی تو دل ان کی طر[ف] کھنچا جا رہا تھا۔ کسی شاعر نے اپنی محبوبہ کی آنکھوں کی تعریف اسطرح کی۔

یہ انکھڑیاں خدایا   کس قہر کی حسیں ہیں
کاجل نہیں لگایا   ویسے ہی سُرمگیں ہیں
آفاق کی نظر میں   تسخیر ہیں یہ آنکھیں
عشاق کی نظر میں   تقدیر ہیں یہ آنکھیں
بس کہربائیت کی   تفسیر ہیں یہ آنکھیں
روحِ نسائیت کی   تصویر ہیں یہ آنکھیں
جادو ہے نام اِن کا   کہتے ہیں موہنی بھی
شغلِ مدام اِن کا
افسوں بھی، رہزنی بھی

کہنے والے نے جو کچھ کہا ہے خوب کہا ہے۔ مگر میں سچ کہتا ہوں اگر شاعر نے وہ آنکھیں دیکھی ہوتیں جو میری نظر میں ہیں۔ تو اُسے ما[ننا] پڑتا کہ آنکھوں کی تعریف میں ابھی بہت کچھ کہنے کو باقی ہے۔ وہ آنکھیں بجلیوں کے خزینے تھیں۔ مستیوں کے ساگر تھیں کشش کا مرکز تھیں۔

اس طرح میں نے محبت کی دنیا میں پہلا قدم رکھا۔ مگر خدا کیلئے بتائے۔ میری خواہش یا میرے ارادہ کو اس میں کیا دخل تھا۔ اس بعد جو کچھ ہوا اسکا ایک حد تک میں ذمہ وار کہا جا سکتا ہوں۔ مگر اس کی بھی ایسی ہے جیسے کسی کو شراب پلا دی جائے۔ اور پھر وہ لڑکھڑا کر گر[ے] تو اُسے قصوروار ٹھہرایا جائے۔

میں نے تحقیق کی تو معلوم ہؤا کہ وُہ میری چھوٹی بہن زبیدہ کی پیاری سہیلی شاہدہ تھی۔ شاہدہ اس کا اصلی نام نہیں۔ میرا رکھا ہؤا ہے وہ اپنی والدہ کے ہمراہ بارہا ہمارے یہاں آئی تھی۔ مگر میں نے اُسے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اسوقت وہ ایف۔ اے کے دوسرے سال میں تھی شعر کہنے کا اُسے خاصہ سلیقہ تھا "پنہاں" اُسکے تخلص کا فارسی ترجمہ ہے زبیدہ کی معرفت ایک مرتبہ اس نے اپنی ایک نظم پر مجھ سے اصلاح بھی لی تھی شاہدہ کے والد تعلیم کے حامی ہوتے ہوئے بھی پردہ کے معاملہ میں بہت سخت تھے اس بارہ میں ان کا مبالغہ اور وہم جنون کی حد تک پہنچگیا تھا۔ خدا جانے جھوٹ یا سچ مگر ان کے متعلق مشہور تھا کہ وہ کوّوں کو اپنی دیواروں پر نہیں بیٹھنے دیتے تھے۔ بندوق سے مار دیتے تھے۔ کہ شاید ان میں کوئی نر ہو۔ ظاہر ہے کہ کوئی نر کوّا دیوار پر آبیٹھے گا تو عورتوں کی بے پردگی ہوگی۔ ایسی صورت میں اپنے گھر کے سوا۔ اور وہ بھی چوری چھپے۔ کہیں اور شاہدہ کو ایک نظر دیکھ لینا بھی میرے لئے ناممکن تھا۔

میں نے کوشش کی۔ شاہدہ اور اس کی والدہ کی آمدورفت ہمارے یہاں بڑھ گئی۔ عام طور پر جس کمرے میں یہ لوگ آکر بیٹھے تھے۔ وہ میرے کمرے سے ملا ہؤا تھا۔ درمیان میں دروازہ تھا۔ میں نے کواڑ میں ایک چھوٹا سا سوراخ کر لیا۔ شاہدہ جب اس سوراخ کے مقابل سے گذرتی یا سامنے بیٹھی ہوتی تو میں اُسے دیکھ سکتا تھا۔ شاہدہ کو بار بار دیکھنے سے میری طبیعت اور بھی زیادہ متاثر ہوگئی۔ میں نے تہیہ کر لیا کہ جسطرح بھی ممکن ہوگا شاہدہ سے اپنی محبت کا جواب لیکر چھوڑونگا۔

شاہدہ اَب تک میرے خیالات اور میرے ارادوں سے بالکل ناواقف تھی۔ لاکھ سوچتا تھا۔ مگر شاہدہ کو اپنی طرف ملتفت کرنے کی کوئی تدبیر میری سمجھ میں نہ آتی تھی۔ تمام حالات کو دیکھتے ہوئے میں کسی قسم کی پیشقدمی کرتے ہوئے بھی ڈرتا تھا۔ معاملہ بہت نازک تھا۔ اتفاق سے ایک دن شاہدہ نے زبیدہ سے رسالہ ہزار داستان منگا بھیجا۔ میں نے ہمت کرکے چپکے سے۔ فہرست مضامین والے صفحے پر پنسل سے یہ شعر لکھ دیا۔ ؎

یوں نام کو "پنہاں" ہے، شعروں سے نمایاں ہے
یہ ہوشربا کوئی غارت گر ایماں ہے

رسالہ جب واپس آیا۔ تو میں نے دیکھا کہ وہ شعر ربڑ سے مٹا دیا گیا تھا۔ پندرہ دن گذر گئے۔ شاہدہ پھر ہمارے یہاں آئی۔ اسکے دو روز بعد زبیدہ نے مجھ سے کہا "بھائی جان! آپ نے ہزار داستان دیکھ لیا ہو تو شاہدہ کو بھیجدوں۔ پرسوں وہ کہہ گئی تھی"۔ میں نے کہا "آج نہیں کل" دراصل میں رسالہ دیکھ چکا تھا۔ مگر بات کچھ اور تھی۔ اسی رات کو میں نے یہ غزل کہی:۔

؎ کہتے ہوئے ڈرتا ہوں، جو کچھ مجھے کہنا ہے
وہ کاش سمجھ لیں خود جو میری تمنّا ہے
اب جرم کہو اس کو، یا شوق کی بیتابی
سو مرتبہ چھُپ چھپ کر میں نے تمہیں دیکھا ہے
مشتاق نگاہوں سے کیا حاصلِ رُو پوشی
ہاں دیدۂ دل سے بھی چھپ جاؤ تو پردا ہے

آئینہ میں دیکھو تو طوفانِ شباب اپنا
یوں ہی مرے سینہ میں محشر نہیں برپا ہے
آنکھیں ہیں کہ مستی کے سرشار قرابے ہیں
سینہ ہے کہ فتنوں کا دریا اُمنڈ آیا ہے

ہاں تیرے ہی دامانِ عصمت کی قسم "پنہاں"
تو ہی دلِ شیدا کی معصوم تمنّا ہے

یہ اشعار فقط ایک پردہ تھے۔ ورنہ کہاں ہم اور کہاں غزلگوئی دراصل نثر میں یہ باتیں کہنے کی میری مجال نہ تھی۔ بہرحال یہ اشعار ایک پرزہ پر لکھے اور اُسے ہزار داستان کے فہرست مضامین والے صفحہ پر چپکا کر احتیاط کے ساتھ شاہدہ کے پاس بھجوا دیا۔ تین چار دن کے بعد جب رسالہ واپس آیا۔ تو میں نے دیکھا کہ وُہ پرزہ اس میں سے کھیڑا لیا گیا تھا۔

دو مہینہ تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ میں اسی طرح ہر رسالے میں چند شعر بھیجدیتا تھا۔ وُہ پرزہ رسالہ میں سے نکال لیتی تھی۔ اس اثناء میں شاہدہ کئی مرتبہ ہمارے یہاں آئی۔ ہر مرتبہ اس کی محبت کا نقش میرے دل پر زیادہ گہرا ہوجاتا تھا۔ میری بے تابیاں روز بروز بڑھتی جارہی تھیں

کسی کام میں جی نہ لگتا تھا۔ آخر مجبور ہو کر میں نے شاہدہ کو خط لکھنے کا تہیہ کر لیا۔ انجام کا اب مجھے کوئی خوف نہ تھا۔ اور تھا بھی تو جذبات کے طوفان میں بالکل دب گیا تھا۔ کچھ لے دے کر شاہدہ کے گھر کی ملازمہ "چمن" کی ماں کو ہموار کیا۔ اور اس کے ہاتھ یہ خط بھیجا۔

"جانِ آرزو! للہ میری اس گستاخی کو معاف کر دینا۔ میں نے بالکل مجبور ہو کر خطاب کی جرأت کی ہے تمہیں کیونکر بتاؤں کہ جبدن سے تمہیں دیکھا ہے۔ میرے سینے کے اندر کیا حشر برپا ہے۔ خدا شاہد ہے میں نے بہت کوشش کی کہ یہ خیال میرے دل سے نکل جائے۔ مگر اس کا کیا علاج۔ کہ تمہاری خیالی تصویر ہر وقت آنکھوں کے سامنے کھڑی رہتی ہے۔ راتیں جس بےچینی سے کٹ رہی ہیں۔ بس کیا بتاؤں۔ رات پچھلے پہر جو آنکھ کھلی تو پھر نیند نہ آئی۔ تمہارے پیارے خیال سے باتیں ہوتی رہیں۔ شاید تم پوچھو کہ آخر میں کیا چاہتا ہوں۔ پنہاں! تمہاری جادوگر آنکھوں کی قسم! مجھے خود بھی نہیں معلوم کہ میں کیا چاہتا ہوں۔ پھر تمہیں کیا بتاؤں۔ بس اتنا جانتا ہوں۔ کہ سینہ میں ایک آگ سی بھر گئی ہے۔ دل میں ایک خلش ہے۔ ہر دم ایک تڑپ ہے مسلسل کسی طرح سکون نصیب نہیں۔ خدارا مہر خاموشی کو توڑ دیجئے۔ اور چند کلمے اپنے پیارے ہاتھ سے لکھ کر بھیجئے کہ بیچین روح کچھ تسکین پائے۔ اور مضطرب دل کو قرار آئے پنہاں! تمہیں اپنی محبوب ترین شے کی قسم! جواب ضرور دینا ورنہ میرے دل کا خون ہو جائیگا"

فقط تمہارا پرستار

کئی دن تک انتظار کیا۔ مگر جواب نہ آیا۔ ان دنوں کی وحشت اور بیکلی۔ اللہ اکبر! صبح سے شام اور شام سے صبح کرنا قیامت تھا۔ طرح طرح کے خیالات دماغ میں آتے تھے۔ کبھی کہتا وہ بھولی بھالی معصوم ناتجربہ کار لڑکی۔ ایک بیگانہ مرد کو کیونکر خط لکھے اور کیا لکھے۔ ڈرتی ہوگی۔ جھجکتی ہوگی۔ شرماتی ہوگی۔ کبھی خیال آتا کہ میرا خط بہت گستاخ تھا۔ کہیں اس نے برا نہ مانا ہو۔ بگڑ نہ گئی ہو۔ ایسا ہوا تو قہر ہوا۔ کیونکر اُسے مناؤں گا کسطرح راہ پر لاؤنگا۔ کون اس نامراد دل کی اس سے عذرخواہی کریگا ہائے کیا کروں۔ کبھی یہ خوف کہ کہیں کسی سے کہہ نہ دے۔ کہیں یہ اپنے والد کو نہ دکھا دے۔ ایسا ہوا تو میں کہیں منہ دکھانے کے قابل رہونگا۔ جب ان خیالات کا ہجوم ہوتا تو دل کی کچھ عجب کیفیت ہو زور زور سے دھڑکنے لگتا۔ سر چکر آتا۔ معلوم ہوتا کہ جی بیٹھا جاتا ہے خود ہی خیال آتا کہ نہیں۔ کچھ بھی سہی۔ شاہدہ اتنی بیدرد تو ہرگز نہیں سکتی کہ ساری دنیا کی نظروں میں مجھے ذلیل کر دے۔ اس خیال سے کچھ ڈھارس ہوتی۔ مگر پھر گھڑی بھر کے بعد وہی وحشت۔ وہی اضطراب وہی ہراس۔ کیا کہوں کیسی اذیت کے ساتھ وہ پانچ دن کٹے۔ چمن کی معرفت میں نے پھر جواب کا تقاضا کیا۔ اگلے دن وہ یہ جواب لائی انہوں نے کہلا ہے۔

"خدا جانے آپ نے کیا لکھا ہے۔ میں کچھ نہیں سمجھی"

اسی دن میں نے یہ دوسرا خط لکھا۔

"پنہاں! کیا واقعی تم مجھے اسقدر بیوقوف سمجھتی ہو کہ میں تمہارے قول کو باور کر لونگا"

"خدا جانے آپ نے کیا لکھا ہے۔ میں کچھ نہیں سمجھی" تم اور نہ سمجھو کہ میں نے کیا لکھا۔ ہاں سمجھنا نہ چاہو تو کیونکر سمجھ میں آئے۔ اور کون تمہیں سمجھائے۔ کسی دانشمند کا قول ہے۔ کہ "محبت یکطرفہ نہیں ہوتی۔ اور اگر ہو تو وہ محبت نہیں دیوانگی ہے"۔ یعنی انسان کو محبت صرف اُسی سے ہو سکتی ہے۔ جو محبت کا جواب محبت سے دے سکے اسکے بغیر کسی کو چاہنا ایسا ہی ہے جیسے پتھر کی ایک حسین مورت کو پوجنا۔ میرا بھی ہمیشہ سے یہی عقیدہ تھا کہ جسے میرے ساتھ دلچسپی نہ ہو میں کبھی اس سے محبت نہیں کر سکتا۔ مگر آہ پنہاں! تمہاری سحرکار آنکھوں نے میری تمام استوار عقیدوں کو نقش بر آب ثابت کر دیا۔

اصولاً میں اس بات کو تسلیم کرتا ہوں کہ جسے میری ذات سے کوئی دلبستگی نہ ہو اُسے چاہنے کے کوئی معنی نہیں۔ مگر تجربہ نے بتایا کہ جذبات کی دنیا منطق کے اصولوں کی پابند نہیں۔ میں نے ہر طرح اس نامراد دل کو سمجھانے کی

کوشش کی کہ دیوانے! جو تیری بات تک نہ سمجھے بلکہ نہ سمجھنا چاہے۔ بھلا وہ تیرے جذبات واحساسات کو کیا سمجھے گا آخر اس محبت کا انجام اندوہ محرومی کے سوا اور کیا ہوگا! مگر وہ میری کب سنتا ہے۔ خلش میں اسکے لئے ایک کیف ہے۔ تڑپ میں اُسے لذّت ملتی ہے۔ اُسنے اپنی ایک خیالی دنیا بنائی ہے۔ ایک کافر جوانی کو اس میں آباد کیا ہے اور اس کی پرستش کو مدعائے زندگی سمجھا ہے۔

پنہاں! مجھے کوئی حق نہیں کہ تم سے بے التفاتی کا شکوہ کروں۔ میں نے خود ہی اپنی جان کو یہ روگ لگایا ہے میں خود ہی اسکا ذمہ وار ہوں۔ اور صرف مجھی کو اسکا عذاب سہنا ہوگا۔ اس سے زیادہ حماقت اور کیا ہو سکتی ہے۔ کہ میں نے خواہ مخواہ تم سے کچھ امیدیں قائم کرلیں اور اب جو وہ پوری نہیں ہوتیں تو دل کو رنج ہوتا ہے ایسا رنج جسنے میری راتوں کی نیندیں کھودی ہیں جس نے میرا سکون مجھ سے چھین لیا ہے۔ آہ کیا کروں۔ کاش میرے اختیار میں ہوتا کہ تمہارے بے احساس دل میں بھی محبت کی ایک ننھی سی چنگاری روشن کر دیتا۔ پھر اپنے نیاز وارادت کے دامن سے اُسے ہوا دیتا۔ وُہ مشتعل ہوتی۔ بھڑکتی، پھیلتی اور بڑھتی۔ یہانتک کہ اُسکے شعلے تمہارے برف سے ڈھکی ہوئی پہاڑیوں کی طرح سرد وخاموش دل کو گرما دیتے۔ اس میں زندگی کی روح پھونکدیتے۔ تمہارے خوابیدہ جذبات انگڑائیاں لے لے کر بیدار ہوجاتے۔ اور تم سمجھتیں کہ صرف چاہنا اور چاہا جانا ہی زندگی کا واحد مقصد ہے۔ کسی نے خوب کہا ہے:-

خلش ہو، درد ہو، کاہش ہو، کچھ ہو
فقط جینا بھی کوئی زندگی ہے

پنہاں! تم اس دفتر بے معنی کو پڑھتے پڑھتے اکتا جاؤگی۔ ایسی ابتر تحریر جسکا نہ سر ہے نہ پیر۔ شاید تم نے پہلے کبھی نہ دیکھی ہوگی۔ معاف کرنا پنہاں! میں بالکل بے اختیاری کی عالم میں لکھتا چلا گیا۔ اور اتنا کچھ لکھ ڈالا۔ مجھے خود بھی نہیں معلوم کہ میرا کیا لکھنے کا ارادہ تھا۔ اَب اسکے سوا اور کیا کہوں کہ درد دینے والے! خدا تجھے خوش رکھے۔ میں اپنے دل کی گہرائیوں سے تیرا شکر گذار ہوں۔ یہ درد میرے لئے ایک لذّت ہے ایک نعمت ہے۔ ایک نئی زندگی ہے جس کی مجھے انتہاسی زیادہ آرزو تھی۔ کسطرح کہوں کہ میری تحریر کا جواب دیجئے آخر مجھے اس کا کیا حق ہے۔ مگر نہ جانے کیوں آج میرا دل ایسا محسوس کر رہا ہے کہ ممکن ہے۔ آپ کو یہ خیال آجائے کہ "اگر میرے ہاتھ کے لکھے ہوئے چند نقطہ ایک مضطرب دل کیلئے سامان سکون ہوسکتے ہیں تو لاؤ لکھدوں۔ میرا اس میں کیا ہرج ہے۔" اور آپ کا قلم میرے لئے سرمایۂ تسکین فراہم کردے۔ فقط۔

تمہاری جادوگر آنکھوں کا قیدی"

اگلے دن اس خط کا جواب آیا۔ کاغذ کے ایک چھوٹے سے پرزے پر یہ عبارت تحریر تھی:-

"میری سمجھ میں نہیں آتا۔ کہ آپ کیا چاہتے ہیں۔ مجھ کو سخت الجھن ہے۔ براہ کرم کسی اور مشغلہ سے دل بہلائیے آپ میری پابندیوں اور مجبوریوں کو مجھ سے زیادہ جانتے ہیں ایک ذرا سا گمان اباجان کیلئے میرے خون کو جائز کردیگا۔ اور کوئی وجہ نہیں کہ یہ بات اُن سے پوشیدہ رہے کیونکہ ایسے اہم واقعات کہیں چھپ سکتے ہیں۔ للہ ذرا انجام پر بھی نظر کیجئے۔ میری تو روح تحلیل ہوئی جارہی ہے۔ نجّ یک نام[1] کا توسط بھی انتہائی خطرناک ہے۔"

شاہدہ کا یہ پہلا خط تھا۔ جو اس نے مجھے لکھا۔ یہاں تو آگ لگی ہوئی تھی۔ اس تحریر نے تیل کا کام کیا۔ فی الفور جواب لکھا:-

"شاہدہ۔ میری پیاری! کسطرح شکریہ ادا کروں

[1] "جن کی ماں" کی ماں کو اُلٹ کر "نجّ یک نام" بنایا ہے۔

اس لطف خاص کا کہ تم نے زحمت تحریر گوارا کر کے مغموم دل کو خوشی سے لبریز کر دیا۔ مگر آہ، ہماری مسرتیں کسقدر ناپائدار ہوتی ہیں۔ ابھی خط پڑھ کر تمام کیا تھا۔ کہ مستقبل کے بھیانک تصورات سے کلیجہ کانپنے لگا۔ ہاں پیاری شاہدہ یہ سچ ہے کہ تمہاری قید نہایت سنگین ہے۔ تم سے ملنا۔ باتیں کرنا۔ ہنسنا بولنا۔ عالم خیال کے سوا اور کہاں ممکن ہے تم نے لکھا ہے "بلٰلہ ذرا انجام پر بھی نظر ڈالئے"۔ آہ، شاہدہ تمہیں یقین نہ آئے تو کیا کروں۔ ورنہ حقیقت تو یہ ہے۔ کہ انجام پر نظر ڈالنے کی قوت تمہاری سحرکار آنکھوں نے پہلے ہی سلب کر لی۔ سب کچھ دیکھتا ہوں، سب کچھ سمجھتا ہوں، مشکلیں، دقتیں، خطرے، تباہیاں، سب کی سب اپنی مہیب ترین شکلوں میں نما ہوتی ہیں۔ مگر مجھ میں ان کے آگے سے بھاگ جانے کی طاقت نہیں پاؤں یاری نہیں دیتے۔ اسکے سوا اور کچھ بھی میرے اختیار میں نہیں کہ دل افگندیم بسم اللہ مجریہا و مرسٰہا کہہ کر آنکھیں بند کر لوں اور خاموشی کے ساتھ سرنوشت ازلی پر راضی ہو جاؤں۔

شاہدہ تم نے لکھا ہے کہ "میری سمجھ میں نہیں آتا آپ کیا چاہتے ہیں"۔ میں نے جو کچھ لکھا تھا۔ کیا واقعی تم نے اُسے ایک جنوں زدہ دماغ کا ہذیان سمجھا جسکا کوئی مطلب نہیں جسکا کوئی معنی نہیں۔ جسکا کوئی مفہوم نہیں۔ اچھا! کیا واقعی تم جاننا چاہتی ہیں۔ کہ میں کیا چاہتا ہوں؟ سمجھ میں نہیں آتا کہ کن الفاظ میں اپنے مافی الضمیر کا اظہار کروں۔ میری تمنا اسقدر مبہم ہے کہ واضح طور پر میں خود بھی اُسے نہیں سمجھ سکتا۔ پھر تمہیں کیونکر سمجھاؤں۔ بہرحال کوشش کرونگا کہ میری آرزو کا تمہیں کچھ اندازہ ہو جائے۔

شاہدہ تم جانتی ہو کہ دنیا میں عورتوں کے لئے مردوں کی اور مردوں کے لئے عورتوں کی کمی نہیں۔ اسلئے اگر میرا میلان فقط جنسی ہوتا تو تکمیل آرزو کی ہزار صورتیں ممکن تھیں۔ مگر میری تشنہ کام روح فقط محبت کی بھوکی ہے۔ محبت کی جستجو میں بھٹکتی پھرتی ہے۔ میرا خیال تھا اور اب بھی ہے کہ وہ محبت مجھے تم سے ملے گی۔ کیوں شاہدہ۔ کیا تم اپنی معصوم محبت مجھے دیدوگی؟ اسکی قیمت ادا کرنے کے لئے میرے پاس کچھ بھی نہیں۔ زمانہ کا ستایا ہُوا۔ ٹھکرایا ہُوا۔ آشفتہ، شکستہ۔ ایک نامراد دل ہے۔ مگر وہ تمہارے کس کام کا پھر میں کس منہ سے تم سے کہوں کہ شاہدہ! جان آرزو شاہدہ! اپنی محبت اپنی رنگین و روح پرور محبت مجھے دیدو۔ تمہیں یقین آئے یا نہ آئے۔ میرے دل کو تمہاری پرستاری میں ایک آسمانی مسرت، ایک فردوسی لذت حاصل ہوتی ہے جس سے میں کسی طرح دست کش نہیں ہو سکتا۔

بھولی شاہدہ۔ یہ تم نے کیا کہا کہ "براہ کرم کسی اور مشغلہ سے دل بہلا لیجیئے"۔ میں تمہارے مشورہ کا شکر گذار ہوں۔ مگر لکھتے وقت کاش تم نے اتنا سوچا ہوتا کہ محبت کرنے والے دل کیلئے مرکز تمنا صرف ایک ذات ہو سکتی ہے۔ محبت کوئی کھیل نہیں۔ کہ جس کھلونے سے جی چاہا کھیل لئے۔ ایک نہ سہی دوسرا سہی۔ نہ یہ کوئی بازار کا سودا ہے کہ ایک دوکان پر نہ پٹا تو دوسری دوکان سے خرید لیا۔ آہ۔ شاہدہ اگر یہ ممکن ہوتا تو پھر رونا ہی کیا تھا۔ کسی اور مشغلہ سے اگر جی بہلایا جا سکتا تو پھر خطروں میں پڑنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ شاہدہ تمہیں کسطرح سمجھاؤں کہ محبت بدلی نہیں جاتی جس سے ہو گئی ہو گئی۔ البتہ یہ انتہائی بدقسمتی ہے کہ محبت یکطرفہ ہو۔ اس میں محبت کرنے والے کیلئے اپنے آپ کو مٹانے کے سوا اور کچھ حاصل نہیں۔ مگر جب دل پر اختیار نہ رہے تو اپنے آپ کو اسطرح مٹانے کے سوا اور چارہ بھی کیا ہے؟

تمہاری پیاری تحریر پانے کے بعد میں نے یہ ارادہ کیا تھا۔ کہ اب کبھی اس کا جواب نہ لکھونگا تاکہ تمہارے مطمئن دل کو انتشار و اضطراب سے دوچار ہونا نہ پڑے۔ کرنے کو تو یہ عہد میں نے کر لیا۔ مگر اسکے بعد شاہدہ، تمہاری کافر ساز آنکھوں کی قسم! دل کو جیسی اذیت ہوئی بس کیا بتاؤں خصوصاً رات جس انتشار و اضطراب میں بسر ہوئی اسکی لذت بس کچھ میرا ہی دل جانتا ہے۔ بار بار تمہارے یہ الفاظ کہ "ایک ذرا سا گمان اباجان کے لئے میرے خون کو جائز کر دے گا...... میری تو روح تحلیل ہوئی جاتی ہے" مجسم ہو کر

میرے سامنے آجاتے تھے اور میں خوف سے لرزلرز جاتا تھا۔ نہیں شاہدہ۔ خدا کے لئے اس قسم کے ہولناک تصورات سے اپنی معصوم روح کو عذاب میں مبتلا نہ کرو۔ تمہیں اندازہ نہیں ہو سکتا کہ تمہاری اذیت کا خیال خود میرے لئے کسدرجہ سوہانِ روح ہو رہا ہے

ہاں تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ میں نے تمہیں خط نہ لکھنے کا عہد کیا تھا۔ مگر خدا سمجھے اس نامراد دل کو میں چوبیس ۲۴ گھنٹے سے زیادہ اس عہد پر قائم نہ رہ سکا۔ اور آج پھر یہ دو صفحے سیاہ کر ڈالے آج کل میرے دل و دماغ کی جو حالت ہے اسکے ہوتے ہوتے یہ سمجھنا بہت مشکل ہے۔ کہ کونسی بات لکھنے کے قابل ہے۔ اور کونسی نہیں جب لکھنا شروع کرتا ہوں تو بس لکھتا چلا جاتا ہوں اسلئے پیاری شاہدہ اگر کوئی بات بے محل میرے قلم سے نکل گئی ہو تو تمہیں اپنے معصوم دل کی نیکیوں کا واسطہ مجھے معاف کر دینا

خط بہت طویل ہو گیا۔ حالانکہ مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ جو کچھ میں کہنا چاہتا تھا وہ جوں کا توں ہنوز میرے دل میں ہے

اچھی شاہدہ اس خط کا جواب جلد دینا۔ جب تک تمہاری تحریر نہ آئے گی، میری روح تڑپتی رہیگی۔ فقط

تمہارا گرفتار"

دو دن تک کوئی جواب نہ آیا۔ میں نے پھر تقاضا کیا۔ بڑی منتوں کے ساتھ۔ بڑے اصرار کے ساتھ۔ مگر جواب ندارد آخر میں نے یہ شعر لکھ کر بھیجا:

میری ہر التجا کا خموشی جواب ہے
ہاں تیری آرزو کے بھی قابل نہیں ہوں میں

دوسرے دن شام کو ایک پرزہ ملا۔ اس میں لکھا تھا۔

"میری تو سمجھ میں نہیں آتا کہ میں آپ کو کیا جواب دوں بہتر ہوتا اگر آپ خود ہی لکھ دیتے میں نقل کر کے بھیجدیتی"

ان چند لفظوں سے میری تسلی نہ ہوئی۔ میں نے مکرر جواب کی خواہش کی۔ پیاپے تقاضوں کے بعد شاہدہ نے یہ خط لکھا۔

"آپ بار بار مجھ سے جواب طلب کرتے ہیں۔ خدا کی قسم میں بہت کوشش کرتی ہوں۔ کہ جواب دوں لیکن کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا لکھوں۔ میرے تمام جسم کی قوت سلب ہو رہی ہے دماغ بالکل بیکار ہو گیا ہے۔ کاش آپ میری پریشانیوں کا اندازہ کر کے مجھے قابل رحم سمجھتے۔ میں ایک بار پھر عرض کرتی ہوں۔ کہ للہ انجام پر غور کیجئے معاملہ نہایت پیچیدہ ہو رہا ہے۔ کئی بار دل چاہا کہ آپ کو کل حالات سے آگاہ کر کے اس خطرہ میں پڑنے سے باز رکھوں لیکن اپنی بیوقوفی پر خود ہنسی آئی کہ آفتاب کو سمجھانا سورج کو چراغ دکھانا ہے۔ موجودہ "واسطہ" بھی نہایت ہی خطرناک ہے۔ ملازمین بہت بدتمیز ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ یا تو آپ اُسے ہمیشہ اپنے پاس رکھیں گے اور اس کی ہر گستاخی کو خاموشی سے سہینگے۔ یا پھر راز فاش ہو گا۔ بہرکیف دونوں حالتیں تکلیف دہ ہیں۔ آپ ایک بار پھر غور کیجئے۔

ایک گذارش۔ وہ یہ کہ میرا یہ خط اور پہلا خط براہ کرم واپس کر دیجئے۔ تاکہ میں خود انہیں چاک کر کے مطمئن ہو جاؤں"

اس خط کا جواب نقل کرنے سے پیشتر ایک چھوٹا سا واقعہ بیان کر دینا ضروری ہے۔ عید قریب تھی۔ شاہدہ نے ایک ریشمی کپڑا زبیدہ کے پاس بھیجا اور یہ پیام کہ "سنا ہے تمہارے بھائی جان کا ٹیلر ماسٹر زنانہ کپڑے بہت اچھے سیتا ہے۔ اگر یہ صحیح ہے تو میرا قمیص اس سے سلوا دو۔ مگر دیکھنا کہیں کپڑے کا ستیاناس نہ کر دے۔ خراب سیا تو کپڑے کے دام تم سے رکھوا لوں گی"

میں نے شاہدہ کا قمیص خاص اہتمام سے سلوا کر بھجوا دیا۔ اس کے چند روز بعد میں نے یہ خط لکھا۔

"شاہدہ۔ میری پیاری، تمہاری امانتیں واپس بھیج رہا ہوں انسان بھی اپنے متعلق کیسا خوش گمان ہوتا ہے۔ میری حماقت دیکھو۔ میں نے خواہ مخواہ یہ فرض کر لیا تھا۔ کہ تم مجھ پر اعتماد کرو گی اپنی امانتوں کو میرے پاس محفوظ سمجھو گی، مگر جلد ہی اس خود فریبی کی حقیقت کھل گئی۔ شاہدہ تمہیں اندازہ نہیں ہو سکتا کہ تمہارے ان خطوں کے واپس مانگنے سے مجھے کسقدر صدمہ ہوا۔ اس میں شک نہیں کہ اپنی چیز کے واپس لینے کا حق انسان کو ہر وقت حاصل ہے۔ مگر سوال اعتماد کا ہے۔ کیا تم سمجھتی تھیں کہ چاک کر دو تو میں چاک نہ کر دیتا۔ اسکے علاوہ کیا تمہارا

یہ خیال ہے کہ میں ان کی حفاظت میں کسی قسم کی کوتاہی یا غفلت برتتا جسوقت میں نے تمہارا خط تمام کیا اور خاتمہ پر یہ الفاظ دیکھے کہ "میرے خط واپس کر دیجئے"۔ تو خدا کی قسم شاہدہ یہ معلوم ہؤا کہ جیسے کسی نے میرے سینہ میں ایک گھونسہ مارا بے اختیار میرا دل بھر آیا۔ اور کتنی ہی دیر تک میں سناٹے کی عالم میں بیٹھا رہا۔ آخر میں نے یہ کہکر اپنے دل کو سمجھایا کہ "دیوانے آخر تو نے یہ فرض ہی کیوں کر لیا کہ انہیں تجھ پر اعتماد ہونا چاہیئے"

---

۷ شاہدہ تم کسقدر شوخ ہو کسقدر شریر ہو صورت سے تو اسقدر بھولی بھالی معلوم ہوتی ہو۔ میں آپ کو کیا جواب دوں۔ بہتر ہوتا اگر آپ خود ہی لکھ دیتے، میں نقل کر کے بھیج دیتی" جسوقت میں نے یہ جملے پڑھے شوخی و شرارت کی ایک تصویر میری آنکھوں کے سامنے تھی۔ بس بے اختیار یہ جی چاہا کہ اسکے جواب میں گدگدا دوں۔ اور جن شریر ہونٹوں سے یہ الفاظ نکلے تھے۔ انہیں اپنے لبوں سے سزا دوں۔ مگر آہ یہ حسرت عالم خیال کے سوا اور کہاں پوری ہو سکتی ہے۔

شاہدہ تم نے انجام پر غور کرنے کی بار بار تاکید کی ہے کیا تم سمجھتی ہو کہ اب تک میں نے اسطرف کوئی توجہ نہیں کی۔ نہیں شاہدہ ایسا نہیں، میں نے ہر پہلو پر اچھی طرح غور کیا۔ نشیب و فراز کو خوب سوچا سمجھا۔ عواقب و نتائج پر بار بار نظر ڈالی۔ مگر کچھ حاصل نہ ہؤا۔ جانتا ہوں کہ میں شعلوں سے کھیل رہا ہوں۔ جو مجھے جلا ڈالینگے۔ نبات سمجھ کر زہر قاتل کی ڈلیاں چبا رہا ہوں۔ جو مجھے ہلاک کر دینگی۔ زہریلے ناگ کے خوبصورت رنگ پر فریفتہ ہو کر ایک نادان بچہ کی طرح اُسے ہاتھ میں اٹھا لیا ہے۔ اور منہ میں رکھ لینا چاہتا ہوں وہ مجھے ڈس لیگا۔ میں سب کچھ دیکھ رہا ہوں۔ سب کچھ سمجھ رہا ہوں مگر عقل کو جذبات نے کچھ اس بُری طرح مغلوب کر لیا ہے۔ کہ خطرات کا احساس ہی مٹ گیا ہے۔ یہانتک کہ میں یہ سوچنا بھی پسند نہیں کرتا کہ کیا ہوگا۔ آئندہ کے تصور سے میرے خواب رنگین میں برہمی پیدا ہوتی ہے۔ اسلئے مستقبل کی طرف ایک غلط انداز نظر ڈالنا بھی مجھے گوارا نہیں۔ آج میرے لئے زہر میں تریاق کی خاصیت ہے۔ آب حیات کی لذّت ہے۔ شعلہ و شرر کو میں پھول اور کلیاں سمجھتا ہوں۔ اور چاہتا ہوں کہ میرا دامن اُن سے بھرا رہے۔ تمہیں بتاؤ جب یہ کیفیت ہے تو میں کیا کروں عقل کا حکم ماننے کی قوت مجھ سے یکسر سلب کر لی گئی ہے اُس ساعت کو یاد کرتا ہوں جب پہلی بار تمہاری قاتل آنکھوں نے زہرآلود تیر و نشتر میرے دل و جگر میں پیوست کر دئے تھے۔ ہائے تمہیں خبر بھی نہ ہوئی اور میں کلیجہ تھام کر رہ گیا۔ شاہدہ اب وُہ زہر میرے رگ و پے میں سرایت کر گیا ہے۔ خون کے ہر قطرہ میں شامل ہو گیا ہے۔ اب اس سے بچنا کہاں ممکن ہے۔ ہر آنے والا دن میری قید کو سنگین تر کر دیتا ہے۔ ہر روز میری بے اختیاریوں میں اضافہ ہو رہا ہے۔ بتاؤ اب میں بھاگ کر کہاں جاؤں محبت کی نہ ٹوٹنے والی زنجیر جو تم نے مجھے پہنا دی ہے اس سے کسطرح آزاد ہو جاؤں۔

اس سلسلہ کو منقطع کرنے کی شاید ایک تدبیر تمہارے ذہن میں آئے اور اپنی ناتجربہ کاری کی بنا پر شاید تم اُسے ایک کامیاب علاج سمجھو۔ مگر حقیقت اُسکے بالکل برعکس ہے ممکن ہے تم یہ سوچو کہ "لاؤ ستانا شروع کر دوں اور اتنا ستاؤں اتنا آزار دوں۔ کہ ترک محبت پر مجبور ہو جائے"۔ مگر پیاری شاہدہ یقین رکھو۔ اس تدبیر میں تمہیں کبھی کامیابی نہ ہوگی۔ کامیابی ہو جاتی اگر میرا مطمع نظر صرف تمہاری "جنس" ہوتی۔ مصائب کے طوفان میں "ہوس" کے پاؤں اکھڑ جاتے ہیں مگر "محبت" کیلئے ہر اذیت ایک لذّت ہے۔ اسکی بنیاد پہاڑوں کی طرح استوار اور قطب کی طرح پائدار ہوتی ہے۔ بہرحال اگر تم اسکا تجربہ کرنا چاہو تو مجھے اسپر کوئی اعتراض نہیں۔ نتیجہ خود تمہارے سامنے آجائیگا مجھے پیشینگوئی کی ضرورت نہیں۔

شاہدہ کل سے مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ شاید میری بیتابیوں نے تم پر بھی کچھ اثر کیا ہے۔ میرے سینہ میں

بھڑکنے والی آگ نے غالباً تمہارے جامد دل کو بھی گرمایا ہے تمہارے خوابیدہ جذبات کو جگایا ہے۔ ممکن ہے یہ سب کچھ میرا واہمہ ہو۔ تخیل کی کارفرمائی ہو۔ جو کچھ بھی ہو، بہرحال اس رنگین خواب نے مجھے مدہوش کر رکھا ہے۔ دل کی کچھ عجب کیفیت ہے۔ میرے لکھنے کے بغیر شاید تم سمجھ سکو۔ شاہدہ تمہارے معصوم تصور کی قسم! مجھے اس خیال سے بے انتہا اذیت ہے کہ میں تمہارے لئے انتشار و اضطراب کا سبب ہو رہا ہوں تمہاری مضطرب تصویر میری آنکھوں کے سامنے ہے اور میں شرم و ندامت کے مارے تم سے آنکھ نہیں ملا سکتا۔

شاہدہ۔ کچھ تمہیں معلوم ہے کہ وہ پیراہن جو تم نے عید کے دن زیب بدن کیا تھا۔ تم تک پہونچنے سے قبل کہاں کہاں رہا تھا۔ شاہدہ۔ میرے لبوں نے، میری آنکھوں نے، میرے ہاتھوں نے اُسے چھوا تھا۔ اسکے لمس حریری نے میرے جسم میں ایک سنسنی سی پیدا کر دی تھی۔ میری روح نے ایک کیفیت اہتزاز محسوس کی تھی۔ میں نے اُسے ہاتھوں میں لے کر اپنے ہونٹ اُس پر رکھ دئے اور ایک لمحہ کیلئے مجھے ایسا محسوس ہونے لگا جیسے تمہاری عریاں باہیں اور گردن میرے لبوں سے مس ہو رہی ہیں۔ اس تصور سے ایک بجلی سی میرے تمام بدن میں دوڑ گئی۔ سینہ میں جذبات کا ایک طوفان برپا ہو گیا۔ کاش الفاظ میں اس کیفیت کے اظہار کی قدرت ہوتی اور میں بیان کر سکتا تو مجھے یقین ہے کہ خود تم بھی ایک لمحہ کے لئے بیخود ہو جاتیں۔ میں نے اپنے دل میں کہا کہ اگر میری آنکھیں اور میرے لب اس پیکر شباب و مستی تو نہیں چھو سکتے۔ تو کم سے کم اس پیرہن سے تو مس ہو سکتے ہیں۔ جو اُسے اپنے آغوش میں لے کر آزادی کے ساتھ جس حصہ کو چاہے گا چھوئے گا۔ چومے گا۔ مس کریگا۔ تو گویا ایک واسطہ سے میرے لبوں کی تمنا پوری ہو جائے گی۔ اسلئے میں نے اُسے چوما۔ اور بار بار چوما۔ بار بار آنکھوں سے لگایا۔ اور کتنی دیر اُس پر منہ رکھے رہا۔ شاہدہ سچ کہنا۔ اُسے پہنتے وقت کوئی نئی کیفیت تو تم نے محسوس نہیں کی تھی؟ یا اس تحریر کے پڑھنے کے بعد کوئی خاص احساس تو پیدا نہیں ہوا۔

شاہدہ، جانِ آرزو شاہدہ، میرے دنیائے تخیل کو یکسر رنگ و بو میں تبدیل کر دینے والی شاہدہ۔ خدا کی قسم رات سے دل بہت ہی بےچین ہے کیا کہوں، کیسی الجھن ہے کسی کام میں جی نہیں لگتا۔ اب جب تک تمہارا خط نہ آئیگا۔ روح بیکل ہی رہے گی۔ فقط

تمہارا ......"

دیہاں کیا لکھوں شاہدہ؟ جو تم کہو گی آئیندہ یہی لکھوں گا،

اس طرح میری اور شاہدہ کی خط و کتابت جاری ہو گئی۔ مگر آہ اس کا حسرت ناک انجام! اس کے تصور ہی سے کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ زندگی ہے تو وہ اندوہ ناک داستان کسی دوسری صحبت میں سنا دوں گا۔ فقط

عشق کہتے ہیں جسے ہے یہی شاید حالیؔ | خود بخود دل میں ہے اک شخص سمایا جاتا
شاید اسی کا نام محبت ہے شیفتہؔ | اک آگ سی ہے سینے کے اندر لگی ہوئی

وہ آتے ہیں تو دل میں اک خلش سی ہونے لگتی ہے
میں ڈرتا ہوں کہیں اس کو محبت تو نہیں کہتے

جناب ماہر القادری

دُنیا کا بہترین بُت تراش تمدّن

تاریخی تقابل ← فنی مباحث

دنیا کے قریب قریب تمام تمدّنوں میں فنونِ لطیفہ (Fine Arts) کی آمیزش پائی جاتی ہے۔ شعر، تصویر اور موسیقی دنیا کی ہر بزم تمدّن میں کارفرما نظر آتے ہیں یہاں اس چیز سے بحث کرنے کا محل نہیں ہے کہ اقوام کے اخلاق اور فطری جذبات کو ان چیزوں نے کس حد تک متاثر کیا۔ اور قوموں کے عروج و زوال میں ان فنون نے کہاں تک حصہ لیا ہے۔ شعر، تصویر اور موسیقی میں زیادہ تر توجہ سنگتراشی کیطرف کی گئی ہے۔ اور وہ اس لئے کہ بہت زمانہ تک قوموں نے خدا کی بجائے خود تراشیدہ بتوں کی پُوجا کی ہے۔ اور اس قدیم عقیدت کے نقوش آج بھی دُنیا میں پائے جاتے ہیں۔

یہ اس زمانے کی باتیں ہیں جبکہ انسان کی نظر پیکرِ محسوس کی خوگر تھی۔ اور ان دیکھے خدا کے ماننے کے لئے گمراہ اور پست ذہنیتیں تیار نہ تھیں۔ اسی ذہنیت اور جامد عقیدت کا سبب تھا۔ کہ دُنیا کے تمام قدیم تمدنوں میں بُت تراشی، جزوِ لاینفک کی حیثیت سے داخل ہوگئی، قوموں نے ہزاروں خدا اپنے ہاتھ سے بنا ڈالے، اور کروڑوں پیشانیوں کی لکیریں ان ہی خود ساختہ خداؤں کی آستانوں میں جذب ہوکر رہ گئیں۔

تمدنِ اقوام کی تاریخ کتنی افسوسناک ہے ——!

دُنیا کے مشہور تمدّن

عربوں میں بت پرستی کی عام وبا پھیل گئی تھی، اور ہر ایک گھر صنم کدہ بن گیا تھا۔ انتہا یہ ہے۔ کہ توحید کے علمبردار حضرت ابراہیم خلیل کے بنائے ہوئے کعبہ میں بھی سینکڑوں بُت رکھ دیئے گئے تھے۔ اور بڑے بڑے لوگوں میں عرب کے بہادر لاتؔ و عزیٰؔ کی جے پکارتے تھے۔ اسوقت جبکہ عربوں کے تمدّن پر بتوں کی خدائی ہو رہی تھی، عربوں نے سنگتراشی کے فن میں کوئی خاص کمال حاصل نہیں کیا۔ ان کے تراشے ہوئے بت نہایت ہی معمولی درجہ کے تھے۔ بہت سے بت لکڑی کے بنے ہوئے تھے۔ کچھ پتھر کے تھے لیکن وہ سب کے سب فن سنگتراشی کے نقطۂ نگاہ سے کسی اعتبار سے بھی جاذبِ نظر نہ تھے۔ عربوں کی جنگجویانہ سپرٹ اپنے خداؤں کو کبھی حسین صورت میں پیش نہ کر سکی۔ لاتؔ، عزیٰؔ اور مناتؔ جیسے زبردست اصنام نہایت معمولی تھے۔ اگر آج وہ یورپ کے کسی عجائب خانہ میں موجود ہوتے۔ تو لوگ ان کو دیکھ کر ہنستے۔

بابل کا تمدّن اپنی عظمت کے اعتبار سے ایک خاص درجہ رکھتا ہے میں نے اس دور کے بہت سے بتوں کو بغداد کے متحف (میوزیم) میں دیکھا ہے بعض بُت ثابت پتھر کے ترشے ہوئے ہیں۔ جو دیکھنے میں عظیم الجثہ ہیں لیکن ان میں غیر معمولی جاذبیت نہیں پائی جاتی، بابل کے بادشاہوں نے خدائی کا دعویٰ کیا تھا۔ اور ہر بادشاہ کے بت کی پُوجا کی جاتی تھی۔ انہی بادشاہوں کے بُت بابل کی سنگتراشی کا سب سے کامل نمونہ ہیں، ایک کاہن اور جوتشی کا بت البتہ بہت زیادہ جاذبِ نظر ہے۔ اس کاہن کی ران پر زائچہ رکھا ہوا ہے۔ جسے وہ بہت غور سے دیکھ رہا ہے۔ غور و فکر کرنے میں جو ماتھے کی سلوٹوں میں ایک خاص ترتیب اور نگاہوں میں خاص جھکاؤ

پیدا ہوجاتا ہے۔ وہ جابکدست سنگتراش نے اس بُت میں پیدا کرنے کی کوشش کی ہے اسمیں شک نہیں کہ بابل کی سنگتراشی قدیم عرب کی سنگتراشی کے مقابلہ میں بہت ترقی یافتہ تھی۔ اور پتھر تراشنے اور اس کے نقوش کو متناسب بنانے کا ان کو خاص سلیقہ تھا۔

بغداد شریف سے تقریباً ساٹھ میل کے فاصلے پر بابل کے کھنڈر ہیں۔ یہ وہی بابل ہے جس کی تعریف میں یونان کے مشہور مورخ ہیروڈوٹس نے صفحے کے صفحے لکھ ڈالے ہیں۔ انقلاب کے بے نیاز ہاتھوں نے بابل کے سر بفلک ایوانوں اور جنت نشان معلق باغیچوں کو خاک کے ڈھیروں میں تبدیل کر دیا۔ پرانی عمارتوں کے البتہ چند آثار باقی رہ گئے ہیں۔ بابل کے معبد کی دیواریں اب بھی باقی ہیں جن پر بعض ایسے جانوروں کی تصویریں کھنچی ہوئی ہیں جو اس وقت دُنیا میں نہیں پائے جاتے۔ یہ تصویریں رنگین ہیں۔ اور دیواروں پر نمایاں طور پر ابھری ہوئی ہیں۔ ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ بابل کے مصور اور سنگتراش تصاویر میں رنگ بھرنا بھی جانتے تھے۔

مصر کا تمدن بھی اپنی قدامت کے لحاظ سے ایک خاص عظمت کا مالک ہے۔ مصر قدیم کے مجسموں کو دیکھ کر اس امر کا اندازہ ہوتا ہے۔ کہ مصر کا تمدن سنگتراشی کی نزاکتوں سے زیادہ واقف نہ تھا۔ اس عہد کے سنگتراش بتوں اور تصویروں کے بہت زیادہ طویل و عریض بنانے کو کمال سمجھتے تھے۔ ابو الہول میرے اس دعوے کی ناقابل تردید ثبوت ہے۔

یونان اور روما نے بھی بُت تراشی میں اپنا کمال دکھایا ہے۔ یونان اور روم میں دیویوں کو خدا سمجھا جاتا تھا۔ انہی دیویوں کو بتوں کی شکل میں تراش لیا گیا تھا۔ اور یونان جیسا فلسفی تمدن بھی انہی پتھر کے ٹکڑوں کے سامنے سر نیاز خم کرتا تھا۔ کوئی شک نہیں کہ یونان کی سنگتراشی بہت زیادہ ترقی یافتہ تھی لیکن بھارت ورش کی سنگتراشی سے یونان و بابل کی سنگتراشی کسی طرح . . . . مقابلہ نہیں کر سکتی۔

بھارت ورش کا فن سنگتراشی

بات یہ ہے۔ کہ بھارت ورش کے قدیم تمدن نے امن و عافیت کی آغوش میں پرورش پائی۔ اور فنون لطیفہ کی ترقی کے لئے سب سے زیادہ ضرورت امن و عافیت کی ہوتی ہے۔ بھارت ورش کے تبکدوں کی تعداد دنیا کے تمام صنم کدوں کی تعداد سے زیادہ تھی۔ اور نہ صرف تعداد زیادہ تھی۔ بلکہ سنگتراشی کے "معجزے" صرف بھارت ورش ہی میں نظر آتے تھے ہندوستان کے بادشاہوں نے اس فن کو بہت زیادہ ترقی دی۔ ایک طرف بادشاہوں کی دولت تھی۔ اور دوسری طرف سنگتراشوں کی بےپناہ عقیدت۔ ان دونوں قوتوں نے ان گھڑ پتھروں کو سنگتراشی کے معجزوں کی صورت میں تبدیل کر دیا۔

بھارت ورش کا علم الاصنام ایک مستقل فن کی حیثیت رکھتا ہے۔ ایک ایک واقعہ کو مفصل طریقہ پر مصور کیا گیا ہے۔ اخلاقی اور تاریخی اعتبار سے ان چیزوں کی حیثیت خواہ کچھ ہی ہو لیکن یہ تصویریں اور مجسمے دلچسپ ضرور ہیں۔ علامہ اقبال مرحوم نے کہا تھا :-

سچ کہہ دوں اے برہمن گر تو برا نہ مانے
تیرے صنم کدہ کے بُت ہو گئے پرانے

لیکن انہی "پرانے بتوں" میں ہندوؤں کا قدیم تمدن نظر آتا ہے اور برہمنوں کی پیشانیوں کے قشقوں اور بتوں کی گردنوں کی مالاؤں سے حقیقت شناس نظریں، عبرت و موعظت کے بہت سے خاکے مرتب کرتی ہیں۔

صوبہ متحدہ کے قدیم بت خانوں میں زیادہ تر کرشن مہاراج کی تصویریں اور مجسمے نظر آتے ہیں۔ رنگین تصویریں بہت زیادہ جاذب نظر ہیں۔ جن میں دکھایا گیا ہے۔ کہ حسین و چنچل گوپیاں جمنا جی میں اشنان کر رہی ہیں۔ انکے لانبے اور گھنے بالوں سے پانی کی بوندیں ٹپک رہی ہیں۔ ان کے شفاف اور ابھرے ہوئے سینوں پر پانی کے قطرے جھلک رہے ہیں بعض گوپیاں جو زیادہ چنچل اور بے باک ہیں۔ آزادی کے ساتھ نہا رہی ہیں اور اپنے

جسم کی عریانی کی زیادہ پروا نہیں کرتیں اور بعض گوپیاں جو زیادہ شوخ نہیں ہیں اپنے سینوں اور رانوں کو چھپانے کی کوشش کر رہی ہیں۔ کرشن مہاراج جمنا جی کے کنارے "درخت پر چڑھے ہوئے ہیں"۔ ان گوپیوں کے کپڑے کرشن جی اٹھائے گئے ہیں۔ اور خوب مسکرا رہے ہیں۔ صوبہ متھرہ کے معبدوں میں زیادہ تر رنگین تصویریں پائی جاتی ہیں۔ بندیل کھنڈ کے بعض مندروں میں قدیم زمانے کے نادر مجسمے نظر آتے ہیں۔

دکن میں آکر سنگتراشی کا فن حیرت انگیز شکل اختیار کر لیتا ہے ایلورا اور اجنتا کے غار انسانی کمال کا حیرت ناک نمونہ ہیں۔ پہاڑوں کو اس طریقہ پر تراشا ہے۔ کہ دیکھنے والی نگاہ غرقِ حیرت ہو جاتی ہے۔ لاکھوں من کی چٹانوں کو موم کی طرح تراش کر رکھ دیا ہے۔ پہاڑوں کو تراش کر مکان بنائے ہیں جن میں دروازے ہیں ستونوں میں محرابیں اور کمانیں ہیں۔ جگہ جگہ مہاتما بدھ کے مجسمے نصب ہیں۔ مہاتما بدھ آنکھیں بند کئے ہوئے گہری سوچ میں ہیں۔ ایلورا کے غاروں میں جین مذہب کے بت بھی اپنی پوری شان و شوکت کے ساتھ نگاہوں کو دعوت نظارہ دے رہے ہیں۔ اجنتا کے ایک غار کی دیوار پر ایک رنگین تصویر میں دکھایا گیا ہے کہ مہاتما بدھ فقیر ہونے کے بعد اپنی راجدھانی میں آئے ہیں۔ ان کے ہاتھ میں بھیک مانگنے کا پیالہ ہے کپڑے بوسیدہ اور بال بڑھے ہوئے ہیں۔ ان کے گھر والے قصرِ شاہی کی چھتوں سے اس منظر کو حسرت و افسوس کی نظر سے دیکھ رہے ہیں۔ یہ منظر واقعی قابل دید اور مصور کے فن کا زندہ ثبوت ہے۔

جنسی مجسمے

دکن کے بہت سے مندروں میں عورت اور مرد کے جنسی اختلاط کو مجسموں کی صورت میں پیش کیا گیا ہے۔ ورنگل کے مندر جو کئی ہزار سال قبل کے تعمیر شدہ ہیں۔ اس قسم کے مجسموں سے پٹے پڑے ہیں۔ فنی اعتبار سے یہ مجسمے سنگتراشی اور منبت کاری کا شاہکار ہیں۔ ان مجسموں کی تشریح غالباً ناظرینِ ادب لطیف کے وجدان اور غیرت کو ناگوار ہو گی۔ اس لئے ان کا ذکر نہیں کرتے!

بہرحال فنی حیثیت سے یہ مجسمے اپنی آپ نظیر ہیں۔ اور ان کو دیکھ کر ہندوؤں کی قدیم سنگتراشی کا لوہا ماننا پڑتا ہے۔ میرا خیال ہے۔ کہ جنسی اختلاط کی تصویر کشی میں یورپ بھارت ورش سے ابھی آگے نہیں بڑھا۔

کیا تاریخ اپنے کو دُہرا رہی ہے؟

حقیقت یہ ہے کہ بھونیشور۔ سانچی۔ ایلورا۔ اجنتا۔ بدامی۔ کھجوراہا اور کنبہ کنم کے معبدوں میں سنگتراشی کے حیرت انگیز نمونے نظر آتے ہیں۔ اور اودے گیری۔ بربت اور مہابلی پور کی عمارتیں منبت کاریوں کے شاہکاروں سے بھری پڑی ہیں۔ ان عمارتوں کے دیکھنے سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے۔ کہ بھارت ورش کے قدیم دور میں سنگتراشی ایک مقدس فن کی حیثیت رکھتی تھی۔ اور لاکھوں آدمی اس کام کے لئے وقف تھے۔ بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے۔ کہ بھارت ورش کے "پراچین سپرٹ" دنیا کے سب سے اچھے ...... بت تراش تھے......!

جناب پروفیسر فراق گورکھپوری ایم اے۔

غزل

تم تو چپ رہنے کو بھی رنجشِ بے جا سمجھے
درد کو درد نہ سمجھے تو کوئی کیا سمجھے

جب تری یاد نہ تھی، جب ترا احساس نہ تھا
ہم تو اس کو بھی محبت کا زمانا سمجھے

آہ یہ بزمِ طرب۔ لیکن انہیں کیا کہئیے
بادہ و نغمہ کو جو انجمن آرا سمجھے

تیرے وارفتۂ وحشت کی ہے دنیا ہی کچھ اور
وہ گلستاں نہ وہ زنداں نہ وہ صحرا سمجھے

یاس و امید کسی کا بھی سہارا نہ رہا
اب تو جو سمجھے۔ عنایت تری جیسا سمجھے

وہ کسی شکل سے اپنا نہ ہوا۔ دل اس کو
خونِ حسرت کہے یا خونِ تمنّا سمجھے

زندگی یوں کہیں برباد ہوا کرتی ہے!!
وہ ترا غم تھا جسے ہم غمِ دنیا سمجھے

کہہ گئی کیا نگہِ ناز تری۔ ہم جس کو
بات کی بات۔ فسانے کا فسانا سمجھے

عشق کے سوزِ نہاں کی وہ جھلک تھی لیکن
زندگی موت، قیامت اسے کیا کیا، سمجھے

یوں تو لوگوں نے کیا عشق کو رسوا۔ لیکن
نہ بُرا سمجھے ہم ایسوں کو نہ اچھا، سمجھے

آج انہیں ایک زمانہ نظر آتا ہے خراب
تیرے دیدار کو جو لوگ تماشا، سمجھے

بے نیازی کو بہت سہل سمجھ رکھا تھا!
عشق لے آج ترا حسنِ خود آرا، سمجھے

بے بجھی پیاس تھی یا شعلۂ مے کی تھی لپک
جس کو اک جلوہ سرِ ساغرِ مینا، سمجھے

ایسے دیوانے کا دُنیا میں ٹھکانا ہے کہیں!
لوگ اپنا جسے سمجھے نہ تمہارا، سمجھے

نگہِ لطف و کرم نے نہ کہیں کا رکھا!
جس کا یہ حال ہوا وہ تجھے کیسا، سمجھے

عشق کے وہم و گماں ہو دل کی کشاکش مت پوچھ
تجھ کو بیگانہ ہی سمجھے نہ ہم اپنا، سمجھے

آہ اُن مست نگاہوں کے اشارے بھی فراقؔ
ہم سمجھنے کو بہت سمجھے، مگر کیا سمجھے!

جناب ڈاکٹر اعظم کریوی:-

خودداری

اس کا نام ہیرا تھا۔ حسن کے بازار میں اس کے چڑھتے دن تھے۔ ناچ اور گانے کے ساتھ ہی اس کی ماں نے ہیرا کو اُردو، ہندی اور کچھ انگریزی کی بھی تعلیم دلائی تھی۔ جوانی میں اس کی ماں نے لاکھوں روپے کمائے تھے، مگر اب ضعیفی میں نائکہ کے عہدہ پر فائز تھی۔

ہیرا کی شاندار حویلی وسطِ شہر میں تھی وہ جس رنگ کی پوشاک پہنتی اسی رنگ کے جواہرات سے اپنا جسم بھی سجاتی۔ اور اسی رنگ میں رنگی ہوئی موٹر میں بھی سیر کرنے نکلتی۔ نوکروں اور ڈرائیوروں کی وردی بھی اسی رنگ کی ہوتی... جب وہ شام کے وقت بن ٹھن کر سیر کو نکلتی تو اس کے شیدائی اپنی آنکھیں سڑکوں پر بچھا دیتے۔ متوسط طبقہ والوں کا کیا ذکر، بڑے بڑے رؤسا بھی ہیرا کے یہاں جانے میں ہچکچاتے تھے۔

چنانچہ ہیرا ایک طوائف تھی عصمت فروش تھی، مگر کتنی مہنگی کتنی گراں فروش، اس پر بھی وہ سب کی آنکھوں میں بسی ہوئی تھی ہیرا سولہویں سال میں تھی۔ رنگ موتی کی طرح صاف اور گالوں کی سرخی گویا چھونے سے خون ٹپک پڑے گا۔ نہایت نستعلیق اور قبول صورت تھی۔ اس کی آنکھوں سے زہر اور امرت کی بارش ہوتی رہتی۔ جو ایک بار دیکھتا مر جاتا اور پھر پل بھر میں جی جاتا۔ لوگوں کا ہیرا کے متعلق ایسا ہی خیال تھا۔

جب رات کو وہ اپنے سجے سجائے کمرہ میں بجلی کی روشنی میں ایرانی قالین پر سادگی کی موہنی مورت بنی ہوئی گانے کے لئے بیٹھتی اور ہنس کی طرح اپنی گردن کو موڑ کر کوئل کی طرح کوکتی، تو موسیقی کا دریا ابل پڑتا سنگت کی لہریں جوش میں آجاتیں۔ وہ پہلے خود موسیقی کے سمندر میں تیرتی اور پھر سننے والوں کو بھی تیراتی۔ خود تو صاف نکل آتی، مگر سننے والوں کو ڈبو دیتی۔ اور پھر ساحل پر کھڑے ہو کر ان کے ڈوبنے کا تماشا دیکھتی۔

اسی مست شباب حسینہ کے متعلق اقبال اور ارشد میں بحثیں ہوا کرتیں۔ دونوں دوست شہر کے رؤسا میں سے تھے۔ ان کی علمیت اور خاندانی شرافت میں بھی کوئی کلام نہ تھا۔ مگر ہیرا کے متعلق دونوں کے خیالات میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ ارشد بازار کے پتے چاٹنے کے شوقین تھے۔ مگر اقبال کو ان باتوں سے نفرت تھی۔ دونوں ہم عمر تھے۔ اب تک شادی نہیں ہوئی تھی۔ اقبال کبھی کبھی ارشد کو سمجھاتا کہ حسن کے بازار میں جانا کچھ اچھی بات نہیں۔ یہ شریفوں کا شیوہ نہیں وہاں جانے سے شرافت کی توہین ہوتی ہے۔ اس کے جواب میں ارشد کہتا۔ کہ یہ سب کہنے کی باتیں ہیں۔ ہیرا کو دیکھ کر انسان اپنے ہوش میں نہیں رہتا۔ کبھی سابقہ پڑے گا، تو قدر "عافیت معلوم ہو جائے گی،

اقبال ہنس کر کہتا کہ یہ تمہارا غلط خیال ہے۔ میں تمہاری طرح جذباتی انسان نہیں ہوں۔ میں کہیں بھی جاؤں میری خودداری میرا ساتھ نہیں چھوڑتی۔ طوائفوں کے سامنے جو مرد اپنی خودداری کا خیال نہیں کرتے انہیں مرد ہی کہنا مردانگی کی توہین ہے"۔

ایک دن باتوں ہی باتوں میں ارشد نے کہا۔ اقبال تمہارا خیال ہے۔ کہ مجھ میں خودداری نہیں"

"بیشک"

"تو گویا اس لحاظ سے بقول تمہارے مجھے مرد بھی کہنا مردانگی کی توہین ہے"

"اس میں بھی کوئی شک نہیں"

"جناب میں تو اس کا اسی وقت قائل ہوں گا۔ جب ہیرا سے تم ملاقات کرو اس کو دیکھو۔ اور پھر اپنی خودداری اور مردانگی کا ثبوت دو۔"

مجبوراً اقبال ہیرا کے یہاں جانے کیلئے تیار ہو گیا۔ اس نے کہا۔

"ارشد! میں تمہاری خاطر ہیرا سے ملوں گا۔ ابھی تو کچھ نہیں کہتا۔ مگر اس کا فیصلہ مستقبل کرے گا۔ کہ کیچڑ میں رہ کر بھی کنول اپنی لطافت نہیں کھوتا۔ بلکہ کنول کی صحبت سے اکثر کیچڑ میں بھی پاکیزگی کا اثر ہو جاتا ہے وہ مرد مرد ہی نہیں جو خوددار نہیں۔"

(۲)

اپنے آراستہ پیراستہ کمرہ میں ہیرا سازندوں کے ساتھ بیٹھی تھی، وہ گانا گانے کی تیاری کر رہی تھی۔ کہ ارشد کے ہمراہی میں اقبال ہیرا کے بالاخانہ پر آیا۔ ہیرا سرو قد کھڑی ہو گئی۔ اقبال نے ایک بار ہیرا کی طرف دیکھا۔ اور سوچا: "آہ! ناگن کا یہ حسن!"

موسیقی کی لہریں اٹھیں اور گریں۔ جیون آیا اور گیا۔ ارشد کی حالت غیر ہونے لگی۔ وہ لوٹن کبوتر کی طرح تڑپنے لگے۔ اور جیب سے نوٹ نکال نکال کر پھینکنے لگے۔ لیکن اقبال چھت کی طرف دیکھ رہے تھے۔ معلوم ہوتا تھا۔ کہ ان پر کچھ اثر ہی نہیں ہوا۔ ان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کا نشان بھی نہ تھا۔

گناہ کی بیٹی نے دونوں مردوں کی حالت کا موازنہ کیا۔ اس نے اقبال کی طرف غور سے دیکھا۔ اس کی غیر معمولی شخصیت سے کچھ متاثر ہوئی اس کے بالاخانے پر آ کر مرد کی خودداری جواب دے دیتی تھی مگر اقبال تو اسے عجیب و غریب مرد معلوم ہوا۔ وہ اقبال کے لب پر مسکراہٹ دیکھنے کے لئے اور بھی محنت اور کوشش سے گانے لگی، در و دیوار وجد میں آ گئے مگر اقبال پتھر کی طرح خاموش و ساکت رہا۔ ہیرا کی پیشانی پر پسینہ آ گیا وہ تھک کر ہانپنے لگی۔ اس نے آخر کار شرما کر گانا بند کر دیا۔ زندگی میں اس نے پہلی مرتبہ ہی اقبال سا عجیب و غریب مرد دیکھا۔ جو ہیرا کو دیکھ کر مرا نہیں۔ اور اس کا گانا سن کر جیا نہیں۔ وہ اپنے بدن کو چرائے ہوئے ایک ادا کے ساتھ چاندی کی طشتری میں پان لے کر اقبال کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ اقبال نے ایک پان اٹھا لیا۔ اور سو روپے کا ایک نوٹ طشتری میں پھینک دیا۔

ایک لمحہ کے لئے ہیرا سناٹے میں آ گئی۔ اس نے ایک ہی پل میں اقبال کو۔ ارشد کو۔ نائکہ اور طشتری کو دیکھا۔ اور پھر ادب سے سر جھکا کر آگے بڑھ گئی۔

اقبال اٹھ کھڑے ہوئے۔ اور ارشد کو بھی مجبوراً اٹھنا پڑا۔ اس دن پھر ہیرا اور کچھ نہ گا سکی۔

(۳)

دو ہفتے گزر گئے۔ ہیرا کو روز گانا ہی پڑتا تھا لیکن اس کی خوش دلی اور شوخی ختم ہو چکی تھی۔ اس کا جی اداس رہنے لگا تھا۔ گویا اس کے دل پر کوئی چوٹ لگی تھی۔ اب اس کی آنکھوں میں اقبال کی صورت بس گئی تھی۔ اس پر ہیرا کو بہت غصہ آتا تھا۔ الجھن ہوتی تھی۔ پھر بھی اس کے دل سے اقبال کا خیال نہ جاتا تھا۔ وہ سوچتی تھی: "وہ کیسا آدمی تھا، گونگا اور بہرا۔ بالکل اندھا۔ جاہل گنوار! لیکن —— لیکن وہ نوٹ نوٹ نہ تھا۔ ردی کاغذ کا ٹکڑا تھا۔ تب کیا اقبال کو میں سمجھ نہیں سکی —— کیا اقبال میرے حسن کو ٹھکرا گیا۔ وہ ایک بار بھی نہ ہنسا۔ نہ ہلا۔ نہ بولا۔ وہ مرد نہ تھا۔ پتھر تھا۔ کیا وہ اب میرے یہاں کبھی نہ آئے گا۔ اس کی نگاہوں میں ہیرا کوئی وقعت نہیں۔ بس یہی اصلی بات ہے۔ میرے حسن اور موسیقی نے اس پر کچھ اثر نہ کیا لیکن وہ پھر سو روپے کا نوٹ کیوں پھینک گیا۔ سمجھ گئی! اس نے میری اور میرے حسن کی ہتک کی۔ مجھ سے غلطی ہوئی میں نے اس کا نوٹ کیوں لیا۔ جب میں پسند ہی نہیں تھی۔ جو مجھ پر، میرے حسن پر، میری آواز پر فریفتہ ہی نہیں ہوا۔ اس کا روپیہ میں نے کیوں

لیا، ہائے وہ جیتا اور میں ہار گئی"۔

ہیرا غصّے سے ہونٹ چبا کر اٹھی اور قدِ آدم آئینہ کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ ایک بار اس نے اپنی اٹھتی جوانی کے سایہ کو دیکھا، اور پھر روتی ہوئی کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس نے مصمم ارادہ کر لیا۔ کہ وہ اپنی ہتک کا اس مرد سے ضرور انتقام لے گی۔

(۴)

ارشد ایک دن ہیرا کے پاس پہنچے۔ اور اس کے قریب ہی بیٹھ گئے۔ ہیرا کو اداس دیکھ کر انہوں نے پوچھا "یہ کیا؟ کیا آج بادل برسنے والے ہیں؟"

ہیرا نے سر اٹھا کر ارشد کی طرف دیکھا۔ سنبھل کر بیٹھی اور بولی کیا آپ کھیت بو کر آئے ہیں جو برسنے کے منتظر ہیں"؟

ارشد ٹھنڈے پڑ گئے۔ انہوں نے کہا "خدا خیر کرے آج تو بہت ناراض معلوم ہوتی ہو۔ کیا مجھ سے خفا ہو گئی ہو؟"

"واہ کیا خوب! برستے برستے اب آپ کو ناراضگی کی بھی آنچ لگ گئی"!

اپنی خفت مٹانے کے لئے ارشد زور سے ہنس پڑے، مرد کی بیچارگی کی کیسی حسرتناک تصویر تھی۔

ارشد نے ہیرا سے بالکل مل کر بیٹھنا چاہا، ہیرا نے دُور کھسکتے ہوئے کہا "ہاں صاحب! آپ کے ان دوست کا کیا حال ہے؟ پھر کبھی یہاں تشریف نہیں لائے۔ شاید میرا گانا ان کو پسند نہیں آیا۔ آجکل کے لوگ ہنر کی قدر کیا جانیں۔ فن سے واقف ہی نہیں ہوتے۔ سمجھتے بھی کم ہیں" آخری جملہ کہتے کہتے ہیرا کی آنکھوں کے سامنے سو روپے کا نوٹ آ گیا۔ وہ دل ہی دل میں شرمندہ ہو گئی۔

ارشد کا اس طرف دھیان نہ تھا۔ وہ بولے "اس دن کے بعد انہوں نے تمہارا کچھ ذکر ہی نہیں کیا۔ عجیب بد مذاق انسان ہے۔ مگر تمہارا یہ خیال غلط ہے۔ کہ وہ موسیقی سے واقف نہیں۔ وہ خود بہت اچھا گا لیتے ہیں۔ ستار اور دلربا میں تو وہ شہر کے رؤسا میں اپنا جواب نہیں رکھتے۔ وہ اس فن کے استاد ہیں۔ آج میں ان کو تمہارے یہاں ضرور لاؤں گا"۔

ہیرا تڑپ گئی "آہ! اس دن کے بعد پھر میرا کوئی ذکر ہی نہیں ہوا مجھ پر میرے اس رُوپ اور حُسن پر لعنت ہے"۔ ہیرا اپنے طوفانی جذبات پر قابو نہ رکھ سکی۔ اس نے نفرت انگیز لہجہ میں کہا "کوئی میرے یہاں آئے یا نہ آئے۔ میں کسی کو بلانے تو نہیں جاتی۔ جس کو غرض ہو گی، وہ یہاں ناک رگڑتا آئے گا"۔

ارشد یہ کہتے ہوئے کہ "میں آج اقبال کو یہاں ضرور لاؤں گا" وہاں سے چلتے ہوئے۔

(۵)

ہیرا نے مصمم ارادہ کر لیا۔ کہ آج وہ اس مغرور مرد کو ضرور ذلیل کرے گی شام ہوتے ہی ہیرا کو اپنے سنگار کی فکر پڑ گئی۔ وہ کونسی پوشاک پہنے، وہ کچھ فیصلہ نہ کر سکی۔ اس نے کئی پوشاکیں تبدیل کیں کئی ڈھنگ سے بالوں کا جوڑا باندھا اور کھولا۔ کئی مرتبہ منہ دھویا۔ کئی طرح کے عطر لگائے لیکن کس رُوپ میں کس رنگ اور کس ساز میں آج وہ اپنے حسن کی نمائش کرے وہ کچھ طے نہ کر سکی۔ آخرکار اس نے اپنی تجربہ کار جہاندیدہ ماں سے مشورہ کیا۔ بڑھیا حیرت سے ہیرا کا منہ تکنے لگی "پوشاک کا کیا مطلب؟ کیا آج کہیں باہر جانے کی تیاری ہے؟ خلافِ معمول آرائش کی ضرورت کیا پڑ گئی"؟

ہیرا جھینپ گئی وہ کوئی جواب نہ دے سکی۔ بھاگ کر اپنے کمرہ میں چلی گئی۔

رات ہو گئی۔ ہیرا نے اپنے کمرہ میں بجلی کی روشنی کی، اور خوشنما پھولوں کا ایک گجرا اپنے گلے میں ڈال کر حسنِ شباب کے بوجھ سے دب کر فرش

پر بیٹھ گئی۔

ارشد اور اقبال نے کمرہ میں قدم رکھا۔ سحر زدہ ناگن کی طرح ہیرا کھڑی ہوگئی۔ دونوں دوست بیٹھ گئے۔ لیکن ہیرا کھڑی رہی۔ اقبال نے ہیرا کی طرف دیکھ کر کہا۔ "بیٹھ جائیے۔"

ہیرا بیٹھ گئی۔ غرور و تمکنت نے ہیرا کا ساتھ چھوڑ دیا۔ اب وہ اپنے حسن و شباب کے بل پر گانے کی تیاری کرنے لگی۔ اقبال نے رُک کر کہا "تکلیف نہ کیجئے۔ مجھے آج آپ کی ماں سے تنہائی میں کچھ باتیں کرنی ہیں۔ معاف کیجئے گا۔"

ہیرا منہ بنا کر کمرہ سے باہر چلی گئی —— ہائے رے آج کا سنگار!

اقبال کی باتیں سُنکر نائکہ چونکی، مگر آخر میں دو ہزار روپے ماہوار پر وہ اقبال کے یہاں ہیرا کو ملازم رکھنے کے لئے راضی ہوگئی۔

(۶)

اس سے پوچھے بغیر ہی اس کا سودا ہوگیا۔ یہ سُن کر ہیرا بہت ناراض ہوئی، اس نے زمین پر پاؤں مار کر کہا "ایسا ہرگز نہیں ہوسکتا وہ بدتہذیب مرد —— وہ گنوار —— گونگا بہرا مرد۔ میری قدر کیا جانے اُسکی یہ مجال کہ مجھے ملازم رکھے۔ میں اس سے بدلہ لوں گی میں اسکو ذلیل کروں گی" وہ غصہ میں بھری ہوئی نائکہ کے پاس پہنچی۔ بڑھیا ایسی نہ معلوم کتنی چھوکریوں کو اُلّو بنا چکی تھی۔ اس نے آخر کار "ریشیا پن" کے آزمودہ ہتکھنڈوں سے ہیرا کا غصہ ٹھنڈا کر دیا۔ اور ہیرا کو اس دن اپنے مالک کی خدمت میں جانا ہی پڑا۔

ہیرا کے لئے ایک عالی شان کوٹھی کا انتظام کیا گیا تھا نوکروں اور خادماؤں نے اس کا استقبال کیا۔ پوشاک اور کھانے پینے کی کوئی کمی نہ تھی۔ دولت سے جو کچھ خریدا جا سکتا ہے، وہ سب سامان اس کے خاص کمرہ میں موجود تھا۔ ہیرا کے مرغوب و دلپسند زیورات، موٹر وغیرہ سب سامان مہیا کر دیا گیا تھا۔ اس راج محل میں پہنچکر ہیرا حیران رہ گئی۔ اقبال کی جانب سے یہ سب کچھ ہوسکتا ہے۔ یہ اس نے کبھی سوچا ہی نہ تھا۔ لیکن ان سب آرائشوں کے پردہ میں جو ہستی پوشیدہ تھی، وہ ہیرا کے خیال میں بے جان مورت تھی۔ ہیرا نے سوچا "شاید میرا خیال غلط ہو۔ یہ سارا سامان کا تو کچھ اور ہی مطلب نکل رہا ہے خیر کچھ بھی ہو میں تو اپنا انتقام اس مرد سے ضرور لوں گی، وہ اپنی سی کر چکا اب میری باری ہے۔ میں اس کی داسی بن کر نہیں رہ سکتی۔ اس کو میرا غلام بننا پڑے گا۔"

شام ہوئی۔ بجلی کی روشنی سے بنگلہ جگمگا اٹھا اس نے موٹر کے آنے کی آواز سنی۔ ہیرا نے جوش میں آکر اپنے عہد کو دہرایا —— "نہیں بولوں گی! نہ بولوں گی! ہرگز نہ بولوں گی!!"

مردوں سے اپنی خوشامد کرانا ہیرا کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ وہ مرد جو عورت کے دل کے نہیں۔ بلکہ اس کے جسم کے عاشق ہوتے ہیں، ہیرا کی چوکھٹ کو چومتے تھے۔ ایسے ایسے منظر ہیرا بارہا دیکھ چکی تھی۔ ہیرا کی آنکھوں میں اس وقت ان مردوں کی تصویریں پھر رہی تھیں۔ جو اسکی پھٹکار اور گالیاں سنکر بھی اپنی دولت اور اپنی باوفا بیویوں کے زیورات لاکر ہیرا کے قدموں پر ڈال دیتے تھے۔ لیکن سب مرد برابر نہیں ہوتے اس کا ہیرا کو تجربہ نہ تھا۔

غرورِ حسن سے تن کر ہیرا اپنے "دشمن مرد" کا جس نے اس کے سڈول و گداز بدن کی ذرا بھی پروا نہ کی تھی جس نے نسوانی حُسن کی توہین کی تھی مقابلہ کرنے کے لئے تیار ہوگئی۔

نصف گھنٹہ گزرا۔ موٹر واپس جانے کی آواز سن کر وہ چونکی۔ اس نے کھڑکی سے دیکھا۔ وہی عجیب و غریب مرد تیر کی طرح اڑا چلا جا رہا تھا۔ ہیرا کچلی ہوئی ناگن کی طرح پھنکار کر پاؤں پٹک پٹک کر کمرہ میں گھومنے لگی۔ سارا سنگار کیا ہوا دھرا رہ گیا۔ دشمن سامنے ہی نہ آیا اس نے

ایک خادمہ کو بلا کر پوچھا "کیا بابو صاحب آئے تھے؟"

"جی ہاں"

"کس لئے؟"

"دریافت کرتے تھے۔ کہ سرکار کو کسی چیز کی ضرورت تو نہیں ہے؟"

"اور کچھ کہتے تھے؟"

"کہتے تھے کہ مالکن کو کوئی تکلیف نہ ہونے پائے ان کے حکم کی فوراً تعمیل کی جائے"

ہیرا نے غصہ سے ہونٹ چبا کر کہا "میرے حکم کی فوراً تعمیل کی جائے"

"جی ہاں"

"اچھا تو میں حکم دیتی ہوں۔ کہ یہ مرد میرے بنگلہ میں گھسنے نہ پائے"

خادمہ منہ تکنے لگی۔ ہیرا نے ڈانٹ کر اس کو کمرے سے نکل جانے کا اشارہ کیا۔ اس کے جاتے ہی وہ پلنگ پر گر کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ وہ پھر رات بھر نہ سو سکی۔

(۷)

کئی دن بیت گئے۔ ہیرا کے حکم کے مطابق اقبال بنگلہ کے اندر تو نہ آتے مگر حسب معمول روزانہ بنگلہ کی حد سے باہر آتے۔ اور موٹر میں بیٹھے بیٹھے نوکروں سے ہیرا کی خیریت دریافت کر کے چلے جاتے۔

وہ عموماً شام کو آیا کرتے تھے۔ اس وقت کا انتظار ہیرا صبح سے شام تک کیا کرتی تھی۔ موٹر کے ہارن پر اس کے کان لگے رہتے تھے۔ ان کے آنے سے ایک گھنٹہ پہلے ہی سے وہ اپنی کھڑکی میں کھڑی ہو جایا کرتی تھی۔ کچھ دنوں تک تو وہ سامنے نہ ہوتی تھی۔ پھر رفتہ رفتہ وہ بالکل سامنے کھڑی ہونے لگی۔ روزانہ نیا سنگار نئی پوشاک اور نئی شان سے خود کو ظاہر کرتی تھی۔ مگر واہ رے مرد کی فطرت، اقبال نے کبھی بھولے سے بھی اس خوبصورت بلا کی طرف آنکھ اٹھا کر نہ دیکھا۔ کس سنسان جنگل میں ہیرا نے حسن و جوانی کا بازار سجایا تھا۔

کچھ دنوں کے بعد ہیرا کے لئے بنگلہ میں رہنا ... دشوار ہو گیا۔ "یہ بھی کوئی بات ہے وہ آتے ہیں مجھ سے بولتے نہیں۔ سب سے میری خیر و عافیت دریافت کر جاتے ہیں۔ مجھے ہر قسم کی آسائش ہے مجھے رانیوں کی طرح رکھتے ہیں۔ مجھے سب کچھ دے رکھا ہے مگر ... کچھ نہیں۔ بڑے آئے کہیں کے خوددار! جاتے ہیں ان کا غرور اس طرح خاک میں ملاؤں۔ کیا اس عجیب و غریب "مرد" کو خوش کرنے کے لئے مجھ میں کوئی گن نہیں یہ روپ۔ یہ بدمست جوانی ... شہر میں اس کے کتنے دام ہیں؟ — دام — دام ... وہ سوچتی۔ دام تو انہوں نے بھی دیئے ہیں معقول دام۔ آخر کس لئے۔ ان کی یہ تمام دولت کس لئے؟ میرے حسن کی گھٹتی بڑھتی کے لئے یا تباہ کرنے کے لئے؟" — ہیرا انہی خیالوں میں ڈوبنے لگی پھر بھی ... نہ پا سکی۔

کچھ ... دن بیت گئے۔ وہ بیمار پڑ گئی۔ اس کی بیماری کی خبر سن کر شہر کے دو مشہور ڈاکٹروں کو لے کر اقبال بنگلے پر پہنچے۔ خود تو بنگلہ سے باہر ہی رہے مگر ڈاکٹروں کو اندر بھیج دیا۔ ہیرا پلنگ پر پڑی تھی ڈاکٹروں کو دیکھتے ہی ہیرا نے کہا۔ آپ لوگوں کو تکلیف اٹھانے کی ضرورت نہیں مہربانی کر کے آپ یہاں سے تشریف لے جائیے"

ڈاکٹروں نے اسے سمجھانا چاہا۔ تو اس نے جھنجھلا کر کہا "وہ کہاں ہیں؟ — ہائے وہ کہاں ہیں۔ انکو بلا لاؤ"

اقبال دبے پاؤں کمرہ میں داخل ہوئے۔ ہیرا نے ان کی طرف سے منہ پھیر لیا۔

اقبال نے کہا "آپ ڈاکٹروں کو دیکھنے دیجئے"

"آپ انہیں رخصت کر دیں۔"

"لیکن ـــ"

"میں کچھ کہوں گی۔ آپ ڈاکٹروں کو رخصت کر دیں۔"

مجبوراً اقبال نے ڈاکٹروں کو فیس دیکر رخصت کر دیا۔

اقبال نے کہا "معلوم ہوتا ہے کہ اب آپ کی طبیعت کچھ اچھی ہے۔ ذرا آرام کرنے سے اور بھی ٹھیک ہو جائے گی۔"

ہیرا نے کہا "آپ میرے دل کا حال کیا جانیں۔" وہ اقبال سے آنکھ نہ ملا سکی مگر ہونٹ کچھ کہنے کے لئے کھل کر رہ گئے۔

اقبال چلنے کو تیار ہوئے۔ ہیرا نے بے چین ہو کر کہا "ٹھہرئیے ذرا کچھ دیر کے لئے کرسی پر بیٹھ جائیے۔"

اقبال بیٹھ گئے۔ وہ اٹھ بیٹھی۔ پھر کھڑی ہو گئی۔ اقبال اس کی طرف دیکھنے لگے۔ ہیرا آگے بڑھی۔ اقبال کرسی سے اٹھ کر پیچھے کی طرف ہٹنے لگے۔ ہیرا دل ہی دل میں سوچ رہی تھی "کیا کوئی مرد عورت سے اسی طرح سلوک کرتا ہے۔" اس کا دل بھر آیا۔ اور اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا "آپ! آپ!! کیا مجھے زہر نہیں دے سکتے۔ کہیں سے لاکر نہیں دے سکتے؟"

اقبال نے ملامت سے جواب دیا "آپ ایسی مایوسی کی باتیں کیوں کرتی ہیں! آپ کے لئے تو میری جان تک حاضر ہے۔"

"کیا کہا۔ جان! ـــ ہاں ہاں میں وہی چاہتی ہوں ـــ میں آپ کا دل چاہتی ہوں۔ یہ سب ٹھاٹ۔ بنگلہ ساز و سامان مجھے کچھ نہ چاہیئے۔ ان سب کو آگ لگا دو۔ اس پاپی جسم کو آرام پہنچانے کے لئے آپ نے میرے لئے یہ تمام آسائشیں مہیا کیں۔ مگر اس سے میرا سکونِ قلب رخصت ہو گیا۔ میری یہ زندگی کوئی زندگی نہیں ہے۔ ہاں ہاں مجھے اپنا دل دیدو۔ میں تو پریم کی پیاسی ہوں مجھے اس سے محروم نہ کرو۔ مجھے اتنا کیوں ترساتے ہو۔ سنگدل مرد ـــ"

ہیرا اقبال کو پکڑنے کے لئے بڑھی اور بے سدھ ہو کر فرش پر گر پڑی، اقبال نے آہستہ سے ہیرا کو اٹھا کر کوچ پر لٹا دیا۔ ہوش میں آنے پر ہیرا پھر اقبال کی طرف جھپٹی۔ اقبال مسکرائے اور انہوں نے محبت بھری آواز میں کہا "مہربانی کر کے ہوش میں رہیئے۔ آپ کو کیا تکلیف ہے؟"

ہیرا اب زیادہ ضبط نہ کر سکی۔ وہ اقبال کے قدموں پر جھک گئی، وہ رو رہی تھی۔ دریا کا بند ٹوٹ گیا تھا۔ اس وقت ہیرا نہیں رو رہی تھی۔ بلکہ عورت کا دل رو رہا تھا۔

اقبال نے کہا۔ "روئیے نہیں۔ آخر آپ چاہتی کیا ہیں۔ میں آپ کی خدمت کرنے کے لئے تیار ہوں۔"

"واہ رے تغافل! میں کیا چاہتی ہوں۔ یہ آپ پوچھتے ہیں۔ عورتیں مردوں سے کیا چاہتی ہیں۔ یہ آپ مرد ہو کر نہیں جانتے۔ آپ ایسے سنگدل مرد ـــ" ہیرا کی زبان بند ہو گئی، مگر غصہ سے ہونٹ کانپنے لگے۔

اقبال نے نرمی سے کہا "میں اس سے خوب واقف ہوں کہ عورتیں کیا چاہتی ہیں لیکن میری اس صاف گوئی کو معاف کیجئے گا آپ عورت نہیں طوائف ہیں ـــ ویشیا ہیں۔ میں یہ باتیں کہنا نہیں چاہتا تھا مگر آپ نے خود چھیڑ کر مجھے سب کچھ کہنے کیلئے مجبور کیا۔ طوائف جن چیزوں کی بھوکی ہوتی ہے۔ جن چیزوں کی اسے خواہش ہوتی ہے۔ میرا خیال ہے۔ کہ وہ میں نے سب مہیا کر دی ہیں"

ہیرا کچھ بھی نہ سمجھی، وہ بولی "تو کیا طوائفیں عورتیں نہیں ہیں؟"

"نہیں"

"کیونکر؟" ہیرا نے تعجب سے اقبال کی طرف دیکھ کر کہا۔

اقبال کہنے لگے "عورت دنیا کی ایک پاکیزہ ہستی ہے۔ وہ مردوں کے تن میں آب حیات کا کام دیتی ہے۔ عورت کے لئے مرد دنیا کی ہر مصیبت کا خندہ پیشانی سے ساتھ مقابلہ کرتے ہیں۔ وہ عورت کے

لئے تکلیف اٹھا کر بھی جیتے رہنے کی تمنا کرتے ہیں. عورت دیا. دھرم پریم اور وان کی مورتی ہونی چاہیئے. عصمت اور عفت اس کا اوڑھنا اور بچھونا ہوتا ہے. تیاگ اس کا سہاگ، وفاداری اس کا شیوہ شوہر پرستی اس کا مذہب اور محبت اس کی زندگی ہے. وہ محبّت ہی کیلئے پیدا کی گئی ہے. اور محبت ہی میں فنا ہو جاتی ہے. وہ شرافت، اور پاکیزگی کی دیوی ہوتی ہے ——— لیکن طوائف دنیا کی ایک نہایت مکروہ و شرمناک ہستی ہے. وہ شرافت کے دامن پر دھبہ ہے. انسانیت کی پیشانی پر کلنک کا ٹیکہ ہے. وہ مکر و فریب کی پتلی ہے. کینہ دروست اور وفا دشمن ہوتی ہے. پاپ اس کی زندگی، اور تباہی و بربادی اس کی آخری منزل ہے. دیکھنے میں خوبصورت لیکن حقیقت میں ناگن، جسم کے ٹکڑے ٹکڑے ہونے پر بھی عورت جس "چیز" کو قربان نہیں کر سکتی اس کو طوائف کھلے بندوں بیچتی ہے. جانتی ہو وہ کیا چیز ہے؟

"آپ ہی فرمائیے"

"عصمت. ہاں! وہ عصمت جس کا مول اس دنیا میں نہیں لیکن خدا نے صنف لطیف سمجھ کر وہ نعمت عورت کو بخش دی. لیے ولیشیائیں کوڑھی. کلنکی پاپی جسکے پاس بھی چاہیں بیچ دیتی ہیں. دنیا کے تمام مرد بھی مل کر تاہے کے ٹکڑے میں اتنی طاقت نہیں پیدا کر سکتے"

ہیرا نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا" لیکن اس کے ذمہ دار مرد ہی ہیں. مردوں ہی کی مہربانی سے ہم طوائفوں کا دنیا میں وجود ہوا اور ہے"

اقبال نے محبّت سے ہیرا کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا" یہ بھی حقیقت ہے لیکن ابھاگن ناری! تعجب تو اس کا ہے کہ تم اپنے نازک جسم کو کمینے سے کمینے بدمعاش مرد کے سپرد کرنے کے لئے تیار ہی کیوں ہو جاتی ہو. آہ. جس طرح زہر آلود پھولوں کو سونگھنے سے ہی موت آ جاتی ہے اسیطرح کا پھول تم بھی ہو. ہیرا تم طوائف کیوں ہوئیں؟"

ہیرا نے آنکھوں سے موتی برساتے ہوئے کہا" آپ مجھے طوائف نہ کہیئے"

اقبال نے رُک کر کہا" تو کیا کہوں؟"

"میں عورت ہوں"

اقبال کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے. وہ چپ چاپ ہیرا کی طرف دیکھتے رہے پھر بولے" میں نے تمہیں پہلے ہی دن دیکھکر سمجھ لیا تھا. کہ تم عورت ہو مگر بُری صحبت نے تمہیں مایا کے جال میں پھنسا عورت کی صفات سے محروم کر دیا تھا. طوائف ہو کر کوئی عورت عورت ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتی. میں نے یہی سمجھ کر کہ تمہارا طوائف پن کبھی تو دور ہوگا تم کو یہاں لے آیا تھا. میں نے ارادہ کر لیا تھا کہ گناہ کی بیٹی ہو تو کیا تم کو عورت ہی بنا کر چین لوں گا. تم کو طوائف نہ بننے دوں گا. ہیرا سچ بتاؤ کیا تم عورت بننا چاہتی ہو؟"

"دو شرطیں ہیں"

"وہ کیا؟"

"پہلی شرط تو یہ ہے کہ کیا آپ میرے لئے سماج کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار ہیں آپ ایک خاندانی رئیس ہیں کہیں ایسا نہ ہو کہ میری وجہ سے آپ کو سماج برادری سے باہر کر دے"

"مجھے سماج کے ٹھیکیداروں کے اندرونی حالات کا کافی اندازہ ہے تم عورت بن جاؤ تو میں سب سے نپٹ لونگا. اچھا تو اب دوسری شرط بتاؤ"

ہیرا نے حسرت بھری نظروں سے اقبال کی طرف دیکھکر کہا" دوسری شرط یہ ہے کہ عورت بنکر کیا میں آپکو پا جاؤنگی کیا آپ مجھے اپنی خادمہ بنا لیں گے؟"

اقبال کچھ کہتے کہتے رکے. ہیرا نے ان کے قدموں پر اپنا سر جھکا دیا اور کہا. میں آپ سے مرتے دم تک کیلئے عورت بنتی ہوں عورت کی لاج رکھیئے"

اب اقبال زیادہ تن نہ سکے. انہوں نے کہا" پیاری! عورت ہی کے لئے مرد ہے"

جناب رام جوایا خنداں :-

کنارے کنارے چلا جا رہا ہوں

سُنا تھا کبھی مجھ کو آتی خبر ہے
کہ اُس کا ندی پار جنگل میں گھر ہے
جنوں خیز اک راہ پیشِ نظر ہے
نہ رہبر نہ کوئی مرا ہم سفر ہے
یہ پانی کھڑا ہے۔ یونہی یا رواں ہے
کہیں پل بھی ہے کوئی کشتی کہاں ہے
چلا جا رہا ہوں یہ کس کو خبر ہے
کہ منبع کدھر ہے۔ دہانہ کدھر ہے

کنارے کنارے چلا جا رہا ہوں

گلستانِ فطرت کا شیدائی کہہ دو
ریا کا مجذوب۔ سودائی کہہ دو
کسی کی نگاہوں کا مستانہ کہہ دو
جنونی کہو مجھ کو۔ دیوانہ کہہ دو
تصوّر کی دُنیا کا سیّاح ہوں میں
محبت کی کشتی کا ملاّح ہوں میں!
نگاہِ جہاں میں وقار اپنا کھوکر
حوادث کی موجوں میں کشتی ڈبوکر

کنارے کنارے چلا جا رہا ہوں

لبِ جُو کی سرمست و رنگیں فضائیں
نشیلی، سبک رَو معطر ہوائیں
ندی کیا ہے بحرِ لطافت کی رَو ہے
اُفق سے طلوعِ تجلائے نو ہے
ہر اک چیز ہے اک نیا نقشِ حیرت
ہر اک شے ہے خود ایک زورِ مانِ فطرت

مگر میری دُنیا سے بالا نظر ہے	مرے دل میں ذوقِ جہانِ دگر ہے
کنارے کنارے چلا جا رہا ہوں!

تخیّل کی وادی کا دریا یہی ہے	شرابِ محبت کی گنگا یہی ہے
تجلی گہِ طورِ سینا یہی ہے	یہی ہے فسانوں کی دنیا یہی ہے
غرض دورِ اسرارِ ہستی یہی ہے	مۓ ہوش کا سیلِ مستی یہی ہے
اسی سیلِ مستی کے چھینٹے ہیں انجم	اسی کے نشیلے نظاروں میں گم صم
کنارے کنارے چلا جا رہا ہوں

اسے نیل کا اک کنارہ سمجھ لو	مجھے صبحِ ہستی کا تارا سمجھ لو!
بڑھا جا رہا ہوں نگاہیں جھکائے	خیالی صنم زار سے لَو لگائے!
بہا جا رہا ہوں خود اپنی ہی رو میں	جوانی و بے اختیاری کی رَو میں
دکھاتا ہوا اپنی شانِ محبّت	سناتا ہوا داستانِ محبّت
کنارے کنارے چلا جا رہا ہوں

گناہوں میں ہستی تبہ کر چکا ہوں	سمجھ سوچ کر بھی گنہ کر چکا ہوں!
ندامت سے آنکھیں جھکائے ہوئے ہوں	بہت بوجھ سر پر اٹھائے ہوئے ہوں!
جہانِ محبّت کی پھر جستجو ہے!	مجھے عمرِ رفتہ کی پھر آرزو ہے
مجھے خوف آتا ہے گہری ندی سے	نہیں ہوں میں بیزار ابھی زندگی سے
کنارے کنارے چلا جا رہا ہوں

جناب اوپندر ناتھ اشک بی اے ایل ایل بی

لکشمی کا سواگت[1]

افرادِ تمثیل

روشن ←——— ایک تعلیم یافتہ نوجوان
سریندر ←——— اس کا دوست
بھاشی ←——— اس کا چھوٹا بھائی
باپ ←——— روشن کا باپ
ماں ←——— روشن کی ماں
اُرن ←——— روشن کا بیمار بچہ
ڈاکٹر ←———

جائے وقوع

ضلع جالندھر میں متوسط درجے کے مکان کا ایک دالان

وقت

نو دس بجے صبح ۔

منظر دالان میں سامنے کی دیوار سے میز لگی ہے۔ جس کے اس طرف ایک پرانی کرسی پڑی ہے۔ میز پر بچوں کی کتابیں بکھری پڑی ہیں۔
دیوار کے دائیں کونے میں ایک کھڑکی ہے۔ جس پر معمولی چھینٹ کا پردہ پڑا ہے۔ بائیں کونے میں ایک دروازہ ہے۔ جو سیڑھیوں میں کھلتا ہے ـــ دائیں دیوار میں ایک دروازہ ہے۔ جو اُس کمرے میں کھلتا ہے۔ جہاں اس وقت روشن کا ننھا بچہ اُرن بیمار پڑا ہے۔
دیواریں فریم سے محروم ـــ سستی تصویریں میخوں سے جڑی ہوئی ہیں۔ اور چھت پر کاغذ کا ایک پرانا فانوس لٹک رہا ہے۔
پردہ اٹھنے پر سریندر کھڑکی میں سے باہر کی طرف دیکھ

[1] سواگت۔ خیر مقدم

رہا ہے۔ باہر موسلا دھار بارش ہو رہی ہے۔ ہوا کی سائیں سائیں اور مینہ کے تھپیڑے صاف سنائی دیتے ہیں۔

روشن :۔ (دروازے کو آہستہ سے بند کرکے) ڈاکٹر ابھی نہیں آیا؟

سریندر۔ نہیں۔

روشن۔ بارش ہو رہی ہے۔

سریندر۔ موسلا دھار۔ جل تھل ایک ہو رہے ہیں۔

روشن۔ شاید اولے بھی پڑ رہے ہیں۔

سریندر۔ ہاں؛ اولے بھی پڑ رہے ہیں۔

روشن۔ بھائی پہنچ گیا ہوگا؟

سریندر۔ ہاں پہنچ ہی گیا ہوگا۔ یہ بارش اور اولے! ندیاں بہہ رہی ہونگی بازاروں میں!

روشن۔ لیکن اب تک آجانا چاہیئے تھا انہیں (خود آگے بڑھ کر کھڑکی کے پردے کو ہٹا کر دیکھتا ہے۔ پھر پردہ چھوڑ کر واپس آجاتا ہے گھٹی گھٹی آواز میں) اُن کی حالت بگڑ رہی ہے۔

(سریندر خاموش رہتا ہے)

روشن۔ (اسی آواز میں) اس کا سانس جیسے ہر گھڑی رکتا جا رہا ہے اُس کا گلا جیسے بند ہوتا جا رہا ہے۔ اس کا بدن پھنک رہا ہے اس کی آنکھیں کھلی ہیں، پر وہ کچھ کہہ نہیں سکتا۔ بے بس سا، بے ہوش سا، چپ چاپ منہ تک رہا ہے۔ سریندر جب وہ سانس لیتا ہے۔ تو اسے بڑی تکلیف ہوتی ہے۔

سریندر۔ حوصلہ کرو! ابھی ڈاکٹر آجائے گا۔ دیکھو دروازہ پر کسی نے دستک دی۔

(دونوں چند لمحے سنتے ہیں۔ ہوا کی سائیں سائیں)

روشن۔ نہیں؛ کوئی نہیں ہوا ہے۔

چند لمحے کھڑے رہنے کے بعد کھڑکی کا پردہ چھوڑ کر کمرے میں گھومتا ہے پھر جاکر کھڑکی کے پاس کھڑا ہو جاتا ہے۔ اور پردہ ہٹا کر باہر دیکھتا ہے۔ بیمار کے کمرے سے روشن لال داخل ہوتا ہے۔)

سریندر۔ یہ دیکھو پھر کسی نے دستک دی۔

(روشن بڑھ کر کھڑکی میں دیکھتا ہے۔ پھر واپس آجاتا ہے)

روشن۔ سامنے کے مکان کا دروازہ کھٹکھٹایا جا رہا ہے۔

(بے چینی سے کمرے میں گھومتا ہے۔ سریندر کرسی سے پیٹھ لگائے چھت میں جلتے ہوئے فانوس کو دیکھ رہا ہے)

روشن (گھومتے ہوئے۔ جیسے اپنے۔ . . . آپ) یہ عام بخار نہیں۔ گلے کی یہ تکلیف معمولی نہیں۔

(اچانک سریندر کے پاس رک کر)

میرا تو دل ڈر رہا ہے سریندر! کہیں اپنی ماں کی طرح، اُن بھی تو مجھے دھوکا نہ دے جائے گا؟ (گلا بھر آتا ہے) تم نے اسے نہیں دیکھا۔ سانس لینے میں اسے کتنی تکلیف ہوتی ہے

(ہوا کی سائیں سائیں، اور مینہ کے تھپیڑے)

یہ بارش۔ یہ آندھی۔ یہ میرے من میں ہول پیدا کر رہے ہیں نہ جانے کیا ہونے کو ہے۔ قدرت کا یہ بھیانک کھیل، موت کی یہ آوازیں . . . . . .

(بجلی زور زور سے کڑکتی ہے۔ بادل گرجتے ہیں۔ اور مکانوں کے کواڑ کھڑکھڑا اٹھتے ہیں)

(رسوئی سے ماں کی آواز آتی ہے)

روشی دروازہ کھول آ۔ دیکھو شاید ڈاکٹر آیا ہے۔

(روشن سریندر کی طرف دیکھتا ہے)

سریندر۔ میں جاتا ہوں۔ ابھی۔

(تیزی سے جاتا ہے۔ روشن بے چینی سے کمرے میں گھومتا ہے)

(سریندر کے ساتھ ڈاکٹر اور بھاشی داخل ہوتے ہیں۔ بھاشی کے ہاتھ میں انجکشن کا سامان ہے)

ڈاکٹر۔ کیا حال ہے بچے کا؟

(برساتی اتار کر کھونٹی پر لٹکاتا ہے۔ اور رومال سے منہ پونچھتا ہے)

روشن۔ آپ کو بھاشی نے بتایا ہوگا۔ ڈاکٹر صاحب! میرا تو جیسے حوصلہ ٹوٹ رہا ہے۔ کل صبح اسے کچھ بخار ہوا۔ اور سانس لینے میں بھی کچھ تکلیف ہونے لگی پر آج تو وہ بے ہوش سا پڑا۔۔۔ جیسے آخری سانسوں کو جانے سے روک رکھنے کی کوشش کر رہا ہے۔

ڈاکٹر۔ چل کر دیکھتا ہوں۔

(سب بیمار کے کمرے میں چلے جاتے ہیں۔ باہر دروازہ کے کھٹکھٹانے کی آواز آتی ہے۔ ماں تیزی سے داخل ہوتی ہے)

ماں۔ بھاشی، بھاشی!

(بیمار کے کمرے سے بھاشی آتا ہے)

ماں۔ دیکھو بھاشی! باہر کون دستک دے رہا ہے؟ آنکھوں میں چمک آجاتی ہے (میرا تو خیال ہے۔ وہی لوگ آئے ہیں۔ میں نے رسوئی کی کھڑکی سے دیکھا ہے۔ ٹپکتے ہوئے چھاتے لئے اور برساتیاں پہنے۔۔۔۔۔۔

بھاشی۔ وہی کون؟

ماں۔ وہی جو سرلا کے مرنے پر اپنی لڑکی کیلئے کہہ رہے تھے بڑے بھلے آدمی ہیں سنتی ہوں سیالکوٹ میں ان کا بڑا کام ہے اتنی بارش میں بھی۔۔۔۔۔۔

(زور زور سے کنڈی کھٹکھٹانے کی لگاتار آواز، بھاشی بھاگ کر جاتا ہے۔ ماں کھڑکی میں جا کھڑی ہوتی ہے بیمار کے کمرے کا دروازہ کھلتا ہے۔ سریندر تیزی سے داخل ہوتا ہے)

سریندر۔ بھاشی کہاں ہے؟

ماں۔ باہر وہ آئے ہیں۔ کنڈی کھولنے گیا ہے۔

(سریندر تیزی سے واپس چلا جاتا ہے۔ ماں ایکبار پردہ اٹھا کر کھڑکی سے جھانکتی ہے۔ پھر خوشی خوشی کمرے میں ٹہلتی ہے بھاشی داخل ہوتا ہے)

ماں۔ کون ہیں؟

بھاشی۔ شاید وہی ہیں۔ نیچے بٹھا آیا ہوں۔ پتاجی کے پاس تم چلو!

ماں۔ کیوں؟

بھاشی۔ ان کے ساتھ ایک عورت بھی ہے۔

(ماں جلدی جلدی چلی جاتی ہے۔ سریندر کمرے کا دروازہ ذرا کھول کر دیکھتا ہے۔ آواز دیتا ہے۔)

سریندر۔ بھاشی!

بھاشی۔ ہاں!

سریندر۔ ادھر آؤ!

(بھاشی کمرے میں چلا جاتا ہے۔ چند لمحوں کے لئے خاموشی صرف باہر مینہ برسنے اور ہوا کے تھپیڑوں سے دروازوں کے کھڑکھڑانے کا شور کمرے میں فانوس کے جلنے کی سرسراہٹ ڈاکٹر، سریندر، روشن اور بھاشی باہر آتے ہیں)

روشن۔ ڈاکٹر صاحب! اب بتائیے۔

ڈاکٹر۔ (نہایت سنجیدگی سے) بچے کی حالت نازک ہے۔

روشن۔ بہت نازک ہے!

ڈاکٹر۔ ہاں!

روشن۔ کچھ نہیں ہو سکتا۔

ڈاکٹر۔ پرماتما کے گھر کچھ کمی نہیں۔ لیکن آپ نے بہت دیر کردی۔ ڈپتھیریا (خناق) میں فوراً ڈاکٹر کو بلانا چاہیئے۔

روشن۔ ہمیں معلوم ہی نہیں ہوا ڈاکٹر صاحب۔ کل شام اسے بخار ہوگیا۔ گلے میں بھی اس نے بہت تکلیف محسوس کی۔ میں ڈاکٹر جیورام کے پاس لے گیا۔ وہی جو ہمارے بازار میں ہیں۔ انہوں نے گلے میں آیوڈین گلیسرین پینٹ کردی۔ اور فلیو مکسچر بنا دیا۔ بس خوراکیں دیں۔ اس کی حالت تو پہلے سے بھی خراب ہوگئی۔ شام کو یہ کچھ بے ہوش سا ہوگیا۔ میں بھاگا بھاگا آپ کے پاس گیا۔ پر آپ ملے نہیں۔ پھر رات کو بھاشی کو بھیجا۔ پھر بھی آپ نہیں ملے۔ اور تب یہ جھڑی لگ گئی۔ اولے۔ آندھی اور جھکڑ! جیسے قیامت کے بندھن ڈھیلے ہوگئے ہوں۔

(باہر ہوا کی سائیں سائیں سنائی دیتی ہے۔ ڈاکٹر سر نیچا کئے کھڑا ہے۔ روشن امید وبیم کے عالم میں اس کی طرف تک رہا ہے۔ سرنیدر میز کے ایک کونے پر بیٹھا چھت میں زور سے جلتے ہوئے فانوس کو دیکھ رہا ہے)

ڈاکٹر۔ (سر اٹھاتا ہے) میں نے انجکشن دیدیا ہے۔ بھاشی نے جو علامتیں بتائی تھیں۔ انہیں سنکر میں احتیاطاً انجکشن کا سامان لے آیا تھا۔ اور میرا خیال ٹھیک نکلا۔ بھاشی کو میرے ساتھ بھیجدو۔ میں اسے نسخہ لکھ دیتا ہوں۔ یہیں بازار سے دوائی بنوا لینا۔ میرا دواخانہ تو دور ہے۔ پندرہ پندرہ منٹ بعد حلق میں دوائی کی دو چار بوندیں۔ اور ایک گھنٹے میں مجھے خبر دینا۔ اگر ایک گھنٹے تک یہ ٹھیک رہا۔ تو میں ایک انجکشن اور کر جاؤں گا۔ کوئی دوسرا علاج بھی تو نہیں۔

روشن۔ ڈاکٹر صاحب! ...... (آواز بھرآتی ہے)

ڈاکٹر۔ گھبرانے سے کام نہ چلے گا۔ احتیاط سے اس کی تیمارداری کرو شاید ......

روشن:۔ میں اپنی طرف سے کوئی کسر نہ اٹھا رکھوں گا۔ سرنیدر! دیکھو تم میرے پاس رہنا۔ جانا نہیں۔ یہ گھر اس بچے کے لئے ویرانہ ہے۔ یہ لوگ اس کی زندگی نہیں چاہتے۔ بڑا رشتہ پانے کے راستے میں اسے روڑا سمجھتے ہیں۔ اس کی موت چاہتے ہیں ...

سرنیدر۔ کیا کہتے ہو روشن ......

ڈاکٹر:۔ روشن لال ......

روشن:۔ آپ نہیں جانتے ڈاکٹر صاحب! ان لوگوں کا خون سفید ہوگیا ہے۔ آپ کو معلوم نہیں۔ ادھر میں اپنی بیوی کو چتا کے حوالے کرکے آیا تھا۔ ادھر یہ دوسری جگہ ...... شگن لینے کی سوچ رہے تھے۔

سرنیدر۔ بھائی یہ تو دنیا کا قاعدہ ہے۔

روشن۔ دنیا کا قاعدہ اتنا سخت گیر! اتنا بے رحم اتنا بے حس! نہیں جانتا کہ جو مر جاتی ہے وہ بھی کسی کی لڑکی ہوتی ہے۔ کسی کے لاڈ پیار میں پلی ہوتی ہے۔ پھر ...... (ڈاکٹر کو کھونٹی سے برساتی اتارتے ہوئے دیکھ کر) آپ جا رہے ہیں ڈاکٹر صاحب ۔ (بھاشی سے) دیکھو بھاشی جلدی آنا۔ بس۔ جیسے یہیں کھڑے ہو۔

(ڈاکٹر اور بھاشی چلے جاتے ہیں)

روشن۔ سرنیدر کیا ہونے کو ہے۔ کیا اُن بھی مجھے سرلا کی طرح چھوڑ کر چلا جائے گا۔ میں تو اسے دیکھ کر سرلا کا غم بھول چلا تھا۔ لیکن اب ...... اب ......

(ہاتھوں سے چہرہ چھپا لیتا ہے)

سرنیدر۔ (اسے دھکیل کر کمرے کی طرف لیجاتا ہوا) پاگل نہ بنو چلو اس کے گھر کیا کمی ہے۔ وہ چاہے تو مردوں کو جلا سکتا ہے تم ٹھیک...

روشن ۔ (بھرائی ہوئی آواز سے) مجھے اس پر کوئی یقین نہیں رہا۔ اس کا کوئی بھروسہ نہیں۔ ظالم، سنگدل اور بے رحم۔ اس کا کام ستے ہوؤں کو اور ستانا ہے۔ جلے ہوؤں کو اور جلانا ہے۔

سریندر ۔ دیوانے نہ بنو۔ چلو اس کے سرہانے چل کر بیٹھو۔ میں دیکھتا ہوں بھاشی ابھی کیوں نہیں آیا؟

(اسے دروازے کے اندر دھکیل کر مڑتا ہے۔ دائیں طرف کے دروازے سے ماں داخل ہوتی ہے۔)

ماں ۔ کدھر چلے؟

سریندر ۔ ذرا بھاشی کو دیکھنے جا رہا تھا۔

ماں ۔ کیا حال ہے۔ اُن کا؟

سریندر ۔ اس کی حالت بگڑ رہی ہے۔

ماں ۔ ہم نے تو بابا بولنا ہی چھوڑ دیا ہے۔ یہ ڈاکٹر جو نہ کریں تھوڑا ہے۔ بہو کی بار بھی تو یہی ہوا تھا۔ اچھی بھلی حکیم کی دوا ہو رہی تھی، آرام آ رہا تھا۔ جگر کا بخار ہی تو تھا۔ دو دو سال بھی رہتا ہے۔ لیکن ڈاکٹروں کو لائے بنا نہ مانا۔ اور انہوں نے دیر یا دق کا فتویٰ ہم نے تو بھائی اسی لئے کچھ کہنا سننا ہی چھوڑ دیا ہے۔ آخر میں نے بھی تو پانچ پانچ بچے پالے ہیں۔ بیماریاں ہوئیں، تکلیفیں ہوئیں، کبھی ڈاکٹروں کے پیچھے بھاگی بھاگی نہیں پھری کیا بتایا ڈاکٹر نے؟

سریندر ۔ ٹیتھیریا!

ماں ۔ کیا؟ . . . . . .

سریندر ۔ بڑی خطرناک بیماری ہے ماں جی! اچھا بھلا آدمی چند گھنٹوں کے اندر ختم ہو جاتا ہے۔

ماں ۔ رام رام!! تم لوگوں نے کیا کچھ کا کچھ بنا ڈالا۔ اُسے ذرا بخار ہو گا۔ چھاتی جم گئی ہو گی۔ میں ذرا گھٹی دے دیتی تو ٹھیک ہو جاتا۔ لیکن مجھے کوئی ہاتھ بھی لگانے دے تب نا ہیں، وہ کہتا ہے۔ بچے سے پیار ہی نہیں۔

سریندر ۔ نہیں نہیں! یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ آپ سے زیادہ وہ کسے عزیز ہو گا۔

(جانا چاہتا ہے)

ماں : سنو!

(سریندر رُک جاتا ہے)

ماں ۔ میں تم سے کچھ باتیں کرنے آئی تھی۔ تم اس کے دوست ہو نہ۔ اسے سمجھا سکتے ہو!

سریندر ۔ کہیئے؟

ماں ۔ آج وہ پھر آئے ہیں۔

سریندر ۔ وہ کون؟

ماں ۔ سیالکوٹ کے ایک ساہوکار ہیں۔ جب سرلا کا چوتھا ہوا تھا۔ تو اس دن روشی کے لئے اپنی لڑکی کا شگن لے کر آئے تھے لیکن اسے نہ جانے کیا ہو گیا ہے؟ کسی کی سنتا ہی نہیں۔ سامنے ہی نہ آیا۔ ہار کر بے چارے چلے گئے۔ روشی کے پتا نے انہیں ایکماہ بعد آنے کو کہا تھا۔ سو پورے ایک مہینے بعد وہ آئے ہیں۔

سریندر ۔ ماں جی . . . .

ماں ۔ تم جانتے ہو بیٹا! دنیا جہاں کا یہ قاعدہ ہے۔ گرے ہوئے مکان کی نینو پر ہی دوسرا مکان کھڑا ہوتا ہے۔ رام پرتاپ ہی کو دیکھ لو۔ ابھی واہ کرم کے بعد نہا کر صافہ بھی نہ نچوڑا تھا، کہ نکودروالوں نے شگن دے دیا۔ ایک ماہ بعد شادی ہو گئی اور اب تو سنتے ہیں، بچہ بھی ہونے والا ہے۔

سریندر ۔ ماں جی! رام پرتاب اور روشن میں کچھ فرق ہے۔

ماں۔ یہی کہ وہ ماں باپ کا کہا مانتا ہے۔ اور یہ پڑھ لکھ کر ٹکرا کرنا سیکھ گیا ہے۔ بیٹا اب تو چار ناطے آتے ہیں۔ پھر دیر ہو گئی تو ادھر کوئی منہ بھی نہ کرے گا۔ لوگ سو سو باتیں بنائیں گے۔ سو سو نام دھریں گے اور پھر ایسا کون کنوارا ہے۔ . . . .

سریندر۔ ماں جی تمہارا روشن بن بیاہا نہ رہے گا۔ اس کا میں یقین دلاتا ہوں۔

ماں۔ یہ تو ٹھیک ہے بیٹا لیکن اب یہ شریف آدمی ملتے ہیں۔ گھر اچھا ہے۔ لڑکی اچھی ہے۔ خوبصورت ہے۔ پڑھی لکھی ہے۔ غریب مزاج ہے۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ لوگ بھلے ہیں۔ لڑکی کی بڑی بہن سے ابھی میں نے باتیں کی ہیں۔ ایسی ہنس مکھ ہے کہ کیا کہوں۔ بولتی ہے تو پھول جھڑتے ہیں۔ جس کی بڑی بہن ایسی ہے۔ وہ خود کیسی ہو گی؟

سریندر۔ ماں جی! اُن کی حالت نازک ہے۔ جا کر دیکھو۔ تو معلوم ہو۔

ماں۔ بیٹا! یہ بھی تو اتنی دور سے آئے ہیں۔ اس آندھی اور طوفان میں۔ کیسے انہیں نراس لوٹا دوں۔

سریندر۔ آخر آپ مجھ سے چاہتی کیا ہیں؟

ماں۔ تمہارا وہ دوست ہے۔ اس سے کہو کہ ذرا دو چار منٹ جا کر ان سے بات کرے جو کچھ وہ پوچھتے ہوں۔ انہیں بتا دے تب تک لڑکے کے پاس میں بیٹھتی ہوں۔

سریندر۔ مجھ سے یہ نہیں ہو سکتا ماں جی۔ بچے کی حالت ٹھیک نہیں۔ بلکہ نازک ہے۔ آپ نہیں جانتیں وہ اسے کتنا پیار کرتا ہے۔ بچے کے سوا اسے اور کسی کا ہوش ہی نہیں۔ اور اس وقت جب اس کی حالت نازک ہے، میں اس سے یہ سب کیسے کہوں؟

(بیمار کے کمرے کا دروازہ کھلتا ہے۔ روشن داخل ہوتا ہے۔ بال بکھرے ہوئے چہرہ اترا ہوا۔ آنکھیں پھٹی پھٹی سی۔)

روشن۔ سریندر تم یہیں کھڑے ہو پرماتما کے لئے جاؤ! جلدی جاؤ! میری برساتی لے جاؤ۔ نیچے سے چھتری لے جاؤ۔ دیکھو بھاشی آیا کیوں نہیں۔ اُن تو . . . . . .

(سیڑھیوں سے بھاشی کی آواز آتی ہے)

میں آ گیا بھائی صاحب!

(بھاشی دوائی کی شیشی لئے داخل ہوتا ہے۔ سریندر اور بھاشی بیمار کے کمرے میں جاتے ہیں۔ ماں روشن کے نزدیک آ جاتی ہے)

ماں۔ کیا بات ہے۔ گھبرائے ہوئے کیوں ہو؟

روشن۔ ماں اسے ڈپتھیریا ہو گیا ہے۔

ماں۔ مجھے سریندر نے بتایا (بیزاری سے سر ہلا کر) تم لوگوں نے مل ملا کر . . . .

روشن۔ کیا کہہ رہی ہو، تمہیں خود اگر کسی بات کا پتہ نہیں تو دوسروں کو تو کچھ کرنے دو۔

ماں۔ چلو میں چل کر دیکھتی ہوں۔

(بڑھتی ہے)

روشن۔ (راستہ روکتا ہے) تم کوئی گھٹی وٹی کی بات کرو گی نہیں! تم مت جاؤ۔ اسے بے حد تکلیف ہے۔ اس کا دم اکھڑ رہا ہے

(جانا چاہتا ہے)

ماں۔ سنو!

(روشن مڑتا ہے۔ ان کشمکش و پیچ میں ہے۔)

روشن۔ کہو!

ماں - چپ!

روشن - جلدی کہو! مجھے جانا ہے۔

ماں - وہ پھر آئے ہیں!

روشن - وہ کون؟

ماں - وہی سیالکوٹ والے۔

روشن - (غضبناک ہو کر) انہیں کہو، جہاں سے آئے ہیں وہیں چلے جائیں۔

(جانا چاہتا ہے)

ماں - روشی

روشن - میں نہیں جانتا میں پاگل ہوں یا آپ؟ کیا آپ میری صورت نہیں دیکھتے۔ کیا آپ کو اس پر کچھ لکھا دکھائی نہیں دیتا شادی۔ شادی۔ شادی!! کیا شادی ہی دنیا میں سب کچھ ہے؟ گھر میں بچہ بیمار ہے۔ اور تمہیں شادی کی سوجھ رہی ہے آخر آپ لوگوں کو ہو کیا گیا ہے؟ کیا وہ میری بیوی نہ تھی۔ کیا وہ . . . . . .

ماں - شور مت مچاؤ۔ ہم تمہارے فائدے ہی کی بات کہہ رہے ہیں۔ رام پرتاپ . . . . . .

روشن - (چیخ کر) تم رام پرتاب کو مجھ سے ملاتی ہو۔ ناخواندہ وحشی گنوار۔ اس کے دل کہاں ہے؟ محسوس کرنے کا مادہ کہاں ہے؟ وہ جانور ہے!

ماں - تمہارے پتا نے بھی تو پہلی بیوی کی موت کے دوسرے مہینے ہی شادی کر لی تھی۔

روشن - وہ . . . . ماں جاؤ۔ میں کیا کہنے لگا تھا؟

(تیزی سے مڑ کر کمرے میں چلا جاتا ہے۔ اور دروازہ کھٹ سے بند کر لیتا ہے۔ ہاتھ میں حقہ لئے ہوئے کھنکھارتے کھنکھارتے روشن کے باپ کا داخلہ)

باپ - کیا کہتا ہے۔ روشن؟

ماں - وہ تو بات بھی نہیں سنتا۔ جانے بچے کی حالت بہت خراب ہے۔

باپ - (کھنکھار کر) ایک دن میں ہی اتنی خراب ہو گئی میں جانتا ہوں۔ یہ سب بہانے ہیں۔ (زور سے آواز دیتا ہے۔ روشی! کھڑکیوں پر ہوا کے تھپیڑوں کی آواز۔ پھر آواز دیتا ہے) روشی!

(روشن دروازہ کھول کر جھانکتا ہے۔ چہرہ پہلے سے بھی اترا ہوا ہے۔ آنکھیں رونکھی سی اور نگاہوں میں ڈر)

روشن - (نہایت تھکی آواز میں) دھیرے بولیں آپ۔ کیا شور مچا رہے ہیں۔

باپ - ادھر آؤ۔

روشن - میرے پاس وقت نہیں!

باپ - (چیخ کر) وقت نہیں۔

روشن - دھیرے بولیں آپ۔

باپ - میں کہتا ہوں، وہ اتنی دور سے آئے ہیں تمہیں دیکھنا چاہتے ہیں۔ تم جا کر ان سے ذرا ایک دو منٹ بات کر لو۔

روشن - میں نہیں جا سکتا۔

باپ - نہیں جا سکتا۔

روشن - نہیں جا سکتا۔

باپ - تو میں شگن لے رہا ہوں، اس بارش، آندھی اور طوفان میں، انہیں اپنے گھر سے ناامید نہیں لوٹا سکتا۔ گھر آئی لکشمی کی بے عزتی نہیں کر سکتا۔ (دیوانے کی طرح روشن ہنستا ہے)

روشن - ہاں ہاں آپ لکشمی کا سواگت کیجئے (کھٹ سے دروازہ بند کر لیتا ہے)

باپ۔ (روشن کی ماں سے) اس ایک مہینے میں ہم نے کتنوں کو انکار نہیں کیا۔ پر انہیں کیسے نہ کروں۔ سیالکوٹ میں ان کی بڑی بھاری فرم ہے۔ میں نے مہینے بھر میں اچھی طرح پتہ لگا لیا ہے۔ ہزاروں کا تو ان کے یہاں لین دین ہے۔

ماں۔ بہو کی بیماری کا پوچھتے ہوں گے؟

باپ۔ انہیں شک تھا۔ پر میں نے کہہ دیا جگر کا بخار تھا۔ بگڑ گیا۔

ماں۔ بچے کا پوچھتے ہوں گے۔

باپ۔ ہاں پوچھتے تھے۔ پر میں نے کہہ دیا۔ بچہ ہے۔ پر ماں کی موت کے بعد اس کی صحت ٹھیک نہیں رہتی پرماتما ہی مالک ہے۔

ماں۔ تو آپ ہاں کر دیں۔

باپ۔ میں تو شگن لے لوں گا۔

(چلے جاتے ہیں۔ حقے کی آواز دور ہوتے ہوئے گم ہو جاتی ہے۔ ماں خوشی خوشی کمرے میں گھومتی ہے بھاشی آتا ہے۔ اور تیزی سے نکل جاتا ہے۔

ماں۔ بھاشی!

بھاشی۔ میں ڈاکٹر کے جا رہا ہوں۔

(تیزی سے چلا جاتا ہے۔ بیمار کے کمرے سے سریندر نکلتا ہے)

سریندر۔ (بھاری آواز میں) ماں جی ....

ماں۔ (گھبرا کر) کیا بات ہے۔ کیا بات ہے۔

سریندر۔ دانے لاؤ اور دیئے کا انتظام کرو۔

ماں۔ کیا؟ ....

(آنکھیں پھاڑے اس کی طرف دیکھتی رہ جاتی ہے)

(ہوا کی سائیں سائیں)

سریندر۔ اڑن اس سنسار سے جا رہا ہے۔

(فانوس ٹوٹ کر فرش پر گر پڑتا ہے۔ ماں بھاگ کر دروازے پر جاتی ہے۔)

ماں۔ (دروازہ پیٹتی ہے) روشی، روشی!

(دروازہ اندر سے بند ہے)

ماں۔ روشی روشی!!

روشن۔ (کمرے کے اندر سے بھرائی آواز میں) کیا بات ہے؟

ماں۔ دروازہ کھولو۔

روشن۔ تم پہلے لکشمی کا سواگت کر لو۔

ماں۔ روشی!

روشن۔ (چپ)

ماں۔ روشی!

(سیڑھیوں سے روشن کے والد کے حقہ پینے اور کھنکھانے کی آواز)

باپ۔ (سیڑھیوں سے ہی) روشن کی ماں بدھائی ہو۔

(باپ کا داخلہ، ماں ان کی طرف مڑتی ہے)

باپ۔ بدھائی ہو۔ میں نے شگن لے لیا۔

(کمرے کا دروازہ کھلتا ہے۔ مردہ بچے کی لاش لئے روشن داخل ہوتا ہے)

روشن۔ ہاں۔ ناچو۔ گاؤ۔ خوشیاں مناؤ۔

باپ۔ ہیں مرگیا۔

(ہاتھ سے حقہ گر پڑتا ہے۔ اور منہ کھلا رہ جاتا ہے)

ماں۔ میرا لال! (چیخ مار کر فرش پر بیٹھ جاتی ہے)

سریندر۔ ماں جی جا کر دانے لاؤ۔ اور دیئے کا انتظام کرو

پردہ

ندی کنارے گاگر لے کر جل بھرنے کو آئے

جناب چودھری منظور احمد صاحب منظور بی اے ایل ایل بی

کیف کی بارش آنکھوں کے میخانے سے برسائے
قدم قدم پر پھول کی ڈالی بن کر لچکا کھائے!
آنکھ کا جادو نیند کی دیوی کا جوبن شرمائے
من کا بھونرا جوبن رس کو دیکھ دیکھ للچائے
ندی کنارے گاگر لے کر جل بھرنے کو آئے

موجوں کے آئینہ کو وہ چھب سندر دکھلائے
اس شیشہ میں طور کا جلوہ بن بن کر تھرائے
چندرماں جو لہروں کے گہوارے میں لہرائے
آپ ہی اپنی دیکھ کے صورت شرم سے سمٹی جائے
ندی کنارے گاگر لے کر جل بھرنے کو آئے

چاند کی کرنوں سے چھوڑی ہے فطرت نے مہتابی
ڈورے لال شفق کی لہریں دونوں نین شرابی
رخساروں سے جلوے پھوٹیں سرخ سفید گلابی
جلوہ کی تابانی آنکھیں سورج کی جھپکائے
ندی کنارے گاگر لے کر جل بھرنے کو آئے

دنیا پر اک سکتہ طاری حیرانی حیرانی
من موہن متوالی آنکھیں مستانی مستانی
کیفیت سے چور جوانی دیوانی دیوانی
جل داتا کے منہ میں پانی دیکھ جسے بھر آئے
ندی کنارے گاگر لے کر جل بھرنے کو آئے

مدھ ماتی مدہوش جوانی جوں بادل کی رات
گدرا جوبن۔ نکھرا چہرہ ابلی گہلی گھات
لب پر مدھم، دھیمی دھیمی، سمٹی میٹھی بات
ان باتوں سے کاش وہ مدھرا کے ساغر چھلکائے

ندی کنارے گاگر لے کر جل بھرنے کو آئے

تن پر لرزہ، نور جبیں پر، خوشبودار ہوائیں
ساری میں ہلکی سی جنبش اور گیسو لہرائیں!
موجیں اور سب پنچھی مل کر گیت خوشی کے گائیں
آہ یہ منظر! واہ یہ منظر! جنت کو شرمائے
ندی کنارے گاگر لے کر جل بھرنے کو آئے

پانی کو نورانی ہاتوں سے گاگر میں ڈالے
ٹھوڑی سے وہ ساری کا گستاخ پلو سنبھالے
گاگر بھر کر غور سے چاروں جانب دیکھے بھالے
منہ سے بولے گاگر بھاری بھگون کون اٹھائے
ندی کنارے گاگر لے کر جل بھرنے کو آئے

میں گاگر کو ہاتھ لگا کر سارا نشہ بہادوں!
چرنوں میں آنکھوں کے بادل سے آنسو برسادوں!
اپنی پیت کا آنکھوں آنکھوں میں سندیس سنادوں!
پریم کتھا کو سن کر میری اس کا جی گھبرائے
ندی کنارے گاگر لے کر جل بھرنے کو آئے

آ شیریں نغمات کے من سے پریم نگر کو بھر دوں
خامہ سے مدرا ٹپکا کر میں ساگر کو بھر دوں
تو یہ میرا کاسہ بھر دے میں گاگر کو بھر دوں
جیون اپنا بھینٹ چڑھا دوں گر اک جام پلائے
ندی کنارے گاگر لے کر جل بھرنے کو آئے

پیت ہے شیریں، پیت ہے کومل جوں ندی کا پانی
سورج کی کرنوں کا زینہ۔ تاروں کی تابانی
پریم نگر کا راجہ ہوں میں تو کہلائے رانی
میرا تن من دھن سب تیرا تو میری بن جائے
ندی کنارے گاگر لے کر جل بھرنے کو آئے

جناب پروفیسر کنہیالال ایم اے:

چینی شاعری

چینی شاعری پر قلم اٹھانے سے پہلے میں آپ پر واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ میں چینی نہیں جانتا۔ مگر اس بات کا مجھے چنداں افسوس نہیں کیونکہ اگر میں چینی نہیں جانتا۔ تو آپ کب جانتے ہیں؟ چینی تمدن، چینی لٹریچر، چینی تہذیب سے میری واقفیت صرف دو چیزوں کی وساطت سے ہوئی ہے۔ ان میں سے ایک تو ہے چینی کا پیالہ جو کہ میں نے پچھلے سال آل انڈیا نمائش سے خریدا تھا۔ اور دوسری ہے ایک چینی تصویر جس میں کہ ایک چینی شہزادی رہیں اسے شہزادی ہی کہوں گا، ایک کتے کی طرف آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہی ہے بہرحال آپ کو ان چیزوں سے کیا مطلب؟ آپ تو یہ جاننا چاہتے ہیں کہ چین کا سب سے بڑا شاعر کون ہے۔ اور چین میں اس وقت کتنے شاعر ہیں تو لیجئے چین کا سب سے بڑا شاعر شین سے شک ہے۔ اور چین میں اس وقت ہزاروں شاعر ہیں۔ بلا مبالغہ چین کا بچہ بچہ شعر کہتا اور سمجھتا ہے۔ اگر میں ان تمام شاعروں کے نام لکھ دوں تو آپ یقیناً حیران ہو جائیں اور اگر میں ان کے مطبوعات کی فہرست بھی شامل کر دوں۔ تو آپ کی حیرانی پریشانی میں تبدیل ہو جائے مگر میرا مقصد آپ کو حیران یا پریشان کرنے کا نہیں۔ میرا مطلب تو آپ کا چینی شاعری سے تعارف کرانا ہے چینی شاعروں کے نام یاد کرنے کا ایک نہایت سہل طریقہ مجھے یاد ہے۔ اور وہ یہ ہے۔ کہ آپ ان چھ سات لفظوں کو یاد کر لیں۔ پانگ۔ شانگ۔ ٹانگ۔ شک۔ بک۔ تین۔ شین۔ اب انہی لفظوں کے ہیر پھیر اور امتزاج سے چین کے ہر ایک چھوٹے اور بڑے شاعر کا نام بن سکتا ہے۔ مثلاً اگر کوئی آپ سے پوچھے۔ کہ چین کا سب سے بڑا رومانی شاعر کون ہے؟ تو آپ فوراً کہہ دیجئے۔ تین بک بک۔ چین کا سب سے بڑا انقلابی شاعر کون ہے؟ شین ٹانگ ٹانگ۔ انتقادی شاعر؟ شک مین ٹانگ۔ اچھا آپ کی ایک مشکل تو حل ہوئی، اب آگے چلیے۔

یقیناً آپ اس بات کے جاننے کے خواہشمند ہیں۔ کہ چینی شاعر کن چیزوں کو شاعری کا موضوع بناتے ہیں، اور ان کے کلام کی کیا خصوصیات ہیں۔ تو سب سے پہلی بات جو کہ آپ کو سمجھنی چاہیے وہ یہ ہے کہ چینی شاعر عموماً پھولوں، جھیلوں، سمندروں، اور سانپوں کے متعلق لکھتے ہیں۔ مثلاً شین مین ٹانگ کو ہی لیجئے۔ اپنے تازہ مجموعہ کلام میں اس نے سوائے سانپوں کے کسی اور چیز کا ذکر تک نہیں کیا۔ مثال کے طور پر اس نظم کو لیجئے۔

"آہا جھیل کے سنہری پانی پر سانپ ناچ رہا ہے۔
کیا دلکش نظارہ ہے۔
کاش کہ ہم سب سانپ ہوتے۔"

مگر آپ یہ نہ سمجھئے۔ کہ شین مین ٹانگ سوائے سانپوں کے کسی اور چیز پر لکھ ہی نہیں سکتا۔ اس نے مینڈکوں، چوہوں اور مچھروں پر بھی لاتعداد نظمیں لکھی ہیں۔ خیر یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا۔ دوسری بات چینی شاعری کے متعلق یہ ہے۔ کہ چینی شاعر عجیب و غریب استعارے نادر الوجود ترکیبیں اور نہایت دلکش تشبیہیں استعمال کرتے ہیں مثلاً

شین شانگ ایک جگہ لکھتا ہے :-

میری محبوبہ کی آنکھیں
سبز ہیں
شفتالو کے پتوں کی طرح
اس کے دانت
تیز ہیں
تلوار کی طرح
اور آندھی کی طرح
اس کے بال سیاہ ہیں۔
اور قد دیوارِ چین سے اونچا ہے۔

آپ نے کالی، نیلی، اور پیلی آنکھیں تو دیکھی اور سنی ہونگیں۔ مگر "سبز آنکھیں" صرف شین شانگ کے کلام ہی میں پائی جاتی ہیں، اور محبوبہ کے دانتوں کو کس چیز سے تشبیہ دی ہے؟ جزاک اللہ صاحب! یہ چین ہے چین۔ اور سنئے۔ پانگ ین لکھتی ہے :-

سورج کی ٹھنڈی ٹھنڈی کرنیں مجھے بے چین کر رہی ہیں
خزاں آگئی۔
طرح طرح کے پھول کھلے۔
بلبل گا رہی ہے۔ مگر اُف!
مجھے کس قدر بھوک لگ رہی ہے۔

حیران ہونے کی کوئی بات نہیں چین میں یا یوں کہیے، چینی شاعری میں ہر ایک چیز ممکن ہے۔ اور یہی تو چینی شاعری کی خوبی ہے۔ ہمارے ہاں بہار میں پھول کھلتے ہیں۔ مگر چینی شاعروں کا تخیل دیکھیے۔ کہ خزاں میں پھول کھلوا دیئے۔ اور پھر سورج کی ٹھنڈی ٹھنڈی کرنیں! قلم توڑ کر رکھ دیا ہے۔

چینی شاعر پھولوں کے بہت دلدادہ ہوتے ہیں۔ ایک شاعر لکھتا ہے :-

مجھے نیلوفر کے پھول لا دو۔
اور ہاں نرگس، چنبیلی اور گلاب بھی۔
کیا تم نے نہیں سنا۔
مجھے نیلوفر کے پھول درکار ہیں۔
کہیں سوسن نہ لے آنا۔ بے وقوف!
مجھے چاہئیں۔ صرف نرگس۔ چنبیلی اور گلاب۔
اچھا۔ ٹھہرو۔ آج مت لانا۔
مجھے آج زکام ہے۔

آخری مصرع میں شاعر نے حقیقت نگاری کو جس معراج پر پہنچایا ہے۔ وہ اس کا ہی حصہ ہے۔ کاش ہمارے نوجوان ہندوستانی شاعر کچھ چینی شاعروں سے سیکھتے۔ ذرا غور کیجئے۔ شاعر پھول منگوانا چاہتا ہے۔ مگر یک لخت اس کو خیال آتا ہے۔ کہ اسے زکام ہے اور وہ پھول سونگھ نہیں سکے گا۔ تو پھر پھول منگوانے کا فائدہ ہی کیا "پھر کبھی سہی" شاعر کہتا ہے۔ اور نظم کو اس رنگین مصرع پر کہ "مجھے آج زکام ہے" ختم کر دیتا ہے۔

اظہارِ عشق میں چینی شاعروں کا کوئی ہم پلہ نہیں وہ دقیق سے دقیق نفسیاتی مسائل کو نہایت خوش اسلوبی سے ادا کر جاتے ہیں اس طرح کہ بے چارے ہندوستانی شاعر منہ تکتے رہ جاتے ہیں۔ مثلاً سین ٹانگ شنگ کو لیجئے۔ لکھتا ہے :-

کل میں نے خودکشی کرنے کی ٹھانی۔
میں نے زہر خریدا۔
میں سمندر کے کنارے پر گیا۔
میں نے اپنے کپڑوں پر پٹرول ڈالا۔
میں زہر کی گولی کھا کر۔
اپنے کپڑوں کو آگ لگا کر
سمندر میں کودنا چاہتا تھا۔
کہ معاً مجھے خیال آیا۔
کہ وہ مٹھائی جو کہ تمہاری بہن نے تم کو بھیجی تھی۔
میرے مرنے کے بعد
تم اکیلی ہی کھا جاؤ گی۔۔
میں نے خودکشی کا خیال ترک کر دیا۔
اور سیدھا گھر چلا آیا۔

کیوں صاحب! دیکھا آپ نے چینی شاعری کا کمال!
شاعر خودکشی پر آمادہ تھا۔ اس نے بیک وقت تین مختلف طریقوں سے اپنے آپ کو ہلاک کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا تھا۔ مگر اچانک جب کہ وہ دنیا کی ہر ایک چیز سے کنارہ کشی کر کے زہر کھا کر کپڑوں کو آگ لگا کر سمندر میں کودنا چاہتا تھا۔ اسے ایک ایسی چیز یاد آئی۔ جس نے اس کے دماغ میں عجیب ہیجان پیدا کر دیا۔

تنہائی! اور پھر اس پر یہ پریشان کن خیال کہ اس کی بیوی اسے اکیلی کھا جائے گی! یہ ہے نفسیاتی شاعری۔

شاعر انسانی دماغ کی عمیق گہرائیوں میں جس خوبی سے اتر سکتا ہے۔ وہ صرف نفسیات کے ماہر ہی جان سکتے ہیں۔

اب صرف ایک اور بات آپ کو سمجھ لینی چاہیئے۔ اور پھر آپ چینی شاعری کو مکمل طور پر سمجھ جائیں گے۔ وہ بات یہ ہے کہ چینی شاعر بعض دفعہ اپنے شعروں میں اور کئی دفعہ اپنی غزلوں میں ہندوستانی شاعروں کے تخیل کی ترجمانی کرتا ہے۔ مثلاً پو ہانگ لی ایک جگہ کہتا ہے:۔

اے میرے محبوب۔ تمہاری گلی میں میں آنا کس طرح چھوڑ دوں کیونکہ یہ تو ایک عمر بھر کی عادت ہو چکی ہے۔

اب آپ میں سے جنہوں نے کلام غالب کا مطالعہ کیا ہے وہ بخوبی جانتے ہیں کہ یہ شعر حضرت غالب کے مشہور شعر ؎

چھٹتے چھٹتے ہی چھٹے گا اس کی گلی میں جانا
عادت اور وہ بھی عمر بھر کی عادت

کا ماثل ہے۔ ایک اور جگہ یہی شاعر لکھتا ہے:۔

"صرف وہی شخص نیند کا لطف اٹھا سکتا ہے جس کے بازو پر تمہاری زلفیں پریشان ہو جاتی ہیں"

اب یہ شعر آپ کو غالب کے مشہور شعر ؎

نیند اس کی ہے دماغ اس کا ہے راتیں اس کی ہیں
جس کے بازو پر تری زلفیں پریشاں ہو گئیں

کی یاد دلاتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے۔ کہ پو ہانگ لی غالب کی شاعری سے نہایت متاثر ہوا ہے۔

کم بخت ٹانگ ٹانگ نے علامہ اقبال کی مشہور نظم: "اٹھو میری دنیا کے غریبوں کو جگا دو" کا پورا ترجمہ کر ڈالا ہے۔ لکھتا ہے:۔
"کہ جس کھیت سے کاشتکار کو روٹی نہیں ملتی۔ اس کے ہر ایک خوشہ گندم کو جلا دو"

چین کا مشہور شاعر بھک بھک جو کہ شاعر ہونے کے علاوہ ظریف بھی ہے۔ اپنے ملک کے نوجوانوں کی مغرب پرستی کا مذاق اڑاتے ہوئے کہتا ہے:۔

"افسوس کہ چین کے نوجوان مغرب کے دلدادہ ہو گئے ہیں انہیں یہ معلوم نہیں۔ کہ مغرب میں تمام برتن بلور کے ہوتے ہیں اور ہمارے ہاں سب چینی کے"

غور کیجئے۔ بھک بھک کا تخیل علامہ اقبال کے تخیل کے کس قدر نزدیک پرواز کر رہا ہے۔ جو بات بھک بھک نے آج کہی۔ وہ ہندوستان کے شاعر نے بیس برس پہلے ہمارے ذہن نشین کرا دی ؎

ہم مشرق کے مسکینوں کا دل مغرب میں جا اٹکا ہے
واں کنٹر سب بلوری ہیں یاں ایک پرانا مٹکا ہے

مگر اب زیادہ مثالیں دینے کا کیا فائدہ۔ آپ میرا مطلب تو سمجھ گئے ہیں۔ اور اگر آپ نہیں سمجھے۔ تو آپ میری کتاب "چینی شاعری" (جس کے ساتھ علامہ بھک بھک، اور ان کے بڑے بھائی علامہ بک بک کا بصیرت افروز دیباچہ شامل ہے) خرید کر پڑھیں۔ آپ کی آنکھیں کھل جائیں گی۔ آپ کا دماغ چکرا جائے گا۔ اور آپ محسوس کریں گے کہ ہندوستانی شاعری چینی شاعری کے سامنے اس طرح معلوم ہوتی ہے جس طرح ہندوستانی مٹی کا پیالہ چینی پیالے کے سامنے (وہ چینی کا پیالہ جو میں نے پچھلے سال آل انڈیا نمائش سے خریدا تھا!)

کے اس خوابیدہ جوہر کو بیدار کردو، جسے رسم و تقلید کی گھناؤنی کیچڑ میں دفن کردیا گیا ہے۔

میں چلاتا ہوں، مگر دنیا کہتی ہے میں دیوانہ ہوں!

....

اپنی تیوری آلود جبیں پر موٹی موٹی شکنیں ڈال کر وہ کہتے ہیں۔

"تو پاگل ہے۔ تجھے اس سے محبت تھی۔ اور اس لئے تیرا دل مادی حقائق سے ناآشنا ہے۔ تو نہیں سمجھتا کہ مذہب و اخلاق کے عالمگیر قوانین کی بقا کے واسطے انسان اگر اپنا دل خون نہ کرتا رہتا تو دنیا پست جذبات کی کشمکش میں ایک خواب کی طرح چور چور ہو چکی ہوتی زندگی ایک سیدھی لکیر نہیں، کہ جس پر جبلیات کے اشاروں پر ناچتا ہوا انسان بڑھتا چلا جائے ـــ اس میں نشیب و فراز ہیں۔ طوفان ہیں ـــ اور آندھیاں ہیں ـــ تیری طرح اگر ہر ایک انسان ان طوفانوں میں بدحواس ہو کر بغاوت بغاوت کی صدائیں بلند کرنے لگے۔ تو پھر دیوانوں کو دیوانہ کہنے والا کوئی بھی نہ رہے"۔

میں سنتا ہوں اور محسوس کرتا ہوں کہ چاند ستارے ٹوٹ کر ذروں میں تبدیل ہو رہے ہیں۔ مجھے اس سے محبت تھی۔ یہ مجھے معلوم نہیں ـــ مجھے اتنا سمجھنے کا کبھی ہوش ہی نہیں ملا۔ میں تو صرف یہ جانتا ہوں، کہ جب کبھی میں نے اپنی ذات سے علیحدہ اس کا تصور قائم کرنے کی کوشش کی۔ تو ایسا محسوس ہوا، جیسے اب میرے پاس کچھ بھی نہیں رہا۔ میں نے جب کبھی اس کی فردوسی رعنائیوں میں اپنی نظروں کو جی بھر کے ڈبونا چاہا، تو معلوم ہوا، کہ دیکھنے کی قوت سلب ہو گئی ہے، یا پھر وہ نظریں انہی گہرائیوں میں کھو گئیں۔ اور میری آنکھوں تک واپس نہ آئیں۔ پانی یا لائم جوس کا گلاس اس کی طرف بڑھاتے ہوئے یا اس کے مرمریں ہاتھ سے پان لیتے ہوئے اگر اتفاق سے کبھی میری انگلیاں اس کے حسین سر انگشت سے چھو گئیں، تو سچ مانئے اس ایک نئی لمس کے خیر مقدم کے لئے روح کی تمام سپردگی انگلیوں پر کپکپی بن کر مستولی ہو گئی۔ اور اگر کبھی ایسا ہوا ـــ مگر شاذ ـــ کہ میں نے اسے صرف اپنا سمجھنے کی تمنا کی، تو باور کیجئے۔ کہ سر سے پاؤں تک یہ محسوس ہوا، گویا ستار کا ایک بے مایہ تار ہے جو بعید الحصول نغموں کی طلب میں شکستہ ہو کر ٹھہرا رہا ہے ـــ پھر اگر یہ سب کچھ محبت ہے۔ تو کوئی شوق سے اسے محبت کہہ لے۔ میں نے تو اب تک اسے پرستش سمجھا ہے!

مگر وہ کہتے ہیں، تو پاگل ہے اور جبلیات کا دیوانہ!!

....

وہ رات مجھے اب تک یاد ہے۔

کہتے ہیں "چاندنی رات" اور "تاج محل" فطرت اور محبت کے دو لطیف مصرعے ہیں۔ اور جب کبھی یہ دونوں ہم آغوش ہو جاتے ہیں تو کائنات کا ایک بے پناہ حسین "شعر" تخلیق ہو جاتا ہے۔ عورت اسی شعر کو نغمہ سمجھتی ہے۔ اور اس کی فطرت کی خوابیدہ موسیقی بے اختیار گنگنانے لگتی ہے۔ مرد کے نزدیک یہی شعر ایک جرعہ کوثر ہے وہ پیتا ہے۔ اور بہکتا ہے ـــ شاید اسی لئے وہ کہا کرتے ہیں۔ کہ دو مخالف جنس رکھنے والی جوانیوں کا ان فضاؤں میں یکجا ہونا خطرے سے خالی نہیں۔

مگر نہ جانے کیوں مجھے اور اسے بھی یہی فضائیں سکون پرور محسوس ہوتی تھیں۔ اور ہم اکثر اسی بہشت ارضی کے گوشوں میں حوادث عالم کی سپر تلاش کیا کرتے تھے۔

ایسی ہی چاندنی رات تھی وہ!

چمن کے ایک پہلو میں سبز گھاس کے مخملیں فرش پر ہم بیٹھے تھے۔ وہ کچھ دیر سے خاموش تھی۔ میں نے خدا جانے کیوں کہا "یہی چاندنی "تاج محل" کے حدود سے باہر بھی موجود ہے۔ مگر نہ جانے اس مرمریں عمارت کی صباحت سے مس ہوتے ہی یہ کیوں محسوس ہوتا ہے۔ کہ چاندنی یہ ہے۔ وہ نہیں"۔

اس نے خفیف تبسم کے ساتھ کہا ـــ "تم چاندنی کے فلسفہ کو سمجھے ہی نہیں۔ دنیا کی کسی زبان میں اس موضوع پر لکھی ہوئی کوئی نظم اٹھا لو۔ تم دیکھو گے کہ اس میں نشاط بھی ہے۔ اور الم بھی ـــ پھر اسے بھی جانے دو۔ کہ یہ چیز دنیا کی نظر میں صرف ایک شعر ہی سمجھی جائے گی۔ اپنے ذاتی تجربات کا تجزیہ کرو۔ اور سوچو کہ چاندنی نے تمہارے احساسات کے ساتھ کیسا سلوک کیا ہے۔ میں تو یہ جانتی ہوں، کہ

اسی پُراسرار خنک سیلِ نور میں محصور ہو کر میرے دل میں ہمیشہ ایک طربیہ اور المیہ احساس کا امتزاج پیدا ہوا کرتا ہے۔ ممکن ہے میرا نتیجہ غلط ہو۔ مگر مجھے تو یہی یقین ہے۔ کہ چاند کی روشنی ایک الم انگیز نشاط یا نشاط انگیز الم کی ترجمان ہے۔ اس کی ہر کرن میں ایک ایسی لطیف کرب چھپی ہوتی ہے جس سے آنکھ کو آنسو ملتا ہے اور ہونٹوں کو تبسم!"

وہ خاموش ہو گئی اور پھر تاج پر ایک نظر ڈالتے ہوئے بولی۔ "پھر یہ حسین تاج کیا ہے؟ ——— یہ بھی تو آنسو اور تبسم کا ایک مدفن ہے۔ اس کا نظارہ نفسیاتِ انسانی پر غرض اس سے ایک وجدان پیدا نہیں کر دیتا۔ کہ ان مرمریں دیواروں پر ایک ہزار انسانوں نے شب و روز بیس سال تک اپنی جبین کا پسینہ ٹپکایا ہے۔ بلکہ زیادہ تر صرف اس واسطے کہ اس کی حدود میں مسرت و غم پہلو بہ پہلو سو رہے ہیں۔ اب تم خود ہی سوچو کہ جب چاندنی کے تاثرات بھی وہی ہیں جو تاج سے پیدا ہوتے ہیں۔ تو ان دونوں کا اجتماع کیوں نہ قلب و نظر کے واسطے ایک سحر بن جائے ——— اسی لئے تو محسوس ہوتا ہے۔ کہ چاندنی جو تاج پر پھیلی ہے وہ نہیں۔ جو حدودِ تاج سے باہر موجود ہے!"

میں نے نظریں جھکائے ہوئے کہا ——— "جمالیات کا یہ نظریہ بالکل تمہارے ذہنِ رسا کی تخلیق ہے۔ اور چاہے یہ صحیح ہو یا نہ ہو۔ مگر دلچسپ و حسین ضرور ہے۔ . . . . . ."

وہ بولی ——— "میں نظریات تخلیق نہیں کرتی۔ محسوسات و حسیات کا تجزیہ میری عادت ہے۔ اسی کو تم جو چاہو نام دے دو۔ پھر جو کچھ میں نے ابھی ابھی کہا ہے۔ وہ نئی چیز نہیں۔ غالباً ہر ایک انسان جانتا ہے۔ کہ طرب و ملال کا باہم امتزاج ہی وہ شے ہے جس میں انسانی جذب و کشش کا راز پنہاں ہے۔ دنیا کی ہر وہ شے جس میں مسرت و غم کے عناصر پہلو بہ پہلو ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ انسانی قلوب کو متاثر کرنے میں انتہائی کامیاب ہوتی ہے۔ ایک معمر شخص جس کی زندگی مجسم اضمحلال و الم ہے موت کی گود میں اس قدر حسین معلوم نہیں ہوتا جس قدر کہ ایک نوجوان اپنی جوان مرگی کے وقت نظر آتا ہے۔ اجنتا کے غاروں میں وہی تصویر شاہکار قرار دی گئی۔ جس کے اندر ایک جوان شہزادی بسترِ مرگ پر دکھائی گئی ہے۔ تم خود مصور ہو۔ اسلئے شاید یہ بتانا تحصیل حاصل ہے۔ کہ پس منظر یا ارضیہ کا تضاد حقیقی تصویر کی دل آویزی میں کس قدر اضافہ کر دیتا ہے۔ موسیقی میں بھی وہی راگ عام لوگوں کے واسطے سحر پرور ثابت ہوتے ہیں۔ جن کے اندر مسرت کے بلند آہنگ پردوں کے ساتھ محرومیت انگیز کومل سروں کی آمیزش زیادہ ہوتی ہے ——— پھر خود زندگی کی دلفریبی بھی تو مسرت و الم کی اسی آمیزش کی رہینِ منت ہے۔

"نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا!"

اس کا ایک ایک لفظ میری روح میں جذب ہوتا چلا گیا۔ اور میں اس کے الفاظ کے سہارے ان رفعتوں کی طرف اپنے ادراک کو محوِ پرواز کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ جہاں وہ اس قدر آسانی سے پہنچتی معلوم ہوتی تھی آخر چند لمحات کی خاموشی کے بعد میں نے کہا ——— "تم ایک خطرناک فلسفی میں تبدیل ہوتی معلوم ہو رہی ہو"

"خطرناک؟"

"ہاں ——— اور اس لئے کہ خرد کے پاس خبر کے سوا کچھ اور نہیں ذہن کی اس جرأت کے نتائج صرف دو ہی ہوتے ہیں۔ یا تو انسان جیتے جی مر جاتا ہے، یا مرنے کے بعد بھی جیتا رہتا ہے!"

وہ معمول سے زیادہ زور سے ہنسی اور پھر میری نیچی آنکھوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا،

"زندگی کے واسطے ہر شخص کو فلسفی بننا پڑتا ہے . . . .!"

"کیوں؟"

"اس لئے کہ اب زندگی بھی ایک "فن" ہو کر رہ گئی ہے، اور ہر ایک فن میں کسی نہ کسی علم کے مسلمات بنیادی حیثیت سے ضرور ہوتے ہیں تم اچھی طرح جانتے ہو کہ "فن" فطرت کا حریف ہے۔ ہماری زندگی جس قدر فطری اصولوں سے دور ہٹتی چلی جاتی ہے۔ اسی قدر وہ "فن" کے قریب ہوتی جاتی ہے۔ اب سے محض ایک صدی پیشتر کے انسان کو اگر موجودہ زمانے میں کسی صورت سے زندہ کر دیا جائے۔ تو ذرا سوچو کہ زندگی کے ہر گام پر وہ کس قدر غیر مانوس مسائل سے روشناس ہوگا اس کی سمجھ میں نہ آئے گا۔ کہ کس طرح زندہ رہے۔ اور ممکن ہے کہ آخر وہ یہ نتیجہ اخذ کرلے۔ کہ یہ دنیا فطرت کے قوانین سے ہی کوئی

واسطہ نہیں رکھتی۔ ایک مقررہ مدت تک ہوا کے اندر سانس لیکر خاموش ہو جانا۔ اگر زندگی ہے۔ تو کبھی ہوگی ـــــ اب اس کا وجود نہیں اب زندگی نام ہے اسی شے کا جو انسان اپنی عقل و خرد یا علوم و مذہب کے ذریعہ اپنے واسطے خود بناتا ہے۔ اگر وہ زندگی بنانے کا یہ "فن" نہیں جانتا، تو ایک انسان کی حیثیت سے اس زمین پر اسے کوئی نہ جینے دیگا ـــــ یقین نہ ہو تو ہندوستان کی نامراد دوشیزہ کی روداد حیات پر ایک نظر ڈال کر دیکھ لو۔ وہ آج بھی یہی چاہتی ہے۔ کہ فطرت کے اصولوں پر زندگی بسر کرے۔ مگر ہماری موجودہ دنیا کے آہنی قوانین اس کی تاب نہیں رکھتے۔ اور اسے زندہ درگور کر دیتے ہیں!"

"مگر وہ کہتے ہیں۔ کہ اسی میں اخلاق و تہذیب اور سماج کے مصالح کا خیال ہے۔" میں نے کہا۔

اس نے نزدیک سے ایک ننھا سا پھول توڑا۔ اور اپنی مرمریں انگلیوں میں اسے مسلتے ہوئے کہا "ہاں ہاں ـــ یہی مصالح تو ہیں، جن کو میں بحیثیت مجموعی اپنی اصطلاح میں "فن" کہتی ہوں۔ آہ! تم نہیں جانتے! ـــــ کائنات کی ہر مخلوق کو اپنے واسطے جینے کا حق ہے۔ مگر عورت صرف دوسروں کے واسطے زندہ رہ سکتی ہے ـــ پھر ہندوستان کی عورت؟ ـــــ آہ! اس غریب کو تو دوسروں کیواسطے مرنا بھی پڑتا ہے۔ اسے خادمہ بنالو ـــــ اس سے اپنی فرصتوں کو لبریز نشاط کر کے جنبی کہو۔ یا فاتر العقل ـــــ اس کی خودداری و بلندی کو رسوم کی خاطر زمین میں دفن کر دو ـــــ مگر وہ عورت ہے ـــ اور اس لئے اسے اتنا بھی حق نہیں کہ خدا کو اپنا کہہ سکے۔ یہی ہے نادہ چیز جسے مصالح کہتے ہو؟ ـــــ آہ کاش ہمیں معلوم ہو سکتا۔ کہ خود فریبی کی ایک انتہا ہوتی ہے۔ کاش ہم اپنے ہی وطن کے تنگ مکانوں کی متعفن اندھیری فضاؤں میں یہ دیکھ سکتے! کہ ہندوستان کی بیزبان دوشیزہ کو حس عفریت کے حوالے کر دیا گیا ہے۔ اس نے اسکی رگ رگ سے زندگی کا خون چوس ڈالا ہے ـــــ جسے کل دلہن بنا کر موت کے جبڑوں میں چھوڑ دیا گیا تھا آج وہ ایک لاش ہے۔ جو مجبوراً زندگی کا بھیانک مظاہرہ کر رہی ہے۔"

یہ کہتے ہوئے وہ اٹھی، اور "تاج" کی زیریں منزل سے گذرتی ہوئی، اس طرف چلدی جہاں چاند کی کرنوں کے حضور میں جمنا کی سبک موجیں ایک دھیما سا جلترنگ بجا رہی تھیں۔ میں اس کے ساتھ تھا۔ اور نہ جانے کیوں یہ محسوس کر رہا تھا۔ کہ اس کے ہمراہ اسی طرح بڑھتا چلا جاؤں ـــــ بڑھتا چلا جاؤں، اس وقت تک کہ ہم دونوں جمنا کی سطح پر سے تیرتے ہوئے گزر جائیں۔ مجھے معلوم تھا۔ آج وہ نہایت عمیق تاثرات لئے ہوئے تھی ـــــ کاش میں ان تاثرات کی نوعیت سمجھ سکتا!

"کشتی پر چلوگی؟" میں نے پوچھا۔

وہ ایک لفظ کہے بغیر میرے ساتھ بڑھی۔ اور چند منٹ کے بعد ہم دونوں جمنا کی آغوش میں کشتی پر تھے۔ ماحول کے حسن و تازگی سے اس کی جبین پر ـــ اب فکر کی وہ شکن نہ رہی تھی۔ میں نے بے اختیار کہا ـــ "اگر تم اسی طرح خاموش رہیں، تو مجھے یقین ہو جائے گا۔ کہ یہ سب کچھ ایک خواب ہے"!

ایک بار پھر بجلی اس کے لبوں پر تڑپی اور پھر یہی چیز اسکی آنکھوں میں ستارے بن کر چمکنے لگی ـــــ اس نے کہا "خواب؟ ـــ ہاں واقعی یہ ایک خواب ہے۔ اور ایسا خواب جو صرف جاگتے ہی میں دیکھا جا سکتا ہے۔ نیند کی دنیا میں بھی خواب تیرتے پھرتے ہیں، مگر ان میں یہ کیف کہاں! ـــــ وہ تو محض ایک سراب ہیں، جب جاگتے جاگتے اپنی پوری کھلی ہوئی آنکھوں کے سامنے میں دیکھتی ہوں۔ کہ ہوش و فہم احساسات کی شدت میں عجز خموش ہو کر رہ گئے ہیں ـــ جب مجھے مکمل بیداری کے عالم میں یہ محسوس ہوتا ہے۔ جیسے میں ایک بے ہوش تتلی کی طرح پھولوں کی گود میں گر گئی ہوں ـــــ اس وقت میں سمجھتی ہوں، کہ یہ خواب ہے۔ پھر ایک مجھ پر ہی موقوف نہیں ہم سب ایسے خواب دیکھتے رہتے ہیں، اس کشتی کھینے والے کو دیکھو کس قدر سکوت کے ساتھ اپنے چپو کی جنبش سے کھیلتا جا رہا ہے۔! تم سمجھو گے یہ ہمہ تن اپنے کام میں مشغول ہے۔ مگر آہ کون جانتا ہے کہ یہ فاقہ کش مظلوم انسان اسوقت کیا کیا خواب دیکھ رہا ہے!! اس کی تمنائیں بھی ہونگی ـــــ امیدیں بھی ـــ مسرتیں بھی کچھ خواب بن گئیں اور کچھ ابھی بن رہی ہیں ـــــ یہ ان سب

کو دیکھ رہا ہے — اور کیا کرے غریب! — نہ جانے کیا مجبوریاں ہوں گی۔ کہ یہ مر نہیں گیا — یہی خواب جب بھیانک اور انتہائی دہشت خیز ہو جاتے ہیں، تو گھبرا کر آنکھ کھل جاتی ہے۔ دنیا اسے خودکشی کہتی ہے۔"

میں چند لمحات تک سوچتا رہا — سوچتا رہا، یا شاید کھویا رہا، کیونکہ جب ملاح نے اچانک گانا شروع کر دیا، تو مجھے محسوس ہوا۔ کہ میں چونک کر جاگ رہا ہوں۔ وہ دھیمے سروں میں گا رہا تھا — "نیا ہے ڈوبتی — موہے کون لگائے پار......" جمنا کے آغوش میں چاندنی پانی بن کر بہ رہی تھی۔ کچھ دور دائیں جانب "تاج" کی مرمریں صباحت نظارہ فروش تھی۔ بائیں طرف اونچے نیچے کھنڈروں کے پار کھیت پھیلتے چلے گئے تھے۔ خاموشی مستولی تھی، اور اس خاموشی میں ملاح کا کھویا گا رہا تھا — "نیا ہے ڈوبتی موہے کون لگائے پار......"

آہ! کس قدر حسین خواب تھا یہ!

میں نے اس کی طرف ایک نظر ڈالی۔ وہ خاموش بیٹھی سن رہی تھی۔ ہوا کی ہلکی ہلکی موجوں سے اس کی ریشمیں ساری فرشتوں کے مقدس پروں کی طرح تھرتھرا رہی تھی۔

میں نے کہا — "کیا سوچ رہی ہو؟"

اس نے اپنی خوبصورت آنکھیں پوری بیدردی سے مجھ پر جماتے ہوئے جواب دیا — "وہی جو تم سوچ رہے تھے۔"

میرا ذہنی استقلال اس غیر متوقع جواب سے متزلزل ہو گیا۔ میں نے کہا — "میں تو کچھ بھی نہیں سوچ رہا تھا۔"

وہ بولی — مسکراتے ہوئے — "مجھے معلوم تھا تم یہی کہو گے۔ اب تم مجھ سے پوچھو، تو بتاؤں، تم کس سوچ میں تھے۔"

میں نے پوچھا "اچھا بتاؤ۔"

وہ شوخی سے بولی — "نیا ہے ڈوبتی موہے کون لگائے پار"

"میں سمجھا نہیں"۔ میں نے کہا۔

"یہ چیز سمجھنے کی ہے ہی نہیں — پھر یہ بھی کیا ضرور ہے۔ کہ تم ہر چیز سمجھ جاؤ۔"

میں نے ہنستے ہوئے کہا — "ان چند لمحات میں تم اور زیادہ شدید فلسفی بن گئی ہو۔"

"فلسفی نہیں — اگر الزام ہی دینا ہے تو شاعر کہو۔ خواب دیکھنا، بیداری میں ایسے حسین خواب دیکھنا — فلسفہ نہیں۔"

ہم کشتی پر سے اتر کر پھر "تاج" کی طرف روانہ ہو گئے۔ تو میں نے کہا "اگر برا نہ مانو، تو ایک بات کہوں؟"

"ضرور!"

"بیداری میں یہ مسلسل خواب دیکھنا تمہارا کام نہیں۔"

"پھر یہ کام کس کا ہے؟"

"یہ مقدر ہے صرف ان نامرادوں کا، جن کو قدرت نے تمنا پروری کی جرأت دے کر کامرانی سے محروم کر دیا ہے۔ تم ذہین ہو، تعلیم یافتہ ہو اور حصول آرزو کے تمام مادی ذرائع تمہارے واسطے مہیا ہیں، پھر اگر تمہارے ذہن میں بھی ناکام جذبات کا یہ محشر برپا رہے گا۔ تو دنیا کا کون انسان ہے، جو بیداری کا دعویٰ کر سکے گا؟"

"آہ تم سمجھے نہیں" وہ بولی۔

اور پھر وہ چلی گئی۔ میں نے دیکھا۔ اس کی حسین آنکھوں میں ایک ننھا سا آنسو چمک رہا تھا۔

آج میں وہ سب کچھ سمجھ گیا ہوں — وہی جو اس رات کو نہ سمجھا تھا — اور چاہتا ہوں، کہ میری طرح ساری دنیا اسے سمجھ جائے — مگر لوگ کہتے ہیں، تو کچھ نہیں جانتا۔ تو دیوانہ ہے!!

....

"شادی کے لئے پیشگی ہی مبارکباد پیش کرتا ہوں"۔ میں نے اس کے دارالمطالعہ میں آرام کرسی پر دراز ہو کر قدرے تبسم کے ساتھ کہا۔

اس نے میز پر سے ایک کتاب اٹھا کر بے مقصد طور پر اوراق کو منتشر کرنا شروع کر دیا۔ آج وہ معمول سے زیادہ قیامت "بنی ہوئی" تھی۔ میرے سوال پر اس کی خاموشی سنگین ہوتی جا رہی تھی۔ اس کی صورت سے ظاہر تھا۔ کہ میرے الفاظ نے اس کے ذہن کے سامنے ایک ایسا مسئلہ پیش کر دیا ہے۔ جس کا کوئی فیصلہ وہ اب

تک نہیں کر سکی تھی۔

"کیا تمہیں مبارکباد قبول کرنے کی عادت نہیں؟" میں نے پھر مسکراتے ہوئے کہا۔

"تم ہی تہیہ کر کے آئے ہو۔ تو مجھے خواہ مخواہ عادی ہونا پڑے گا" اس نے تبسم کی ایک سعیٔ مضحمل کے ساتھ جواب دیا۔

"ورنہ؟"

"ورنہ شادی اور مبارکباد کم از کم ہم جیسی ہستیوں کیواسطے آجکل قطب نما کی دو سوئیاں ہیں۔ جو کبھی ایک سمت پر متحد نہیں ہو سکتیں"

"کیوں؟"

"اس کیوں کا جواب کسی مرد سے پوچھو تو اچھا ہے"

"مگر تمہارے پاس اس کا کیا جواب ہے؟"

"میرے پاس کوئی جواب ہوتا، تو آج تمہیں اس سوال کا موقع ہی نہ ملتا"

"میں سمجھا نہیں"

"تم مرد ہونے کے باوجود ابھی تک نہیں سمجھ سکے؟ حیرت ہے!"

"یعنی؟"

"یعنی یہ کہ عورت مر سکتی ہے۔ مگر بول نہیں سکتی۔ سماج کہتا ہے عورت کا کام امتثال امر ہے — اسے احتجاج کا بھی حق نہیں"

اس روز میں اور کچھ نہ کہہ سکا۔ بار بار محسوس ہوتا تھا۔ کہ روح کی تمام جراتیں الفاظ میں تبدیل ہو کر لبوں پر تڑپ جانا چاہتی ہیں، مگر نہ جانے کونسی قوت تھی، کہ کچھ کہنے کے بجائے میں کانپ کانپ کر رہ گیا آہ! کسی کو کیا معلوم کہ کبھی کبھی دل کے الفاظ زبان کی جنبش کے بجائے سر سے پاؤں تک جسم کی ایک بے اختیار تھرتھری بن کر ظاہر ہوتے ہیں!

ایک ہفتے کے بعد اس کی شادی ہو گئی۔ اور مجھے معاً ایسا محسوس ہوا۔ کہ اب میں زندگی کے راستے پر ایک شہاب کی طرح اڑتے ہوئے چلے جانے کے لئے چھوڑ دیا گیا ہوں۔ زندگی گزرتی چلی گئی۔ مجھے تو ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ میں آہستہ آہستہ مرتا جا رہا ہوں لوگ کہتے تھے۔ یہ مر جائے گا۔ کاش وہ سمجھ سکتے۔ کہ ہم سب روزانہ مرتے جا رہے ہیں۔ ہر ایک لمحہ ہماری زندگی کے ایک عنصر کو فنا کر کے گزر جاتا ہے — اور مجھ میں فرق اتنا ہی ہے۔ کہ میں خرمن کی طرح سلگ رہا ہوں۔ شعلے بھڑک اٹھنے کی دیر ہے — پھر میری جگہ راکھ ہی راکھ ہوگی — مگر وہ کہتے تھے"۔ دیوانے! اب اس طرح کڑھنے سے فائدہ ہی کیا — زندگی اپنے بس کی تو ہے ہی نہیں۔ کہ جس طرح چاہو کر دو۔ یہ تو ایک سیلاب ہے۔ ہم سب اس میں ڈوب رہے ہیں — بہہ رہے ہیں — کوئی ساتھی آگے بڑھ جائے، یا پیچھے رہ جائے، تو بے فائدہ مڑ مڑ کر دیکھنے سے کیا ہوتا ہے"

میں کہتا تھا، تم مجھے جینا سمجھا رہے ہو؟ — مگر جینے کیواسطے سمجھنے کی ضرورت ہی کب ہے! — ہر ایک آرزو کے خون سے ایک نئی تمنا تخلیق کرنا — یہی زندگی ہے!

آہ زندگی!! — زندگی یا دیوانگی؟

. . . .

آج اس کی شادی کو پورے چھ ماہ ہو چکے تھے۔

یہی وہ دن تھا، جب وہ دلہن بنی تھی۔ یوں تو ہر ایک دوشیزہ کبھی نہ کبھی دلہن بنتی ہے۔ مگر لوگ کہتے ہیں۔ کہ وہ اپنے عروسی لباس میں بالکل ایسی نظر آتی تھی، جیسے شفق کی رنگینیوں پر ڈوبتے ہوئے بادلوں میں برق کی ایک موج منجمد ہو کر رہ جائے۔ میں اسے نہیں دیکھ سکا — اس نے کہہ دیا تھا، تم وہاں آنے کی کوشش نہ کرنا ورنہ شاید میں اپنے جگر کو خون کرنے کے بعد بھی سماج کے زعمِ خودی کی شرم نہ رکھ سکوں۔

آج پورے چھ ماہ ہو چکے تھے، کہ میں نے اسے نہ دیکھا تھا۔

زندگی کا یہی بے کیف زمانہ تھا، جب میں نے اپنی محبوب تصویر "فرشتے کی قربانی" تیار کی۔ شب و روز میرے واسطے اب دو ہی مشغلے رہ گئے تھے۔ اپنے نگار خانہ میں منہمک رہنا، یا پھر اپنی محبوب دوست کو کبھی کبھی خط لکھ دینا۔ میں نے اسے متعدد خطوط لکھے۔ خصوصاً اس لئے کہ مجھے اس کی علالت کی خبریں دیگر ذرائع سے پہونچی تھیں۔ مگر اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس کے اس سکوت نے مجھے آخرکار یقین دلا دیا۔ کہ زندگی نام ہے اس حسین مجبوری کا کہ جو چاہو نہ کر سکو

نہ ہوسکے۔ اور افسردگی و یاس کی اسی کیفیت میں خدا جانے کتنی تصاویر میں نے بنائیں۔ مگر ہر ایک تصویر کو ختم کرنے کے بعد اپنے ہاتھوں سے اس کو شعلوں کی نذر کر دیا۔ "فرشتے کی قربانی" ہی ایک ایسا نقش تھا جو اس تباہی سے محفوظ رہ گیا۔ اور غالباً صرف اس لئے کہ میں نے اس کے جلی خطوط اپنے جسم کے تازہ خون سے بنائے تھے۔ شفاف بلور کی ایک خوبصورت شیشی میں یہ خون رقیق چنگاری کی طرح میری نگاہوں کے سامنے تھا۔ اور میں ایک دیوانے کی طرح اپنے موقلم کو جنبش دیتا چلا گیا۔ فن کی نمائش گاہوں میں اس تصویر پر لاتعداد تعریف صرف کی گئی۔ اور سرخ پھولوں کے دار پر فرشتے کے حلقوم سے خون کی جو ایک موج بہتی دکھائی گئی تھی۔ اس کی سرخی نے لوگوں کو متحیر کر دیا کسی کو کیا معلوم کہ وہ محض رنگ ہی نہیں بلکہ انسانی خون کے چند بیش بہا قطرے بھی اس میں حلول کر دیئے گئے ہیں۔

تصویر کی عام اشاعت کے تقریباً ایک ہفتے بعد مجھے اس کا ایک خط ملا ——— لکھا تھا:۔

"ندیم!

شرمسار ہوں کہ تمہارے خطوط کا ایک جواب بھی نہیں دے سکی۔ میری اس خاموشی نے تمہاری زندگی کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا ہے۔ اس کا حال مجھے "فرشتے کی قربانی" سے معلوم ہوا۔ مصوّر تو تم تھے ہی مگر اب کچھ ایسی چیز بن گئے ہو جسے مصوّر، شاعر، فلسفی سب کچھ کہا جا سکتا ہے ——— مگر یاد رکھو، یہ جینے کے ڈھنگ نہیں ہوتے اگر تم نے اس روش پر ایک قدم کا بھی اضافہ کیا۔ تو بزرگوں کی دنیا میں تمہیں دیوانہ سمجھا جائے گا۔ تم ایک نادار مصوّر ہو۔ سماج فن کو نہیں دیکھتا، دولت کو دیکھتا ہے۔ اگر تم میری طرح ایک نواب کے گھر پیدا ہوتے، تو شاید تمہارے ہر ایک جنون پر ہوش و خرد کی تاویل پیش ہو جاتی۔ صرف اس واسطے کہ تم مرد تھے ——— آہ، تم جانتے نہیں ——— عورت ہونا سب سے بڑا گناہ ہے۔ اس کے بعد صرف افلاس ہی کا شمار ہے ——— پھر میں عورت ہوں، اور تم مفلس!! ——— کتنا سنگین جرم ہے یہ! ——— جو کچھ بھی عقوبت ملے کم ہے۔

تم سوچتے ہوگے۔ کہ تمہارے خطوط کا جواب کیوں نہیں دیا گیا ——— یہ داستان کہنے کی نہیں ——— اس میں سوزش ہی سوزش ہے ——— ممکن ہے۔ زندگی کی رہی سہی سکت بھی جل کر راکھ ہو جائے۔ بس یوں سمجھ لو کہ زندگی اسی کا نام ہے۔ اچھا تو یہی ہے۔ کہ تم بھول جاؤ ——— جو سمجھتے ہو وہ بھی، اور جو نہیں سمجھتے وہ بھی۔ اور اگر بھول نہیں سکتے تو ہونٹوں کو سی لو ——— کلیجے کو لہو بنا دو، مگر آنکھوں میں اس خونِ حیات کی ایک بوند بھی نہ آنے دو۔ جو تم نے "فرشتے کی قربانی" پر قربان کیا ہے ——— اور اگر یہ بھی نہیں کر سکتے تو صرف ایک ہی بہترین راستہ ہے ——— بغاوت!

تمہارے واسطے یہ میرا پہلا خط ہے۔ اور شاید آخری بھی ——— صحت جواب دے چکی ہے۔ زندگی کے اندھیارے میں موت کی چاپ سن رہی ہوں۔ خدا جانے کب تک نزع کی ان ہچکیوں سے کھیلنا پڑے گا۔ جب میں نہ ہوں گی، تو تم روؤ گے۔ اور جب تک تمہارے بیقرار سینے میں لرزنے کی ذرا سی بھی سکت رہے گی۔ تمہارے آنسوؤں کو قرار نہ آئے گا۔ مگر تم جی بھر کے مجھے رو چکو۔ تو یہ بھی سوچنا کہ یہ رونے کا موقع ہی کب تھا۔ میں عورت تھی۔ اور اس لئے سماج کو ستم پسند و قہرمان کہنے کی حسرت بھی پوری نہ کر سکی . . . . . .

——— تم مرد ہو ——— تم چاہو تو اپنی روح کی ایک چیخ سے دنیا کا کلیجہ ہلا سکتے ہو۔ رونے کے لئے میرے بعد بہانے بہت مل جائیں گے ——— پوری زندگی اور کرنا ہی کیا ہے تمہیں ——— جب چاہو رو لینا مگر بغاوت کا وقت تو صرف ایک مرتبہ ہی آتا ہے ——— یہ آگ اگر ایکبار ذرا بھی بجھ گئی۔ تو اس کو شعلہ فشاں کرنے کے واسطے پھر مجھے کہاں سے لاؤ گے؟ ——— دُنیا کے سارے آتشکدے بھی مجتمع کر لو۔ تو یہ چنگاری سوزِ اندوز نہ ہو سکے گی!"

. . . .

بغاوت! ——— بغاوت!! ——— بغاوت!!!

جناب راجہ مہدی علی خان:-

نکہت

نقابِ آتشیں رخسار سرکاتی ہوئی آئی سیہ خانے میں میرے نور برساتی ہوئی آئی

طلوعِ ماہِ سیمیں کا گماں ہونے لگا مجھکو جبینِ ناز کو اس طرح چمکاتی ہوئی آئی

زہے قسمت جسے عادت تھی مجھ سے منہ چھپانے کی بہارِ لالۂ رخسار دکھلاتی ہوئی آئی

کوئی اس کے خرامِ ناز کے انداز تو دیکھے تجلی رقص کرتی برق لہراتی ہوئی آئی

بسا کر آئی اپنا ریشمیں ملبوس خوشبو میں نئی نکہت مشامِ جاں کو مہکاتی ہوئی آئی

اداؤں سے محبت کا سبق دیتی ہوئی پہنچی نگاہوں سے حیا کے پھول برساتی ہوئی آئی

مرے اشعار کی تفسیر اس کا پیکرِ رنگیں مجھی کو وہ مرے اشعار سمجھاتی ہوئی آئی

خموشی اس کی دلکش تھی کہیں حسنِ تکلم سے وہ چپ ہونے پہ بھی اک راز سمجھاتی ہوئی آئی

اُسے تھا خوف مہدی تیری بے باکانہ الفت کا
وہ گھبراتی ہوئی پہنچی وہ شرماتی ہوئی آئی!

میرزا ادیب

صحرانورد کا ساتواں خط

حکایۂ جنوں

حبیب صادق ——————— !!!

اس وقت کہ میں تمہارے لئے "تازہ رومان" لکھکر اپنی صحرائی زندگی کے متعلق کچھ لکھنے کی کوشش کر رہا ہوں تمہاری صورت میری آنکھوں کے سامنے پھر رہی ہے! تمہیں کیونکر بتاؤں کہ تمہارا یہ دور افتادہ دوست تم سے ملنے، تمہارے موجودہ حالات زندگی سننے، اور تمہیں اپنی زبان سے اپنے "صحرائی واقعات" سنانے کے لئے کسقدر بے تاب، کسدرجہ مضطرب ہے! کاش تمہارا "رومانی ذوق" تمہیں یہاں لے آئے۔ اس سے ایک تو ہماری سیاحت زیادہ پُر لطف، زیادہ رومان انگیز اور زیادہ دلچسپ ہو جائے گی۔ اور دوسرے تمہاری دیرینہ آرزو بھی پوری ہو جائے گی! اس میں کوئی شک نہیں کہ میری "تمہیدی عبارت" سے تم کسی حد تک ضرور لطف اٹھاتے ہوگے۔ لیکن میرے دوست! یقین کرو کہ اس سے میری چاروں طرف بکھری ہوئی رنگینیوں، دلآویزیوں اور دلچسپیوں کا پرتو بھی تمہارے سامنے نہیں آسکتا۔ تم یہاں آجاؤ تو تمہیں معلوم ہو کہ علی الصبح پُراسرار اور کہر میں لپٹے ہوئے مشرقی افق کے سینے پر غاروں میں رینگتے ہوئے سانپوں کی طرح جب رنگ برنگ کے ابر پارے لہراتے ہیں، تو ایک رومان پرست دل پر کیا اثر ہوتا ہے۔ اور جب شام کے وقت شفق کے دامن میں دھوئیں کے بادلوں کی مانند درختوں کے دھبے آہستہ آہستہ نگاہوں سے غائب ہونے لگتے ہیں، تو انسان پر کیا کیفیت چھا جاتی ہے، اور پھر جب اس عالم میں کسی برہ کے مارے ہوئے پرندے کی غمناک و درد انگیز آواز فضا میں تھرتھراتی ہے تو روح کی گہرائیوں میں کونسا جذبہ بیدار ہو جاتا ہے۔! ممکن ہے کسی دن تمہارا "رومان پرست دل" تمہیں "وحشت" سکھادے اور تم اپنی آباد و ہنگامہ پرور دنیا سے نکل کر میری ویران و پرسکون دنیا میں آجاؤ! میرا شریک سفر آغا بہرام بھی اس موقع کا منتظر ہے!

اس "رومان" کے متعلق کیا لکھوں۔ یہی سمجھ لو کہ اس "رومان" نے میرے دل میں مدت سے سوئے ہوئے ایک "جذبے" کو بیدار کردیا ہے اور میں پھر "وادی نیزا" کی چاندنی راتوں کو یاد کرکر کے تڑپنے لگا ہوں! امید ہے میری طرح تم بھی اس سے متاثر ہوگے! —
یہ داستان جنوں انگیز محبت کی تباہ کاریوں کو اپنے دامن میں لئے ہوئے ہے ——

محبت اور پھر جنوں انگیز محبت ——————— ! خدا کی پناہ!

محبت کا جذبہ پیدا نہیں کیا جا سکتا، بلکہ خود بخود پیدا ہو جاتا ہے بچپن میں یہ قول میں بھی سنا کرتا تھا۔ اور مجھے اس کی صداقت پر ذرہ بھر بھی اعتبار نہیں تھا میں سمجھتا تھا کہ یہ ایک وہم ہے اور ہر ایک شخص اس وہم میں اس لئے مبتلا ہو جاتا ہے۔ کہ یہ بہت زیادہ شہرت حاصل کر

چکا ہے۔ اور کرتا جا رہا ہے لیکن اب میرا یہ نظریہ تبدیل ہو چکا ہے۔ اور میں مندرجہ بالا مقولے کی صداقت کا بدل و جان قائل ہو گیا ہوں۔ واقعی محبت کی چنگاری ایک نہایت حقیر ایک نہایت معمولی واقعے سے انسان کے دل کی گہرائیوں میں سلگنے لگتی ہے۔ اور پھر ایک وقت ایسا بھی آتا ہے جب یہ ننھی سی چنگاری دل و دماغ کو بھسم کر دینے والے آتشیں شعلوں میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ کوئی انسانی تدبیر اس آگ کو سرد کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکتی، یہاں تک کہ موت کی آندھی کا تیز و تند جھونکا اس آگ کو اور اس کے ساتھ انسانی زندگی کی شمع کو بھی ہمیشہ کے لئے بجھا دیتا ہے۔ یا محبت ایک ایسا زہر ہے۔ جو دل و دماغ کو مسموم کرتا ہوا روح کی گہرائیوں تک سرایت کر جاتا ہے۔ انسان اپنی تمام صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر اس بے رحم دشمن کا مقابلہ کرتا ہے۔ مگر بے سود تا آنکہ موت کے سرد ہونٹ انسان کے ہونٹوں سے لگ کر یہ ہولناک زہر اور اس ہولناک زہر کے ساتھ خونِ حیات کو بھی چوس لیتے ہیں۔

اس افسانے میں یہی ناگوار و تلخ حقیقت پائی جاتی ہے —————— !!

امید ہے۔ تم بخیریت تمام ہو گے! —————— !!!

تمہارا —————— صحرانورد

(۱)

میں کیونکر دامِ محبت میں گرفتار ہوا۔ یہ میں نہیں بتا سکتا۔ اور اس کے بتانے کی چنداں ضرورت بھی نہیں، یہی کہہ دینا کافی ہے کہ جس طرح اور بدنصیب انسان محبت کے غار میں دھکیل دیئے جاتے ہیں اسی طرح میں بھی دھکیل دیا گیا۔ اس کے بعد جب مجھے اپنی حالت کا احساس ہوا۔ تو میں نے خود کو تباہی سے بچانے کے لئے بہتیرے ہاتھ پاؤں مارے، تمام احتیاطی تدابیر پر سختی کے ساتھ عمل کیا۔ لیکن میری ہر ایک کوشش خاک میں مل گئی۔ آہ! اس مصیبت سے نہ چھٹکارا ہونا تھا نہ ہوا۔

میری محبوبہ شہر کی حسین ترین لڑکی تھی۔ اس کی کشادہ چمکتی ہوئی پیشانی، چودھویں کے چاند کی شفافیت، اس کی لمبی کالی زلفیں جاڑے کی راتوں کی تاریکی، اور اس کی سیاہ بڑی بڑی آنکھیں ہرن کی آنکھوں کی مقناطیسیت لئے ہوئے تھیں۔ اس کے رخساروں میں خونِ ناب اس طرح چھلک رہا تھا جس طرح چاند کے سیمیں سینے میں شرابِ احمریں کی موجیں اچھل رہی ہوں۔ وہ جب چلتی تو یہ معلوم ہوتا کہ تالاب کی سطح پر بط تیر رہی ہے۔ اور جب وہ بولتی تو یوں محسوس ہوتا گویا دور کہیں ترنم ریز ندی بہہ رہی ہے۔ وہ یگانۂ روزگار مصور کے تخیل سے بھی زیادہ حسین تھی۔ مگر میری انتہائی بدقسمتی یہ تھی۔ کہ وہ بہت سنگدل واقع ہوئی تھی۔ اس کے سینے میں دل کی بجائے پتھر کا ٹکڑا تھا وہ میری مجنونانہ محبت، میری قابلِ رحم بیکسی کو دیکھتی۔ اور نہایت سنگدلی کے ساتھ حقارت انگیز قہقہہ لگاتی ہوئی منہ دوسری طرف پھیر لیتی۔ میری محبت کی قدر اس کی نگاہوں میں ذرہ برابر نہیں تھی — وہ ظالم ہستی محبت کرنا جانتی ہی نہ تھی۔ میں اپنے باغ کے حسین پھول لیکر ایک جگہ کھڑے ہو کر اس کے انتظار میں کئی کئی گھنٹے صرف کر دیتا۔ مگر جیسے ہی اس کی نظر مجھ پر پڑتی۔ وہ انتہائی بے رخی سے اپنا راستہ تبدیل کر لیتی یا اگر میرے پاس سے گزرتی اور میں اس کے پاؤں پر پھول گرا دیتا تو وہ ایک لفظ کہے بغیر پھولوں پر ایک نظر ڈالے بغیر چلی جاتی، جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ کئی بار دوستوں نے مجھ سے کہا "اگر تم مرتے دم تک بھی اسی طرح محبت کی آگ میں جلتے رہے۔ جب بھی سلمیٰ دمیری بیرحم محبوبہ، تمہاری طرف نظر اٹھا کر نہیں دیکھے گی۔ اس لئے بہتر یہ ہے کہ اپنی زندگی کو اس کی بیرحمانہ محبت میں تباہ نہ کرو۔ شہر میں ہزاروں حسین دوشیزائیں ہیں۔ کیا تمہیں محبت کے لئے کوئی اور نہیں ملتی، سلمیٰ کا خیال چھوڑ دو ورنہ اس جنون میں تمہیں اپنی زندگی سے بھی ہاتھ دھونے پڑیں گے"! اس کی سہیلیاں کہتیں "ہم نے ہزار کوشش کی کہ سلمیٰ کے دل میں تمہارا خیال پیدا کریں۔ مگر جس طرح پتھر میں سے پانی نہیں نکل سکتا۔ اسی طرح اس کے دل میں تمہاری محبت کبھی نہیں پیدا ہو سکتی تم بھی اس سے نفرت کرنے لگو" میں یہ سب کچھ سنکر اپنی بدقسمتی پہ افسوس کرتا مگر سلمیٰ کا خیال دل میں نہ لاتا۔ سلمیٰ سے دور بھاگتا میرے لئے

قطعی ناممکن تھا معلوم نہیں اس حسین ساحرہ نے مجھ پر کیا جادو کر دیا تھا کہ جسقدر میں اسے بھلانے کی کوشش کرتا۔ اسی قدر اس کی محبت بڑھتی جاتی۔

میں جوشِ جنوں میں اکثر شہر سے باہر نکل جاتا۔ اور پرانے قلعے کی سیڑھیوں پر بیٹھ کر اپنی بدقسمتی پہ آنسو بہایا کرتا۔ یہ قلعہ مدت سے ویران پڑا تھا۔ اور جب سے حکومت سامین نے فوج کشی کر کے یہاں کے پہلے حاکم ہاشم کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ اس کے اندر کوئی نہیں جا سکتا تھا۔ اور کوئی جا بھی کیونکر سکتا تھا۔ قلعے کے آہنی دروازے بند تھے اور ان کے آگے بڑے بڑے پتھر رکھے ہوئے تھے۔ اور دوسرا راستہ اندر جانے کا نہیں تھا۔ یہ قلعہ چونکہ ایک مدت سے ویران پڑا تھا۔ اور تھا بھی شہر سے دور۔ اس نے لوگوں کا گمان تھا کہ اس میں بھوت وغیرہ رہتے ہیں۔ ایک بوڑھا کسان تو کہا کرتا تھا کہ اس نے کئی بار قلعے کی ایک کھڑکی میں سے ایک حسین لڑکی کو جھانکتے ہوئے دیکھا ہے۔ الغرض اس پرانی ہیبت ناک عمارت سے طرح طرح کی افواہیں وابستہ تھیں۔

میں قلعے کی ایک سیڑھی پر پڑی ہوئی چھوٹی سی چٹان کے اوپر گھنٹوں بیٹھا رہتا اور دلسوز گیت گاتا رہتا۔ اس چٹان سے کچھ پرے ایک کھجور کا درخت تھا۔ اس درخت کے نیچے ایک بوڑھا آدمی بھی بعض اوقات بیٹھا کرتا تھا۔ میں اس بوڑھے آدمی سے بہت مانوس تھا۔ اس کا نام بابا حمدی تھا۔ اور میں ہفتے میں دو تین بار اس سے ضرور ملا کرتا تھا۔ بابا حمدی محبت کو انسانی زندگی کے لئے خوفناک ترین مرض سمجھتا تھا۔ اور چونکہ میرے واقعاتِ محبت اس سے پوشیدہ نہیں تھے۔ اس لئے وہ مجھے اس جنون سے باز رکھنے کے لئے ہر وقت نصیحتیں کرتا رہتا۔ مگر اس کی نصیحتیں رائگاں جاتیں۔ محبت کا جنون کبھی نصیحتوں سے بھی دور ہوا ہے؟؟ دنیا میں صرف یہی ایک انسان تھا جس کی باتوں سے مجھے ہمدردی کی بو آتی تھی۔ میں نے اس سے کئی بار پوچھا۔ "بابا! تمہارا ٹھکانا کہاں ہے؟ تم کیا کرتے ہو؟" مگر وہ مجھے یہ کہکر ٹال دیتا۔ "پھر پھرا کر زندگی کے آخری دن گزار رہا ہوں۔ دنیا میں ہر جگہ میرا ٹھکانا ہے۔"

جیسا کہ میں نے بتایا۔ حمدی نہایت ہمدردانہ لہجے میں مجھے ترکِ محبت کی صلاح دیتا۔ اور اس سلسلے میں عجیب و غریب داستانیں بھی سناتا۔ مگر بدقسمتی سے اس کی نصیحتوں اور داستانوں کو سنکر میرے دل میں محبت کی آگ اور بھڑک جاتی۔ اور جب میں شہر کا رخ کرتا۔ تو سلمیٰ کی یاد اسقدر بیقرار کرتی کہ اس کا اندازہ ہی نہیں کیا جا سکتا۔

(۲)

اس دن میں خاص طور پر غمگین و مغموم تھا۔ بے رحم سلمیٰ کی سرد مہریوں نے میرے دل کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا تھا۔ اور میں اسی صد پارہ دل کو سینے میں لئے آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا پرانے قلعے کی طرف جا رہا تھا۔

دن بیت چکا تھا۔ اور فضاؤں میں تاریکی کے بادل عفریتوں کی طرح چھا رہے تھے۔ دور ——— مغربی گوشے میں ایک بلند و گنجان درخت خوفناک دیو کی مانند آفتاب کی خونچکاں نعش کو بازوؤں پر اٹھائے آہستہ آہستہ تاریکی کے غار میں غائب ہو رہا تھا۔ میں اس خونیں منظر کو دیکھنے لگا۔ میرے دل میں بھی خیال پیدا ہوا کہ ایک دن میں بھی خون شدہ تمناؤں کو لئے ہوئے دنیا سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہو جاؤں گا! اس خیال کے آتے ہی میری آنکھیں نم ہو گئیں اور میں ایک بندھی ہوئی کشتی میں بیٹھ گیا۔ میرے حقیر آنسو سطحِ آب پر ننھے ننھے دائرے بناتے ہوئے تحلیل ہونے لگے۔ اسی اثنا میں میں نے حمدی کو قلعے کی سیڑھیاں طے کرتے ہوئے دیکھا۔ میں کشتی سے نکلا اور حمدی کے قریب پہنچ گیا۔ حمدی نے قدموں کی آہٹ سنکر مڑ کر میری طرف دیکھا۔ اس کے ہونٹوں پر ہلکا سا تبسم پیدا ہوا۔ اور اس نے ہمدردانہ لہجے میں پوچھا۔ "آج تم بہت غمگین نظر آ رہے ہو؟"

"میرا دل ٹوٹ چکا" میں نے جواب دیا۔

اس نے ایک لمبی آہ بھری۔ اور غمناک لہجے میں کہا۔ "تم خود کو تباہ کر رہے ہو"؟

"تو میں کیا کروں"؟

"اس آگ سے نکلو۔ ورنہ اس کے آتشیں شعلے تمہیں جلا کر خاک کر دیں گے"!

"میں مجبور ہوں۔ میں کچھ بھی نہیں کر سکتا! اس کی محبت میرے

میرے دل کے ذرّے ذرّے کو محیط ہے"

حمدی کھجور کے درخت سے پشت لگا کر بیٹھ گیا۔ اس کا چہرہ افسردہ ہوگیا۔ یکایک ایک پرندہ پھڑپھڑاتا ہوا، ہمارے سروں کے اوپر سے گزر کر قلعے کی دیوار کے پاس تاریکی میں غائب ہوگیا، شاید وہاں وہ اپنے گھونسلے میں جا بیٹھا تھا۔ بابا حمدی قلعے کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں ایک پُراسرار چمک پیدا۔ ہو رہی تھی قلعے کی بلند مہیب دیواریں نظروں سے غائب ہوتی جا رہی تھیں اور یوں محسوس ہو رہا تھا۔ گویا ماضی کے دھندلکوں میں عظمت بیٹھی.. اپنی جھلک دکھا رہی ہے۔

"بابا! میں نے اس قلعے کے متعلق عجیب عجیب باتیں سنی ہیں کوئی کہتا ہے۔ یہاں بھوت پریت رہتے ہیں۔ کسی کا قول ہے یہاں مردوں کی رُوحیں چیختی چلاتی رہتی ہیں۔ بعض لوگوں نے یہاں سے گزرتے ہوئے چیخیں بھی سنی ہیں۔ ایک بوڑھے کسان نے کہا ہے کہ اس نے قلعے کی کھڑکی میں سے ایک نہایت حسین و جمیل لڑکی کو جھانکتے ہوئے دیکھا ہے۔ تم نے بھی کچھ سنا یا دیکھا ہے"؟ میں نے حمدی سے پوچھا۔

بوڑھا خاموش رہا — خاموشی سے قلعے کی طرف دیکھتا رہا۔

"میں نے تو یہاں کچھ بھی نہیں دیکھا۔ اور نہ کبھی کچھ سنا، لوگ یونہی افواہیں پھیلاتے رہتے ہیں" بابا حمدی نے چند منٹ خاموش رہنے کے بعد کہا۔

"مگر — جو اصل حقیقت ہے —"

"اصل حقیقت کیا؟" میں نے بے صبری سے پوچھا۔

"یہاں بھی حسن و عشق کا ایک خونیں کھیل کھیلا جا چکا ہے"!

"حسن و عشق کا خونیں کھیل؟ وہ کیونکر؟"

"لیکن میں دیکھ رہا ہوں، کہ میری نصیحتوں کا تم پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ اس صورت میں کیا سناؤں"!

"یہ درست ہے، مگر مجھے خود پر کچھ اختیار نہیں"! میں نے کہا۔

"تو کیا تم محبت کی ہلاکت آفرینیوں سے واقف نہیں"؟

"میں خوب واقف ہوں، مگر جو چیز اختیار میں نہ ہو، اس پر کیا بس چل سکتا ہے"؟

"اگر تم مصمم ارادہ کرلو، تو یقیناً محبت کے جال سے رہائی پا سکتے ہو۔ محب کے دل میں محبت کا جذبہ اس لئے شدت اختیار کرتا جاتا ہے۔ کیونکہ وہ اپنی محبوبہ کو بار بار دیکھتا ہے۔ اگر وہ اپنی محبوبہ کو چھوڑ کر کہیں دور چلا جائے تو —"

"لیکن میں ایسا نہیں کر سکتا" میں نے اس کے الفاظ کاٹتے ہوئے کہا، "جہاں بھی جاؤں گا محبت کی آگ سینے میں لے کر جاؤں گا"!

حمدی کے چہرے پر مایوسی چھا گئی "تم کوشش تو کرو، میرے بیٹے! ممکن ہے یہ ہولناک مرض دور ہو جائے۔ محبت انسانی زندگی کی سب سے بڑی دشمن ہے۔ یہ ہر زمانے میں تباہی پھیلاتی رہتی ہے، اور ہمیشہ پھیلاتی رہے گی! اگر تم نے اس سے نجات حاصل کرنے کی سعی نہ کی، تو پھر تمہاری بربادی میں کوئی شبہ نہیں۔ جیسا کہ میں نے ابھی کہا تمہارے لئے بہترین طریقہ یہ ہے، کہ یہاں سے فی الفور چلے جاؤ"!

"اچھا بابا! میں ایسا کرنے کی کوشش کروں گا"!

بابا حمدی کی آنکھیں قدرے چمک اٹھیں، اس نے میرے شانے پر اپنا دایاں ہاتھ رکھ دیا۔ اور اپنی نرم و ہمدردانہ آواز میں کہنے لگا "یہ قلعہ انیس سو سال سے ویران پڑا ہے۔ جیسا کہ تم جانتے ہو، یہاں شہر کا حاکم ہاشم رہتا تھا۔ ہاشم بے حد ظالم، کینہ جو اور منتقم مزاج انسان تھا۔ جب تک وہ زندہ رہا، اس کی کسی سے نہ بن سکی۔ اور دائے سامین جعفر سے تو اسے خدا واسطے کی دشمنی تھی۔ جعفر بہت نیک دل اور بہادر حکمران تھا۔ رعایا کا ہر فرد اس کا مطیع و فرمانبردار تھا۔ اور چونکہ وہ بوڑھا ہوگیا تھا، اس لئے لوگوں کو امید تھی کہ کچھ مدت بعد ولیعہد سلطنت صولت تخت نشین ہو جائے گا۔ صولت باپ سے بھی زیادہ نیک دل اور شجاع تھا۔ عنفوانِ شباب میں اس نے کئی معرکے سر کئے تھے۔ اور اب جب کہ وہ جوان تھا، اس کی

شجاعت، دلیری اور نیک طینتی میں بھی اضافہ ہوگیا تھا! شہزادہ صولت سیر و شکار کا بہت دلدادہ تھا۔ ایک دفعہ شکار کرتے کرتے وہ بہت دور نکل گیا۔ اس کے ساتھ صرف دو وفادار خادم تھے تینوں راستہ بھول کر آگے ہی آگے بڑھتے گئے! رات کی تاریکی ہر طرف پھیل چکی تھی، اور گھوڑے تھک کر چور چور ہو چکے تھے۔ آخر وہ ایک گاؤں میں پہنچ گئے۔ ایک کسان سے پوچھنے پر معلوم ہوا۔ کہ وہ "حمیرا" میں پہنچ گئے ہیں۔ حمیرا اس زمانے میں یہاں سے کچھ دور ایک گاؤں تھا۔ کوئی اور ہوتا۔ تو فوراً وہاں سے چلا جاتا۔ کیونکہ اس وقت شہزادہ اپنے جانی دشمن کی سلطنت میں پہنچ گیا تھا! مگر شہزادے نے اس کی قطعاً پروا نہ کی۔ اور شب بسری کے لئے اپنے ساتھیوں کے ساتھ وہیں ٹھہر گیا۔ جیسے ہی ہاشم کو کسان کے ذریعے شہزادے کی آمد کا حال معلوم ہوا، وہ اپنی دیرینہ آرزو کے پورا کرنے کیلئے بیقرار ہوگیا۔ اس نے اپنے خاص مصاحب شہزادے کو لانے کے لئے بھیجے۔ شہزادہ جانتا تھا کہ وہ دشمن کے ملک میں ہے۔ اسے خبر تھی کہ وہ خطرے میں گھر گیا ہے۔ لیکن اس نے ذرہ بھر احتیاط نہ کی، اور اپنے وفادار خادموں کی مسلسل گزارشات کو کچلتے ہوئے، حاکم شہر کے آدمیوں کے ساتھ محل میں پہنچ گیا۔ خادم حیران تھے آخر شہزادے کو کیا ہوگیا ہے، وہ کیوں جان بوجھ کر خطرے میں گرفتار ہو رہا ہے۔ آہ! انہیں کیا خبر تھی، کہ صولت محبت کے ہاتھوں مجبور ہو کر موت کے منہ میں جا رہا ہے!

صولت ہاشم کی لڑکی یاسمین کی محبت میں گرفتار تھا۔ اور یہی جذبۂ محبت اسے کشاں کشاں محل کی طرف لے جا رہا تھا۔ نتیجہ — ؟

نتیجہ وہی ہوا جس کا اندیشہ تھا۔ رات کے آخری حصے میں شہزادہ ایک تاریک زمین دوز کمرے میں بند تھا۔ اس وقت اسے محسوس ہوا، کہ اس کے ساتھ نہایت ہولناک فریب کیا گیا ہے! اس نے ادھر ادھر ٹٹولا، مگر اس کی انگلیاں پتھر کی طرح سخت دیواروں سے مس ہوئیں — اس نے بہتیرے ہاتھ پاؤں مارے، مگر بے سود باہر نکلنے کا کوئی راستہ نہ ملا۔ کافی دیر کے بعد اس کے کمرے میں ہلکی سی روشنی ظاہر ہوئی، اس روشنی میں اس نے محسوس کیا، کہ وہ ایک فراخ کمرے میں ہے۔ جس کی دیواریں بہت مضبوط ہیں۔ ایک طرف آہنی دروازہ ہے، جو مقفل ہے۔ شہزادے کو بہت افسوس ہوا لیکن اب دست تاسف ملنے سے کیا ہو سکتا تھا؟ صولت کو یقین تھا کہ ظالم ہاشم اسے مار ڈالے گا۔ مگر منتقم مزاج حکمران اسے اس طرح ہلاک کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ شہزادے کا اس طرح زندہ رہنا زیادہ مفید ہے۔ ممکن ہے اس کے ذریعہ وہ اپنے دشمن کی سلطنت پر قبضہ کرلے۔

اسی اثناء میں ایک خادم نے آہنی دروازے کی سلاخوں میں سے کھانا اندر داخل کیا۔ شہزادے نے خادم سے بہت کچھ پوچھا مگر اسے کسی کا بھی جواب نہ ملا۔ خادم اپنا فرض ادا کرکے چلا گیا۔

ادھر تو شہزادہ اسیر ہوگیا۔ ادھر اس کے اس طرح پُراسرار طور پر غائب ہو جانے سے تمام سلطنت میں سنسنی سی پھیل گئی۔ لوگوں نے جنگل کا کونا کونا چھان مارا۔ مگر شہزادہ کہاں؟ کوئی بھی نہیں بتا سکتا تھا۔ کہ وہ کہاں ہے۔ زندہ ہے یا مر چکا ہے۔

ہاشم نے اس کے خادموں کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا اس لئے اب کسی ذریعہ سے بھی شہزادے کی اسیری کی خبر نہیں ہو سکتی تھی۔

دن پر دن گزرتے گئے۔ لوگوں نے سمجھ لیا۔ کہ جنگلی درندوں نے شہزادے اور اس کے ہمراہیوں کو چیر پھاڑ ڈالا ہے"!!

حمدی رکا۔ ایک لمبی پُر درد آہ بھری، اور اپنی نگاہیں پرانے قلعے کی دیوار پر جما دیں!

ہوا آہستہ آہستہ چل رہی تھی، قلعے کے قریب ایک بلند بے برگ و بار درخت کی شاخ پر کوئی حسرت نصیب پرندہ ماتمی صدا کے ساتھ اپنے پر پھڑپھڑا رہا تھا۔ درخت کے عین اوپر ایک سفید بادل چاند سے مس کرتا ہوا یوں گذر رہا تھا۔ جیسے ایک بد قسمت محب، اپنی محبوبہ کو الوداعی بوسہ دیتے ہوئے ہمیشہ کے لئے جدا ہو رہا ہے!

میں نے حمدی کی طرف دیکھا، وہ بدستور قلعے کی دیوار کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کے جھرّیاں پڑے ہوئے چہرے پر، غم میں ڈوبی ہوئی

آنکھیں اس طرح دکھائی دے رہی تھیں، جس طرح کسی شکستہ قبر کے گڑھوں میں نیم روشن و نیم تاریک دیئے جمے ہوئے ہوں! وہ کئی لمحے اپنے خیالات میں غرق رہا۔ پھر اپنی لمبی، کمزور اور جھریوں میں لپٹی ہوئی انگلیاں پیشانی پر پھیریں اور غم انگیز لہجے میں کہنے لگا:

"جب آتش فشاں پہاڑ کے سینے سے آتشیں شعلوں کے فوارے پھوٹنے لگتے ہیں، تو ارد گرد کی تمام چیزیں جل کر خاک و خاکستر کی صورت اختیار کر لیتی ہیں۔ بعینہٖ جو آگ اسیر شہزادے کے دل میں بھڑک رہی تھی، اس کی حدت سے یاسمین کا دل بھی پگھلنے لگا۔ اس نے جب دیکھا، کہ اس کا جاں نثار محب محل کے اس تاریک و خوفناک کمرے میں بند کر دیا گیا ہے، جہاں سے آجتک کوئی سلامت نہیں نکل سکا تو وہ بے حد مضطرب بیقرار ہو گئی۔ اس کا باپ بیکسوں کو دیکھ کر متاثر ہونا جانتا ہی نہیں تھا، مگر اس کے برخلاف یاسمین کے پہلو میں ایک حساس اور درد مند دل تھا۔ وہ کیونکر برداشت کر سکتی تھی کہ ایک پائیدار سلطنت کی امیدوں کا تنہا مرکز، شریف طبع، اور پھر اس کا بہادر محب ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر جائے۔ اور کسی کو اس کی خبر تک نہ ہو۔ پہلے تو اس نے اپنے تمام حقوق سے فائدہ اٹھا کر اپنے تمام نسائی حربوں کو کام میں لا کر باپ کو شہزادے کی رہائی پر مجبور کیا۔ مگر افسوس اس کی کوئی پیش نہ چلی۔ بلکہ برعکس اس کے ظالم حکمران اسیر شہزادے پر اور ظلم کرنے لگا۔

شہزادی کو سخت مایوسی کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ اس کی تمام امیدیں خاک میں ملا دی گئی تھیں۔ تاہم اس نے ہمت نہ ہاری محبت میں انسان کا دل زیادہ مضبوط، اس کے ارادے زیادہ بلند، اور اس کی روح زیادہ قوی ہو جاتی ہے۔ وہ ہر ایک مصیبت کا مقابلہ کرتا ہے۔ اور بخندہ پیشانی کرتا ہے۔ شہزادی کے دل میں محبت کا تند جذبہ موجزن تھا۔ اس نے چند قابل اعتبار شخصوں کو اپنے ساتھ ملا کر شہزادے کو رہا کرانے کی کوشش شروع کر دی۔ عین اس وقت جب کہ ان کی کوششیں کامیابی کے قریب پہنچ چکی تھیں، ایک شخص نے غداری کی، اور اس سازش کی خبر حاکم کے کانوں تک پہنچ گئی۔ یہ دیکھ کر کہ اس کے اپنے ہی گھر میں اس کے خلاف سازش ہو رہی ہے۔ حاکم کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ آنکھوں میں خون اتر آیا۔ اس نے تمام سازشیوں کو تہ تیغ کر دیا، اور شہزادی کو زمین دوز کوٹھری میں قید کر دیا!

دونوں بدنصیب اسیروں کو کھانا پہنچانے کا فرض صفدر انجام دیتا تھا۔ صفدر شہزادی کا پرانا نمک حلال خادم تھا۔ اور چونکہ محل میں ہر ایک شخص کو اس پر اعتبار تھا، اس لئے اس قسم کی نازک ذمہ داریوں کا کام اسی کے سپرد ہوتا تھا۔ صفدر لوہے کی سلاخوں میں سے ہاتھ ڈال کر دونوں کو مقررہ وقت پر کھانا پہنچایا کرتا۔ اس کے علاوہ انہیں اس مصیبت میں تسلی بھی دیا کرتا۔ مصیبت کا احساس خواہ کتنا ہی تلخ کیوں نہ ہو مگر ایک ہمدرد دل کی ہمدردی سے بھری ہوئی باتیں اس تلخی کو بہت حد تک دور کر دیتی ہیں!

یاسمین اور صولت دونوں علیحدہ علیحدہ کوٹھریوں میں بند تھے اور ان دونوں کوٹھریوں کے درمیان نہ معلوم کتنا فاصلہ تھا۔ اور یہ کبھی امید بھی نہیں ہو سکتی تھی۔ کہ دونوں کسی وقت ایک دوسرے کو مل سکیں گے! دونوں رات دن پتھروں کی دیواروں میں قید تڑپتے رہتے —— تڑپتے رہتے! اور بدقسمتی پر آنسو بہاتے رہتے!

ایک دن صولت کوٹھری کی ایک دیوار کو غور سے دیکھ رہا تھا یکایک اسے ایک چھوٹا سا سوراخ نظر آیا۔ اس نے پتھر کو ہٹانے کی کوشش کی، تو ایک حد تک وہ کھسک گیا۔ جب صفدر آیا۔ تو صولت نے اس سے لوہے کا اوزار لانے کے لئے کہا۔ وفادار خادم کیلئے یہ جان جوکھوں کا کام تھا۔ لیکن اس نے کسی نہ کسی طرح لوہے کا ایک اوزار صولت کو پہنچا دیا۔ صولت اوزار کی مدد سے پتھر کو ہٹانے لگا۔ تھوڑی دیر کے بعد پتھر کچھ ہٹ گیا۔ یہ دیکھ کر شہزادے کی امید بندھ گئی وہ تمام رات پتھروں کو ہٹانے کی کوشش کرتا رہا یہاں تک کہ دیوار میں کافی بڑا سوراخ ہو گیا۔ شہزادہ اس میں داخل ہو گیا، اور یہ دیکھ کر کہ اس کے قدم زمین پر پڑ رہے ہیں اس کا دل خوشی سے لبریز ہو گیا۔ تاریکی میں وہ چلتا گیا۔ یہاں تک کہ اس کا ہاتھ لوہے کی سلاخوں کو لگا۔ شہزادے کے دل میں میٹھا میٹھا درد ہونے لگا۔ اس نے اپنی محبوبہ کو آواز دی، آواز ہلکی سی گونج پیدا

کرتی ہوئی فضا میں غائب ہوگئی! اس نے دوبارہ آواز دی، اب کے آواز کے جواب میں ایک مضمحل سی چیخ تھرتھرائی۔ شہزادے نے سمجھ لیا۔ کہ وہ اپنی محبوبہ کی کوٹھری ہی کے آہنیں دروازے پر کھڑا ہے۔ اس نے یاسمین کو تسلی دی، اور اپنی کوٹھری میں واپس آگیا اور آتے ہی دیوار میں پتھر لگا دیئے۔ تاکہ کوئی آئے تو اسے خبر نہ ہو۔ صفدر نے روشنی کا انتظام بھی کردیا۔

رات کے وقت صولت دیوار میں سے نکل کر یاسمین کی کوٹھری کی طرف چلا۔ یاسمین سلاخوں کے پاس آکھڑی ہوئی۔ دونوں تمام رات راز و نیاز میں مصروف رہے۔ ان کے درمیان موٹی موٹی خوفناک آہنی سلاخیں حائل تھیں۔ مگر ان کے دل ایک دوسرے سے وابستہ تھے۔ دو تین دن بعد صولت نے یاسمین کی کوٹھری کی دیوار میں سے بھی پتھر ہٹا کر آمد و رفت کا راستہ بنا لیا۔ اور یہ دونوں کے لئے بڑی خوش قسمتی تھی۔ . . . . . .

"اور یہ سب اسی وفادار خادم صفدر کی وفاداری کا نتیجہ تھا" میں نے بے اختیارانہ کہا۔

"تم درست کہتے ہو۔ صفدر نے اپنا فرض ادا کیا" حمدی کہنے لگا۔ "شہزادی کی کوٹھری میں بھی جانے کا راستہ ہوگیا اب تو صولت دن بھر اپنی کوٹھری میں رہتا۔ اور رات بھر یاسمین کی کوٹھری میں! دن گزرتے گئے اور اس راز کا علم سوائے صفدر کے اور کسی کو نہ ہوسکا! ہاشم کو کئی بار اپنی بیٹی کا خیال آیا۔ آخر وہ باپ تھا لیکن صفدر نے یاسمین کے مشورہ کے مطابق اس کو شہزادی سے بدظن رکھا۔ شہزادی کو یقین تھا کہ اس کوٹھری سے باہر نکل کر ایک تو وہ اپنے محبوب سے جدا ہو جائے گی۔ اور دوسرے وہ اسے آزاد کرانے میں بھی کامیاب نہیں ہوسکے گی! اس طرح دو سال گزر گئے جعفر کو خبر مل گئی۔ کہ اس کے دشمن نے صولت کو قید کر رکھا ہے۔ یہ سنتے ہی اس نے دشمن کے ملک پر چڑھائی کردی۔ بدطینت کینہ پرور، انتقام جو ہاشم نے اپنے مسلح سپاہیوں کو حکم دے دیا کہ فوراً صولت کو قتل کردو۔

رات کا وقت تھا، اور چونکہ صولت بیمار تھا۔ اس لئے یاسمین اس کے کمرے میں آگئی تھی۔ مسلح سپاہی اندر داخل ہوتے صولت کھڑا ہوگیا۔ محبت کی پتلی یاسمین اپنے محبوب سے لپٹ گئی فضا میں تلواریں چمکیں، دو چیخیں گونجیں، اور اس کے ساتھ ہی دو لاشے خون میں تڑپنے لگے! ——— چند لمحوں کے بعد محب و محبوبہ، دونوں دنیا سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہوگئے!"

حمدی کی آنکھیں اس طرح نم آلود ہوگئیں، جس طرح خزاں رسیدہ زرد، زرد، سوکھے سوکھے پتوں پر بارش کے قطرے گریں اور پھیل جائیں!

اس نے میرے چہرے سے نگاہیں ہٹا کر قلعے کی جانب دیکھا لمبی آہ بھری۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ اس کے سینے میں طوفان بپا ہے ——— وہ بے اختیار رونا چاہتا ہے۔ مگر چند لمحوں ہی میں اسکی آنکھیں خشک ہوگئیں۔ اس کی افسردہ نگاہیں کہ رہی تھیں کہ مایوسیوں نے آنسوؤں کو چوس لیا ہے ——— وہ رونا چاہتا ہے۔ مگر رو نہیں سکتا!

"یہی وہ محل ہے جس کے ایک کمرے میں دو محبت کرنیوالی ہستیوں نے محبت ہی کے ہاتھوں موت کا جام پیا ——— ! اس واقعہ کو ہوئے کئی برس گزر گئے ہیں، مگر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اب بھی میرا مرحوم دوست صفدر میرے سامنے بیٹھا ہوا اس دردناک واقعے کو سنا رہا ہے!"

"صفدر آپ کا دوست تھا" میں نے پوچھا۔

"ہاں وہ میرا دوست تھا ——— اس واقعہ کے بعد وہ دو سال تک زندہ رہا!"

(۳)

حمدی نے ایک سرد آہ بھری، قلعے کی طرف دیکھا، پھر استفسار انگیز نگاہیں مجھ پر ڈالیں، اس کے بعد کسی گہری فکر میں غرق ہوگیا۔ وہ اس طرح خاموش بے حس و حرکت بیٹھا ہوا یوں نظر آرہا تھا گویا ریت کا ایک تودہ ہے۔ یا قلعے کی دیوار سے گرا ہوا ایک پتھر ہے۔ چاند اس بے قرار محب کی طرح جو اپنی محبوبہ کے کاشانے کو نزدیک دیکھ کر انتہائی تیزی کے ساتھ قدم اٹھانے لگے۔ آسمان

کے ایک ابر آلود راستے پر اڑا چلا جا رہا تھا۔

صولت و یاسمین کی داستانِ محبت سنکر میرا دل بے اختیار چاہتا تھا کہ کاش میں بھی جان ہتھیلی پر رکھ کر اپنی محبوبہ کے لئے دنیا کی ہر مصیبت کو خندہ پیشانی برداشت کروں۔ زندگی کے ہر حملے کے سامنے سینہ سپر ہوں، اور اس وقت جبکہ میری جان لبوں پر ہو میری دلنواز محبوبہ ایک لطف انگیز نگاہ مجھ پر ڈالدے۔ یہی میرے لئے سب کچھ ہے۔ یہی میری زندگی کا حاصل ہے! کاش ——! اے کاش!!

حمدی دائیں ہاتھ کی انگلیوں کے لمبے لمبے ناخنوں سے زمین کو کریدنے لگا۔ اور چند لمحے خاموش رہنے کے بعد بولا:۔

"مجھے یقین ہے کہ اب تم اس تباہی ساماں جنوں کو اپنے دل سے نکال دوگے؟"

"یہ جنون —— آہ یہ جنون میری رگ رگ ریشے ریشے میں سرایت کر چکا ہے" میں نے کہا۔

حمدی نے مایوس نظروں سے مجھے دیکھا، اور سرد آہ بھر کر بولا "تم بھولتے ہو نوجوان! اگر اب بھی تم اس مرض سے نجات حاصل کرنے کی کوشش کرو، تو یقیناً کامیاب ہو جاؤ۔ ہر شخص کو محبت کی آگ سے بچنا چاہیئے۔ محبت کی چنگاری شروع شروع میں تو مسرت انگیز و راحت ساماں حرارت بدن میں دوڑاتی ہے؛ مگر کچھ عرصہ کے بعد جاں سوز شعلوں میں تبدیل ہو جاتی ہے! میری نصیحت مانو، اور محبت کی آگ سے دور بھاگو!"

"کاش میں ایسا کر سکتا —— کاش یہ بات میرے اختیار میں ہوتی!"

"سب کچھ تمہارے اختیار میں ہے!"

"محبت کرنے والا دل محبت پر اختیار نہیں رکھ سکتا۔ اگر یہ بات غلط ہے تو پھر صولت نے کیوں اپنی جان جوکھوں میں ڈالی؟ بدنصیب یاسمین نے کس لئے اپنی زندگی کو تباہ کیا؟"

"یہ —— یہ" حمدی آگے نہ بول سکا۔ اس کی پلکیں نم آلود ہو گئیں چند لمحے خاموشی طاری رہی، پھر حمدی بولا:۔

انہوں نے اپنی زندگی سے دشمنی کی —— لیکن تم ان کی پیروی کیوں کرو؟"

میں خاموش رہا۔ اس کا جواب میں دے ہی کیا سکتا تھا؟ حمدی نے قلعے پر نگاہیں جما دیں۔ میں منہ دوسری طرف پھیر کر درختوں میں سے چمکتے ہوئے دریا کے پانی کی لمبی سی سفید لکیر دیکھنے لگا۔ اور سوچنے لگا۔ "تاریکی میں چمکتی ہوئی اس سفید لکیر کی طرح میرے ظلمت کدہ دل میں بھی ایک ہلکی سی امید روشن ہے —— اگرچہ آج سلمیٰ مجھ سے سرد مہری برت رہی ہے، مگر ممکن ہو سکتا ہے کہ مستقبل میں اس کی سرد مہری محبت میں تبدیل ہو جائے۔ اسوقت مجھے یقیناً دنیا کی سب سے بڑی نعمت حاصل ہوگی —— لیکن ایسا کبھی ہوگا؟ ایسا کبھی ہو سکتا ہے؟؟"

یہ سوال میرے دل میں اس طرح پیدا ہوا جس طرح دریا میں ایکدم طغیانی آجائے۔ سلمیٰ جو سلوک مجھ سے کر رہی ہے، اس کو مدِنظر رکھا جائے تو پھر اس کی التفات کا گمان بھی ذہن میں نہیں آسکتا اس پر اس سفاک ساحرہ کی طرح طرح کی سرد مہریاں مجھے یاد آنے لگیں۔ تین سال سے میں مسلسل اس کے ظالمانہ سلوک کا نشانہ بنا ہوا تھا۔ اس دوران میں ایک دفعہ بھی اس نے مسکراتی ہوئی نظروں سے مجھے نہیں دیکھا تھا۔ ایکبار بھی میری طرف توجہ نہیں کی تھی، یہ خیالات میرے ذہن پر چھا گئے۔

یکایک ایک خاص خیال کے دماغ میں آنے سے میں نے مضطربانہ مڑ کر دیکھا —— حمدی غائب تھا۔

میں نے اسے ادھر ادھر تلاش کیا، مگر بے سود۔

قلعے کی مہیب دیواریں، صدیوں کے راز، برسوں کے واقعات اور پھر صولت و یاسمین کی حسرت انجام محبت کی داستان سینے میں چھپائے نہ معلوم کس کا انتظار کر رہی تھیں؟ نہ معلوم کیوں سوگوار و زخم نصیب روحیں، چاند کی مدھم شعاؤں کے ساز پر ماتمی اور فراقیہ نغمے گاتی، ادھر سے ادھر، ادھر سے ادھر مضطربانہ اڑی چلی جا رہی تھیں؟

میں کچھ دیر اور وہاں ٹھہرا، پھر گھر آکر لیٹ گیا، اور نیند نے مجھے دنیا اور مافیہا سے غافل کر دیا۔

کچھ دیر کے بعد میری آنکھ کھل گئی قریب ہی لمپ جل رہا تھا اس کی شعاعیں جلتی ہوئی سلاخوں کی مانند میری آنکھوں میں چبھیں! میں نے پہلو بدل کر آنکھیں بند کر دیں۔ حمری کی سنائی ہوئی ٹریجدی کے واقعات یکے بعد دیگرے میری آنکھوں میں پھرنے لگے۔ میں سوچنے لگا اگرچہ صولت و یاسمین محبت ہی کے ہاتھوں ہلاک ہوئے، تاہم ان کی خوش قسمتی میں ذرہ بھر شبہ نہیں کیا جا سکتا۔ صولت ایک بہت بڑی سلطنت کا ولیعہد تھا۔ ناز و نعم کے آغوش میں پرورش پایا ہوا، شاہانہ زندگی بسر کرنے والا، دنیا اور زندگی کے مصائب سے بے خبر اور محبت نے اسے دنیا کی دلچسپیوں سے یکسر محروم کر کے ایک تاریک کوٹھری میں بند کر دیا۔ لیکن اس تکلیف دہ حالت میں بھی اس کی محبوبہ اس کے قریب تھی جسے دل و جان سے اسے چاہ رہی تھی اس کے مقابلے میں میں آزاد ہوں، جہاں چاہوں جا سکتا ہوں جو چاہوں کر سکتا ہوں، لیکن میری محبوبہ میری طرف دیکھنا بھی پسند نہیں کرتی! اس خیال کے آتے ہی میری آنکھیں پُرنم ہو گئیں، میں نے بے قرار ہو کر پہلو بدل لیا۔

یوں تو یہ تمنا، کہ کاش، میں موت سے کچھ پیشتر ہی اپنی ظالم محبوبہ کے دل کو فتح کر لوں۔ ہر وقت میرے دل میں بیقرار ہی رہتی تھی۔ لیکن اسوقت تو یہ تمنا میرے دل کے ذرّے ذرّے پر چھائی ہوئی تھی!

میں لیٹا رہا، اور نہ معلوم کب تک میری یہ حالت رہتی، کہ دروازے پر دستک ہوئی، میں نے اٹھ کر دروازہ کھول دیا۔ آنیوالا میرا خاص نوکر تھا۔ لمپ کو جلتے ہوئے دیکھ کر اس نے حیرت سے مجھے دیکھا۔

"لمپ آپ نے ابھی جلایا ہے، یا یہ تمام رات جلتا رہا ہے؟"

"بجھا دو اس کو" میں نے کہا۔ اور اٹھ کر کھڑکی میں سے باہر دیکھنے لگا۔ آفتاب نمودار ہو چکا تھا۔ اور ہر طرف روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ میرا خادم لمپ بجھا کر چپ چاپ چلا گیا۔ میں اپنے سر اور آنکھوں میں شدید درد محسوس کر رہا تھا۔ اس لئے پھر لیٹ گیا۔ اور اس وقت کمرے سے باہر نکلا جب دن کا فی حصہ گزر چکا تھا۔ اب میرے دل میں تمنا تھی، کہ دن بہت جلد بیت جائے اور میں پھر شام کو حمری سے ملوں اور اس سے صولت و یاسمین کے متعلق کچھ اور دریافت کروں! نہ معلوم مجھے ان کشتگانِ محبت سے کیوں اتنی دلچسپی پیدا ہو گئی تھی کہ میں چاہتا تھا، انہی کے متعلق باتیں سنتا رہوں۔ ابھی شام ہونے میں کچھ دیر باقی تھی کہ میں اس باغ میں پہنچ گیا۔ جہاں میری محبوبہ سیر کیا کرتی تھی، لوگ سیر و تفریح میں مشغول تھے۔ لیکن میری محبوبہ کہیں بھی نہیں تھی، میں نے باغ کے حسین ترین پھولوں کو اٹھا کر کے گلدستہ بنایا۔ اور باغ سے باہر نکل کر اپنی محبوبہ کی آمد کا انتظار کرنے لگا۔

مغرب کے خونیں گوشے میں زرد رو آفتاب اس مسافر کی طرح نظر آ رہا تھا جو چلتے چلتے تھک کر، ہر طرف سے مایوس ہو کر مجبوراً ایک جگہ بیٹھ جائے۔ تاریکی ہر طرف پھیلتی جا رہی تھی، اچانک مجھے دور سلمیٰ کا شگفتہ مسکراتا ہوا چہرہ نظر آیا۔ وہ — میرے دل کی ملکہ یوں نظر آ رہی تھی گویا ندی کی شفاف سطح پر ہوا کے جھونکوں سے چاندی کی سیمیں شعاع لہرا رہی ہو!

وہ تنہا تھی، میں نے موقعے کو غنیمت جانا اور دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ اس کا انتظار کرنے لگا۔ یہاں تک کہ وہ میرے قریب آ گئی میں نے گلدستہ اس کے قدموں پر ڈال دیا۔ وہ ذرا رکی، انتہائی حقارت انگیز نظریں مجھ پر ڈالیں، اور پھر روانہ ہو گئی، — میں دل مسوس کر رہ گیا۔ شام کی تاریکی کافی پھیل چکی تھی، اور اس تاریکی میں خاک پر پڑے ہوئے پھول بزبانِ خاموشی مجھے میری بدنصیبی کی داستان سنا رہے تھے! آہ میرے سوا دنیا میں کون جانتا تھا کہ یہ رنگین پھول میرے حرماں نصیب دل کے ٹکڑے ہیں جنہیں نہایت حقارت کے ساتھ ٹھکرا دیا گیا ہے!

آخر میں قلعے کے پاس پہنچا۔ اور دیوار کے ساتھ ساتھ چلنے لگا اچانک مجھے یوں محسوس ہوا کہ ابھی تک سلمیٰ کی آمد کا منتظر ہوں! بجلی کی تندی کی طرح اپنی ناکامی کا خیال میرے دل میں پیدا ہوا میں نے آہ بھر کر اوپر دیکھا، یکایک قلعے کی کھڑکی میں سے ایک لمحے کے لئے ایک نہایت دلآویز حسین چہرہ میری نظروں کے سامنے آیا اور پھر غائب ہو گیا!!

میں ٹکٹکی باندھ کر کھڑکی کی طرف دیکھتا رہا — کافی دیر تک دیکھتا

رہا، مگر وہاں کچھ بھی نمودار نہ ہوا! کیا یہ سپنا تھا؟ میرے دل میں خیال پیدا ہوا، مگر اس حالت میں سپنے کا سوال کیونکر پیدا ہو سکتا تھا، میں عالمِ بیداری میں تھا — عالمِ بیداری میں سب کچھ دیکھ رہا تھا! قلعے کی بلند، سنگین اور مہیب دیوار کے سینے پر تاریک بادلوں کے ہجوم میں سفید ابر پارے کی طرح، چاندنی کی چادر بچھی ہوئی تھی، اور اس سفید چادر کے ایک گوشے میں مختصر سا خلا تھا جس میں سے ابھی ابھی ایک حسین و شاداب چہرے نے نمودار ہو کر میرے دل و دماغ میں ہیجان برپا کر دیا تھا۔

میں نے آگے بڑھ کر اپنا ہاتھ دیوار پر رکھ دیا۔ اس حالت میں بھی کچھ دیر وہاں کھڑا رہا۔ آخر یہ خیال کر کے کہ شاید حمدی سے ملاقات ہو جائے۔ میں وہاں سے ہٹا اور کھجور کے درخت کی طرف قدم اٹھانے لگا۔ ہوا کے سست رو جھونکے۔ درختوں کی شاخوں کو ہٹا ہٹا کر چاندنی سے سرگوشیاں کر رہے تھے! میں کھجور کے درخت کے نیچے پہنچا۔ مگر وہاں حمدی کا نقشِ قدم بھی نہیں تھا۔ میں درخت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ اور اپنی نگاہیں قلعے کی دیوار پر جما دیں۔ اسی اثنا میں بجلی کی طرح یہ خیال میرے ذہن میں پیدا ہوا "یہ حسینہ یاسمین تو نہیں؟" یہ سوال میں نے دل میں بار بار دہرایا۔ مگر جب حمدی کے سنائے ہوئے واقعات کی روشنی میں اس پر غور کیا۔ تو میرے دل کو یقین ہو گیا، کہ یہ پُراسرار حسینہ کسی صورت میں بھی یاسمین نہیں ہو سکتی۔ وہ تو کئی سال قبل اپنے محبوب کے ساتھ موت کے گھاٹ اتاری جا چکی ہے تو پھر یہ حسینہ کون ہے؟ انہی خیالات کو ذہن میں لئے ہوئے میں سو گیا۔ خواب میں بھی وہ پُراسرار حسینہ بار بار میری نگاہوں کے سامنے آتی رہی۔ رات کے آخری حصے میں میں بیدار ہو گیا۔ قلعے کی مہیب دیواریں چاندنی کو آغوش میں لئے ہوئے میرے سامنے کھڑی تھیں۔ میں ایک جذبۂ بے تاب کے زیرِ اثر اٹھا اور اسی کھڑکی کے نیچے پہنچا۔ دیر تک کھڑکی کو دیکھتا رہا۔ جب بالکل مایوس ہو گیا۔ تو پھر بادلِ ناخواستہ گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔

(۴)

جیسے ہی شام ہوئی، میں گھر سے نکلا، اور قلعے کی طرف روانہ ہو گیا۔ سب سے پہلے کھجور کے درخت کے نیچے پہنچا، حمدی اب بھی وہاں نہیں تھا۔ اس کے بعد کھڑکی کے نیچے چلا گیا۔ اچانک مجھے یوں محسوس ہوا۔ جیسے کوئی مجھے دیکھ کر ایک دم کھڑکی سے الگ ہو گیا ہے۔ اس کی صورت تو میں نہ دیکھ سکا، مگر میرے دل میں یہ یقین پیدا ہو گیا، کہ یہ وہی قلعے کی حسینہ تھی! وہ رات بھی میں نے وہیں بسر کر دی۔ نہ صرف وہ رات بلکہ اور کئی راتیں بھی وہیں گزر گئیں۔ میں حیران تھا۔ کہ آخر قلعے کی یہ پُراسرار حسینہ نے صرف ایک جھلک دکھا کر مجھ پر کیا جادو کر دیا ہے۔ میں کیوں بار بار اس کھڑکی کے نیچے آ کھڑا ہوتا ہوں؟

اسی طرح کئی دن گزر گئے۔ میں محسوس کرنے لگا۔ کہ قلعے کی حسینہ میرے دل و دماغ پر چھا گئی ہے۔ مقامِ حیرت یہ تھا کہ سلمیٰ بھی بہت حد تک مجھے بھول گئی تھی۔ اور یہ ایک ایسا امر تھا جس کا تصور بھی کبھی میرے ذہن میں نہیں آ سکتا تھا۔

ایک رات میں قلعے کے پاس پہنچا۔ اور اس دیوار کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے لگا۔ جس کے سینے میں میرا سنہرا سپنا غائب ہو گیا تھا، میں دیر تک کھڑکی کو دیکھتا رہا۔ اس واقعے سے قبل گاہے گاہے حمدی سے ملاقات ہو جایا کرتی تھی، مگر اب تو میں نے اس کی شکل بھی کہیں نہیں دیکھی تھی۔ نہ معلوم وہ کہاں غائب ہو گیا تھا! میرے دل میں یہ خیال پیدا ہو گیا تھا۔ کہ حمدی اس حسینہ کے متعلق بہت کچھ جانتا ہے، اور یہی وجہ تھی، کہ میں اس سے ملاقات کرنے کے لئے اس قدر بے تاب و بیقرار تھا!

میں قلعے کے چاروں طرف گھومتا رہا۔ کہ کوئی راستہ اندر جانے کا مل جائے۔ مگر ایک آہنی دروازے کے علاوہ اور کوئی راستہ اندر جانے کا نظر نہ آیا، اور اس آہنی دروازے کا یہ حال تھا، کہ اس کا آدھا حصہ بڑے بڑے پتھروں میں چھپا ہوا تھا۔ پہلے تو ان بڑے بڑے پتھروں کو ہٹایا جائے، پھر جا کر کہیں دروازہ نظر آئے۔ اس کے علاوہ اس دروازے کو کھولنا کوئی معمولی کام نہیں تھا۔ اچانک میری نظر قلعے سے کچھ دور، بلوط کے ایک درخت کے قریب، ایک مٹیلی چٹان پر پڑی، میں یہ سوچ کر کہ چٹان پر بیٹھ کر بآسانی کھڑکی پر

پڑ سکے گی۔ اس طرف چلنے لگا اور وہاں بیٹھ کر کھڑکی کو دیکھنے لگا۔ کچھ دیر وہاں بیٹھا رہا۔ پھر لیٹ گیا۔ اور فراقیہ اشعار گنگنانے لگا۔ جیسے ہی میں نے پہلو بدلا۔ مجھے چٹان کے پاس ایک غار نظر آیا۔ میں فوراً چٹان سے نیچے اترا۔ اور غار میں داخل ہو گیا۔ غار کے ایک طرف ایک سیڑھی نظر آئی۔ میں نے سیڑھی پر قدم رکھ دیئے —— خوف سے میرا دل دھڑکنے لگا۔ قلعے کی پُر اسرار حسینہ کا شگفتہ و خنداں چہرہ میری نگاہِ تخیل کے سامنے نمودار ہوا۔ اور میں آگے چلنے لگا۔ آگے ایک اور سیڑھی تھی۔ اس کے بعد یکے بعد دیگرے کئی سیڑھیاں آئیں میں امید و بیم کے عالم میں نیچے اترتا گیا۔ تاریکی اس قدر تھی کہ خدا کی پناہ، ہر قدم پر اندیشہ ہوتا تھا۔ کہ اب زندہ باہر نہیں نکل سکوں گا۔ سیڑھیوں کے بعد ایک تنگ و تاریک راستہ تھا۔ میں ٹٹول ٹٹول کر قدم اٹھانے لگا۔ آخر میرا ہاتھ ایک دیوار سے لگا۔ میں دیوار کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ خدا کی پناہ، یہ دیوار ختم ہونے کا نام ہی نہ لیتی تھی۔ ایک جگہ پہنچ کر مجھے محسوس ہوا۔ کہ راستہ بند ہے! میں مڑا اور واپس آنے لگا: ارادہ تھا۔ کہ گھر جا کر لیمپ لا کر پھر یہاں آؤں گا۔ اور قلعہ کے اندر جانے کے راستے کا پتہ معلوم کر دوں گا۔ میرے ہاتھ دیوار سے مس کر رہے تھے۔ یکایک مجھے محسوس ہوا، کہ دیوار میں ایک خلا ہے۔ میں وہاں ٹھہر گیا۔ اور ہاتھوں سے آنکھوں کا کام لینے لگا۔ واقعی ایک وسیع خلا تھا۔ میں خلا میں داخل ہوا۔ میرے پاؤں فرش پر پڑے اور میں آگے چلنے لگا۔ اس حسینہ سے ملنے کی امید راستے کی تاریکی کو روشن کر رہی تھی!

کچھ دیر چلنے کے بعد مجھے ہلکی سی روشنی نظر آئی، اور اس کے ساتھ ہی میں نے دیکھا۔ کہ میرے سامنے پتھر کی سیڑھیاں ہیں! یہ منظر دیکھ کر میرا دل اچھلنے لگا۔ میرے دل میں یقین پیدا ہو گیا کہ میں قلعے میں داخل ہو گیا ہوں۔ اور اب عنقریب اس پُراسرار حسینہ سے ملوں گا۔ سات آٹھ سیڑھیاں تھیں۔ ان سیڑھیوں کے بعد میں قلعے میں تھا —!

چاروں طرف گھاس بے ترتیبی سے اُگی ہوئی تھی، سرو اور شاہ بلوط کے درخت جا بجا کھڑے تھے۔ حوض سوکھ گئے تھے، فوارے زنگ آلود تھے۔ تالابوں میں گرد و غبار پڑا تھا۔ میں ایک بے تابانہ ایک مجنونانہ جذبے کے زیرِ اثر اس پُراسرار حسینہ کو تلاش کرنے لگا۔ کبھی مجھے خیال آتا۔ کہ میری وہ پُراسرار حسینہ کسی سرو کے سائے میں سو رہی ہے۔ کبھی گمان ہوتا، کہ وہ کسی سوکھے ہوئے تالاب کے کنارے کوئی غمگین گیت گا رہی ہے۔ اور کبھی شبہ ہوتا، کہ وہ مجھے آتے دیکھ کر ایک ایسی جگہ چھپ گئی ہے، جہاں میں انتہائی کوشش کے باوجود بھی نہیں پہنچ سکتا۔ حیران تھا، کہ کہاں جاؤں، اسے کہاں تلاش کروں؟

آخر میں ایک تالاب کے کنارے بیٹھ گیا۔ چاند قلعے کے مینار کے پیچھے چھپ رہا تھا۔ آسمان کی نیلگوں وسعتوں میں ابر کا ایک ٹکڑا ایک بے تاب محب کی طرح آوارہ پھر رہا تھا، ہوا کے جھونکوں سے درختوں کے . . . . . . سوکھے سوکھے پتے سوگوار کھڑکھڑاہٹ پیدا کرتے ہوئے تالاب میں گر رہے تھے، میں وہاں سے اٹھا یہ خیال لیکر اٹھا کہ اس کھڑکی کو تلاش کرنا چاہیئے۔ جس میں سے اس حسینہ نے جھلک دکھائی تھی مگر اس کمرے کو جس میں وہ کھڑکی تھی، تلاش کرنا کوئی معمولی کام نہ تھا۔ میں کئی کمروں میں داخل ہوا۔ ادھر اُدھر ہر جگہ اسے تلاش کیا۔ لیکن میری کوشش کامیاب نہ ہو سکی۔ آخر تھک کر میں ایک سرو کے درخت کے نیچے لیٹ گیا۔ حسین تصورات کی نشاط زا لہروں نے مجھے تھپک تھپک کر سلا دیا۔ کئی راتیں عالمِ بیداری میں گزری تھیں، اب جو نیند آئی، تو ایسی آئی کہ میں اس وقت بیدار ہوا جب سورج نصف النہار پر پہنچ چکا تھا۔ روشنی میں میں نے اس کی تلاش شروع کر دی، مگر فضول۔ آخر میں اسی راستے سے باہر نکل آیا۔ عجیب بات یہ تھی۔ کہ باہر نکلتے وقت کسی تکلیف کا سامنا نہ کرنا پڑا۔

(۵)

دوسرے دن جب کہ آفتاب اپنے سفر کا تہائی حصہ ختم کر چکا تھا۔ میں اسی راستے سے قلعے میں داخل ہوا، اور اس پُراسرار حسینہ کو تلاش کرنے لگا۔ میں بے تابی کے ساتھ ایک کمرے

سے دوسرے کمرے میں جاتا، اضطراب کے عالم میں گنجان جھاڑیوں کے اردگرد نگاہیں ڈالتا۔ اور دل میں شوقِ فراواں لئے ہوئے پیچیدہ راستوں کو طے کرتا۔ آخر تھک کر مایوس ہو کر ایک سیاہ پتھر پر بیٹھ گیا یہ سیاہ پتھر قلعے کے مینار سے گرا ہوا تھا۔ شام ہو چکی تھی، درختوں کے، پودوں کے، میناروں کے سائے لمبے ہو گئے تھے۔ آفتابِ لبِ بام کی زرد، مایوس اور تھکی ہوئی شعاعیں بلند درختوں اور میناروں کا سہارا لے لے کر فضا کی لامحدود وسعتوں میں پھیلی ہوئی تاریکیوں میں غائب ہو رہی تھیں۔ لمبے لمبے سائے سسکتے ہوئے، رینگتے ہوئے اندھیرے کے سمندر میں ڈوب رہے تھے۔ اور مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ وہ پُراسرار حسینہ بھی ایک سایہ بنکر سایوں کی اس دنیا میں غائب ہو رہی ہے۔ ایک سوکھے ہوئے درخت کی ٹہنی پر چیل بیٹھی اپنی حسرت ناک آواز سے فضا میں ارتعاش پیدا کر رہی تھی، زرد افسردہ اور سوکھے پتے ٹہنیوں سے گر گر کر آپس میں ٹکرا ٹکرا کر کھڑکھڑ کی آواز پیدا کر رہے تھے۔ قلعے کے عین اوپر بڑے سے سیاہ بادل کے آخری سرے پر مدہم چاندیوں نظر آ رہا تھا، گویا ریت کے تودے پر پھول کی ایک نازک پتی لرز رہی ہے، ہوا کے جھونکے آہستہ آہستہ چل رہے تھے یکایک مجھے محسوس ہوا، کہ کوئی دبے پاؤں میرے پاس سے گزر رہا ہے۔ میں اٹھا، مڑ کر دیکھا۔ قریب و دور کوئی انسان نظر نہیں آتا تھا۔ ہوا کی لہروں سے ایک پودے کی شاخیں جنبش میں تھیں .... چاند کی مدہم روشنی درختوں اور پودوں میں سے چھن چھن کر گر رہی تھی۔ میں نے اس پودے کو پکڑ لیا اور دور تک نگاہیں دوڑائیں، ہر طرف متجسسانہ دیکھا۔ مگر وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ میں آہستہ آہستہ قدم اٹھانے لگا۔ ہر قدم پر خیال ہوتا کہ قلعے کی پُراسرار حسینہ پاس کے پودے میں چھپی ہوئی ہے، ہر لحظہ گمان ہوتا، کہ وہ ساحرۂ جمیل مجھے دیکھ کر کسی زمیں دوز کمرے میں چلی گئی ہے۔ اگرچہ بار بار مایوسی کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ تاہم ایک شدید پُرزور اور جنوں انگیز جذبہ تھا۔ جو مجھے ادھر سے ادھر ادھر سے ادھر دوڑائے پھرتا تھا۔ نگاہوں کو کوئی ہستی نظر نہیں آتی تھی، مگر دل کو کامل یقین تھا کہ وہ حسینہ اسی ویران قلعے کی پُراسرار خلوتوں میں سانس لے رہی ہے! یہی نہیں، بلکہ مجھے اس بات کا بھی یقین تھا، کہ وہ دنیا کی حسین ترین دوشیزہ ہے! اس کے سیاہ لمبے لمبے بال کمر تک پھیلے ہوئے ہیں۔ اس کا چہرہ نہایت دلآویز، نہایت شاداب ہے! وہ سحر و نغمہ کی ملکہ ہے۔ اور ہر ہر قدم پر نشہ بکھیرتی ہے!

میں قدم اٹھائے جا رہا تھا۔ یہاں تک کہ قلعے کے آخری حصے میں پہنچ گیا...... سامنے ایک سیڑھی نظر آئی، میں سیڑھی سے نیچے اترا اب معلوم ہوا، کہ یہاں سے قلعے کا دوسرا حصہ شروع ہوتا ہے۔ یہاں گھاس بہت حد تک ترتیب کے ساتھ اگی ہوئی تھی، پودوں کی ترتیب بھی کسی باغبان کی رہینِ منت تھی۔ پودوں کی شاخوں پر طرح طرح کے پھول کھلے ہوئے تھے میرے دل میں نیا جوش، نیا ولولہ، اور نیا جذبہ پیدا ہوا۔ مجھے محسوس ہونے لگا، کہ وہ دوشیزہ جسے میں انتہائی بے تابی کے ساتھ ڈھونڈ رہا ہوں، اور جو اپنے معطر جلوؤں سے میرے خوابوں کی فضاؤں کو مہکا رہی ہے۔ یہیں کسی پودے کے پیچھے یہیں کسی تالاب کے کنارے بیٹھی ہے۔ میں دیر تک پھرتا رہا، پھر حوض کے کنارے بیٹھ گیا اور مہکتے ہوئے، نشہ برساتے ہوئے تصورات کے ہجوم میں تیرنے لگا۔ نیند ایک نرم رو، نکہت بداماں جھونکے کی طرح میری آنکھوں میں آئی، اور میں سو گیا—— دیر تک سوتا رہا، یکایک میرے خوابِ حسین کے افق سے، دور بہتی ہوئی ندی کے ترنم کی طرح ایک دلآویز نغمہ اٹھا، اور فضا میں تھرتھرانے لگا——! میں بیدار ہو گیا۔ وہ دلآویز نغمہ ابھی تک فضا میں لہرا رہا تھا۔ میں نے اپنی آنکھوں کو ملا، واقعی یہ عالمِ بیداری تھا—— میں آگے بڑھا۔ اور آگے بڑھا۔ ترنم ریز آواز برابر گونج رہی تھی—— پھر...... یہ آواز بند ہو گئی—— اس کے ساتھ ہی شاخوں کے زور زور سے آپس میں ٹکرانے کی آواز کان میں آئی..!

ایک جگہ پہنچ کر میرے قدم خود بخود رک گئے، مجھ سے کچھ دور گھاس پر ایک بربط پڑی تھی۔ میرا دل و دماغ مسرت کی مستیوں میں ڈوب گیا۔ میں تیزی کے ساتھ بربط کے پاس پہنچا، اور اسے اٹھا لیا——!

بربط نہایت حسین و جمیل تھی۔ اس کے سنہری تار چاندنی

میں چمک رہے تھے۔

میں دیر تک اسے دیکھتا رہا۔ "بربط اس قدر حسین و دلآویز ہے تو بجانے والی کس درجہ خوبصورت ہوگی"!

یہ خیال میرے ذہن میں پیدا ہوا، اور میں اسی خیال کو لئے ہوئے، پودوں کی شاخیں ہٹا ہٹا کر اس غزالِ رمیدہ کو ڈھونڈنے لگا اسی اثناء میں کچھ دور مجھے ایک سایہ حرکت کرتا ہوا نظر آیا۔

میں اس کی طرف چلا — مگر سایہ بہت جلد غائب ہوگیا! میں نے بربط کو ایکطرف رکھدیا۔ اور کھڑے ہو کر دُور دُور تک نظر ڈالنے لگا۔ میرا گمان تھا۔ کہ جلد ہی اس پراسرار ہستی کو دیکھ لوں گا جس کی یہ بربط ہے۔ مگر میرا خیال فریبِ تخیل ہی ثابت ہوا، ایک جنون انگیز جذبہ میرے دل و دماغ پر چھا گیا، اور میں اس طرف چلنے لگا، جہاں ابھی ابھی میری نگاہوں نے ایک سائے کو حرکت کرتے ہوئے دیکھا تھا! شاخ کی ہر جنبش پر محسوس ہوتا، کہ وہ پُراسرار ہستی کسی پودے کے پیچھے چھپ کر، شاخوں کو ہٹا کر مجھے دیکھ رہی ہے۔ ہوا کی ہر سرسراہٹ پر گمان گذرتا، کہ وہ سحر طراز حسینہ مجھے دیکھ کر خوف کے مارے بھاگ رہی ہے۔ اپنی مسلسل کوششوں کی ناکامی کے باوجود میری تلاش جاری رہی، اسے ہر ہر گوشہ میں تلاش کیا، ہر ہر کونے میں اسے ڈھونڈا مگر شاید وہ پانی کی ایک لہر تھی، جو دریا کے پہلو سے اٹھ کر تو وہ ریگ میں غائب ہو جاتی ہے۔ یا ایک تودہ ریگ تھی، جو سمندر میں گر کر، پلک جھپکانے میں تحلیل ہو جاتا ہے۔ یا پھر وہ ایک روشن ستارہ تھی، جو خود بخود پہنائے آسمان کی نیلگوں پنہائیوں میں ڈوب جاتا ہے۔ پودوں کی شاخیں یوں جھکی پڑی تھیں، گویا ان پر ایک عجیب و غریب طلسم کا بوجھ پڑا ہوا ہے۔ درخت یوں پُراسرار انداز میں کھڑے تھے جیسے افق کی دھند پر خوابوں کے عکس لہرا رہے ہیں!

آسمان کی نیلگوں وسعتوں پر ننھے ننھے ستاروں کا کارواں خاموش ہو، دم بخود، رکا ہوا چاند کی سیمیں کشتی ایک بڑے سے سیاہ بادل کے طلسماتی غار میں آہستہ آہستہ غائب ہوتی ہوئی، ابر پارے مبہوت، ششدر، ہوا حیرت زدہ، رک رک کر چلتی ہوئی، فضاؤں میں ہر طرف طلسم کے دھندلکے، زمین پر ہر طرف سحر زا سائے، اور اس طلسم و سحر کی دنیا میں، اس سحر انگیز سایوں کی دنیا میں ایک پراسرار حسینہ سایوں میں چھپتی، سائے بکھیرتی۔ ایک سائے کی طرح رواں دواں —!

یکایک ایک پودے کے قریب ایک سوکھی ٹہنی کو جنبش ہوئی میرا سانس رک گیا۔ قدم رک گئے —— خیالات کی رَو رک گئی —! میری آنکھوں کے سامنے چند قدم کے فاصلے پر حمدی کھڑا تھا۔

حمدی دوسری جانب دیکھ رہا تھا، میں نے تیزی سے وہاں پہنچنا چاہا مگر ابھی دو قدم ہی اٹھائے تھے، کہ حمدی غائب! پھر وہی سایوں کی . . . . . .

حمدی یہاں، اس ویران قلعے میں۔ میں نے خواب تو نہیں دیکھا میری آنکھوں نے دھوکا تو نہیں کھایا! نہیں، میں عالم بیداری میں تو تھا —؟ میں ادھر ادھر پھرنے لگا، جب واپس آیا، تو وہاں بربط کا نام و نشان بھی نہ تھا —! میں وہیں رہا۔ یہاں تک کہ قلعہ کے مینار کے عقب سے سورج طلوع ہوا، اور میں قلعے سے نکل کر گھر کیطرف روانہ ہوگیا۔

(۶)

دوسرے دن جب مغربی آسمان ڈوبتے ہوئے سورج کی سرخی سے لالہ فام ہوگیا۔ میں گھر سے نکل کر سب سے پہلے قلعے کے پاس کھجور کے درخت کے نیچے پہنچا، اور حمدی کا انتظار کرنے لگا، وہاں بیم و رجا کی حالت میں دیر تک بیٹھا رہا۔ اور جب مایوس ہوگیا، تو اسی پُراسرار راستے سے قلعے میں داخل ہوا، آخری سیڑھی پر قدم رکھتے ہوئے مجھے یوں محسوس ہوا، کہ ابھی کوئی خلافِ معمول واقعہ رونما ہونے والا ہے۔ سینے میں دھڑکتا ہوا دل، اور آنکھوں میں ایک نیا شوق و بیقراری لئے ہوئے میں قلعے کے اندر پہنچا۔

وہی طلسماتی دنیا تھی، وہی سحر آلود سائے۔ اور پھر وہی میرا جذبہ تجسس، درخت سائیں سائیں کر رہے تھے۔ میں اسی جگہ پہنچا، جہاں گذشتہ رات گزاری تھی۔ اور پودے کے قریب بیٹھ کر آواز کا انتظار کرنے لگا! یکایک کسی کنج سے ایک شیریں و دلآویز نغمہ نکل کر فضا

میں تھرتھرایا۔ میں آہستہ آہستہ سانس روکے اٹھا۔ اور اس کنج کی طرف جانے لگا ـــ آخر ایک سائے کی طرح وہاں پہنچا۔ وہاں میری نظروں نے جو منظر دیکھا۔ وہ میں تادمِ واپسیں بھی نہیں بھلا سکتا۔ ایک نہایت حسین و جمیل دوشیزہ بیٹھی بربط پر گا رہی تھی میں پودے سے لگ کر کھڑا ہو گیا ـــ دوشیزہ کے سنہری بالوں کی لٹیں شعلہ رنگ رخساروں پر یوں بکھری پڑی تھیں۔ جیسے شفق کے سینے پر طلائی کرنیں تیر رہی ہیں۔ اسکی آنکھیں بڑی بڑی اور نہایت حسین تھیں اور اس پر بھویں۔ یوں چھائی ہوئی تھیں۔ گویا دریا کی سطح پر فضا میں اڑتے ہوئے پرندوں کی ایک لمبی قطار کا سایہ لرز رہا ہے! اس کی پتلی پتلی، نورانگن انگلیاں بربط کے تاروں پر جنبش کر رہی تھیں مجھ پر ایک نیم بے ہوشانہ کیفیت چھا گئی۔ ایک ناقابلِ تجزیہ نشہ میرے دل و دماغ کو محیط ہو گیا۔

وہ پُر اسرار حسینہ چاند کا ایک خوابِ جمیل تھی، پھولوں کے ذہن کا تصورِ حسین تھی۔ اور پھر موسیقی کی روح سے نکلا ہوا ایک نغمۂ رنگین تھی! میں بے اختیار ہو کر اس کے پاس پہنچ گیا۔ اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔ اور ایک ہلکی سی چیخ اس کی لبوں سے نکل کر فضا میں تھرتھرائی۔

"ڈرو نہیں ـــ" میں نے کہا۔ وہ پیچھے ہٹ گئی، بربط گھاس پر گر پڑی۔

"ڈرو نہیں ـــ تمہیں ڈرنا نہیں چاہیئے۔ میں تمہاری تلاش میں اتنا عرصہ سرگرداں رہا ہوں۔" میں نے جلدی جلدی کہا۔

وہ اور پیچھے ہٹ گئی ـــ "مجھے جانے دو ـــ" یہ کہتے ہوئے اس کی سہمی ہوئی آنکھیں نم آلود ہو گئیں، میں کھڑا رہا اور وہ وحشی ہرنی کی طرح بھاگ کر نظروں سے غائب ہو گئی۔

اس کے جانے کے بعد میں نے اسے ڈھونڈا۔ مگر وہ کہیں بھی نظر نہ آئی

آخر تھک کر بربط کو اپنے سینے لگا کر میں لیٹ گیا۔ نیند تو نہ آسکی، لیکن خوشگوار تصورات، نکہت کی موجوں کی طرح میرے دل و دماغ پر چھائے رہے!

اس واقعے کے بعد میں نے مسلسل کئی راتیں ویران قلعے میں گذار دیں۔ مگر اس دوران میں قلعے کی ساحرہ کی جھلک تک بھی نہ دیکھ سکا۔ سوچتا تھا۔ کیا نسوانی فطرت اتنی ہی "سنگدل" ہوتی ہے یا یہ میری قسمت ہے۔ کہ جس عورت کو بے تابانہ چاہوں، وہی مجھ سے دور بھاگے۔ مجھ سے شدید نفرت کرے پھر خیال آتا۔ ممکن ہے۔ یہ سب کچھ تخیل کی کرشمہ سازی ہو... اس سنسان اور ویران قلعے میں کوئی حسینہ نہ ہو۔ اور میرے تخیل کی اعجوبہ طرازیوں نے ایک دوشیزہ کا مرمریں پیکر اختیار کر لیا ہو۔ یا پھر دل میں کہتا، جھلکیاں دکھانے والی ـــ جھلکیاں دکھا دکھا کر دل کو بے تاب کرنے والی کوئی بدروح نہ ہو، جو مجھے ستا ستا کر اپنے لیے سامانِ مسرت پیدا کر رہی ہے۔

(۷)

ایک شام کو جب کہ چاند پوری تابانی کے ساتھ فضائے آسمانی میں چمک رہا تھا۔ میں ایک گوشے میں بیٹھا ہوا اپنے خیالات میں غلطاں و پیچاں تھا کہ اتنے میں ترنم کی لہر سامنے کے پودے کی پیشانی سے بلند ہوئی۔ میں تیزی سے وہاں پہنچا، وہی پُر اسرار حسینہ وہاں بیٹھی بربط پر گا رہی تھی۔ میں نے جلدی سے آگے بڑھ کر اس کی نازک کلائی پکڑلی ـــ کلائی پکڑتے ہی اس کے رخسار زرد پڑ گئے۔ وہ بمشکل بولی:۔

"مجھے چھوڑ دو ـــ!"

"بھاگو گی تو نہیں ـــ؟"

"نہیں ـــ مجھے چھوڑ دو!" اس نے خوفزدہ لہجے میں کہا

"یاد ہے، پہلے تم بھاگ گئی تھیں، اس لئے ـــ!"

"مجھے چھوڑ دو، کلائی میں درد ہو رہا ہے۔ اور ـــ"

"اور کیا؟"

"میں جانا چاہتی ہوں ـــ؟"

"اس کا مطلب یہ ہے۔ کہ جب میں نے تمہیں چھوڑا تو تم بھاگ جاؤ گی!"

"ہاں!" اس نے بے ساختہ کہا۔

"ابھی تو تم نے کہا تھا کہ میں بھاگوں گی نہیں ۔۔۔ اب کہہ رہی ہو بھاگ جاؤں گی!"

"مجھے تم سے ڈر لگتا ہے"

"کیوں؟"

"تم مرد جو ہوئے ۔۔۔ اور دادا جان کہتے ہیں مرد بڑے ظالم و سفاک ہوتے ہیں ۔۔۔ عورتوں کو قتل کر دیتے ہیں!" یہ الفاظ کہتے ہوئے اس کے رخسار اور پیلے پڑ گئے!

"حمدی نے یہ کہا ہے؟"

"نہیں! دادا جان نے"

"تمہارے دادا جان کون ہیں؟"

"دادا جان ۔۔۔؟ وہی جو میرے دادا جان ہیں!"

قلعے کی اس بھولی بھالی دوشیزہ نے محبت کی آگ پر تیل کا کام کیا۔ میں نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ اور کہا "لو اب بھاگ جاؤ"

شاہینہ چند قدم چلی پھر ٹھہر گئی ۔۔۔ اور بربط کے تاروں پر انگلیاں پھیرنے لگی۔

"تم ظالم تو نہیں ہو۔ نا؟" اس نے مترنم آواز میں کہا،

"میں تو ظلم کا تصور بھی نہیں کر سکتا ۔۔۔" میں نے اس کی طرف جاتے ہوئے کہا۔

"مگر دادا جان کہتے ہیں، ہر ایک مرد ظالم ہوتا ہے۔!"

"تو پھر تمہارے دادا جان مرد نہیں ۔۔۔ ان سے کیوں نہیں بھاگتیں؟"

وہ چند لمحے خاموش رہی پھر پودے کی ٹہنی کو ہلا کر کہنے لگی ۔۔۔ "وہ ہرگز ظالم نہیں ۔۔۔ وہ تو بڑے اچھے دادا جان ہیں!"

"تو پھر سمجھ لو میں بھی بڑا اچھا ہوں!"

"اگر تم بڑے اچھے ہو تو میں تم سے ضرور ملا کروں گی۔!"

"تمہارا نام کیا ہے ۔۔۔؟" میں نے پوچھا۔

"شاہینہ!"

"شاہینہ بہت اچھا نام ہے۔ میرا نام پوچھو گی؟"

"نہیں! تم خود اپنا نام بتاؤ!"

"میں خود بتاؤں ۔۔۔" میں نے قہقہہ لگایا۔ وہ ایک قدم پیچھے ہٹ گئی پھر میری طرف دیکھ کر مسکرائی۔

"میرا نام شہاب ہے۔!"

"شہاب بڑا اچھا نام ہے"

"کھڑی کیوں ہو، بیٹھ جاؤ ۔۔۔" میں نے اس کی کلائی پکڑ کر کہا۔

"اوہ! میری کلائی نہ پکڑو۔ تمہارے ہاتھ لوہے کے ہیں" اس نے کہا۔

"تم خواہ مخواہ ڈرتی ہو ۔۔۔ اگر تمہیں معلوم ہو جائے کہ میں کتنا عرصہ تمہاری تلاش میں سرگرداں رہا، تو تم شاید بہت غمگین ہو جاؤ"

"تم یہاں آئے کیوں؟"

"تمہاری تلاش میں ۔۔۔ شاہینہ"!

"میری تلاش میں تم یہاں کیوں آئے ۔۔۔؟" اس نے پوچھا۔

"کیونکہ میں تم سے ملنا چاہتا تھا ۔۔۔ تم سے ہر وقت باتیں کرنا چاہتا تھا"

"مگر میں ہر وقت باتیں نہیں کر سکتی۔ دادا جان تمہیں یہاں سے نکال دیں گے"

"تو دادا جان سے یہ نہ کہنا، کہ شہاب یہاں آگیا ہے ۔۔۔ سمجھ لیا نا شاہینہ! ورنہ دادا جان تم سے ناراض ہو جائیں گے!"

"میں نہیں کہوں گی دادا جان سے ۔۔۔ اور اب میں جاتی ہوں ۔۔۔ دادا جان یہاں نہ آجائیں" یہ کہہ کر وہ اٹھی اور پودے کے پیچھے غائب ہو گئی!

میں کچھ دیر وہاں بیٹھا .... پھر قلعے سے نکل آیا۔

(۸)

جب دل کہیں اور ہو، تو ایک لمحہ بھی قیامت کی گھڑی بن جاتا ہے۔ اور مجھے تو جدائی کا پہاڑ سا دن گزارنا تھا۔

انتہائی بے چینی و بے تابی کے ساتھ میں طلوعِ آفتاب سے لیکر غروبِ آفتاب تک انتظار کی گھڑیاں گنتا رہا۔ اور جب شام ہوئی تو...... بے تابانہ قلعے کی طرف روانہ ہو گیا۔ پہلے جب میں قلعے کی سیڑھیوں پر قدم رکھتا تھا۔ تو میرے دل میں امید کے ساتھ ایوسی بھی ہوتی تھی۔ مگر اس دن میرے دل کے ذرّے ذرّے پر بے تابانہ مسرت یا مسرورانہ بے تابی کی کیفیت چھائی ہوئی تھی میں اندر پہنچا۔ اور اسی محبوب کنج میں اپنی محبوبۂ دلنواز کا انتظار کرنے لگا

ماہِ چہاردہم کے بلوریں سینے سے نور کے دریا بہہ رہے تھے ... ہر طرف چاندنی چھائی ہوئی تھی۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا یہ میرے دل کی ملکہ نغمے اور خوشبوئیں برساتی نغموں اور خوشبوؤں کی سیڑھیوں سے اترتی میری طرف آ رہی ہے۔ جب کافی وقت گزر گیا تو میں نے کنج سے نکل کر ادھر ادھر دیکھا۔ کچھ دور وہ معصوم فطرت دوشیزہ، سہمی سہمی سی، گھبرائی گھبرائی سی منہ میں انگلی ڈالے کھڑی تھی۔

میں نے اسے بلایا۔ مگر وہ وہیں سنگِ مرمر کی ایک مورتی سی بنی ہوئی کھڑی رہی۔

میں نے دوبارہ آواز دی" آجاؤ شاہینہ"!

اس نے اپنے ریشمیں بالوں میں انگلیاں پھیریں، دو قدم چلی اور پھر رک گئی۔ میں اس کے پاس پہنچا۔

" کتنی دیر سے تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔ مگر تمہیں پروا ہی نہیں" میں نے کہا۔

" میں تو وہاں کھڑی تھی"!

" وہاں کھڑی تھیں کب سے"؟

" بڑی دیر سے ـــــ شاید اس وقت تم یہاں نہیں تھے"!

" تو تم یہاں کیوں نہ آگئیں"؟

اس نے مسکرا کر منہ دوسری طرف پھیر لیا۔

" تم آج بھی آگئے۔ کل بھی آئے تھے ـــــ اور شاید پہلے بھی آتے رہے ہو"!

" تم میرے آنے پر خوش نہیں"؟

" ہیں ـــــ مگر دادا جان ـــــ وہ دن بھر مجھے بتاتے رہے ہیں، کہ نوجوان مرد بڑے ظالم ہوتے ہیں۔ انہوں نے کئی قصے سنائے"!

" تم نے میری آمد کے متعلق دادا جان کو بتا دیا"؟ میں نے مضطربانہ پوچھا۔

وہ مسکرائی" میں نے کہا تو نہیں ـــــ مگر"!

" تم نے کہا نہیں، تو پھر کوئی ڈر نہیں"!

" تو تم آئندہ بھی آیا کرو گے"؟

" کیوں نہیں ـــــ میں تو چاہتا ہوں، کہ ہر وقت یہاں رہوں"!

"اوہ! ایسا نہ کرنا۔ دادا جان دن کے وقت یہاں ہوتے ہیں مگر تم کیوں یہاں آنا چاہتے ہو"؟

" کیونکہ جب کسی سے محبت ہو جائے، تو دل کی یہی آرزو ہوتی ہے"۔

" تمہیں کس سے محبت ہو گئی ہے"؟

" تم سے ـــــ"!

" مجھ سے محبت ہو گئی ہے ـــــ اوہ"! وہ مسکرائی" لیکن دادا جان جتنی محبت تم کبھی بھی مجھ سے نہیں کر سکو گے"!

میں اس کے معصومانہ چہرے کو غور سے دیکھنے لگا۔

" مجھے یوں گھور گھور کر کیوں دیکھ رہے ہو ـــــ یہ بات ٹھیک نہیں، میں چلی جاؤں گی، اور پھر اپنے کمرے سے باہر ہی نہیں نکلوں گی"!

" تم ناراض ہو گئیں ـــــ مجھے اس کا افسوس ہے۔ مگر مجھے بتاؤ تمہیں بھی مجھ سے محبت ہے"؟

" ہاں ـــــ"! اس نے کہا۔ اس کے چہرے پر حیا کی سرخی دوڑ گئی!

" کتنی"؟ میں نے پوچھا۔

" یہ تو میں نہیں جانتی ـــــ شاید اتنی محبت ہے جتنی مجھے

اپنی بربط سے ہے!"

یہ کہکر اس نے بربط کو سینے سے لگا لیا۔ بربط کے ایک سرے پر مور کی چونچ اس کے نعلیں لبوں کو مس کرنے لگی

"یہ تو کچھ بھی نہیں!"

"کچھ بھی نہیں — تو پھر تم بتاؤ، تم سے کتنی محبت کروں لیکن یاد رکھو، میں تم سے ہرگز اتنی محبت نہیں کر سکتی جتنی اپنے پیارے دادا جان سے کرتی ہوں!"

"وہ محبت اس بوڑھے کے لئے ہی رہنے دو۔" میں نے ہنسکر کہا۔

وہ خاموش ہوگئی کچھ دیر سوچنے کے بعد بولی:

"کچھ —؟"

"پھر — آہستہ آہستہ تمہیں سب کچھ معلوم ہو جائے گا:"

وہ کچھ مضطرب ہوگئی۔

"شاہینہ!" میں نے اسے مخاطب کیا، "بولتی کیوں نہیں!"

"ہاں! کہو!!"

"خفا ہوگئیں تم!"

"نہیں۔ بالکل نہیں!"

یہ کہکر اس نے بربط کے تاروں پر انگلیاں پھیریں، اور پھر بربط میری گود میں رکھ دی، میں بربط بجانے لگا۔ اور وہ مسرت انگیز نگاہوں سے مجھے دیکھنے لگی — نصف رات تک ہم بربط بجاتے رہے اور باتیں کرتے رہے۔ آخر گھبرا کر، دادا جان کے خیال سے مضطرب ہو کر وہ چلی گئی، اور میں قلعے سے باہر نکل آیا۔

(۹)

اس کے بعد میں خود کو نئی دنیا میں محسوس کرنے لگا میرے افسردہ و پژمردہ دن، محبت کے حسین اور نگہتوں میں لپٹے ہوئے تصورات سے رنگین و معطر ہو گئے۔ اور میری مایوس و مضمحل راتیں قلعے کی ساحرہ جمیل کے یاسمین جلووں سے پُرنور و درخشاں! اس سے پیشتر میں خود کو دنیا کا بدنصیب ترین شخص سمجھتا تھا۔ مگر اب اپنی خوش قسمتی کو نقطۂ کمال پر تصور کرنے لگا۔ میری تمام کائنات سمٹ سمٹا کر قلعے کی چاردیواری میں محدود ہوگئی، اور میرے خیالات ہر چیز سے ہٹ کر صرف شاہینہ کے گرد گھومنے لگے۔ راتوں کو میں مسرتوں میں ڈوبا رہتا، اور دن کو ان مسرتوں کے خیالات میں غرق! آہ! یہ زندگی کیسی عجیب زندگی تھی خوابوں کی رنگینیوں میں تیرتی ہوئی نگہتوں کے گہوارے میں جھولتی ہوئی اور مسرتوں کی لہروں میں بہتی ہوئی خوش نصیب زندگی! اب بھی اس خوشگوار و دلآویز زندگی کا خیال کرتا ہوں، تو محسوس ہوتا ہے کہ شاید میں نے ایک خواب دیکھا ہے!

میں ہر رات کو قلعے میں جا کر مخصوص تالاب کے کنارے بیٹھ کر اپنی معصوم صورت و معصوم فطرت محبوبہ کا انتظار کرتا۔ وہ مسکراتی ہوئی خراماں خراماں آتی ہم دونوں شیریں و فرحت زا گیت گاتے تالاب کے کنارے ٹہلتے۔ ایک دوسرے کو چھیڑتے، اور میٹھی میٹھی، پیاری پیاری باتیں کرتے! اسی طرح رات گزر جاتی، اور جب سورج کی پہلی کرن میرے لئے رخصت کا پیغام لاتی تو میں اپنی محبوبۂ بلجا نواز کے لعلیں لبوں پر الوداعی بوسہ دیکر قلعے سے باہر نکل آتا۔ دن پر دن، ہفتوں پر ہفتوں گزرنے لگے۔ اگرچہ میں ہر رات کو اپنی شیریں ادا محبوبہ کے پاس رہتا، لیکن میری انتہائی خواہش یہ تھی، کہ دن کے وقت بھی وہیں رہوں مگر اس میں ایک بہت بڑا خطرہ تھا، دن کے وقت حمدی شاہینہ کو ہمہ اپنی نگاہوں کے سامنے رکھتا، اور اس صورت میں اس سے ملاقات کا ذریعہ کیونکر پیدا ہو سکتا تھا؛ رات کو تو وہ بے فکر ہو کر سو رہتا، اور شاہینہ کو کمرے سے باہر نکلنے کا موقعہ مل جاتا۔

شاہینہ کو جو کچھ معلوم تھا، اس نے مجھے بتا دیا تھا۔ لیکن ابھی تک دو باتیں قطعی طور پر میرے لئے دو معمے تھے! پہلی بات تو یہ، کہ میں یہ نہیں جانتا تھا، کہ شاہینہ کون ہے۔ اور حمدی اس کا حقیقی دادا ہے۔ یا وہ اسے ویسے ہی دادا کہتی ہے۔ دوسری بات یہ کہ حمدی نے شاہینہ کو اس ویران قلعے میں بند کر کے مردوں سے کیوں اسقدر بدظن کر دیا ہے؟ میں ان دونوں باتوں پر بہتیرا غور کرتا۔ مگر کچھ سمجھ میں نہ آتا۔ اگرچہ حمدی کو ہماری ملاقات کا علم نہ تھا۔ مگر یہ بات کب تک چھپی رہ سکتی تھی؟! آخر وہی ہوا جس کا اندیشہ تھا۔ ایک رات میں شاہینہ کے زانو پر سر رکھے، اس کی سنہری لٹوں سے کھیل رہا تھا

کہ حمدی ہمارے پاس آکھڑا ہوا۔ اس کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔ بدن فرطِ غصہ سے کانپ رہا تھا۔ شاہینہ کانپتی ہوئی لرزتی ہوئی کھڑی ہوگئی ——!

"شہاب ——!" حمدی نے غضبناک آواز میں کہا

میں خاموش رہا۔ شاہینہ نے حمدی کا ہاتھ پکڑ لیا اور کہنے لگی

"داداجان! یہ ان مردوں میں سے نہیں ہے جو ——"

حمدی نے اسے دھکا دیکر پیچھے ہٹا دیا۔ اور اگر میں اسے جلدی سے نہ تھامتا تو وہ یقیناً گر پڑتی۔

"بابا! غصے کو قابو میں کیجئے ——!" میں نے کہا۔

"یہ الفاظ کہتے ہوئے تجھے شرم نہیں آتی کمینے انسان! میں اس معصومہ کو تم ظالموں کے سایے سے بھی بچاتا رہا ہوں، مگر آج تم نے میری تمام امیدوں کو خاک میں ملا دیا ——" یہ کہتے ہوئے حمدی کی رگیں ابھر آئیں، آواز زیادہ غضبناک ہوگئی "تم نے یہاں آنے کی جرأت کیسے کی ——؟ تمہارا یہاں کیا کام تھا —— تم اسلئے یہاں آئے، کہ ایک معصوم فطرت دوشیزہ کو تباہ کیا جائے۔ ایک بوڑھے کے خونِ دل سے ہاتھ رنگے جائیں ——؟؟"

"بابا! سوچ سمجھ کر بات کیجئے! آپ خواہ مخواہ مجھ پر الزام لگاتے ہیں ——!" میں نے قدرے خفگی سے کہا۔

"یہ الزام ہے —— ظالم کمینے —— میں تمہیں اچھی طرح نہیں جانتا، تمہارے دل کی ایک ایک بات سے واقف نہیں؟!"

شاہینہ ایک طرف کھڑی تھی، اس نے تیزی سے آگے بڑھکر حمدی کا ہاتھ پکڑ لیا، اور عاجزانہ لہجے کہنے لگی: "داداجان! چلئے میرے ساتھ —— چلئے نا داداجان!"

حمدی کہے جا رہا تھا "میں بوڑھا ہوں، مگر یاد رکھو جب تک میرے کمزور و ناتواں جسم میں جان باقی ہے، تم اپنے ذلیل مقصد میں کامیاب نہیں ہوسکتے —— میں اپنے بوڑھے اور کمزور ہاتھوں سے طاقتور گردن کو مروڑنا جانتا ہوں۔ جاؤ! یہاں سے چلے جاؤ، میرے دُکھے ہوئے دل کی بددعاؤں سے ڈرو —— اس مظلوم وبے کس کی آہوں سے ڈرو —— قدرت کے خوفناک انتقام سے ڈرو۔ جاؤ دور ہو جاؤ!"

"داداجان! چلیے میرے ساتھ داداجان!"

"ابھی تک وہیں کھڑے ہو تم —— مردار کتے!" حمدی نے گرجتی ہوئی آواز میں کہا۔

شاہینہ نے حسرت ناک نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔ اور غمگین و حسرت بآغوش لہجے میں کہا "جاؤ! —— تمہیں یہاں سے چلے جانا چاہئے!"

میں مڑ کر چلنے لگا۔

"خبردار! آئندہ یہاں نہ آنا ——!" حمدی نے غضبناک لہجے میں کہا۔

میں نے مڑ کر شاہینہ کی طرف دیکھا —— اس نے ہاتھ سے مجھے چلے جانے کا اشارہ کیا، اور میں قلعے سے باہر نکل آیا۔

میں قلعے سے نکلا —— یہ محسوس کرتے ہوئے نکلا کہ اپنی روشن معطر اور رنگین دنیا کو چھوڑ کر، ایک نہایت تاریک، بھیانک اور متعفن غار کی گہرائیوں میں اتر رہا ہوں۔ ایک گھنٹہ پیشتر... میں انتہائی مسرور انسان تھا۔ میری قسمت کا ستارہ انتہائی بلندی پر چمک رہا تھا۔ مگر اب وقت کے ایک حقیر ترین حصے کے گزر جانے پر، میری تمام روشن امیدیں، رنگین تمنائیں اور خوشگوار توقعات خاک میں مل چکی تھیں —— آہ مسرتوں کے زینے طے کرتے ہوئے ثریا کی بلندیوں تک جا پہنچنا، اور پھر پامال اور مجروح ہو کر تحت الثریٰ کی پستیوں پر آگرنا، کتنا ہمت شکن، کتنا روح فرسا انقلاب ہے!

حمدی کی آواز میرے کانوں میں گونج رہی تھی، اور اس کیساتھ ہی میری نگاہوں کے سامنے شاہینہ کا مرجھایا ہوا چہرہ بھی پھر رہا تھا۔ ہر قدم پر رُک رُک کر میں قلعے کی طرف دیکھتا تھا، ہر لمحہ میرے ذہن میں اپنی بدقسمتی کا احساس زیادہ تلخ ہوتا جاتا تھا۔

میں اسی کھجور کے درخت کے نیچے بیٹھ گیا۔ چند لمحے ہی بیٹھا ہوں گا کہ میرے دل میں سیلابِ اشک موجزن ہوگیا۔ آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ اور کافی دیر تک بہتے رہے۔ اسوقت مجھے کائنات کی ہر چیز روتی ہوئی نظر آ رہی تھی، درخت سسکیاں لے رہے تھے، ہوا آہیں

بھر رہی تھی۔ اور مایوس، افسردہ چاند، ایک سیاہ مہیب بادل کیطرف رینگتے ہوئے اس طرح جارہا تھا، جس طرح ایک بدنصیب محب محبت کے زخموں سے نڈھال، ابنائے روزگار کے حملوں سے پامال سینے پر داغ تمنا لئے ہوئے، موت کے اندھیرے غار کیطرف جارہا ہو! اسی درخت کے نیچے حمدی پدرانہ شفقت کے ساتھ میرے ٹوٹے ہوئے دل کو سہارا دیا کرتا تھا، اور اب اسی درخت کے نیچے میں اس کے بیرحمانہ سلوک کو یاد کر رہا تھا۔ شاہینہ کہا کرتی تھی کہ جس دن دادا جان کو ہماری ملاقاتوں کا علم ہوا، اسی دن وہ سخت ناراض ہو جائینگے اور ممکن ہے تمہیں یہاں آنے سے روک دیں۔ مگر مجھے حمدی سے ایسے سنگدلانہ سلوک کی توقع نہیں تھی!

اس قسم کے خیالات میرے ذہن میں آتے رہے۔ میں آنسو بہاتا رہا۔ آخر اشک ریزی ختم ہوئی۔ شاید میرے آنسو ختم ہو گئے تھے ورنہ دل تو اب بھی رونے کے لئے بے تاب تھا! میں نے قلعہ پر حسرت آگیں نگاہ ڈالی اور گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ وہ دن انتہائی بے قراری کے عالم میں گزرا۔ جب شام ہوئی، اور طاق مغرب پر چراغ خورشید کا شعلہ تاریکیوں کے ہجوم میں سسکیاں لینے لگا۔ میرے قدم خود بخود قلعے کی طرف اٹھنے لگے۔ قلعے کے پاس پہنچکر کچھ دیر تک کھڑا رہا۔ پھر قلعے کے اندر چلا۔ دل زور زور سے دھک دھک کر رہا تھا۔ اور اس کی دھڑکن برابر بڑھتی جا رہی تھی۔ یکایک مجھے محسوس ہوا، کہ بہت آگے نکل آیا ہوں میں مڑا، اور اسی جگہ پہنچا، جہاں اوپر جانے کو سیڑھیاں تھیں۔ مگر دیکھ میرا دل مایوسی میں ڈوب گیا۔ کہ یہ راستہ بند ہو چکا ہے میرے ہاتھ کسی سخت چیز سے مس کر رہے تھے! اب مجھے معلوم ہوا۔ کہ سیڑھیوں کے بعد جو آہنی دروازہ تھا، اور جو ہمیشہ کھلا رہتا تھا بند ہو چکا ہے۔ کافی دیر تک میں وہیں کھڑا رہا ـــ حیران و سراسیمہ کھڑا رہا۔ پھر باہر نکل آیا۔ میری مایوسی کی کوئی انتہا نہ تھی، اور یہ انتہائی مایوسی انتقام کی آگ میں تبدیل ہو رہی تھی! اس وقت اگر حمدی میرے قریب ہوتا۔ تو یقیناً میں اس کی گردن مروڑ ڈالتا میں پچھتانے لگا، کہ کیوں شب گزشتہ قلعے سے باہر نکل آیا، کیوں نہ اسے ہلاک کر ڈالا۔

تمام رات میں قلعے کے گرد چکر لگاتا رہا، کہ شاید اندر جانے کا کوئی راستہ مل جائے۔ مگر میری کوششیں رائگاں ہی گئیں آخر بالکل مایوس ہو کر میں گھر پہنچا۔ میرے دل میں ایکطرف تو امید کی خاک بکھری ہوئی تھی، اور دوسری طرف انتقام کے شعلے بھڑک رہے تھے۔ دوسری رات بھی میں نے قلعے کے گرد چکر لگا کر گزاری اسی طرح کئی راتیں گزر گئیں۔ ایک شام کو جب کہ میرا دل و دماغ غم و غصہ کی آگ میں جل رہا تھا، کسی نے میرے شانے پر ہاتھ رکھ دیئے۔ میں نے پلٹ کر دیکھا، حمدی میرے سامنے کھڑا تھا، جی میں آئی کمبخت کو مار ڈالوں، مگر اس کی مایوس آنکھوں کو دیکھ کر میرا ارادہ متزلزل ہو گیا۔ حمدی چند لمحے گھور کر مجھے دیکھتا رہا پھر کہنے لگا "میرے ساتھ آؤ" یہ کہکر وہ اسی راستے کیطرف چلنے لگا، جو قلعے کے اندر جاتا تھا، میں نے اسکی تقلید کی، تھوڑی دیر کے بعد ہم قلعے کے اندر تھے۔ حمدی بیٹھ گیا اور مجھے بھی بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں جب بیٹھ چکا، تو وہ نرم اور محبت انگیز لہجے میں کہنے لگا:

"جانتے ہو میں تمہیں کیوں یہاں لایا ہوں؟"

"نہیں!" میں نے جواب دیا۔

"تو سنو! سب سے پہلے تو تمہیں یہ معلوم ہونا چاہیئے کہ قلعے کے اندر داخل ہو کر اور ایک معصوم فطرت دوشیزہ پر ڈورے ڈال کر تم نے سخت ظلم کیا ہے۔ کاش تمہیں اندر آنے کا راستہ نہ معلوم ہوتا ـــ اپنی طرف سے تو میں نے کوئی کمی نہ کی، مگر جو نہ ہونا تھا، وہ ہو کر ہی رہا"

وہ رک گیا، پھر غمناک لہجے میں کہنے لگا "شاہینہ کا معصوم دل دنیا کے حالات کو نہیں سمجھ سکتا ـــ وہ زہر ہلاہل کو شہد سمجھ رہی ہے ـــ"

"آپ کیا کہہ رہے ہیں بابا!" میں نے پہلی دفعہ پرجوش لہجے میں کہا۔

"میں بہت کچھ دیکھ چکا ہوں بیٹا! محبت دنیا کی خوفناک ترین

مرض ہے۔ اس ظالم مرض نے صولت اور یاسمین کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اور اسی مرض سے بچانے کے لئے میں نے اپنی شاہینہ کو اس ویران قلعے میں بند کر رکھا تھا ۔۔۔ مگر قسمت! شاہینہ اس مرض میں مبتلا ہو ہی گئی۔

"بابا! تم میرے دل کا حال نہیں جانتے۔ کاش میں اپنے زخموں سے بھرے ہوئے سینے کو تمہاری نگاہوں کے سامنے پیش کر سکتا!"

"تمہیں واقعی شاہینہ سے محبت ہے؟" حمدی نے پوچھا۔

"تصورات سے بڑھ کر!"

"اس کا ثبوت؟"

"اس کا ثبوت یہ کہ میرا دل راکھ ہو چکا ہے!"

"کیا اس کے لئے قربانی کرو گے؟"

"میں اس کے لئے ہر قربانی کرنے کو تیار ہوں!"

"مگر یہاں قربانی کا سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا۔ سلمیٰ!"

"سلمیٰ ۔۔۔ سلمیٰ کو میں بھلا چکا ہوں! وہ ایک حماقت تھی ۔۔۔"

"تو کل تم شاہینہ کو بھی بھلا دو گے!"

"نہیں یہ ہرگز نہیں ہو سکتا ۔۔۔! تا دم واپسیں نہیں ہو سکتا ۔۔۔ میں مرتے دم تک شاہینہ سے محبت کرتا رہوں گا۔ اس کا آپ کو یقین دلاتا ہوں!"

"تو شاہینہ کے لئے قربانی کرو گے؟" حمدی نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

"ہر وقت ۔۔۔"

"اگر تم قربانی کرنے کے لئے تیار ہو! تو سمجھ لو آج سے تمہیں یہیں رہنا ہوگا۔"

"میری یہ انتہائی خواہش ہے ۔۔۔ سب سے بڑی تمنا ہے!"

"تو آج سے تم یہیں رہو گے ۔۔۔ قلعے میں سب کچھ ہے تمہیں کسی چیز کسی کی عدم موجودگی محسوس نہیں ہوگی۔ اور اس کے ساتھ یہ بھی یاد رکھو! شاہینہ کی آہ وزاری سے مجبور ہو کر میں تمہیں یہاں رہنے کی اجازت دے رہا ہوں۔ اگر میں نے دیکھا۔ کہ تمہاری محبت میں کمی آگئی ہے۔ اور تم میری بچی کو دھوکا دے رہے ہو۔ تو تمہارے اور اس کے درمیان سنگین دیوار کھڑی ہو جائے گی۔ تم ہمیشہ کے لئے اسے کھو دو گے۔ دنیا کی کوئی طاقت میرا ارادہ بدل نہیں سکتی ۔۔۔ سن لیا تم نے میں کبھی برداشت نہیں کر سکتا کہ شاہینہ کو دھوکا دیا جائے!" یہ کہتے ہوئے حمدی کی آنکھوں سے آگ سی برسنے لگی۔

"میں تمہیں یقین دلاتا ہوں بابا! میں مرتے دم تک شاہینہ سے اسی بے تابی کے ساتھ محبت کرتا رہوں گا!"

"تمہارے الفاظ مجھے یقین دلانے سے قاصر ہیں ۔۔۔ خیر میں تم پر اعتبار کرتا ہوں۔ اب سنو میں تمہیں بتاتا ہوں کہ شاہینہ کون ہے؟"

میں نے حمدی کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں اس قسم کی چمک تھی جو سمندر کی سطح پر سورج کے غروب ہونے کے بعد بھی رہتی ہے۔

"میں نے تمہیں بتایا تھا۔ کہ صولت اور یاسمین اسی قلعے میں رہتے تھے۔ اور میں نے یہ بھی بتایا تھا۔ کہ قید خانے کی سنگین دیواریں انہیں جدا نہ کر سکیں۔ وہ آپس میں ملتے رہے ۔۔۔ ایک سال کے بعد ان کے ہاں ایک بچی پیدا ہوئی۔ یہ بچی ابھی شیرخوار ہی تھی۔ کہ اس کے والدین قتل کر دیئے گئے۔ پھر بچی اسی غلام کے ہاں پرورش پانے لگی۔ جو ان شہیدان محبت کو کھانا پہنچایا کرتا تھا۔ اور ان کا ہمراز تھا ۔۔۔ . . . .

. . . . . . آج یہ بچی شاہینہ ہے۔ اور وہ غلام صفدر یہ بوڑھا حمدی ۔۔۔!"

میری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں!

"شاہینہ یاسمین کی بچی ہے؟" میں نے چند لمحے خاموش رہنے کے بعد پوچھا۔

"ہاں یہ اسی شہیدۂ محبت کی یادگار ہے!"

"تو یہ زندہ کیونکر رہی؟"

"بچی اپنی ماں کی کوٹھری میں تھی، اس لئے جلادوں کے پنجے سے بچ گئی، میں نے بچی کو اٹھا لیا۔ اس کے بعد میرے دل میں یہ یقین پیدا ہو گیا، کہ محبت دنیا کی سب سے بڑی بیماری ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ میں نے اسے یہاں چھپائے رکھا ہے۔ اسے اپنے والدین کی بھی خبر نہیں ــــ!"

میں نے حمدی کو اپنی محبت کا یقین دلایا۔ اور انتہائی وفاداری کا وعدہ کیا، چند منٹ کے بعد میں شاہینہ کے پہلو میں بیٹھا تھا۔

میں پھر قلعے میں رہنے لگا اب میری زندگی اسقدر پُرسوز اس درجہ مطمئن تھی، کہ مایوسی و اضطراب کا ہلکا سا سایہ بھی میرے دل و دماغ کے قریب نہیں بھٹک سکتا تھا۔ شاہینہ کی خوبصورت آنکھیں دو چاند تھے جن کی عطر آگیں روشنی میں میرے دل کی دنیا ہر وقت جگمگاتی رہتی، اور ہر روز علی الصبح جب قلعے کے مشرقی کہر میں ملفوف مینار سے پرے، بلند درختوں کے اوپر خورشید کے پیکر نور سے روشنی کی ندیاں بہنے لگتیں، میں محسوس کرتا، کہ میری یہ دُنیا زیادہ روشن، زیادہ شاداب ہو گئی ہے! اور ایسا کیوں نہ ہوتا، اب کس کا غم، کسی چیز کی فکر مجھے غمگین و ملول بنا سکتی تھی!

دن پر دن گذرتے جا رہے تھے۔ ہر لمحہ میری مسرتوں میں اضافہ ... کرتا جاتا تھا۔ اور اسی طرح کئی مہینے گذر گئے۔ یکایک میں کچھ تھکاوٹ سی محسوس کرنے لگا۔ میرے اور شاہینہ کے درمیان محبت قائم تھی، میری تمام مسرتوں کا سرچشمہ وہ تھی اور اس کی تمام خوشیوں کا مرکز میں تھا۔ پھر بھی ایک تھکاوٹ سی، ایک اضمحلال سا، ایک افسردگی سی میں اپنے دل و دماغ میں محسوس کرنے لگا۔ تغیر انسانی زندگی کا خاصہ ہے، اور شاید میری زندگی بھی کسی تغیر کی متمنی تھی، ایک دن میرے دل میں خیال پیدا ہوا، کہ کیوں نہ کچھ دیر کے لئے باہر سیر کر آیا کروں۔ اس خیال کا اظہار میں نے شاہینہ کے سامنے کیا وہ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد کہنے لگی "مجھ سے اکتا گئے کیا؟"

یہ سنکر میرے دل پر برچھی سی لگی "کتنا بیہودہ خیال، نہ معلوم کبھی کبھی تم اتنی مایوس و یاس پرست کیوں ہو جاتی ہو؟؟ ذرا سوچو، تمہاری زندگی یہیں گزر رہی ہے۔ اس کے برعکس میں شہر میں پیدا ہوا، شہر میں رہا ــــ"

"یہ درست ہے، تاہم میں ڈرتی ہوں، شہر میں ہزاروں دلچسپیاں ہوتی ہیں"

"پاگل لڑکی! میں وہ ہزاروں دلچسپیاں چھوڑ کر یہاں آگیا ہوں"

"اور اب مجھے ڈر ہے۔ تم مجھے چھوڑ کر ان ہزاروں دلچسپیوں کی طرف نہ چلے جاؤ"

"ایسا کبھی بھی نہیں ہوگا" میں نے کہا۔ کافی دیر کی گفتگو کے بعد یہ طے ہوا کہ رات کے وقت کچھ دیر کے لئے میں قلعے سے باہر جایا کروں، اور چونکہ مجھے اس بات کا یقین تھا۔ کہ حمدی اس کی اجازت نہیں دے گا۔ اس لئے اس سے اجازت حاصل کرنے کی کوشش ہی نہ کی۔

میں قلعہ سے نکل جاتا۔ اور شاہینہ مغربی مینار کے قریب کھڑے ہو کر مجھے دیکھتی رہتی، مغربی مینار کی بائیں طرف قلعے کی دیوار کا کچھ حصہ گر پڑا تھا۔ اس لئے وہاں کھڑے ہو کر انسان دُور دُور تک بہ آسانی دیکھ سکتا تھا۔

ایک دن خلافِ معمول میری طبیعت دن بھر منغّص رہی، میں شاہینہ سے اجازت لے کر قلعے سے باہر نکل گیا۔ مجھے معلوم ہوا کہ اس رات "تیرہ کا میلا"۔۔۔۔ ہے۔ اس لئے میں یہ سوچکر کہ وہاں شاہینہ کے لئے چند چیزیں خرید لوں گا، "نصرتی باغ" کی طرف روانہ ہو گیا۔

میں باغ میں پہنچا، اور اپنے آپ کو اپنے آشناؤں اور عزیزوں کی نظروں سے بچا کر چیزیں خریدنے لگا۔ اسی دوران میں باغ کے آخری حصے میں پہنچ گیا۔ وہاں لوگ سستا رہے تھے۔ یا بیٹھے ہوئے باتیں کر رہے تھے۔ میں واپس آنے کا ارادہ کر رہا تھا۔ کہ میرے سامنے دو سیاہ آنکھیں چمکنے لگیں۔ میں رک گیا ــــ میرے سامنے سلمیٰ کھڑی گھور گھور کر میری طرف دیکھ رہی تھی!

میں نے منہ دوسری طرف پھیر لیا، اور تیزی سے چلنے لگا۔
ایک آدھ چیز اور خریدی، اور باغ سے باہر نکل آیا، مگر محسوس کر رہا تھا، کہ سلمیٰ میرے پیچھے پیچھے آ رہی ہے۔

اپنی محبوبۂ دلنواز کی بے چینی کا خیال کر کے میں قلعے کو نزدیک ترین راستے سے جانا چاہتا تھا، مگر جب یہ سوچا، کہ کمبخت سلمیٰ برابر میرا تعاقب کر رہی ہے۔ تو میں نے دوسرا راستہ اختیار کر لیا، چند قدم طے کرنے کے بعد جب پلٹ کر دیکھا۔ تو معلوم ہوا کہ بدبخت سلمیٰ ٹکٹکی باندھے مجھے دیکھ رہی ہے۔ میں نے منہ پھیرا، اور جلدی جلدی قدم اٹھانے لگا۔

قلعے کی سیڑھیوں پر پہنچ کر مجھے یوں محسوس ہوا، گویا ایک بوجھ جو میری رُوح کو تکلیف دے رہا تھا۔ اب موجود نہیں ہے ایک سایہ جو میرے دل پر لہرا رہا تھا۔ اب غائب ہو گیا ہے۔

اندر جا کر میں نے تمام چیزیں اپنی محبوبہ کے سامنے ڈھیر کر دیں، اس کی بے قرار نگاہیں ایکدم مسرت سے چمک اٹھیں اور وہ ایک ایک چیز کو غور سے دیکھنے لگی۔

مگر معلوم کیا بات تھی، کہ میرا دل پھر بے چین ہو رہا تھا، آدھی رات گزرنے پر میں لیٹنے کو تو لیٹ گیا، مگر نیند کہاں ذہن میں خلش آور خیالات کا ہجوم بے قرار تھا۔ اور میں بار بار سوچتا تھا۔ یہ کیونکہ ممکن ہو سکتا ہے کہ سلمیٰ، جس کے جور و ستم نے مجھ پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا تھا۔ اب میری طرف بار بار دیکھے، میرے پیچھے پیچھے پھرے اور دیر تک پھرتی رہے۔ آخر اس تغیّر کی وجہ کیا ہے؟ شاید وہ مجھے اپنے جال میں گرفتار کرنا چاہتی ہے! اس التفات کے پردے میں کوئی خطرناک چال پوشیدہ ہے۔ یہی بات ہے۔ یقیناً یہی بات ہے میں نے دل میں کہا، لیکن میں اس کے دامِ تزویر میں ہرگز گرفتار نہیں ہوں گا! میرا دل، میرا دماغ، میری ہستی کا ذرہ ذرہ، شاہینہ صرف شاہینہ کے لئے وقف ہے۔ میری یہ محبوبۂ دلنواز کتنی نیکدل، کتنی پاکیزہ روح، کتنی معصوم فطرت لڑکی ہے —!

انہی خیالات میں رات کا بقیہ حصہ بھی گزر گیا، صبح میری صورت دیکھتے ہی شاہینہ مضطرب ہو گئی۔

"تمہاری آنکھیں اس درجہ سرخ —— کیا بات ہے شہاب؟"
اس نے پوچھا۔

"کچھ نہیں — کچھ بھی نہیں" میں نے پھیکی ہنسی ہنسکر کہا، اور اپنی ذہنی کوفت کو دور کرنے کے لئے اس سے باتیں کرنے لگا۔
شاہینہ بار بار مجھ سے میرے اضطراب کی وجہ پوچھتی رہی، مگر میں اسے ہنسی مذاق میں ٹالتا رہا۔

دو دن تک میں قلعے سے باہر نہ نکل سکا، تیسرے دن میری طبیعت گھبرائی، میں شام کو قلعے سے باہر نکلا، پھرتے پھراتے آبادی کے قریب پہنچ گیا، وہاں سے لوٹنے کا ارادہ ہی کر رہا تھا۔ کہ میرے سامنے وہی بدبخت عورت آکھڑی ہوئی، میرے قدم رک گئے دل دھڑکنے لگا، سلمیٰ ٹکٹکی باندھ کر مجھے دیکھنے لگی۔ چند لمحے گزر گئے میں تیزی سے چلنے لگا —— یہاں تک کہ قلعے کی سیڑھیوں پر پہنچ گیا، میرے دل کا بوجھ ہلکا ہوا اور میں قلعے کے اندر داخل ہو گیا
اس رات میں نے شاہینہ کی بہت کم باتوں کا جواب دیا اور کمرے میں جا کر لیٹ گیا —! مجھے خود پر بہت غصہ آ رہا تھا۔ آخر میں کیوں اس بدبخت عورت سے ڈرتا ہوں، مجھے اس سے قطعاً محبت نہیں پھر اس کی صورت دیکھ کر کیوں میرے ہوش و حواس گم ہو جاتے ہیں۔ کیوں میری ہمت جواب دے دیتی ہے؟؟

میری نگاہوں کے سامنے سلمیٰ کی لمبی لمبی سیاہ پلکوں کے نیچے حرکت کرتی ہوئی آنکھیں پھرنے لگیں۔ میں سلمیٰ کے تصوّرات کو ذہن سے دور کرنے کی کوشش کرنے لگا، مگر اس کی صورت میری نگاہوں تلے پھر رہی تھی!

میں اپنے کمرے سے باہر نکل آیا، صبح ہو گئی تھی، کہیں کہیں صاف فضا میں دھوئیں کے بادل بل پر بل کھاتے ہوئے لہرا رہے تھے۔ شام کے وقت میں قلعے سے باہر نکل آیا۔ ابھی چند قدم ہی چلا ہوں گا، کہ سلمیٰ میرے قریب آکھڑی ہوئی

"شہاب! ذرا ٹھہرو —— اتنی تیزی سے کیوں چل رہے ہو" اس نے کہا۔

میرا دل دھڑکنے لگا —— مگر میں اس کی طرف توجہ کئے بغیر

چلتا گیا۔ وہ میرے ساتھ ساتھ چل رہی تھی، وہ بولتی گئی — اس کی آواز میں حسرت تھی، اس کے لہجے میں التجا تھی اور اس کی آنکھوں میں مایوسی!

"میں تو اب تھک گئی شہاب!" اس نے کہا، اور میرا ہاتھ پکڑنے لگی۔ میں نے اسے دھکا دیا۔ وہ ایک چھوٹے سے پودے پر گر پڑی اور میں تیزی کے ساتھ چلتا گیا — ایک لمحہ توقف کئے بغیر میں چلتا گیا —!

قلعے میں پہنچا، تو دیکھا، شاہینہ کا چہرہ اترا ہوا ہے رخساروں پر جا بجا آنسوؤں کے نشان ہیں —! مجھے دیکھتے ہی وہ دوڑی اور مجھ سے لپٹ گئی۔

"آہ شہاب! تم نے مجھے بڑا بیقرار کیا — تم کیا جانو مجھ پر کیا گزر رہی ہے؟"

تمہارے پہلو میں بہت نازک اور ننھا منا سا دل ہے، ذرا سی بات پر ڈر جاتی ہو!" میں نے کہا۔

اس نے مجھے پرحسرت نگاہوں سے دیکھا، اور میرے ہاتھ کو زور سے پکڑ لیا۔ میں نے بھی اس کا ہاتھ پکڑا اور ہم دونوں بیٹھ گئے۔

فضا میں ایک چکوی بے قرارانہ ادھر سے ادھر اور ادھر سے ادھر اڑ رہی تھی، اور اس کی درد انگیز آواز ہوا میں تھرتھرا رہی تھی۔

"میرا دل گھبرانے لگتا ہے! — تم قلعہ سے باہر کیوں جاتے ہو؟ آئندہ یا تو باہر نہ جایا کرو، یا پھر مجھے بھی لے جایا کرو! تم یہاں سے چلے جاتے ہو تو —!"

"تم پاگل ہو شاہینہ! ذرا تفریح کے لئے باہر چلا جاتا ہوں!"

"باہر چلے جاتے ہو — تفریح کے لئے — تفریح — اچھا!"

یہ کہتے ہوئے اس کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے!

میرا دل بیقرار ہو گیا، میں نے اس کے چہرے کو سینے سے لگا لیا۔ اور میرے ذہن سے تمام کشمکش دور ہو گئی!

چند دن کے بعد میں قلعے سے نکلا۔ جب تک پھرتا رہا سلمیٰ کی صورت نظر نہ آئی، مگر جب قلعے کے قریب پہنچا، تو میں نے اپنے قریب ایک سائے کو دیکھا، میرے دل میں یقین پیدا ہو گیا، یقیناً سلمیٰ نے قلعے کے اندر جانے کا پر اسرار راستہ دیکھ لیا ہے — میں وہاں سے ہٹ گیا، اور کافی دیر کے بعد قلعہ کے اندر گیا — لیکن جو یقین دل پر بیٹھ چکا تھا، وہ کیونکر دور ہو سکتا تھا!

آندھی کے تیز و تند جھونکے بلند اور گنجان درخت کو گرا سکتے ہیں مگر اس درخت کی کسی شاخ سے لپٹے ہوئے جالے کو نہیں ہٹا سکتے اسی طرح میری مسلسل کوششیں سلمیٰ کے تصورات کو بھی میرے ذہن سے نہ نکال سکیں! ہر بار جب میں قلعے سے نکلتا، وہ مجھے دکھائی دیتی — مجھ سے بولنے کی کوشش کرتی، اگرچہ میں اس کا جواب نہ دیتا، اس کی ذرہ بھر پروا نہ کرتا، تاہم وہ بدبخت عورت ایک ناگن بن کر میرے جسم کی... نسوں میں سے گزرتی ہوئی، دل کی انتہائی گہرائیوں میں اپنا زہر بکھیر رہی تھی۔

ایک دن اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا، اور کہنے لگی:

"ذرا شہاب سوچو تو سہی تمہاری یہ حرکت کتنی بے رحمانہ ہے تم اس عورت سے بھاگ رہے ہو، جس کے نقشِ قدم بھی تم چوم رہے ہو — میرے شہاب! اس تغیر کا سبب؟"

"مجھے تم سے کوئی واسطہ نہیں، بدبخت عورت!" میں نے گرج کر کہا۔

"تمہیں مجھ سے کوئی واسطہ نہیں — کوئی واسطہ نہیں، یہ الفاظ شہاب تم کہہ رہے ہو!"

اسکی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

"شاید تم میرا امتحان لینا چاہتے ہو — میں بھی تمہارا امتحان لیتی رہی ہوں —!"

"میرا امتحان!"

"میرے شہاب! میں نے تمہارا امتحان لیا تھا، میرا دل محبت کی آگ میں جل چکا تھا، مگر میں تمہاری محبت کو آزمانے کیلئے تمہاری جانب دیکھتی بھی نہ تھی، اور جب تم محبت کے امتحان میں پورے اترے تو یہاں سے چلے گئے — نہ معلوم کہاں؟ میں تمہارا انتظار کرتی رہی — یہاں تک کہ تم آگئے —! انتظار

کی کیفیت سے تم تو واقف ہو"

انتظار کا لفظ سنکر میں مضطرب ہوگیا۔ میں نے سلمیٰ کے چہرے سے نظریں ہٹالیں اور سامنے دیکھا، کچھ دور ہوا کے تیز و تند جھونکوں میں ایک نازک پودا اس طرح ہل رہا تھا، کہ معلوم ہوتا تھا ابھی ٹوٹ جائے گا! میں نے قدم اٹھایا، سلمیٰ نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔

"شہاب! تم اتنے ظالم نہیں ہوسکتے!"

میں رک گیا۔ اس کی طرف دیکھا، اس کی بڑی بڑی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں۔ میرا ہاتھ پکڑ کر وہ پچھلے واقعات دہرانے لگی — اس کی آنکھوں سے آنسو بہتے رہے!

آہ! میری کمزوری!! وہ تمام منحوس رات میں نے سلمیٰ کے پہلو میں گزار دی۔

جب علی الصبح میں قلعے میں پہنچا، تو شاہینہ کو مغربی مینار کے پاس کھڑے ہوئے پایا، اس کی آنکھیں شب بیداری کے باعث سرخ تھیں۔ ہونٹوں پر پپڑیاں جمی تھیں اور بال بے ترتیب پریشان تھے۔ مجھے دیکھکر اس نے ٹھنڈی آہ بھری اور میرا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لےکر بولی،

"رات بھر کہاں رہے شہاب!؟"

"کہیں بھی نہیں — تم مضطرب کیوں نظر آرہی ہو؟" میں نے کہا،

"رات بھر کہاں رہے شہاب؟" اُس نے دوبارہ پوچھا۔

"گھر چلا گیا تھا شاہینہ!" میں نے جواب دیا۔

"گھر چلے گئے تھے سچ کہتے ہو؟"

"تو کیا جھوٹ بول رہا ہوں؟ تمہیں میری بات پر اعتبار نہیں؟"

"شہاب!" اس نے حسرت بھرے لہجے میں کہنا شروع کیا! "تم پر اعتبار نہیں کروں گی، تو دنیا میں کس پر کرونگی؟"

"تو پھر جو کچھ میں نے کہا ہے، اسے درست مان لو!"

"تم درست ہی کہہ رہے ہو۔ خیر چھوڑو اس بات کو؛ "شاہینہ تم میں یہ بہت بری عادت ہے۔ کہ تم بہت جلد بدظن ہوجاتی ہو"

اس کی نگاہیں جھک گئیں، دو تین لمحوں کے بعد اس نے نگاہیں اوپر اٹھائیں، اور قریب ہی ایک پودے کے لرزتے ہوئے سائے کو دیکھنے لگی — چند لمحے اور خاموش رہنے کے بعد وہ بولی" جب تم یہاں نہیں ہوتے، تو میرے دل میں خوف پیدا ہو جاتا ہے — تمہیں کیونکر بتاؤں کہ یہ رات میں نے کس بیتابی سے کاٹی؟"

"اس کی وجہ صرف یہ ہے، کہ تم میری محبت کو بدگمانی کی نگاہوں سے دیکھتی ہو؟"

"نہیں یہ بات نہیں — مگر معلوم نہیں کیا بات ہے کہ تمہاری عدم موجودگی میں میرا دل ڈوبنے لگتا ہے!"

اپنی محبوبہ کی بے تابی دیکھ کر میرا دل پریشان ہوگیا۔ اور اس دن میں نے مصمم ارادہ کر لیا۔ کہ آئندہ قلعے سے باہر نہیں نکلوں گا، ایک ہفتہ گزر گیا — میری طبیعت گھبرائی، اور انتہائی بدقسمتی یہ کہ شاہینہ سے میری طبیعت اکتا گئی۔ میں قلعہ سے نکلا۔ اور دو راتیں اور دو دن سلمیٰ کے ہاں گذار دیئے۔ جس وقت واپس قلعہ میں پہنچا، تو حمدی نے مجھے اپنا وعدہ یاد دلایا۔ مجھے سختی کے ساتھ باہر جانے سے روکا، اور منت سماجت سے کہا" شاہینہ پر رحم کرو۔ اس دن تو میرا دل موم کی طرح نرم ہوگیا، مگر چند دن کے بعد یہ نرم دل پتھر بن گیا! میں نے قلعے سے نکلنے کا ارادہ کیا۔ اور شاہینہ سے اجازت مانگی!

آہ! وہ ملاقات ہماری آخری ملاقات تھی۔ آسمان پر کالی کالی بدلیاں چھائی ہوئی تھیں، اور ایک گوشے میں مایوس و مضمحل، افسردہ و پژمردہ چاند یوں نظر آرہا تھا۔ گویا کوئی فراق کے صدموں کی ماری مجروح دل حسینہ بستر مرگ پر آخری سانس لے رہی ہے۔ شاہینہ حزن انگیز گیت گاتی رہی اور بار بار روتی رہی۔ وہ میرے ساتھ دروازے تک آئی، اس نے اپنے آنسو خشک کئے اور خاموشی سے میری طرف دیکھنے لگی۔ ہمارے قریب کھڑے ہوئے درخت کی ٹہنی سے دو پتے گرے۔ ایک تو شاہینہ کے بازو سے مس کرتا ہوا میرے پاؤں پر آگرا

اور دوسرا ہوا کے تیز و تند جھونکوں میں کہیں سے کہیں پہنچ گیا۔ میں قلعے سے باہر نکل آیا۔

چار ہفتے، مسلسل چار ہفتے میں ظالم چڑیل سلمیٰ کے دامِ فریب میں گرفتار رہا۔ وہ مجھے ہر لحاظ سے اپنی شدید محبت کا ثبوت دیتی رہی اور میں ظالم انسان، کمزور دل انسان، اور پھر انتہائی بے وفا انسان اُس کی باتوں میں آگیا۔ آہ! اٹھائیس دن اور اٹھائیس راتیں میں نے اس کے پہلو میں گزار دیں۔ اس کے بعد جب میرے دل کا شعلہ بھڑکا، تو میں جنوں انگیز عجلت کے ساتھ قلعے میں پہنچا۔ مگر اب ہال کیا دھرا تھا۔ میں نے قلعہ کا ہر گوشہ چھان مارا، لیکن نہ تو شاہینہ کہیں نظر آئی اور نہ حمدی!

دنیا میری آنکھوں تلے تاریک ہوگئی، دل مایوسیوں کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوبنے لگا ـــــ انتہائی تلاش کے باوجود بھی مجھ ان میں سے کوئی نظر نہ آیا ـــــ دن کا آخری حصہ گزر رہا تھا۔ اور میں قلعے میں وحشیوں کی طرح پھر رہا تھا۔ یکایک مغربی مینار کے پاس مجھے ایک سفید سی چیز حرکت کرتی ہوئی نظر آئی۔ میں شاہینہ شاہینہ پکارتا ہوا اس کی طرف دوڑا ـــــ وہاں پہنچکر مجھے یوں محسوس ہوا، ایک متوحش خواب دیکھ رہا ہوں۔

میرے سامنے سلمیٰ کا مسکراتا ہوا چہرہ تھا۔

"میرے شہاب! وحشیوں کی طرح کیوں پھر رہے ہو؟" اس نے کہا۔

"تم ـــ یہاں؟"

"میں یہاں کیوں نہیں آسکتی ـــــ محبت میں انسان کیا کچھ نہیں کرسکتا، آؤ میرے شہاب! اس ویران قلعے سے باہر نکلیں۔ اب ہماری محبت میں کوئی رکاوٹ نہیں!"

میرے دل میں نشتر چبھنے لگے۔

"کیا کہا تم نے!" میں نے اس کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑتے ہوئے کہا۔

میرے چہرے کو دیکھ کر وہ خوفزدہ سی ہوگئی ـــ اور گھبرائی ہوئی آواز میں کہنے لگی: "میں نے کہا میرے شہاب! اب یہاں سے باہر نکلیں، دیکھتے ہو قلعہ کتنا ویران اور سنسان ہے!"

"تم نے شاہینہ کو ـــ"

"شاہینہ، کون شاہینہ؟" سلمیٰ نے میرے الفاظ کاٹتے ہوئے کہا۔

میرے ہاتھ خود بخود اس کی گردن کی طرف اٹھنے لگے۔ دو تین لمحوں کے بعد اس کی گردن میری مضبوط گرفت میں تھی۔

"بتاؤ شاہینہ کہاں ہے؟ سچ سچ بتاؤ، ورنہ گردن مروڑ ڈالونگا" میں نے اس کی گردن کو دباتے ہوئے کہا۔ اس نے اپنا ہاتھ اوپر اٹھایا، اور اثبات میں سر ہلایا۔ میں نے اس کی گردن چھوڑ دی

"سنا ہے، وہ یہاں سے چلی گئی ہے!" اس نے خوفزدہ لہجے میں کہا۔

"سنا ہے ـ سنا ہے ـــ سچ سچ نہیں بتاؤ گی!!!" ـــ یہ کہکر میں نے اس کی گردن کی طرف ہاتھ بڑھائے۔ وہ پیچھے ہٹ گئی، اور ڈرتے ڈرتے کہنے لگی،

"یہ سب کچھ محبت کی وجہ سے ہوا۔ مجھے تم سے محبت ہے۔ اور میں یہ برداشت نہیں کرسکتی۔ کہ کوئی اور بھی تم سے محبت کرے تمہارا تعاقب کرتی ہوئی میں دو تین دفعہ یہاں آچکی تھی، اور مجھے معلوم ہوگیا تھا۔ کہ شاہینہ تم سے محبت کرتی ہے، اور تم اس سے ـــ اس لئے میری محبت نے مجبور کیا۔ کہ اس کانٹے کو راہ سے ہٹا دوں اسی مقصد کو پورا کرنے کے لئے میں نے تمہیں اپنے ہاں رہنے پر مجبور کیا۔ جب ایک ہفتہ گزر گیا۔ اور تم وہاں نہ پہنچے۔ تو میں نے قلعے میں جاکر شاہینہ اور بوڑھے سے کہدیا۔ کہ شہاب اب قلعے میں نہیں آئے گا۔ وہ میرا محبوب ہے ـــــ اس کے ایک ہفتے بعد جب میں پھر وہاں پہنچی، تو وہ جاچکے تھے۔!"

"کہاں؟"

"یہ میں نہیں جانتی ـــــ بوڑھے نے اس دن شاہینہ سے کہا تھا۔ شاہینہ! اب ہمیشہ کے لئے اس قلعے کو چھوڑ دیں ـ" یقیناً وہ یہاں سے ہمیشہ کے لئے چلے گئے ہیں!"

میرے کانوں میں حمدی کے وہی الفاظ گونجنے لگے، جو اس نے قلعے میں کہے تھے!

"ذلیل عورت! تو نے مجھے سخت دھوکا دیا۔ اب تو بھی زندہ نہیں رہ سکتی" میں نے کہا، اور اس کی گردن پکڑلی۔

"شہاب! میرے شہاب؟" اس نے کہا، اور اپنی گردن چھڑانے لگی۔ میری گرفت ڈھیلی ہوگئی ــــ زخمی ہرنی کی طرح اس نے مجھے دیکھا اور بھاگی ــــ یکایک فضا میں ہلکی سی چیخ گونجی ــــ اور پھر ہمیشہ کے لئے خاموش ہوگئی ــــ میں نے نیچے دیکھا ــــ پتھروں پر خون میں لتھڑا ہوا گوشت نظر آرہا تھا۔ میں نے بھی اپنے آپ کو نیچے گرا دینے کا ارادہ کیا۔ مگر جب یہ خیال آیا شاید شاہینہ مل جائے۔ تو میں نے یہ ارادہ ترک کردیا۔ اور قلعے سے باہر نکل آیا۔

(۱۳)

سالہا سال میں شاہینہ کی تلاش میں سرگرداں رہا ہوں۔ مگر کہیں بھی اسے نہیں دیکھ سکا۔ نہ معلوم موت اسے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کہاں لے گیا ہے۔ کائنات کے کس گوشے میں وہ سانس لے رہی ہے۔

آج میں پھر قلعے میں بیٹھا ہوا یہ سطریں لکھ رہا ہوں۔ جس جگہ میں بیٹھا ہوں وہ جگہ ہے، جہاں پہلے پہل میں نے شاہینہ سے گفتگو کی تھی، اور ــــ جہاں بیٹھ کر میں اس کا انتظار کیا کرتا تھا!!

"میری آنکھوں کے سامنے تاریک سائے پھر رہے ہیں ــــ چند سانس باقی رہ گئے ہیں ــــ کاش میں ان آخری لمحوں میں بھی اپنی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ محبوبہ کو دیکھ سکوں ــــ!!!

پروفیسر کرپال سنگھ بیدار

"شمعِ سحر"

زبانِ اشک سے کہتی تھی آج شمعِ سحر ۔۔۔ ظہورِ صبح قیامت نما ہوا مجھکو
چمک کے ڈوب گیا اخترِ حیات مرا ۔۔۔ طلوعِ مہر پیامِ قضا ہوا مجھکو

جو دردمندِ اجل ہو اسے شفا کیسی!
فنا نصیب کو زیرِ فلک بقا کیسی!

دیا جواب یہ میں نے کہ اے فسردہ مآل! ۔۔۔ غمِ نہاں کو سرِ انجمن نہ رُسوا کر!
جو آرزوئے فروغِ دوام ہے تجھکو ۔۔۔ درونِ سینہ محبت کا سوز پیدا کر!

یہ سوز وہ ہے جو شام و سحر فروزاں ہے
اسی سے مشعلِ شمس و قمر فروزاں ہے

جناب امینؔ حزیں سیالکوٹی:-

حقائق

جوہرِ پاک ترا خاک میں گر خاک نہ ہو تا ابد لب پہ ترے شکوۂ افلاک نہ ہو
آبروریزِ "خودی" ہو نہ اگر تو خود ہی! عمر بھر آنکھ تری اشک سے نمناک نہ ہو
ہے تری سوختہ سامانی ہی سے اسکا وجود شعلہ رہتا ہے کہاں جب خس و خاشاک نہ ہو
عزمِ تسخیر کے جذبات ہوں آنکھوں میں اگر منحرف تجھ سے کبھی فطرتِ چالاک نہ ہو
رشکِ جنت ہو کہاں جوہرِ فرزانہ کی نمود ہاتھ سے اپنے اگر اسکا جگر چاک نہ ہو
اِس حقیقت کو خدارا نظر انداز نہ کر سرد ہو جاتا ہے وہ شعلہ جو بے باک نہ ہو

غیر ممکن ہے امیںؔ، حل ہو معمّاء حیات
جب دلِ پاک نہ ہو، دیدۂ درّاک نہ ہو

جناب شوکت تھانوی

منگیتر

بعض اوقات ذرا سی شرارت بہت بڑی سنجیدگی بن جاتی ہے۔ اور خدا نہ کرے کہ وہ سنجیدگی حادثہ کی صورت اختیار کر لے مگر جب کسی کی شامت ہی آگئی ہو تو وہ سنجیدگی اور حادثہ دونوں سے خالی الذہن ہو کر شرارت کر ہی بیٹھتا ہے اور آپ جانتے ہیں، کہ مولوی محمد اسمٰعیل صاحب میرٹھی اسی قسم کے آدمی کے متعلق اپنی ایک ریڈر میں فرما گئے ہیں کہ :ع۔

ایسے نادان سے مشکل ہے سلامت رہنا

ہوا یہ کہ ایک دن یونہی لیٹے ہوئے اخبار پڑھ رہے تھے کہ نگاہ ایک اشتہار پر پڑ گئی۔

شادی کی ضرورت

ایک حسین و جمیل سلیقہ شعار انٹرنس پاس شریف خاندان حنفی المذہب دوشیزہ کے لئے ایک ایسے بر کی ضرورت ہے جو شریف خاندان تعلیم یافتہ، جوان العمر اور برسر روزگار ہو شادی شدہ یا صاحب اولاد حضرات خط و کتابت نہ کریں۔

ع۔ معرفت منیجر صاحب روزنامہ خیبر لاہور

اس قسم کے اشتہار اخبارات میں چھپا ہی کرتے ہیں، یہ کونسی نئی بات تھی، مگر معلوم نہیں ہمکو کیا سوجھی، کہ بیگم کو بلا کر اشتہار سناتے ہوئے کہا :

"کہیئے کیا کہتی ہیں آپ ؟"

بیگم نے ہنسکر کہا "بھیجئے نا خط میں کیا روک رہی ہوں"

ہم نے کہا "سنا بھی کہ شادی شدہ یا صاحب اولاد حضرات خط و کتابت نہ کریں"

بیگم نے کہا "مگر کیا خبر ہوگی کہ آپ کی شادی ہو چکی ہے"

ہم نے کہا "اچھا لاؤ، ذرا میرا قلم، یہی لطیفہ سہی"

بیگم نے شیروانی کی جیب سے قلم نکالتے ہوئے کہا "لطیفہ نہیں سچ مچ پیغام دیجئے نا۔ کس بے چارے شریف آدمی سے اس قسم کا مذاق کرنے سے کیا فائدہ"

ہم نے کہا "سچ مچ پیغام تو خیر میں نے آپ کے یہاں بھی نہیں دیا تھا۔ مگر یہ تو دلچسپ مذاق رہے گا۔ میں اپنی تصویر بھی بھیجوں گا"

بیگم نے کہا "اور لڑکی کی تصویر خود منگاؤں گا، یہ بھی تو کہیئے"

ہم نے ہنسکر کہا "اچھا یاد آگیا اپنا قصہ۔ بے شک منگاؤں گا لڑکی کی تصویر"

بیگم نے سنجیدگی سے کہا "بڑی بری بات ہے۔ انسان اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر دیکھے"

ہم نے کہا "اجی لاحول ولا قوۃ۔ یہ سب اعتبارات ہیں، اگر میں نے تصویر منگالی، اور تصویر آ بھی گئی میرے پاس تو اس سے واقعی کیا اثر پڑ سکتا ہے۔ لڑکی یا اس کی خاندانی شرافت پر"

بیگم نے کہا "لڑکی پر تو اثر نہیں پڑتا۔ مگر انسان کو خود اپنی شرافت کا خیال تو کرنا چاہیئے"

ہم نے کہا "اور فرض کر لیجئے کہ میں شریف نہیں ہوں تو"؟

بیگم نے منہ پھیرتے ہوئے کہا "تو پھر کچھ بھی نہیں، جو چاہے کیجئے"

ہم نے ایک پھول دار کاغذ پر "ع معرفت روزنامہ منیجر خیبر لاہور" کے نام نہایت عبارت آرائی اور خوش خطی کے ساتھ اپنی پوری قابلیت صرف کر کے ایک ایسا خط لکھا۔ کہ اس خط کو پڑھ کر بڑے سے بڑا لڑکی والا بھی تا اطلاع ثانی ہمکو اپنی غلامی میں لینے کے لئے تیار ہو جاتا۔ اور واقعہ بھی یہی ہے۔ کہ ہم میں سوائے

اس ایک عیب کے کہ بدقسمتی سے شادی ہو چکی ہے اور اس سلسلہ میں صاحب اولاد تک ہونے کے گنہگار ہو چکے ہیں اور کوئی ایسی خرابی نہیں ہے کہ کسی کو اپنی لڑکی دینے میں تامل ہو۔ لیکن اگر کسی کے سامنے ہم اپنی اس خامی کو چھپا کر پیش ہوں تو اس کو آپ خودستائی نہ کہیں، بلکہ واقعہ یہی ہے کہ بہت سے امیدواروں سے بہتر نکلیں گے۔ خدا نے خاندانی طور پر شریف بنا ہی دیا ہے۔ تعلیم بھی آپ کی دعا سے ہو ہی چکی ہے۔ برسرِ روزگار تو ہیں ہی، لیکن اگر نہ بھی ہوتے، تو دال روٹی کھانے کے لیے گھر میں خدا کے فضل سے کوئی کمی نہیں ہے۔ رہ گئی صورت وہ بھی کم سے کم ایسی ہے۔ کہ تصویر ہمیشہ اچھی آجاتی ہے۔ اور ہم خود اپنی ہر تصویر کو دیکھ کر حیران رہ جاتے ہیں۔ کہ یہ کیا ہماری تصویر ہے؟ اب آپ ہی بتا دیجیے کہ اس زمانے میں جبکہ بقول لڑکی والوں کے لڑکوں کا کال پڑا ہوا ہے ایسے لڑکے کہاں ملتے ہیں۔ اس دعوے کی دلیل یہ ہے کہ ہماری شادی ہو چکی ہے۔ اور اگر ہم میں یہ خصوصیات نہ ہوتیں تو ظاہر ہے کہ جو شادی ہو چکی ہے وہی نہ ہو سکتی۔ لیکن اس شادی کے ہو جانے کے بعد کم سے کم یہ تو طے ہو گیا کہ ہماری شادی ہو سکتی ہے اور ہم اس قابل ضرور ہیں کہ لڑکی والے اپنی نظر انتخاب کا مرکز ہم کو بنائیں۔ ہماری طرف تو یہ حقائق ہیں، اور بیگم غالباً اس مغالطہ میں مبتلا ہیں کہ انہوں نے ہمارے ساتھ شادی کر کے گویا ہماری پرورش کی ہے۔ ورنہ کہاں ہم اور کہاں شادی، یعنی اگر وہ شادی کرنے کے لیے ازراہ کرم آمادہ نہ ہو جاتیں۔ تو ہم جیسے کنوارے ہی تو رہ جاتے۔ بیگم کے اس مغالطہ کو دور کرنا بحیثیت ایک خوددار شوہر کے ہمارا اولین فرض تھا، اور اس فرض کی ادائیگی کا بہترین موقعہ یہی تھا۔ کہ اس اشتہار سے ہم فائدہ اٹھاتے، چنانچہ ہم نے خط لکھا۔ اور بیگم کو سنا کر بند کر دیا۔ حالانکہ وہ اب بھی اسی طرح ہنس رہی تھیں، کہ گویا ہماری شادی ہو ہی نہیں سکتی۔ خیر شادی تو ہمکو بھی کرنا نہ تھی، مگر شادی ہو سکتی ہے، یا نہیں یہ بات ضرور ظاہر کرنا چاہتے تھے، خط بھیجنے کے بعد دو ایک روز اسی کا چرچہ رہا۔ اور اسی خط کے سلسلہ میں معاصرانہ نوک جھونک کا سلسلہ ہم دونوں میں جاری رہا۔ اس کے بعد رفتہ رفتہ یہ تذکرہ کچھ ختم سا ہو چلا تھا۔ کہ ایک دن ڈاک میں ہم کو اس خط کا جواب معہ فوٹو کے وصول ہو گیا۔ یقین جانیے کہ ہم اچھل پڑے۔ کیا کسی امیدوار کو ایسی خوشی ہوتی ہوگی، جو ہم کو اسوقت ہوئی تھی، بیگم کی شکست کا کھلا ہوا اعتراف ان کے پندار باطل کو ہمیشہ کے لیے پاش پاش کر دینے والا تیر اس وقت ہمارے قبضہ میں تھا۔ ہم بچوں کی طرح اچھلتے کودتے بیگم کے پاس پہنچے۔ اور ان کے ہاتھ سے گردشیا اور میز پوش دونوں کو چھین کر ایک طرف اچھالتے ہوئے کہا۔

"یہ آگیا جواب۔ کہیے اب آپ کیا کہتی ہیں"؟

"بیگم نے لفافہ کی طرف جھپٹتے ہوئے کہا:" دیکھوں"

"ہم نے لفافہ کو مضبوط گرفت میں لے کر کہا:" ابھی نہیں، پہلے ایکمرتبہ ذرا یہ کہہ دیجیے۔ کہ میں نے آپ کی چوکھٹ پر ناک رگڑی تھی، جوتیاں توڑی تھیں دوڑتے دوڑتے"

بیگم نے ڈھٹائی سے کہا:" یہ تو میں اب بھی کہتی ہوں۔ اور نہیں تو کیا میں خود ہاتھ جوڑتی ہوئی آگئی تھی"

ہم نے سرخروئی کے ساتھ لفافہ سے خط نکالتے ہوئے کہا "اچھا تو اب سنیے"

بیگم نے ہاتھ بڑھا کر کہا:" یہ تصویر تو دیکھوں"

ہم نے ذرا ہٹتے ہوئے کہا:" نہیں، پہلے خط سنیے۔ فرماتے ہیں ہمارے ــــ لاحول ولاقوۃ ــــ یعنی لڑکی کے والد صاحب محترم کہ ــــ "جناب محترم۔ اشتہار کے سلسلہ میں جناب والا کا گرامی نامہ معہ تصویر کے موصول ہوا۔ اس اشتہار کو دیکھ کر بہت سے حضرات نے خطوط بھیجے ہیں، مگر میں سب سے پہلے آپ ہی کو جواب دے رہا ہوں ــــ"

ــــ ہم نے خط پڑھنا ملتوی کرتے ہوئے کہا:" سن رہی ہیں آپ سب سے پہلے یعنی اور سب خطوط کو بیکار سمجھ کر"

بیگم نے کہا:" اچھا اچھا، خوش بعد میں ہو لیجیے، خط تو پڑھ دیجیے"

ہم نے پھر خط پڑھنا شروع کیا:" آپ کا خط رسمی تکلفات اور غیر متعلق باتوں سے بالکل پاک ہے۔ اور جو حالات آپ نے

لکھے ہیں وہ میرے لئے اطمینان بخش ہیں۔ لڑکی کی تصویر بھیج رہا ہوں اور میرے یہاں اس میں کوئی عیب نہیں سمجھا جاتا۔ اس لئے کہ میرے یہاں پردہ کی بھی پابندی نہیں ہے۔ غالباً آپ بھی اتنے ہی آزاد خیال ہونگے۔ اور یہی اندازہ کرنے کے لئے آپنے تصویر طلب کی ہے۔ اب آپ مجھ کو موقع دیں، اور میں آپ کو موقع دیتا ہوں۔ کہ اپنے اپنے ذرائع سے ایک دوسرے کیلئے تحقیقات کرلیں۔ میرا شجرۂ نسب منسلک ہے۔ آپ بھی اپنا شجرہ ارسال کردیں۔ اور تفصیلی حالات لکھیں۔ امید کہ آپ بخیریت ہونگے

والسلام۔ راقم عبدالحمید"

بیگم نے خط سنکر بے صبری کے ساتھ کہا" اچھا دیکھوں تو تصویر"

ہم نے کہا" تصویر تو دیکھئے گا۔ مگر خط سنا آپ نے"

بیگم نے کہا" جی ہاں! یہ سنا ہے کہ تحقیقات ہوگی"

ہم نے کہا" تحقیقات تو جب ہوگی، کہ میں خط کا جواب بھی دوں، اور اگر تحقیقات ہوئی بھی تو کیا میں جولاہا ثابت ہوؤنگا یا میراثی نکلوں گا؟ یہی نا کہ شادی شدہ ہوں، یہی بات انکو معلوم ہوجائے گی"

بیگم نے کہا" اچھا خیر، تصویر تو دکھائیے"

ہم نے لفافہ سے تصویر نکالتے ہوئے کہا۔ اگر تصویر صحیح ہے، تو لڑکی بری نہیں"

بیگم نے تصویر دیکھ کر کہا" ارے ـــ"

ہم نے کہا" کیا ہے"

بیگم نے جلدی سے کہا" کچھ نہیں یہ تو لڑکی کی تصویر ہے"

ہم نے تعجب سے کہا" اے سبحان اللہ۔ تو کیا آپ سمجھی تھیں کہ لڑکی کے والد کی تصویر ہوگی؟"

بیگم نے کہا" نہیں! میرا مطلب یہ ہے کہ یہ تو واقعی ابھی لڑکی سی ہے"

ہم نے تصویر دیکھتے ہوئے کہا" لڑکی ہے ہی، لڑکی سی کیا معنی؟"

بیگم نے کہا" اچھی ہے۔ واقعی اچھی ہے۔ بڑی بڑی آنکھیں ہیں، ناک نقشہ بھی اچھا ہے۔ بال بھی لمبے ہیں"

ہم نے تصویر پر تنقیدی نظر ڈالتے ہوئے کہا" اور چہرے سے ذہانت بھی برستی ہے معلوم ہوتا ہے کہ پڑھی لکھی لڑکی کی تصویر ہے۔ تصویر کھچوانا بھی ایک مستقل فن ہے اور اس فن کو یہ لڑکی جانتی ہے"

بیگم نے تصویر پر انگلی رکھ کر کہا" یہ کیا ہے ہاتھ میں"

ہم نے غور سے دیکھتے ہوئے کہا" غالباً ٹینس کا بلا لئے ہوئے ہے۔ پوری تصویر ہوتی، تو سمجھ میں آتا۔ کہ کیا ہے"

بیگم نے کہا" ہاں ٹھیک کہتے ہیں آپ۔ یہ ٹینس کے بلے کا دستہ ہی ہے۔ اچھا تو جواب بھیجئے اپنے حالات لکھکر"

ہم نے تصویر لفافے میں رکھتے ہوئے کہا" اب میں کیوں لکھوں کچھ مجھے تو بس یہ بتانا تھا کہ میں بھی ایسا گیا گذرا، اور ایسا گرا پڑا تو نہیں ہوں، کہ مجھکو کوئی پوچھے ہی نہیں"

بیگم نے سنجیدگی سے کہا" یہ بڑی بری بات ہے۔ وہ بیچارے جواب کا انتظار کریں گے۔ اور آپ ہیں کہ مذاق کرکے بیٹھ رہے۔ وہ غریب کہیں اور بھی سلسلہ جنبانی نہ کرسکے گا"

ہم نے کہا" کمال کرتی ہیں آپ بھی، تو کیا میں ان کو یہ لکھدوں، کہ میں نے مذاق کیا تھا؟"

بیگم نے غور کرتے ہوئے اور خدا جانے کس خیال میں کھو جانے کے بعد کہا" ہاں تو آپ کیا لکھئے گا ان کو؟"

ہم نے لاپروائی سے کہا۔ کچھ بھی نہیں، بس چپ"

بیگم پھر کچھ کھوسی گئیں اور چند منٹ تک خاموش رہنے کے بعد بولیں" آپ یہ لکھدیجئے۔ کہ اس عرصہ میں میں نے ایک دوسری جگہ سے خط و کتابت شروع کردی ہے۔ تاکہ وہ بیچارہ آپکے بھروسے پر بیٹھا تو نہ رہے"

ہمکو بھی یہ تجویز معقول نظر آئی۔ اور یہی طے کرنے کے بعد ہم دفتر کے کمرے میں چلے آئے۔ مگر واقعہ تو یہ ہے۔ کہ اسوقت دل و دماغ پر یہ تصویر جیسے کچھ چھائی سی جاتی تھی۔ اس لڑکی کے [illegible]

طریقہ اور تصویر کھچواتے ہوئے کیمرہ کی طرف ایک سرسری سی نظر پھر اس کی شاعرانہ نگاہیں اور شاعر کی شکل وصورت ہلکا سا تبسم اور تبسم میں متانت کی جھلک۔ بالوں کی ژولیدگی اور اس انتشار میں بھی ایک غیر مرتب ترتیب ان تمام چیزوں کو کیسے نظر انداز کیا جا سکتا تھا۔ شادی کا خیال نہ بھی سہی لیکن اس خیال کو کیونکر رد کیا جا سکتا تھا۔ کہ ہماری شادی کیوں ہو چکی ہے۔ بہر حال اس وقت ہم میز کے سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔ اور تصویر ہمارے سامنے تھی۔ مصور نے تصویر کو کھینچا تھا۔ اور تصویر ہم کو کھینچ رہی تھی شرارت نہایت تیزی کے ساتھ سنجیدگی کے مدارج طے کر رہی تھی۔ اور ہم اس طرح خاموشی کے ساتھ اس کیفیت کو دماغ کی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔ جس طرح ایک تماشائی کسی فلم کو دیکھتا ہے یہاں تک کہ غیر ارادی طور پر ہم نے قلم اٹھایا۔ کاغذ گھسیٹا۔ اور اپنے تفصیلی حالات خط کے پیرائے میں لکھنا شروع کر دیئے۔ اس وقت صرف یہی ایک بات سمجھ میں آئی تھی۔ کہ اگر مزید خط وکتابت کی جائے۔ تو آخر حرج ہی کیا ہے۔؟

خط لکھا اور بھیج دیا۔ مگر اب شرارت سنجیدگی اختیار کر چکی تھی۔ لہذا بیگم کے تقاضوں کے باوجود ہم برابر یہی کہتے رہے۔ کہ آج نہیں کل خط لکھ دیں گے۔ حالانکہ خط لکھنا کیا معنی اب تو لکھے ہوئے خط کے جواب کا ہر وقت انتظار رہتا تھا۔ تصویر اس کثرت سے دیکھی گئی تھی۔ کہ اب حفظ ہو چکی تھی۔ اور بغیر دیکھے ہی ہر وقت اسی کو دیکھا کرتے تھے بیگم نے آجکل کی تاکیدوں سے عاجز آکر اپنے سامنے ہم سے خط لکھوایا۔ مگر ہم نے باہر جا کر اس خط کو چاک کر دیا۔ بیگم اس ذکر کو رفتہ رفتہ بھول گئیں۔ مگر یہاں نہایت زور شور کے ساتھ خط وکتابت کا سلسلہ جاری تھا۔ اور اب اس حد تک اس شرارت نے سنجیدگی اختیار کر لی تھی۔ کہ عبد الحمید صاحب ہم سے انگوٹھی تک منگا کر لڑکی کو پہنا چکے تھے۔ اور ہم نے بھی اس خیال سے انگوٹھی بھیجدی تھی۔ کہ آخر اس شرارت کی کچھ قیمت ہونا چاہیئے۔ مگر انگوٹھی بھیجنے کے بعد نیاز مندانہ تحریر کھلا کر ان صاحبزادی کا والا نامہ بھی موصول ہو گیا۔ جو نہایت سادہ اور نہایت معصوم طرز تحریر کے ساتھ لکھا گیا تھا۔ حالانکہ ہمارے لئے یہی بہت بڑی بات تھی کہ ایک غیر شادی شدہ لڑکی اپنے منگیتر کو خط لکھے۔ مگر وہ ایک ایسے آزاد گھرانے کی لڑکی تھی۔ جہاں غالباً انگوٹھی کی رسم کے بعد خط وکتابت کی اجازت اور آزادی دیدی جاتی ہے۔ بہر حال ہم نے بھی اسی سادگی کے ساتھ خط کا جواب دیدیا۔ یعنی جناب من کا جواب ہماری طرف سے محض ایک سطر تھا یعنی ــــــ "تسلیم" آپ ہی بتائیے اور ہم کیا لکھتے مگر اب تو خطوں کی بوچھاڑ شروع ہو گئی۔ ایک دو تین ہر ہفتہ ہفتہ میں دو بار، ایک دن بیچ کر کے، اور پھر روزانہ اخبار کی طرح بغیر اتوار کی تعطیل کے بلکہ اتوار والا خط سنڈے ایڈیشن کی طرح ذرا فرصت سے لکھا ہوا طویل حالانکہ ان تمام خطوں میں وہی کالج کی باتیں، استانیوں کے جھگڑے، سہیلیوں کی خرافات کے علاوہ اور کچھ نہ ہوتا تھا۔ مگر ہمارے لئے تو یہ مصیبت تھی۔ کہ ان خطوں کو چھپائیں کیونکر اور خطوں کا سلسلہ بند کریں۔ تو کیونکر ادھر عبد الحمید صاحب کے تقاضے کہ فوراً آؤ۔ اور ہم لوگوں سے مل جاؤ۔ زمین سخت اور آسمان دور والا مضمون صادق آ رہا تھا۔ ریچھ کو کمبل سمجھ کر اوڑھ لیا تھا۔ اور اب کمبل چھوڑتا نہ تھا۔ خطوں کا جواب دینا بند کر دیا۔ مگر آنے والے خطوں کو روکنا ہمارے بس میں نہ تھا۔ ایکمرتبہ سوچا کہ اپنے انتقال کی خبر لکھ بھیجیں۔ پھر ارادہ کیا کسی سے عبد الحمید صاحب کو یہ لکھوا دیں کہ لڑکا نہایت نالایق اور آوارہ گرد ہے۔ عنقریب گرفتار ہونے والا ہے کبھی ضمیر نے ملامت کی تو تمام سچ حالات لکھ بھیجنے کا ارادہ کیا۔ مگر نہ یہ لکھا نہ وہ۔ اور خط وکتابت کا سلسلہ جاری رہا۔ ہر دو تین خط کے بعد ایک مختصر سا خط ہم لکھ دیتے تھے، اور اس کے جواب میں چھ چھ سات سات صفحات کے متعدد خطوط ادھر سے آ جاتے تھے عجیب مصیبت میں جان تھی۔ بیگم بے چاری کو کیا خبر کہ ان کے سعادت آثار شوہر صاحب کیا گل کھلا رہے ہیں۔ مگر اس خیال سے دم ہی نکلا جاتا تھا۔ کہ جب ان کو خبر ہو گی اسوقت کیا ہو گا۔ ایک آدھ مرتبہ تو یہ بھی ارادہ کیا۔ کہ لاؤ بیگم ہی سے تمام واقعہ کہدیں۔ مگر آپ کو معلوم ہونا چاہیئے کہ ایک بے وقوف شوہر جب خودداری کی حماقت میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ تو وہ پھانسی تک کو قبول کر سکتا ہے۔ مگر اپنی ذاتی اور

بجی بیوی کے سامنے منفعل ہوکر گردن جھکانے کو کبھی تیار نہیں ہوسکتا حالانکہ ہم ایسے بے وقوف نہیں ہیں، مگر خدا جانے کیوں یہ حماقت ہم پر بھی سوار تھی اور اسی راز داری میں بات کا بتنگڑ بنتا چلا جا رہا تھا۔ ایک طوفان تھا، جو ہم کو حباب کی طرح ہر طرف سے گھیرے ہوئے تھا اور عقل حیران تھی کہ آخر اس طوفان سے ہم نکلیں گے کیونکر شادی کرنے کا خیال تک نہ تھا، مگر جو مذاق سنجیدگی اختیار کرلے اس کو پھر مذاق کیونکر بنایا جا سکتا ہے۔ مگر آپ جانتے ہیں کہ وہ تو بڑا کارساز ہے۔ اور بڑا مسبب الاسباب۔ ایک دن دیکھتے کیا ہیں کہ پوسٹمین صاحب نے لاکر دو لفافے دیئے۔ ایک ہمارے نام اور ایک ہمارے "گھر میں سے" کے نام، ایک ہی قسم کے دونوں لفافے۔ ایک ہی خط میں دونوں لکھے ہوئے۔ ہمارا لفافہ تو خیر ہماری منگیتر کا تھا، مگر بیگم کے نام جو خط تھا وہ بھی یقیناً اس شخص، جگہ، یا چیز کے ہاتھ کا لکھا ہوا تھا، جس نے ہمارے نام کے لفافہ پر پتہ لکھا تھا۔ ظاہر ہے کہ اس شک کے بعد پرائے خطوط کو کھولنا مجرمانہ طور پر جائز ہو جاتا ہے۔ لہٰذا ہم نے نہایت احتیاط کے ساتھ پانی لگا کر لفافہ کھولا اور اب جو اسے پڑھتے ہیں تو سے

رات گزری نور کا تڑکا ہوا۔
ہوشیار اسکول کا لڑکا ہوا

ان ہی صاحب زادی کا خط۔ بجذا ان ہی مسماۃ کا والا نامہ تھا اور ستم یہ کہ معلوم ہوا کہ عرصہ سے خط و کتابت جاری تھی، ملاحظہ ہو ذرا یہ خط:-

پیاری سعیدہ تمہارے خط کے ساتھ ہی اباجان کے اور میرے نام تمہارے شوہر نامدار کے خطوط بھی آئے، وہ حضرت اب تک اباجان کو مغالطہ میں مبتلا کئے ہوئے ہیں۔ میں اباجان سے کسی نہ کسی طرح کہلوا دیتی، مگر تمہاری اجازت کے بغیر اس سلسلہ کو کیسے ختم کرسکتی ہوں، مگر خدا کے لئے میری تصویر ان حضرت کے قبضہ سے نکال لو۔ اب کے میرے نام ان کا جو خط آیا ہے، وہ بھیج رہی ہوں۔ اس کا جواب فوراً لکھ کر بھیجدو۔ فی الحال تو میں خط کی محض رسید دے رہی ہوں، اچھا یہ بتاؤ کہ یہ تماشہ ختم کب کرو گی؟ امی جان دعا کہتی ہیں۔

تمہاری بہن رضیہ

اب معلوم ہوا کہ تصویر دیکھ کر بیگم صاحبہ کا بے ساختگی کے ساتھ "ارے" کہنا کیا معنی رکھتا تھا۔ اور اب پتہ چلا، کہ شرارت محض سنجیدگی ہی نہیں بلکہ حادثہ بھی بن سکتی ہے۔ خیر یہ تو سب کچھ ہوا، مگر یہ بتائیے کہ اب ہم گھر میں کیونکر جائیں ——؟

جناب اثر چکوالی بی اے۔

غزل

اے دوست تیرے ذہن میں آنے لگا ہوں میں
ہر خفتہ آرزو کو جگانے لگا ہوں میں

چھائی ہوئی ہیں بزم خرد پر خموشیاں
اُلفت کا کوئی گیت سنانے لگا ہوں میں

پھر ملتفت ہے ان کا شباب فسوں طراز
پھر کیف و رنگ و نور کو پانے لگا ہوں میں

یوں کھو گیا ہوں عشق و محبت کے دیس میں
ہستی کے غمکدے کو بھلانے لگا ہوں میں

رعنائی مجاز کی کیفیتیں نہ پوچھ!!
رعنائی مجاز میں آنے لگا ہوں میں

پست و بلند ایک ہیں میری نظر میں اب
شاید تری نظر میں سمانے لگا ہوں میں

پھر کھا کے ہر فریب محبت کا اے اثر
پھر لطف ہائے زیست اٹھانے لگا ہوں میں

جناب احسان دانش

مزدور کا چالان!

دوپہر کی دھوپ ڈھلنے کے لئے تیار تھی
خشکیاں نظریں اٹھاتی تھیں تپش بیمار تھی
سر پھرے سورج کی سنگینیں نگوں ہونے کو تھیں
رُوح کی بے چینیاں بڑھ کر سکوں ہونے کو تھیں
زرد ہو جانے کو تھی مہرِ منور کی جبیں!
ہانپ کر لب بند کر لینے کو تھی گونگی زمیں!
سانولا ہونے کو تھا جُھلسے ہوئے میداں کا رنگ
دن کے دل میں اٹھ رہی تھی شام ہونے کی امنگ
مطمئن ہونے کو تھی ہر تمتماتی رہ گذار!!
بیٹھتا جاتا تھا بھوبل کی طرح تپتا غبار

سائے پیڑوں سے اتر کر فرش ہو جانے کو تھے
دھوپ کے مارے مناظر ہوش میں آنے کو تھے

تھا عدالت کے احاطے میں ہجوم بے پناہ
ڈھل رہا تھا دن۔ مگر تھا گرم بازارِ گناہ
کام کرتی تھی یہاں الفاظ کی جادوگری
دورِ فرعونی تھا اور شیطان کی پیغمبری
منصفی کے بھیس میں نا منصفی تھی دادگر!
بارِ عصیاں سے جھکی جاتی تھی مذہب کی کمر
چل رہا تھا جھوٹ کا سکہ یہاں بے اشتباہ
دل سے جیبوں تک تھی جاری رشوتوں کی رسم و راہ
رہزنی تھی مختلف شکلوں میں سرگرمِ عمل!
خیر خواہوں کے لباسوں میں تھے قزاقوں کے دل
جن کے ماتھوں پر عیاں تھے ورزشِ سجدہ سے داغ
گل تھے ان کی داڑھیوں کی چھاؤں میں دل کے چراغ
منتخب ہوتے ہیں جو حضرت امامت کے لئے
آئے تھے جعلی نکاحوں کی شہادت کے لئے
اس جگہ جو خضر صورت تھے مسافر مار تھے
غمگساری میں یہاں شبخون کے آثار تھے!
کھاتے بغلوں میں دبائے پھر رہے تھے ساہوکار
جن کے سینے تھے دلوں کی نابداری کے مزار
جن کی آنکھوں میں تھی ہستی سود خواری شعلہ ریز
جن کے مشرب میں روا ہے شرم و غیرت سے گریز
پارسائی اس کشاکش میں شکست انگیز تھی
معتبر رشوت سے ہر بے جان دستاویز تھی
باغیٔ فطرت، مہذب چور بستے تھے یہاں
زر کی صورت خون کے بادل برستے تھے یہاں
کر رہا تھا علم گمراہی کے پرچم کو بلند
سفلگی نے ڈال رکھی تھی شرافت پر کمند
مستند ڈاکو سیہ فرغل پہ اتراتے ہوئے
پھر رہے تھے بیکسوں کو لوٹتے کھاتے ہوئے
اس جگہ ابلیس سب کچھ تھا، خدا کچھ بھی نہ تھا
زہد اک اوچھے تخیل کے سوا کچھ بھی نہ تھا،
حق یہاں باطل کے آگے ششدر و حیران تھا
جھوٹ پر مہرِ صداقت کے لئے قرآن تھا

پھر رہا تھا میں یہاں خستہ دل و آہستہ گام
دُور سے اتنے میں فضلو نے کیا جھک کر سلام

کون فضلو! آہ اک مزدور با حالِ خراب　　اپنی ہستی کی سزا، روحِ تمدن کا عذاب
یوں لگا کہنے ز راہِ عاجزی با چشمِ تر　　"رحم فرماؤ خدا کے واسطے آؤ ادھر
غور تو کیجے کہ مزدوری سے گھر آتے ہوئے　　مال پر اترے دکھن کی طرف جاتے ہوئے

دیکھتا کیا ہوں سڑک سے ہٹ گئے نل کے روبرو
سنتری صاحب کسی سے کر رہے ہیں گفتگو

دیکھا جب موقع تو چورا ہا کیا میں نے عبور　　یہ ہوا ہے جرم بس اتنا ہے بندے کا قصور
سنتری صاحب بڑے جھلائے اور کہنے لگے

کیوں بے اندھو! حاکموں سے بے خبر بننے لگے!
دوسری جانب بتا کس کے اشارے پر گیا؟　　حکم سے کس کے لپک کر اس کنارے پر گیا؟

نام اپنا اور اپنے باپ کا جلدی بتا!
لا انگوٹھا! اور چالانی مچلکہ پُر کرا!

مجھ پہ ایسی ناگہاں آفت کبھی آئی نہ تھی　　اس پہ یہ طرہ کہ میری جیب میں پائی نہ تھی!
کی خوشامد پاؤں پکڑے، ہاتھ جوڑے رو دیا　　ان پہ لیکن کیا اثر ہوتا مچلکہ بھر لیا!

اب مقدمہ پیش ہونے کو ہے میں جانے کو ہوں
فیصلہ جو کچھ ہو شکرانہ بجا لانے کو ہوں

دُو سے کم جرمانہ ہے رسمِ عدالت کے خلاف　　اور معافی حاکمانہ شان و شوکت کے خلاف
اپنا یہ عالم کہ ناداری سے دو بھر زندگی　　شعلہ افگن، اشک افشاں، نالہ پرور زندگی!
بدنصیبی سے خوشی کا سانس لے سکتا نہیں　　جان دے سکتا ہوں میں جرمانہ دے سکتا نہیں
ہے یہی انجام ہفتہ بھر کی ہو جائے گی قید　　مجھ کو بچوں سے علیحدہ کر کے تڑپائے گی قید
خیر جو ہونا ہے ہو جائے مگر اتنی ہے بات　　لو یہ نو آنے کے پیسے! یہ ہے میری کائنات

یہ امانت جا کے دے دینا مرے گھر شام تک
جب میں آیا تھا تو آنے کا نہیں تھا نام تک

اور کہہ دینا یہ بچوں سے بطرزِ خوشگوار　　ہے تمہارا باپ کچھ دن کے لئے مصروفِ کار
رات دن کی نوکری ہے ہلکا ہلکا کام ہے!　　بارہ آنے روز ٹھہرے ہیں بڑا آرام ہے!!
بعد اک ہفتے کے جس دن گھر کو واپس آئے گا　　وہ تمہارے واسطے میٹھے کھلونے لائے گا!!

لو ایک مزدور کا نام ہے جس سے متاثر ہو کر نظم لکھی گئی ہے　　مال روڈ سے مراد لاہور کی ایک بارونق سڑک ہے۔

تم اگر روئے تو وہ ہو جائے گا تم سے خفا　　وہ یہ کہتا تھا غریبوں کا محافظ ہے خدا!
میں بمشکل سن سکا احسان اس کی گفتگو
آ گیا واللہ انجام تمدن روبرو

محترمہ خیر النساء :-

تراجم

ماضی

کیا تم ان مسرت پرور لمحات کو بھول جاؤ گی۔
جن کو ہم نے محبت کے رنگین ایوانوں میں دفن کیا تھا
اور ان کی سرد لاشوں پر
مٹی کی بجائے پھولوں اور پتیوں کا ڈھیر لگا دیا تھا۔

پھول جو انبساط کی طرح رُوح پرور تھے اور جو کملا گئے
پتے جو امید کی طرح خوشگوار تھے اور اب تک باقی ہیں
مرے ہوئے کو۔ گذرے ہوئے کو۔ بھول جاؤں؟ لیکن
اب تک۔

ایسے بھوت موجود ہیں جو شاید اس کا انتقام لیں۔
وہ یاد جو دل کو مزار بنا دیتی ہے
وہ ندامت جو دل کی افسردگی میں سرایت کر جاتی ہے
اور بھوتوں کی آواز میں لپٹی ہے۔
خوشی کا لمحہ جو گذر گیا ہو مصیبت کا پہاڑ بن جاتا ہے۔

انکے نام

موسیقی جب نقرئی آواز خاموش ہو جاتی ہے۔
ذہنی فضا میں تھرتھراتی رہتی ہے۔
خوشبو، جب مخملیں پھول کملا جاتے ہیں۔
اس حس میں زندہ رہتی ہے۔ جس کو اس نے بیدار کر دیا ہو
گلاب کی پتیاں، جب گلاب بکھر جاتا ہے
محبوب کی سیج پر بکھیر دی جاتی ہیں۔
اسی طرح تیرے خیال پر، جب تو میرے پاس نہیں ہوتا
خود عشق آرام کرتا ہے!

(شیلی)

گیت

ان کے گانے ختم ہو چکے تھے۔ اور گھاس خشک ہو چکی تھی
لیکن پھر بھی وہ گا رہے تھے۔
ان کے گانے میرے سینے میں گونجنے لگے۔
جس وقت میں ان کے قریب سے گذری
انہوں نے میری رُوح کے خوابیدہ تاروں کو
چھیڑ دیا۔
اور میری آہوں کو بیدار کر دیا۔
سوکھے پتوں کی کھڑکھڑاہٹ کے سوا اور کوئی آواز
نہ تھی۔
تاہم میری رُوح گانے لگی

جارج میریڈتھ

جناب نرسیدر ناتھ صاحب
(بی اے ایل ایل بی)

عدالت[1]

ایک ایکٹ کا ڈراما

مقام:۔ عدالت کا کمرہ　　**وقت**:۔ ساڑھے دس بجے صبح

پسِ منظر

(دروازے میں سے داخل ہوتے ہی دائیں کونے میں ایک میز دکھائی دیتی ہے۔ جس پر پرانے خاکی کاغذوں کا ایک انبار لگا ہے۔ اور ساتھ ہی ایک کرسی پر ایک مکروہ شکل کا خاکی وردی میں ملبوس، سپاہی گردن جھکائے چند ایک کاغذوں کی پڑتال کر رہا ہے۔ میز کے عین سامنے ایک بنچ پر دو باوردی سپاہی بیٹھے ہیں۔ ان کے چہرے ہر قسم کے جذبے سے عاری ہیں۔ سخت اور بے حس۔ ایک کی پیٹھ کے ساتھ ہتھکڑی کا ایک سرا لگا ہوا ہے۔ اور دوسرا مقفل سرا زمین پر بیٹھے ہوئے آدمی کے ہاتھوں میں لگا ہوا ہے۔ اس آدمی کا چہرہ جھکا ہوا ہے۔ ہاتھوں پر جھریاں دکھائی دیتی ہیں۔ سر کے بال بکھرے ہوئے اور گرد آلود۔ آدھے سفید اور آدھے کالے ـــــ لیکن گرد کی وجہ سے سب سفید معلوم ہوتے ہیں۔

بنچ کے بالکل ساتھ بائیں طرف اینٹوں کا ایک چبوترہ ہے۔ جس پر ذرا پیچھے ہٹ کر لکڑی کا ایک قد آدم کٹہرہ لگا ہے جو اوپر کی طرف سے کچھ بڑھا ہوا ہے۔ کٹہرے کی بائیں جانب کے کونے میں کچھ فائلیں پڑی ہیں۔ جن کو کٹہرے کی باہر کی طرف کھڑا ہوا باوردی سرکاری وکیل الٹ پلٹ کر دیکھ رہا ہے۔

کٹہرے کے اندر اور بالکل قریب ہی وسط میں کاغذوں سے لدی ہوئی ایک بوسیدہ اور پرانی میز رکھی ہے جس کی بائیں طرف ایک چھوٹی میز پر ٹائپ کی مشین دھری ہے اور ساتھ ہی کرسی پر ٹائپسٹ بیٹھا ہے۔ میز کے سامنے حاکم عدالت کی خالی کرسی ہے۔ اور دائیں طرف ایک چھوٹا سا تخت ہے جس پر ایک بوسیدہ دری پر عدالت کا سرشتہ دار بیٹھا ہے۔ خوب موٹا سا سفید چہرہ، چھوٹی چھوٹی آنکھیں ان پر ایک ٹوٹی ہوئی کمانی والا چشمہ۔ بائیں ہاتھ سے اپنا چھوٹا سا گول گول ناک ٹٹولا کرتا ہے۔ وہ دائیں ہاتھ سے خاکی کاغذوں پر کچھ لکھ رہا ہے۔ اور لکھتے لکھتے کٹہرے کے ساتھ کھڑے ایک دو وکیلوں کے ساتھ آہستہ آہستہ باتیں بھی کر رہا ہے۔)

وکیل:۔ کتنی دیر میں تشریف لائیں گے "صاحب"؟

سرشتہ دار:۔ بس اب آنے ہی والے ہیں۔ کون مقدمہ ہے آپ کا؟

وکیل:۔ وہی "بت" کا چالان، ذرا پہلے رکھ دینا۔ مجھے ایک اور عدالت میں پیش ہونا ہے۔

سرشتہ دار:۔ آپ کی باری آنے پر پیش ہوگا صاحب۔ پہلے تو

---

[1] ڈرامے کے سب کردار فرضی ہیں

وہ شہادتی چالان پیش کروں گا۔

وکیل:۔ یار پہلے رکھ دو تو مہربانی ہوگی (مسکرا کر) اور آج ضمانت بھی ہونی چاہیئے۔

سررشتہ دار:۔ اچھا دیکھو جو خدا کو منظور۔

(اتنے میں حاکم عدالت چبوترے کی دائیں طرف کے بائیں کمرے سے باہر نکلتا ہے۔ سب کھڑے ہو جاتے ہیں۔ دروازے پر کھڑے چند وکیلوں کے منشی دروازے سے باہر نکل جاتے ہیں۔)

آداب عرض جناب!

سلام حضور!

(حاکم عدالت ادھر اُدھر دیکھتا ہے۔ اور پھر خالی کرسی پر بیٹھ جاتا ہے۔ دونوں ہاتھ اوپر اٹھا کر ایک انگڑائی لیتا ہے۔ پھر ہاتھ نیچے لا کر کھلے ہوئے منہ کے آگے رکھ دیتا ہے)

حاکم عدالت:۔ اچھا کریم بخش لاؤ تو آج کا کام۔

(کمرے کے کونے والی میز کے ساتھ بیٹھا ہوا مکروہ شکل کا سپاہی کچھ کاغذوں کو ہاتھ میں لئے اٹھتا ہے۔ اور حاکم عدالت کے سامنے پیش کرتا ہے، حاکم عدالت جمائی پر جمائی لیتے ہوئے۔ بائیاں ہاتھ منہ پر رکھتے ہوئے دائیں ہاتھ سے مشین کی طرح دستخط کرتا ہے)

سپاہی۔ حضور! یہ حافظ کے بلا ضمانت وارنٹ ہیں یہ اللہ داد کے سمن۔ یہ لالہ کروڑی مل کے نام نوٹس جاری کیا گیا ہے۔ بڑا شریف آدمی ہے بے چارہ، صرف نوٹس ہی کافی ہوگا۔ اور یہ اس بابو کی ضمانت کے کاغذ ہیں جس کی موٹر کے نیچے گامے کا لڑکا آکر مر گیا تھا۔

. . . .

(حاکم عدالت آخری کاغذ پر دستخط کرتے ہوئے پھر جمائی لیتا ہے۔ قلم کو میز پر رکھ دیتا ہے۔ اور پھر کمر سیدھی کرکے بیٹھ جاتا ہے۔ جیسے بہت تھک گیا ہو

اس کے بعد سررشتہ دار آج کے مقدمات کی فہرست پیش کرتا ہے۔)

حاکم عدالت:۔ یہ شامو کے چالان میں کتنے گواہ ہیں؟

سررشتہ دار:۔ بارہ حضور!

حاکم عدالت:۔ کیا سب حاضر ہیں؟

سررشتہ دار:۔ جی سرکار

حاکم عدالت:۔ اچھا اسے کل پر رکھ دو

سررشتہ دار:۔ حضور یہ پانچ مرتبہ پہلے بھی ملتوی ہو چکا ہے۔

حاکم عدالت:۔ بکو مت! آج ہمیں بہت کام ہے۔ آج نہیں ہو سکتا یہ مقدمہ۔ مر تو نہیں چلا وہ حرامخور۔ اسے اور ابھی جیلخانے کی ہوا کھانے دو۔ اچھا چلو آگے۔ اس جاکو والے مقدمہ میں کتنے گواہ ہیں؟

سررشتہ دار:۔ تین سرکار!

حاکم عدالت:۔ اچھا بلاؤ اسے۔

(سررشتہ دار چپراسی کو آواز دیتا ہے)

"بلاؤ، سرکار بنام جاکو"

(چپڑاسی دروازے کے پاس جاکر آواز دیتا ہے)

"چلو۔ سرکار بنام جاکو"

(بنچ پر بیٹھا ہوا سپاہی ہتھکڑی کو ہلا کر اس فرش پر بیٹھے ہوئے آدمی کو بلاتا ہے۔ وہ اٹھ کر سپاہی کے پیچھے ہو لیتا ہے۔ کٹہرے کی دائیں طرف ایک چھوٹے کٹہرے میں جو تین طرف سے بند ہے ملزم اور سپاہی دونوں کھڑے ہو جاتے ہیں۔)

حاکم عدالت:۔ (سرکاری وکیل سے مخاطب ہوتے ہوئے) اس کا چالان مکمل ہے؟ کیا جرم ہے۔ اس کے خلاف؟

سرکاری وکیل:۔ تین سو نواسی جناب۔ اس نے لطیف کے مکان سے کپڑوں کے ٹرنک کی چوری کی ہے۔

حاکم عدالت:۔ اچھا بلاؤ گواہ

سرکاری وکیل:۔ (چپڑاسی سے) بلاؤ محمد لطیف

(چپڑاسی دروازے پر جاکر آواز دیتا ہے۔ ایک پست قد آدمی جلد جلد قدم اٹھاتا ہوا سرکاری وکیل کے پاس آکھڑا ہوتا ہے۔ اس کے ہاتھ کانپ رہے ہیں چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی ہیں۔ کبھی حاکم عدالت کی طرف دیکھتا ہے کبھی سرکاری وکیل کی طرف، اور کبھی چور آنکھ سے ملزم کیطرف)

حاکم عدالت:۔ (نووارد سے) نام؟

سرکاری وکیل:۔ (اونچی آواز سے) نام بتاؤ

(سرشتہ دار اپنے قلم کی نوک تخت پر بچھی ہوئی میلی دری پر گھستا ہے۔ اور لکھنے کو تیار ہو جاتا ہے، ادھر ٹائیپسٹ بھی اپنی موٹی موٹی بھدی بھدی انگلیاں مشین کے چمکتے ہوئے لفظوں پر رکھ دیتا ہے)

گواہ:۔ محمد لطیف

(سرشتہ دار اردو میں لکھتا ہے۔ اور ٹائیپسٹ انگریزی زبان میں ٹائپ کرتا ہے)

سرکاری وکیل:۔ عمر؟

گواہ:۔ سرکار اچھی طرح سے پتہ نہیں۔ یہی ہوگی کوئی چالیس پچاس برس۔

سرکاری وکیل:۔ پیشہ؟

گواہ:۔ گورنمنٹ پریس میں نوکر

سرکاری وکیل:۔ سکونت؟

گواہ:۔ ہاتھی دروازہ لاہور۔

سرکاری وکیل:۔ کہو جو کچھ کہوں گا ایمان سے سچ کہوں گا

گواہ:۔ "جو کچھ کہوں گا ایمان سے سچ کہوں گا"

سرکاری وکیل:۔ کیا ہوا تھا؟ (ملزم کی طرف اشارہ کرکے) اسکو جانتے ہو تم؟

گواہ:۔ ہاں سرکار اسے جانتا ہوں، یہ میرے گھر کے پاس ہی سڑک پر سویا کرتا ہے، اور صبح کو سینما کے اشتہار کی ریڑھی چلاتا ہے۔

سرکاری وکیل:۔ ٹھیک: تو پھر کیا کیا تمہارا اس نے؟ تیرے گھر چوری کی تھی؟

گواہ:۔ جی ہاں حضور!

سرکاری وکیل:۔ (لکھانے کیلئے دہراتا ہے) ملزم نے میرے گھر چوری کی تھی۔

حاکم عدالت:۔ ارے تیرے باپ کے نوکر ہیں ہم۔ کیا بکتا ہے تو۔ کیسے چوری کی تھی؟ نقب لگائی گئی تھی؟ تالا توڑا تھا؟ کیا کیا تھا؟ جی ہاں حضور۔ جی ہاں حضور کا بچہ

(سرشتہ دار۔ ٹائیپسٹ۔ سب گواہ کے منہ کی طرف تکتے ہیں۔ اور گواہ سرکاری وکیل کی طرف اس خوفزدہ بکرے کیطرح دیکھتا ہے۔ جس کے سر پر قصاب کی چھری لٹک رہی ہو۔ وہاں سے کچھ جواب نہ پاکر مری ہوئی آواز میں جواب دیتا ہے)

گواہ۔ تا۔۔۔۔تا۔۔۔۔۔ تالا توڑا تھا حضور۔

حاکم عدالت:۔ تیرے سامنے توڑا تھا کیا؟

گواہ:۔ (سہم کر) نہیں جناب!

حاکم عدالت۔ پھر کیسے پتہ چلا، کہ تالا توڑا تھا۔ خواب آیا تھا کیا؟

(سرکاری وکیل سے) کیا یہی آپ کے گواہ ہیں جی!

(سرکاری وکیل گردن جھکا لیتا ہے۔ گواہ گھبراکر کانپنے لگتا ہے، اور سرکاری وکیل کی طرف دیکھ کر آنکھوں ہی آنکھوں میں مدد کی درخواست کرتا ہے، آخر سرکاری وکیل گردن اونچی کرکے گواہ سے مخاطب ہوتا ہے)

سرکاری وکیل:۔ ارے بکتا کیوں نہیں آدمی ہے یا جانور، اتنی صاف سی بات ہے کہ جب تو شام کو چھاپا خانہ سے گھر واپس آیا، تو تالا ٹوٹا پڑا تھا، بول جلدی کیسے معلوم ہوا، کہ تالا ٹوٹا پڑا تھا؟

گواہ ایسے ہی حضور!

سرکاری وکیل:۔ ایسے ہی حضور کا بچہ (سرشتہ دار سے) لکھو جی، جب میں چھاپا خانہ سے گھر واپس لوٹا، تو تالا ٹوٹا ہوا تھا

مکان کے اندر پہنچا، تو سب چیزیں ادھر ادھر بکھری ہوئی تھیں، اور ایک کپڑوں کا ٹرنک غائب تھا۔

(حاکم عدالت میز پر پڑے ہوئے پیپر ویٹ سے کھیلتے ہوئے گواہ کے بیان کا انگریزی میں ترجمہ کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اور آخر سرکاری وکیل کی مدد سے کامیاب ہوتا ہے۔ ٹائپسٹ ٹائپ کرتا ہے)

سرکاری وکیل:- (گواہ سے) کچھ کیا کیا تم نے؟ تھانے میں رپورٹ دی-؟

گواہ:- جی ہاں!

حاکم عدالت:- (ملزم سے) کوئی سوال پوچھو گے؟ نہیں۔ اچھا نو کراس اگیزامینیشن (

) (گواہ سے) چلو ہو پرے (سرشتہ دار سے) دستخط کرالو جی۔ چلو اگلا گواہ بلاؤ

(گواہ دستخط کرتا ہے۔ چپراسی دوسرے گواہ کو بلاتا ہے)

——— امیر چند تھانیدار ———

ایک موٹا تازہ باوردی تھانیدار۔ اکڑی ہوئی گردن تنا ہوا سرخ چہرہ، اندر دھنسی ہوئی سرخ سرخ آنکھیں، پالش کئے ہوئے چرچر کرتے بوٹ ۔ دونوں پاؤں زور سے ملا کر بوٹوں سے آواز پیدا کرتے ہوئے حاکم عدالت کو سیلوٹ (salutes) کرتا ہے پھر سرشتہ دار اور ٹائپسٹ سے نہایت کرخت آواز سے مخاطب ہوتا ہے)

لکھو جی۔

(دونوں لکھتے ہیں)

"امیر چند"

"از دوڑہ"

"عمر ۳۵ سال"

"تھانہ ہاتھی دروازہ"

"نمبر ۴۹۲"

(ہاتھ اٹھا کر) جو کچھ کہوں گا، اپنے دھرم سے سچ کہوں گا"

(پھر سرکاری وکیل کی طرف منہ کر کے کھڑا ہو جاتا ہے)

سرکاری وکیل:- کیا آپ ملزم کو جانتے ہیں؟

(حاکم عدالت انگریزی میں ترجمہ کرتا ہے۔ سرشتہ دار اردو میں لکھتا ہے۔ ٹائپسٹ انگریزی میں ٹائپ کرتا ہے)

تھانیدار:- جی ہاں! میں اسے جانتا ہوں۔ مورخہ ۱۹ ستمبر بروز سوموار مسمی محمد لطیف نے تھانے میں رپورٹ دی، کہ جب وہ کام سے گھر واپس آیا۔ تو اس کا تالا ٹوٹا ہوا تھا۔ اور کمرے میں سے اس کا ایک عدد ٹرنک معہ پارچات پوشیدنی غائب تھا۔ میں نے موقعہ پر جا کر سب چیزوں کا معائنہ کیا۔ ملزم نے اس روز نئے لٹھے کی شلوار پہنی ہوئی تھی۔ مجھے یہ دیکھ کر شبہ ہوا۔ محمد لطیف نے شلوار کو پہچانا کہ یہ اسی کی ہے۔ میں نے ملزم کو گرفتار کر لیا اور اس سے تمام پارچات معہ ٹرنک کے برآمد کئے۔ (عدالت میں پڑے ہوئے ایک ٹرنک اور چند پارچات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) یہ سب چیزیں وہی ہیں۔ جو میں نے ملزم سے برآمد کیں۔ میں انہیں شناخت کرتا ہوں اور یہ

(وہ ایک تالا پیش کرنے کو نکالتا ہے، تو سرکاری وکیل اسے پیر سے ٹھوکر مارتا ہے)

ہاں! اور بس جناب تب سے ملزم حراست میں ہے۔ آداب عرض!

(دونوں پاؤں جوڑ کر آواز پیدا کرتے ہوئے سلام کرتا ہے۔ اور مسکراتے ہوئے کمرے سے باہر چلا جاتا ہے۔ اتنے میں ایک خوش پوش درمیانہ قد کا بڑھے ہوئے پیٹ والا شہری کمرۂ عدالت میں داخل ہوتا ہے، اور جھٹ پٹ چبوترہ پر چڑھ کر حاکم عدالت کے پاس پہنچ جاتا ہے۔ حاکم عدالت اٹھ کر اسے بڑے تپاک سے ملتا ہے۔ اور اسے اپنے پاس کرسی پر بٹھا لیتا ہے)

——— دونوں باتیں کرتے ہیں ———

کٹہرے میں ملزم کے ساتھ کھڑا سپاہی سرشتہ دار سے

آنکھ کے اشارے سے پوچھتا ہے "کون ہیں یہ صاحب"

تہ دار: (نہایت آہستہ سے) لالہ کرم نرائن رئیس، اب آنریری مجسٹریٹ ہونے ہی والے ہیں۔

(سرکاری وکیل کرسی پر بیٹھ جاتا ہے۔ ملزم اپنے دونوں ہتھکڑی میں مقفل ہاتھوں کو کٹہرے پر رکھ دیتا ہے۔ اور سپاہی ایک ٹانگ اٹھا کر کٹہرے کے درمیانہ حصہ پر رکھ دیتا ہے۔

—— گھڑی بارہ بجاتی ہے ——

تین چار وکیل کالے کالے ماڈرن کٹ کے سلے ہوئے کوٹ پہنے بغل میں ہیٹ دبائے اور دائیں ہاتھ میں چند کاغذات تھامے کٹہرے کے پاس آکھڑے ہوتے ہیں۔ حاکم عدالت کی کرسی کیطرف دیکھکر منہ میں "آداب عرض جناب" گنگناتے ہیں اور پھر واپس چلے جاتے ہیں۔ لیکن ایک وکیل وہیں کھڑا رہتا ہے۔ جب اکیلا رہ جاتا ہے تو سررشتہ دار کے پاس جاکر آہستہ سے اسے کہتا ہے)

:- اس کے بعد میرا کیس رکھدینا دوست! آج ضرور ضمنت ہونی ہے۔ پھر وقت بھی تو نہیں رہے گا۔

تہ دار:- (اونچی آواز سے) جناب مجھے کام کرنے دیجئے، آپ کو ایکبار کہہ دیا کہ سب کام نمبر پر ہونگے۔

:- دیکھو یار بیچارہ غریب آدمی ہے۔

تہ دار:- غریب ہے تو جرم کیوں کیا تھا اس نے؟

:- اچھا خدا را یہ کام تو کردو اور (آنکھیں جھپکتے ہوئے) اس کے لئے تم بالکل فکر نہ کرو۔

دار:- (آہستہ سے) تو پھر دیر کس بات کی ہے۔ جلدی کیجئے نہ، ٹیپنی کرائیے!

(وکیل پتلون کی جیب میں ہاتھ لے جاکر پھر باہر نکالتا ہے۔ سررشتہ دار اپنے بدن کی اوٹ دیکر بایاں ہاتھ کٹہرے کے سوراخ سے باہر نکالتا ہے، وکیل اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ پر رکھ دیتا ہے۔ سررشتہ دار جلدی سے اپنا ہاتھ اندر کھینچتا ہے۔ اور پھر اسے اپنے کوٹ کی جیب میں ڈالتا ہوا ایک لمبی سانس لیتا ہے۔ پھر وکیل سے کہتا ہے)

"اچھا جناب! اس کے بعد آپ آجائیے"

(حاکم عدالت اور رام نرائن ابھی باتوں میں مشغول ہیں)

حاکم عدالت:- (رام نرائن سے) آپ نے ناحق تکلیف کی۔ یہ تو آپ مجھے ٹیلیفون پر ہی کہہ سکتے تھے۔

رام نرائن:- نہیں سرکار! میں نے کہا چلو ایک تو "درشن" ہو جائینگے اور دوسرے بات اچھی طرح سے ہو جائے گی۔

حاکم عدالت:- آپ اس بات کا بالکل فکر نہ کریں، ان سالے بھنگیوں کی کیا مجال ہے، جو اپنی "جھگیاں" آپ کی زمین کے ساتھ بنائیں۔ کمینے حرامزادے جس کا نمک کھاتے ہیں، اسی کے سر پر چڑھتے ہیں، میں کل ہی اس کا انتظام کردوں گا۔

رام نرائن:- مہربانی جناب کی۔ آپ ہی لوگوں کے دم پر تو ہم لوگ زندہ ہیں، ورنہ یہ کمینے ہمیں کہیں کا نہ چھوڑیں۔

حاکم عدالت:- ہم کیا ہیں جی، سرکار برطانیہ کو دعا دیجئے۔ جس کی یہ سب بدولت ہے۔ اور ہاں میں تو بھول ہی گیا تھا، ڈپٹی کمشنر صاحب بہادر آپ پر بہت خوش ہیں۔ آپ ان کانگرسی چھوکروں کی خوب خبر لیتے ہیں بھئی واہ! کیا وفاداری ہے۔ آپ ہی لوگوں کے بل بوتے پر تو سرکار زندہ ہے۔

رام نرائن:- ہم کیا ہیں صاحب! یہ تو سب ایشور اور آپ لوگوں کی مہربانی ہے۔

(اٹھتا ہے۔ کھڑے ہوکر)

"اچھا صاحب! اب اجازت دیجئے۔ ذرا جاکر ان مبشہ کے لونڈوں سے بات کرلیں۔ الیکشن کے وقت کام آئیں گے"

(حاکم عدالت کھڑا ہوکر ہاتھ ملاتا ہے)

آداب عرض!

(آداب عرض)

کرم نرائن اٹھ کر کمرے سے باہر چلا جاتا ہے۔ اور حاکم عدالت ایک انگڑائی لے کر نیند بھری آواز سے سرکاری وکیل سے پوچھتا ہے)

حاکم عدالت:۔ "ابھی کتنے گواہ باقی ہیں اس میں؟"

سرکاری وکیل:۔ صرف ایک جناب!

حاکم عدالت:۔ بلاؤ اسے

(چپڑاسی تیسرا گواہ بلاتا ہے)

—— چلو حکم سنگھ گواہ ——

(ایک لمبا، دوہرے جسم کا آدمی عدالت میں داخل ہوتا ہے۔ اور سرکاری وکیل کے پاس کھڑا ہو جاتا ہے)

سرکاری وکیل:۔ نام؟

گواہ:۔ "حکم سنگھ"

سرکاری وکیل:۔ قوم؟

گواہ:۔ "سکھ"

سرکاری وکیل:۔ عمر؟

گواہ:۔ تیس سال

سرکاری وکیل:۔ سکونت؟

گواہ:۔ "ہاتھی دروازہ لاہور"

سرکاری وکیل:۔ کیا خبر ہے تمہیں؟

گواہ:۔ جناب! میں محمد لطیف کے ساتھ ہی گورنمنٹ پریس میں کام کرتا ہوں، محمد لطیف کو اچھی طرح جانتا ہوں اسے ہر روز دیکھتا ہوں، شام کو ہم اکیلے سیر کو جاتے ہیں۔

سرکاری وکیل:۔ ہمیں اس قدر تفصیل کی ضرورت نہیں (کپڑوں کی طرف دیکھ کر) یہ کپڑے پہچانتے ہو کیا۔ محمد لطیف کے ہیں یا نہیں؟

گواہ:۔ ہاں جناب اسی کے ہیں۔ میں نے بیسوں مرتبہ اسے یہ کپڑے پہنتے دیکھا ہے۔ میں انہیں اچھی طرح پہچانتا ہوں (کپڑوں کو ہاتھ میں لے کر) یہ ہیں ہی اسی کے، اور کسی کے کیسے ہو سکتے ہیں؟

سرکاری وکیل:۔ بس بس!! زیادہ ضرورت نہیں۔ چلو دستخط کرو۔

(گواہ دستخط کر کے عدالت کے ایک کونے میں علیحدہ کھڑا ہو جاتا ہے۔)

حاکم عدالت:۔ (ملزم سے) تمہارا نام کیا ہے؟

ملزم:۔ (چونک کر) میرا حضور! حاکو۔ مائی باپ!

حاکم عدالت:۔ قوم؟

ملزم:۔ مسلمان۔

حاکم عدالت:۔ پیشہ؟

ملزم:۔ مزدوری جناب! سینما کے اشتہار کی ریڑھی چلاتا ہوں!

حاکم عدالت:۔ عمر؟

ملزم:۔ جناب! معلوم نہیں بچپن ہی میں ماں باپ مر گئے تھے۔ تب سے مزدوری کر کے پیٹ پالتا ہوں، نہ جانے کتنے سال بیت گئے۔

حاکم عدالت:۔ (سرکاری وکیل سے) کوئی ہو گی بیس پچیس برس

سرکاری وکیل:۔ ہاں اتنی ہی ہو گی جناب! پچیس برس لکھ لیجئے۔

حاکم عدالت:۔ (ملزم سے) کیا تم۔۔ سوموار مورخہ ۲۲ ستمبر ۱۹۳۸ء کو بوقت پانچ بجے شام محمد لطیف کے مکان واقع ہاتھی گیٹ لاہور میں تالا توڑ کر باقدام چوری داخل ہوئے اور ایک عدد ٹرنک آہنی جس میں ایک شلوار لٹھا، دو قمیص بوسکی اور ایک رومال و دیگر پارچات پوشیدنی موجود تھے چوری کر کے لائے۔

ملزم:۔ (نہایت حیرانی سے) چوری! میں نہیں سمجھا مائی باپ!

حاکم عدالت:۔ (نہایت غصہ سے) چوری کر کے تو خاک سمجھے گا حرامخور!

ملزم:۔ میں نے چوری نہیں کی حضور۔ میں بے گناہ ہوں۔ میں نے چوری نہیں . . . .

(حیرت سے ادھر اُدھر تکتا ہے)

سرکاری وکیل:۔ چپ رہ گستاخ ابھی بتاتے ہیں تجھے تو نے

چوری کی ہے یا نہیں۔ تین سال کے لئے چکی پیسے گا تو پتہ چلے گا۔

ملزم :- میں بے گناہ ہوں، سرکار! میں . . . . . .

سرکاری وکیل :- بکو مت اُلّو کا پٹھا کہیں کا۔ بول کیا یہ ٹرنک اور کپڑے تو نے چرائے تھے۔ جلدی بول عدالت کا وقت ضائع ہو رہا ہے۔

ملزم :- (بالکل سہم جاتا ہے) میں . . . . . ٹرنک . . . .
. . . . چوری . . . . . . میں . . . . . غریب . . . .
. . . . میں . . . . . . سرکار! . . .
رحم کریں . . . میں . . . . بے گناہ ۔

سرکاری وکیل :- رحم کریں، رحم! (سررشتہ دار سے) لکھئے صاحب میں نے چوری کی تھی۔ ملزم اقبالی ہے (پھر ملزم سے) اور یہ ٹرنک تیرے ہی گھر سے نکلا تھا نا (پھر حاکم عدالت سے) ہاں جناب یہ بھی آ جائے۔ ملزم صاف اقبالی ہے۔

سررشتہ دار :- (دائیں جانب ذرا ملزم کی طرف مڑ کر کاغذوں کو ہاتھ میں اٹھاتے ہوئے، ملزم سے) "انگوٹھا لگاؤ اس جگہ"

(ملزم کے ساتھ کھڑا سپاہی ملزم کے ہتھکڑی میں مقفل ہاتھوں کو اوپر اٹھاتا ہے۔ اور ملزم کے بائیں ہاتھ کا انگوٹھا پکڑے ہوئے سپاہی کے پیڈ سے رگڑ کر سررشتہ دار کے ہاتھ میں پکڑے ہوئے کاغذ پر لگا دیتا ہے۔ ملزم کے چہرے کے اعضا کھنچ جاتے ہیں، اور وہ درد سے تلملا اٹھتا ہے۔)

حاکم عدالت :- (ٹائپسٹ سے) ملزم اقبالی ہے۔ کہ اس نے چوری کی ہے۔ ان حالات میں میں اسے صرف چھ ماہ قید سخت کی سزا دیتا ہوں۔

(ٹائپسٹ ٹائپ کرتا ہے)

حاکم عدالت :- (پھر سپاہیوں سے ملزم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) لے جاؤ اسے۔

جناب کیفی جام پوری :-

غزل

گرچہ ناکامگار ہیں ہم لوگ — عاشقی کا وقار ہیں ہم لوگ
یہ نہ سمجھو کہ خار ہیں ہم لوگ — زادگانِ بہار ہیں ہم لوگ
کوئی اُلجھے تو سوچ کر اُلجھے! — مست و بادہ گسار ہیں ہم لوگ
شاہبازِ حریمِ فطرت ہیں — یعنی گردوں شکار ہیں ہم لوگ
مہرِ خوبی سے ہم کو نسبت ہے! — ذرۂ تابدار ہیں ہم لوگ
آپ کیوں بدگمان ہیں ہم سے — آپ کے جاں نثار ہیں ہم لوگ
جبر دل پر بھی کر نہیں سکتے — کتنے بے اختیار ہیں ہم لوگ
ہم سے ذکرِ بہار کیا معنی — سوگوارِ بہار ہیں ہم لوگ

جیئے جاتے ہیں ورنہ اے کیفی!
کشتۂ روزگار ہیں ہم لوگ

جناب اعجاز صدیقی اکبرآبادی مدیر شاعر آگرہ

شگفتِ فکر و نظر

پہلے تو دیدیا غمِ ہر دو جہاں مجھے
اب ہنس رہے ہیں دیکھ کے وہ سرگراں مجھے

ہر ذرّے پر ہے جلوہ گری کا گماں مجھے
لے آئی میری دوُر نگاہی کہاں مجھے!

پھول آئے راس اور نہ پھلا آشیاں مجھے
اے کاش بجلیوں ہی میں ملتی اماں مجھے

رکھتا ہے ذوقِ سجدہ بہت سرگراں مجھے
اب تک کہیں ملا نہ ترا آستاں مجھے

دامانِ حسن میں بھی نہیں ہے اماں مجھے
کھو دیں گی دو جہاں سے یہ بیتابیاں مجھے

قطعہ

اے چاندنی نہ دے تو مجھے دعوتِ نظر
اے "تاج" تو دکھا نہ درخشانیاں مجھے

اِک روز میرا چاند بھی تھا بام پر جسمیں
ملتی تھیں جس کے حُسن سے تابانیاں مجھے

وہ میرے ساتھ بیٹھ کے گانا لبِ چمن
دینا وہ رنگ و چنگ سے تسکینِ جاں مجھے

وہ سبزۂ خموش پہ اُس کا خرامِ ناز
لینا وہ دیکھ دیکھ کے انگڑائیاں مجھے

وہ مسکرا کے نرگسی آنکھوں سے دیکھنا
نسرین و نسترن کا دکھانا سماں مجھے

وہ دِل کا اضطراب وہ شوقِ نیاز و ناز
دینا وہ جانکر خلشِ ناگہاں مجھے

وہ فرشِ گل پہ اس کا بیک آہ بیٹھنا!
کہنا مرا کہ درد کا کچھ دو نشاں مجھے

وہ اُس کا دل کی سمت اشارا بصد حجاب
وہ حسرتِ نظارۂ دردِ نہاں مجھے

وہ اُس کی مثلِ آہوئے صحرا پھر ایک جست
اس حال میں نہ جس کا کبھی تھا گماں مجھے

پھر تھا وہ میری زینتِ آغوش ناگہاں
اور گھورتا تھا چاند اے کہکشاں مجھے

نالوں کی لے بڑھا کے کروں کیا میں ہمنشیں!
معلوم ہے ابھی سے مآلِ فغاں مجھے

روزِ ازل سے میں تو ہوں رُسوا کُنِ جمال
دنیا سمجھ رہی ہے ترا رازداں مجھے

رفتارِ واقعات پہ منزل نظر رکھے
رستے میں چھوڑ جائے نہ عمرِ رواں مجھے

انساں نواز! اِس تری تقسیم پر نثار!!
رنگینیاں بہار کو دیں بجلیاں مجھے

دونوں سے کھیلتا ہوں جب آتا ہوں باغ میں
بازیچۂ نظر ہیں بہار و خزاں مجھے

اعجاز کیوں وفاؤں پہ میری یقیں نہیں
سو بار آزما تو چکا آسماں مجھے

فصاحت جنگ حضرت جلیلؔ

غزل

روز افزوں تپشِ دل ہے خدا خیر کرے
نبض میری رگِ بسمل ہے خدا خیر کرے

دورمے دیکھئے کیا رنگ ہے لانے والا
شمع گریاں سرِ محفل ہے خدا خیر کرے

تاکتے ہیں نگہِ ناز سے جس پہلو کو
اُسی پہلو میں مرا دل ہے خدا خیر کرے

عشق میں زیست کی گھڑیاں کہیں کٹ جائیں
ہر نفس خنجرِ قاتل ہے خدا خیر کرے

بیخودی روکتی ہے آپ میں آؤں کیونکر
سخت دشوار یہ منزل ہے خدا خیر کرے

اپنے وعدے سے پشیمان نہ ہوا ہو کوئی
کچھ دھڑکتا سا مرا دل ہے خدا خیر کرے

اُسکی نیرنگیٔ فطرت سے بہت ڈرتا ہوں
کبھی عیسیٰ کبھی قاتل ہے خدا خیر کرے

نیند سے آنکھ نہ کھل جائے کہیں غنچوں کی
ہر طرف شورِ عنادل ہے خدا خیر کرے

حشر اٹھانے کو وہ بیٹھے ہیں جو بن ٹھن کے جلیلؔ
شور برپا سرِ محفل ہے خدا خیر کرے

محترمہ مسز عبد القادر

داغِ معصیت

(۱)

اکتوبر کے آخری دن تھے۔ کائنات رنگ و بو پر بے رحم خزاں کا قبضہ ہو چکا تھا، سبزہ پائمال، درخت خاک آلود اور ہوائیں اندوہگیں ہوتی جا رہی تھیں۔ شری یت امرت بابو جس نے قومی مفاد کیلئے اپنی زندگی ہندو گرلز کالج کی پروفیسری کے لئے وقف کر دی تھی موسم کے تاثرات سے کھویا کھویا کالج کے احاطہ میں داخل ہوا۔

ابھی بہت سویرا تھا سوائے خاکروب کے جھاڑو کی آواز کے ہر طرف خاموشی تھی رات کو چاند نے گرہن کیا تھا اسلئے خاکروب کو دیکھ کر امرت بابو نے بد دلی سے چاندی کا سکہ اُسکی طرف پھینکا اور برآمدے کی طرف چل دیا۔ برآمدے میں پہنچ کر جیسے ہی امرت بابو نے زینے پر قدم رکھا اُسکی نگاہ ایک حسین دوشیزہ پر پڑی جو زینے سے ٹیک لگا کر کھڑی تھی۔ خوف و ہراس سے اس کا رنگ اڑ گیا وہ دھڑکتے ہوئے دل سے آگے بڑھا "تم کون ہو" اس نے اپنے دلی خوف کو دباتے ہوئے کہا۔ دوشیزہ ایک مرمری مجسمے کی طرح ساکت و صامت کھڑی تھی ——— اس کے خوشنما یاقوتی لبوں میں ہلکا سا ارتعاش پیدا ہوا۔ اور اس نے آہستہ سے اپنا نام بتا دیا۔

نہ جانے اس کے نام میں کیا بھرا تھا کہ امرت بابو کو پسینہ آگیا مگر فوراً ہی اپنی حالت پر قابو پا کر وہ خونخوار نگاہوں سے لڑکی کو دیکھنے لگا۔ گویا وہ کوئی مجرم تھی ——— وہ لڑکی بھی بلا کی نڈر تھی بجائے ڈرنے کے اسکی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر برابر اس کو گھورتی رہی۔ کئی منٹ تک دونوں کی یہی حالت رہی گویا وہ ایک دوسرے کو پہچان رہے تھے ——— آخر بحرِ حسن میں ایک ہلکی سی موج اٹھی لڑکی کے صدف گوں لبوں سے دُرِ یتیم کی لڑیاں جھلکنے لگیں۔ وہ مسکرا رہی تھی یہ مسکراہٹ امرت بابو کی جھلاہٹ کے لئے کافی تھی اور وہ بے اختیار "جودھا، جودھا" بڑبڑاتا ہوا جدھر سے آیا تھا واپس چلا گیا۔ لڑکی کی حسین آنکھیں دور تک اس کا تعاقب کرتی رہیں۔

امرت بابو نے کالج سے دو دن کی رخصت لے لی وہ وہاں جانا نہ چاہتا تھا تیسرے دن مجبوراً وہ کالج کو روانہ ہوا۔ اتفاقاً وہ لڑکی راستے میں ہی کھڑی تھی۔ وہ اس کو دیکھ کر مسکرائی۔ امرت بابو لرز گیا مگر بظاہر لاپروائی سے پھرتی سے گھماتا دفتر کی طرف چلا گیا۔

چونکہ امرت بابو اعزازی کام کرتا تھا اس لئے کالج میں اس کی بہت عزت تھی۔ جب وہ دفتر میں داخل ہوا۔ تو مسٹر کیلاش جو کالج کا نوجوان اور قابل پرنسپل تھا تعظیماً کھڑا ہو گیا مگر امرت بابو بغیر کسی التفات کے کرسی پر بیٹھ گیا اسکے چہرے پر گھبراہٹ کے آثار تھے ———

کیلاش بے چینی سے اسکی گفتگو کا منتظر تھا۔ آخر بڑی دیر کے بعد امرت بابو نے مہر سکوت توڑا۔ "مسٹر کیلاش کوئی نئی لڑکی بھی کالج میں داخل ہوئی ہے۔" اس نے دریافت کیا "ایک نہیں بلکہ چار" کیلاش نے جواب دیا۔ "ان میں کوئی جودھا بھی ہے" اس نے پوچھا "جودھا میرے خیال میں تو اس نام کی کوئی لڑکی داخل نہیں ہوئی" کیلاش نے کچھ سوچتے ہوئے جواب دیا۔ اور پھر رجسٹر کو دیکھکر کہا "جودھا تو نہیں یشودھا ہو گی آپ کو دھوکا ہوا" "اجی نہیں اس کا نام جودھا ہے" امرت بابو نے کہا "میں نے ابھی اُسے برآمدے میں دیکھا ہے" "اس کے متعلق آپ کچھ کہنا چاہتے ہیں کیا" کیلاش نے دریافت کیا۔ "ہاں" امرت بابو نے کہا "وہ نہایت گستاخ لڑکی ہے مجھ پر آتے جاتے آوازے کستی ہے ایسی لڑکیوں کے لئے ہمارے کالج میں جگہ نہ ہونی چاہیئے" جودھا نام کی کوئی لڑکی کالج میں نہ تھی۔ کیلاش نے ناچار اسی یشودھا کو بلا بھیجا۔

حکم حاکم مرگ مفاجات یشودھا حاضر ہوئی۔ امرت بابو نے

اُسے فوراً پہچان لیا "یہی جودھا ہے" امرت بابو نے نفرت انگیز نگاہوں سے اُسے دیکھ کر کہا۔ لڑکی نے جو امرت بابو کی برہمی سے بے خبر تھی تنگ آ کر نہایت بھولے پن سے جواب دیا "جودھا نہیں بلکہ جودھا کی روح"۔ روح کے لفظ پر امرت بابو اچھل پڑا "خاموش لڑکی" ایک کرخت آواز سے اس نے کہا اور کچلے ہوئے سانپ کی طرح غضبناک نگاہوں سے لڑکی کو دیکھا ——

لڑکی سہم کر پیچھے ہٹی۔ کیلاش نے جو لڑکی کے سحر آفریں حسن کو حیرت سے دیکھ رہا تھا چونک کر کہا "دیوی تعلیم یافتہ لڑکیاں ایسی فضول باتیں نہیں کرتیں" "میں نے تو کچھ نہیں کہا" لڑکی نے روندھے ہوئے گلے سے جواب دیا "تمہاری سراسر غلطی ہے" کیلاش نے کہا "ابھی بابو جی نے تمہارا نام پوچھا تم نے اُلٹا پلٹا جواب دیا" "بابو جی نے میرا نام نہیں پوچھا بلکہ جودھا کہہ کر خطاب کیا ہے حالانکہ میرا نام یشودھا ہے" لڑکی نے دل کڑا کر کے کہا "جودھا ہو یا یشودھا اسمیں بگڑنے کی کونسی بات ہے اتنی زود رنجی اور تنگ مزاجی اچھی نہیں ہوتی وہ تمہارے استاد ہیں۔ استاد اور پتا کا درجہ ایک ہوتا ہے" کیلاش نے ناصحانہ انداز سے کہا۔ پتا کا لفظ سنتے ہی یشودھا کا چہرہ اتر گیا۔ اس نے دبی زبان سے دو تین بار پتا کا لفظ دہرایا پھر امرت بابو کے پاؤں پر گر پڑی۔ حسن و معصومیت کے اس بہترین دلکش اور قدرتی نظارے نے کیلاش کے جذبات میں ہلچل ڈال دی۔ وہ ایک ذمہ دار شخص تھا لیکن یشودھا نے اپنے معصومانہ طرزِ عمل سے اس کی آرزوؤں کو بیدار کر دیا۔ یشودھا کی ایک ایک ادا اس کے قلب کی گہرائیوں میں اتر گئی۔

(۲)

امرت بابو حساب کا پروفیسر تھا۔ اس کی کلاس کی لڑکیاں بے انتہا شریر تھیں جنہوں نے اپنی شرارتوں سے اس کا ناک میں دم کر رکھا تھا امرت بابو اکثر ان کی شرارتوں کو نظر انداز کر دیتا لیکن یشودھا سے جو نہایت ادب سے کلاس میں بیٹھتی اور صحیح معنوں میں اس کی عزت کرتی امرت بابو برابر سختی کا برتاؤ کرتا رہا۔ ایک دن امرت بابو لیکچر دے رہا تھا کہ یکایک ایک لڑکی بے اختیار ہنس پڑی اسکی دیکھا دیکھی دوسری لڑکیاں بھی ہنسنے لگیں مگر یشودھا بالکل خاموش رہی۔ کلاس میں یوں ہنسنا پروفیسر کی کھلی توہین تھی۔ وہ لڑکیوں پر برس پڑا۔

دوسرے دن امرت بابو یشودھا سے کہنے لگا "میں تم سے بہت خوش ہوں اب تم کسی حد تک سدھر گئی ہو ورنہ کل لڑکیوں میں اگر تم بھی شامل ہوتیں تو شاید ——" بابو جی کو مہربان پا کر یشودھا کے چہرے پر رونق آگئی "شاید آپ کیا کرتے بابو جی فقرہ تو پورا کیا ہوتا" یشودھا نے الھڑپن سے کہا۔ امرت بابو نے ہنس کر جواب دیا "شاید میں تمہارا خون کر دیتا" یکدم تمام لڑکیوں کا رنگ فق ہو گیا "انسانی خون" انہوں نے کانپتے ہوئے کہا یشودھا نے افسردگی سے سر جھکا لیا۔ امرت بابو نے لڑکیوں کو مزید خوف دلانے کیلئے کہا "ہاں انسانی خون" —— یشودھا کو یہ بات بہت ناگوار گزری "انسانی خون بہانا آپ سے کیا بعید ہے آپ آگے بھی اس کی مشق کر چکے ہونگے" اس نے رنج سے کہا۔ یشودھا کے جواب سے اسکے دل پر برچھی سی لگی۔ غیظ و غضب سے اسکی پیشانی کی رگیں اُبھر آئیں تاہم وہ غصہ کو پی گیا اب وہ اس کے خون کا سچ مچ پیاسا ہو گیا ہر وقت وہ چاہتا تھا کہ کسی طرح یشودھا کو ذلیل کر کے کالج سے نکال دیا جائے۔۔۔۔

بیساکھ کی ایک رومان پرور رات تھی چاندنی صحن چمن کی بلائیں لے رہی تھی۔ دھرتی ماتا اپنے پرانے پر پرزے جھاڑ کر نئی نویلی دکھائی دیتی تھی ہر پھول پتی پر جوانی کا عالم تھا۔ امرت بابو اپنے باغ میں شہتوت کے درخت کے نیچے بنچ پر بیٹھا کسی شخص سے آہستہ آہستہ باتیں کر رہا تھا اُسکی گھبرائی ہوئی آواز سے اندازہ ہوتا تھا کہ کوئی بڑی راز کی بات ہے —— کچھ دیر کے بعد جب اس کا ساتھی باہر نکلا تو سنگترے کی باڑ کے پیچھے کسی کو چھپا ہوا دیکھ کر اس نے امرت بابو کو گھبرا کر آواز دی۔ آواز پر امرت بابو دوڑا دوڑا باہر آیا —— چمکتی ہوئی چاندنی میں اس نے ایک نازک اندام لڑکی کو دیکھا جو سڑک کو عبور کر کے سامنے والی کوٹھی کے پھاٹک تک پہنچ چکی تھی۔ امرت بابو کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ سامنے والی کوٹھی دراصل ہندو گرلز کالج کا ہوسٹل تھا" یہ یقیناً یشودھا تھی۔ امرت بابو نے پیشانی سے پسینہ پونچھتے ہوئے کہا اور پیچ و تاب کھاتا ہوا واپس آگیا۔ "آہ میرا راز اب ایک ایسی لڑکی کے ہاتھ میں ہے جو میری سخت ترین دشمن ہے" اس نے دل ہی دل میں کہا۔ وہ سخت ہراساں تھا آہ موت ایک خوفناک چیز تھی ورنہ وہ موت کو رسوائی پر ترجیح دیتا۔ یکایک ایک خطرناک خیال اُسکے ذہن میں آیا یشودھا کے سوا سب

لڑکیاں موسم بہار کی چھٹیوں پر جا چکی تھیں۔ ہوسٹل میں اس کے سوا صرف ایک آیا موجود تھی اس نے ایک رومال پر کلورافارم انڈیلا (جو ایک دن پہلے وہ دانت کے درد کے لئے لایا تھا) اور اسے اپنے چرمی بٹوے میں ڈال کر ہوسٹل کی دیوار پھاند کر اندر جا داخل ہوا۔

بارہ بجے کا عمل تھا ہوسٹل پر سکوت طاری تھا۔ یشودھا کے کمرے میں روشنی نظر آ رہی تھی ——— ہوسٹل کے پچھواڑے باورچی خانہ تھا جس کے گودام کی کوٹھڑی ان کمروں سے ملحق تھی۔ امرت بابو نے کمزور تالے کو ایک جھٹکے سے توڑ دیا۔ اور گودام کے ذریعے کئی کمروں سے گزرتا ہوا یشودھا کی خوابگاہ میں ایک بھاری پردے کے پیچھے چھپ گیا۔

چونکہ سب کمرے خالی تھے۔ اس لئے یشودھا دوسرے کمرے میں آیا کے پاس بیٹھی کچھ سی رہی تھی کیونکہ صبح اس کو اپنے گھر جانا تھا کچھ دیر بعد آیا سو گئی اور یشودھا اپنی خوابگاہ میں جا پہنچی۔

یشودھا اس وقت سچ مچ حسن کی دیوی معلوم ہو رہی تھی۔ اسکے ہاتھ میں پھولوں کے دو خوبصورت ہار تھے اس نے اندر سے دروازے کی چٹخنی لگائی اور سامنے کی دیوار سے لگے ہوئے میز کی طرف بڑھی اب وہ امرت بابو کے بالکل قریب تھی اس نے میز پر رکھی ہوئی آئینہ نما تصویر سے کپڑا اٹھایا اور ہار اسکے فریم پر ڈال کر پوجا کے طریقے پر سرنگوں ہو گئی ——— فرط حیرت سے امرت بابو کی آنکھیں پتھرا کر رہ گئیں اس کے اعضا ڈھیلے پڑ گئے میز پر رکھی ہوئی تصویر خود امرت بابو کی تصویر تھی۔ پوجا کے بعد اس نے تصویر کو مخاطب کر کے کہا "مہاراج آج تک کسی کے دل میں آپ کی اتنی محبت نہ ہو گی جتنی دکھیا یشودھا کے دل میں موجود ہے۔" پھر وہ دیر تک تصویر کو دیکھ کر روتی رہی بعد ازاں تصویر کو بدستور کپڑے سے ڈھانپ دیا اور اپنے بستر پر چلی گئی ——— امرت بابو نے اپنا خوفناک ارادہ ترک کر دیا اور جس طرح وہاں پہنچا تھا اسی طرح چپ چاپ واپس چلا آیا۔

اس کا دماغ نئے نئے خیالات کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ وہ خوبصورت تھا وجیہہ تھا تاہم اسکی عمر چالیس کے قریب تھی اس عمر میں وہ روپیہ کے زور سے کسی عورت کو اپنا بنا سکتا تھا لیکن کوئی لڑکی اس پر عاشق نہ ہو سکتی تھی پھر یشودھا جیسی نوخیز لڑکی ——— وہ تمام رات اسی ادھیڑبن میں رہا اسے اب بھی اس سے نفرت تھی تاہم اسکی کدورت کسی حد تک دھل گئی اس نے فیصلہ کر لیا کہ آئندہ وہ یشودھا سے نرمی کا برتاؤ کرے گا۔

(۳)

سردی کے دن تھے رات کو چاند گرہن تھا۔ اہل ہنود نے گرہن کا وقت نہروں تالابوں یا دریاؤں کے کناروں پر کاٹا۔ لوگوں کا خیال تھا کہ اس سال کا چاند گرہن نسبتاً زیادہ دیر رہا۔ دوسرے دن گو کالج میں چھٹی تھی مگر لڑکیوں کو ہوسٹل میں کسی سے معلوم ہوا کہ امرت بابو علیل ہیں۔ وہ پرنسپل کے ساتھ اس کی عیادت کو گئیں۔

امرت بابو بظاہر بیمار نہ تھا مگر کسی اندرونی تکلیف نے اسے نڈھال کر رکھا تھا۔ لڑکیوں نے خیریت پوچھی تو امرت بابو نے بتایا کہ ہمیشہ چاند گرہن کے موقع پر اس کی طبیعت خراب ہو جایا کرتی ہے۔ یشودھا نے آہ بھر کر کہا "ہاں جب دیوتاؤں کو پاپ کی سزا مل سکتی ہے تو پھر انسان کی کیا حقیقت ہے اسے کیوں نہ اپنے پاپ یاد آئیں۔ اور خاصکر اس وقت جبکہ وہ ———" اس نے فقرہ نامکمل چھوڑ دیا۔ امرت بابو نے کرب اور بے چینی سے آنکھیں بند کر لیں اور تھکی ہوئی آواز میں اس کا فقرہ یوں پورا کر لیا "جب کہ وہ بوڑھا ہو چکا ہو اور موت کے قریب پہنچ رہا ہو" ——— لڑکیاں سہم کر چپ ہو گئیں۔ کمرے میں سناٹا چھا گیا کیلاش نے دیکھا تو وہ سو رہا تھا اس لئے جلد ہی لڑکیوں کو واپس لے آیا۔

اس واقعہ کو بہت دن گزر چکے تھے خزاں کا بدشگون موسم تھا۔ ہوا موت کے پروں پر اڑ رہی تھی۔ رات بھر طوفان برپا رہا امرت بابو کلاس میں لیکچر دے رہا تھا کہ یکایک آسمان پر پھر سرخ آندھی اٹھی یشودھا نے جو کھڑکی کے قریب بیٹھی تھی دوسری لڑکی کو کچھ اشارہ کیا۔ امرت بابو جو اس وقت اتفاقاً یشودھا کی طرف دیکھ رہا تھا۔ خفا ہو کر بولا "یشودھا کام کی طرف دھیان کرو باتیں پھر کرنا" "میں نے تو صرف آندھی دکھائی ہے بابو جی" یشودھا نے جواب دیا "کیسی آندھی" امرت بابو نے جھلا کر کہا "سرخ آندھی" یشودھا نے دوبارہ کہا ——— ایک لڑکی بولی "کیا تم آندھی سے ڈرتی ہو" یشودھا

نے لرز کر کہا "ہاں لوگ کہتے ہیں جب مظلوم روحیں اپنے انتقام کیلئے بیقرار ہو کر ہوا میں منڈلاتی ہیں تو ان کے خون کی سُرخی سے ہوا سُرخ آندھی کی صورت اختیار کر لیتی ہے" لڑکی کے کہا "کیا تم نے بھی کوئی قتل کیا ہے جو ڈرتی ہو یا کوئی اور قاتل یہاں بیٹھا ہے جسکے پاپوں کی نحوست کا تمہیں ڈر ہے" یشودھا نے غصّے سے جواب دیا۔ "میں نے تو کسی کو قتل نہیں کیا اور نہ کسی دوسرے کے متعلق کچھ جانتی ہوں یہ تو ایک پاپی کا دل ہی جان سکتا ہے" ——— لڑکیاں اس کی بیوقوفی پر ہنسنے لگیں۔

بات گئی گزری ہو گئی مگر اس دن سے امرت بابو کی طبیعت زیادہ خراب ہوتی گئی۔ اکثر اس کی نگاہوں سے خوف وہراس کا سُراغ چلتا تھا اب وہ اپنی عمر سے دس سال زیادہ بوڑھا دکھائی دینے لگا۔ اس کے بائیں ہاتھ میں گنٹھیے کا درد تھا اسلئے وہ اسے گلے میں بندھے ہوئے ایک رومال میں لٹکائے رکھتا۔

وقت گزرتا گیا کالج کا سالانہ جلسہ تھا پارٹی کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ ہر ایک لڑکی کو مختلف کام سپرد کیا گیا۔ امرت بابو منتظم کی حیثیت سے لڑکیوں کے کام دیکھتے ہوئے ہال کی طرف آئے۔ یشودھا میز کو پھولوں سے سجا رہی تھی۔ امرت بابو کو دیکھکر اس کے چہرے پر مسرت کی سُرخی دوڑ گئی اور وہ اپنی گلابی انگلیوں سے جلدی جلدی کام لینے لگی ——— "تم پھول گوندھنے میں ماہر ہو یشودھا" امرت بابو نے خوش ہو کر کہا یکایک وہ کسی چیز سے خوف زدہ ہو کر پیچھے ہٹا "کیوں بابو جی خیر تو ہے" یشودھا نے حیرت سے پوچھا۔ "تمہارے ہاتھ پر یہ داغ کیسا ہے" اس نے اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے پوچھا "چاند گرہن کا بابو جی" یشودھا نے کہا ——— یشودھا کے بائیں ہاتھ پر پیسے کے برابر گول داغ تھا جو آدھا سُرخ تھا اور آدھا سیاہ ——— "چاند گرہن کا داغ" امرت بابو نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا "ہاں چاند گرہن کا" یشودھا نے پھر جواب دیا۔ "کیا تمہارے اس داغ میں جلن بھی ہوتی ہے۔ میں نے سنا ہے کہ ایسے منحوس داغ چاند گرہن کے موقع پر جلا کرتے ہیں" اس نے داغ کو بغور دیکھتے ہوئے کہا "نہیں بابو جی" یشودھا نے کہا "جلن تو پاپیوں کے داغوں میں ہوتی ہے اور وہ جلن کوئی چاند گرہن پر ہی موقوف نہیں اس کے علاوہ بھی ہو سکتی ہے" امرت بابو نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا اُس کے منہ سے کراہنے کی آواز نکلی اور سر پکڑ کر کُرسی پر بیٹھ گیا۔ اس کے چہرے پر بھیانک شکنیں پڑ گئیں وہ بیمار معلوم ہوتا تھا۔

اُس دن سے امرت بابو کو پھر کسی نے خوش نہ دیکھا۔ یشودھا کو دیکھ کر اس کی افسردگی میں اضافہ ہوتا جاتا وہ اس کی نظروں سے بچنے کی کوشش کرتا۔

(۴)

پھاگن کی ایک اُداس دوپہر تھی۔ امرت بابو تفکرات میں گھرا ہوا چپ چاپ اِملی کے پیڑ کے نیچے بنچ پر بیٹھا تھا۔ یشودھا جو ٹینس کھیل کر ہانپتی ہوئی آ رہی تھی اتفاقاً اس طرف آ نکلی۔ اور امرت بابو کو سراسیمہ پاکر اسکے قریب ہی گھاس پر بیٹھ گئی "بابو جی کیا آپ کچھ بیمار ہیں" اس نے پوچھا۔ امرت بابو نے غم آلودہ نگاہوں سے یشودھا کی طرف دیکھا۔ "یشودھا میں تمہیں کچھ کہنا چاہتا ہوں بُرا تو نہ مانو گی" اس نے جھجکتے ہوئے کہا "آپ بلا تامل فرمایئے بابو جی میں بُرا کیوں ماننے لگی" یشودھا نے نرمی سے جواب دیا "یشودھا تم جانتی ہو میری یہ حالت کیونکر ہوئی" اس نے کہا "نہیں بابو جی" اس نے جواب دیا۔ امرت بابو نے آہ سرد بھر کر کہا "یشودھا میں تمہاری باتوں کی وجہ سے بیمار ہوا ہوں" "بابو جی اب کبھی ایسی باتیں نہ کرونگی" یشودھا نے پشیمان ہو کر کہا "یشودھا میں تمہیں ملامت نہیں کرتا لیکن ایک التجا کرنا چاہتا ہوں" امرت بابو نے کہا "حکم کیجئے" یشودھا نے ادب سے جواب دیا "یہ کہ تم میرے سامنے نہ آیا کرو تمہاری شکل و صورت مجھے خوف زدہ کر دیتی ہے" امرت بابو نے کہا "یہ کیسے ہو سکتا ہے بابو جی مجھے کلاس میں تو مجبوراً آنا ہی پڑے گا" اس نے سوکھی زبان سے کہا "آہ لیکن یہ بات مجھے موت کے قریب لے جائے گی" اس نے کمزور آواز میں کہا "پھر یہ گتھی کیونکر سلجھے گی بابو جی" یشودھا نے پوچھا "تم میرا مضمون خود تیار کر لیا کرو" امرت بابو نے جواب دیا۔

وہ سوچ میں پڑ گئی پھر اُسے حسرت بھری نظروں سے دیکھکر کہنے لگی "بہت بہتر ایسا ہی ہوگا" اور اُسے پرنام کرکے چلی گئی۔

اُس دن سے اس نے حساب کا مضمون اپنی ہم جماعتوں کی مدد سے تیار کرنا شروع کیا ——— یہ سب کچھ ہوا لیکن امرت بابو کو سکھ نہ ملا اس کے بائیں ہاتھ پر ناسور ہو گیا وہ باوجود کئی اپریشنوں کے اچھا نہ ہو سکا۔

ایک دن صبح کا وقت تھا کالج کی پڑھائی شروع ہونے میں ابھی پندرہ بیس منٹ باقی تھے۔ امرت بابو کالج کی طرف آ رہا تھا جونہی اس نے کالج میں قدم رکھا ایک اچھوت عورت جس کے چہرے سے شرارت اور بدچلنی ٹپکتی تھی ایک نوزائیدہ بچے کو لے کر آگے بڑھی اور امرت بابو کو گالیاں دیتی ہوئی گھسیٹنے لگی۔ شور و غل سن کر تمام لڑکیاں، پروفیسر اور ملازمین وغیرہ جمع ہو گئے۔ ایک اچھا خاصہ مجمع لگ گیا ———

عورت چیخ چیخ کر کہنے لگی "تم نے شادی کے وعدہ پر میری زندگی برباد کی اب مجھے گھر والوں نے نکال دیا ہے میں تمہارے حرامی بچے کو لیکر کہاں جاؤں اب مجھ سے باقاعدہ شادی کر دیا اس بچے کو کہیں ٹھکانے لگاؤ" امرت بابو کا منہ فق ہو گیا "دور ہو چڑیل ہاتھ مت لگا میں نے تو آج سے پیشتر تمہاری شکل تک نہیں دیکھی" اس نے حوصلہ کر کے کہا "ہاں بعد میں بدمعاش ایسا ہی کہا کرتے ہیں" عورت نے گرج کر کہا "کیا تم ان خطوں سے بھی انکار کرتے ہو" ——— یہ کہتے ہوئے اس نے درجن بھر خطوط مجمع کے سامنے بکھیر دیئے۔ امرت بابو پر گویا بجلی گر پڑی۔ اس کا سر چکرانے لگا وہ دیوار کا سہارا لے کر مجمع کو دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں حلقوں سے باہر ابلی پڑتی تھیں۔ اور چہرہ لٹک کر ڈراؤنا ہو چکا تھا۔ مجمع دانتوں میں انگلیاں دبائے کھڑا تھا۔ یشودھا قریب شدت غم سے سر جھکائے کھڑی تھی۔ یکایک اس نے کڑک کر کہا "بس ملیا بس اب تم حد سے بڑھ رہی ہو میں نے تو تمہیں صرف اتنا کہا تھا کہ انہیں ملنے جلنے والوں میں بدنام کرو نہ کہ بھرے مجمع میں اتنی بے عزتی کر کے ان کو جان سے مارنے کی کوشش کرو" ——— عورت ٹھٹھک کر یشودھا کو دیکھنے لگی لوگ حیران تھے کہ کیا معاملہ ہے۔ امرت بابو تصویر یاس بنا کھڑا تھا۔ یشودھا فوراً اس کی طرف بڑھی اور ہاتھ جوڑ کر کہنے لگی "بابو جی میں آپ کے خلاف ایسی خوفناک سازش کر کے سخت شرمسار ہوں۔ چونکہ میرا اور آپ کا خط بالکل ایک جیسا تھا میں نے دشمنی کی بنا پر آپ کے نام سے یہ خط لکھ کر اس عورت کو دیئے" سب کے دلوں میں یشودھا کی طرف سے نفرت کی لہر دوڑ گئی۔ انہوں نے امرت بابو کو جسے غش آنے لگا تھا ہاتھوں پر تھام لیا۔ اور اس عورت کو مار کر بھگا دیا۔ یشودھا کا یہ جرم کوئی معمولی جرم نہ تھا۔ اس پر چاروں طرف سے لعنتوں کی بوچھاڑ ہونے لگی اور اسی دن اُسے کالج سے جواب مل گیا۔

یشودھا کی اس حرکت سے کیلاش کے دل پر سخت صدمہ ہوا وہ دو تین دن کسی سے بات چیت بھی نہ کر سکا آخر ایک دن امرت بابو نے اسے بلا بھیجا وہ ابھی بیمار تھا اور چھٹی پر تھا "یشودھا کہاں ہے" کیلاش کو دیکھتے ہی اس نے کہا "میرے سامنے اس کا نام نہ لو میں نے اسے کالج سے نکال دیا ہے" کیلاش نے افسردگی سے کہا امرت بابو کے دل پر دھچکا سا لگا اس نے آبدیدہ ہو کر کہا "آہ یشودھا ستی۔ یشودھا سورگ کی اپسرا۔ یشودھا دیوی کا روپ بلکہ بھگوان کا اوتار تھی اسے کالج سے کیوں نکالا گیا" ——— "نہیں بابو جی وہ بدکردار لڑکی تھی جو اپنے پہلو میں زہر سے بجھا ہوا دل رکھتی تھی" کیلاش نے دکھے ہوئے دل سے جواب دیا۔ "نہیں نہیں تم غلطی پر ہو۔ اعتراف گناہ اس کا ایک زبردست ایثار تھا جو اس نے میری عزت بچانے کیلئے کیا" امرت بابو نے جوش سے کہا "آہ میں پاپوں کی آگ میں جل رہا تھا اس لے اپنے ایثار سے میری آتما کو بیدار کر دیا۔ ایک عورت جب دوسرے کے اطمینان کی خاطر اتنی بھاری قربانی کر سکتی ہے تو میں مرد ہو کر کیوں اتنا بزدل بنوں میں ضرور اپنے پاپوں کا پول کھول کر اپنے من کو شانت کروں گا"

(۵)

امرت بابو سر جھکائے ہوئے بیٹھا تھا "میں ایک معمولی آدمی کا بیٹا تھا" اس نے اپنی داستان حیات شروع کرتے ہوئے کہا "میری ماں بچپن میں ہی فوت ہو چکی تھی۔ میرا باپ جو کچھ کماتا میری تعلیم پر خرچ کر دیتا اس نے مجھے اعلےٰ تعلیم دلائی۔ تعلیم ختم کرنے پر میں نے ملازمت کی جستجو کی مگر ناکام رہا .... باپ کی زندگی میں مجھے کھانے پینے کی کچھ پروا نہ تھی بیکاری نے مجھے آوارہ

ور میں بدچلن ہوگیا میں نے خوب دل کھول کر دادِ عیش دی
——— باپ کی موت پر میری آنکھیں کھلیں گھر میں پھوٹی
می نہ تھی اب مجھے روٹی کی فکر ہوئی میرا باپ جگت بابو کی فرم
چاس روپے ماہوار پر ملازم تھا۔ میں نے جگت بابو کی منت
ت کی اور اس نے مجھے میرے باپ کی جگہ دے دی۔ مجھے جو
ملتی ہر مہینے اپنی عیاشی پر صرف کر دیتا۔ جگت بابو نیکدل
ھے تھے وہ مجھے ہمیشہ نیکی کے راستہ پر چلنے کی تلقین کرتے۔
"ایک دن میں کسی خاص کام کے لئے ان کی کوٹھی پر گیا جہاں
نے ان کی اکلوتی لڑکی جودھا کو دیکھا۔ جودھا کا حسن و جمال
تعریف کا محتاج نہ تھا۔ وہ گلستانِ حسن کی نوشگفتہ کلی تھی
کا پیکر نور کے خمیر سے گندھا ہوا تھا اسے دیکھ کر ایک عارضی شوق
بے بنیاد ولولہ میرے دل کو گدگدانے لگا ——— یہ لڑکی
زوں روپے کی واحد مالک تھی۔ میں نے سوچا اگر جودھا سے میری
دی ہو جائے تو میں کتنا دولتمند بن جاؤں چنانچہ اسی خیال سے
نے بدچلنی کچھ عرصے کے لئے ترک کر دی اور تندہی سے کام
روع کر دیا۔ چنانچہ میں نے اعلےٰ تعلیم پائی تھی۔ چند ہی دنوں میں
قی کر گیا ——— میں اکثر جگت بابو کے گھر آیا جایا کرتا
دھا کی ماں مجھ پر بہت مہربان ہو گئی مگر جگت بابو مطمئن نہ تھے
ں نے ان کے کاروبار میں اپنی جان لڑا دی۔ آخر کار میری اُمیدیں
آئیں۔ جودھا کی ماں کے زور دینے پر جگت بابو مجھے جودھا کا رشتہ
ینے پر آمادہ ہو گئے ——— جگت بابو کی کوٹھی دریائے
یاس کے کنارے تھی جس کے پچھواڑے تھوہر کا جنگل تھا اور
ختتام پر ایک پرانے زمانے کا چنا ہوا شکستہ اور ویران گھاٹ تھا
س کے قریب ہی کسی کھنڈر کے آثار تھے ——— اسوج
ی پہلی تاریخ تھی۔ سردی کے جنم کا تہوار اسی گھاٹ پر منایا گیا۔
میں میلہ دیکھنے کے لئے جگت بابو کی کوٹھی میں موجود تھا جگت بابو
نے مجھے تنہائی میں کہا "امرت جودھا کی ماں اس کا رشتہ تمہیں دینا
چاہتی ہے کیا تم بھی چاہتے ہو؟" میں نے جواب دیا "اس سے زیادہ
میری کیا خوش قسمتی ہو سکتی ہے؟" "مگر مجھے تم پر بھروسہ نہیں کیا تم

میرے شکوک کو رفع کر سکتے ہو؟" جگت بابو نے مجھے گہری نظروں
سے دیکھتے ہوئے کہا۔ میں نے متانت سے کہا "آپ جسطرح اپنا اطمینان
کرنا چاہیں کر لیں" جگت بابو کہنے لگے "اچھا آج تم یہیں رہنا رات کو
تمہارا امتحان لیا جائے گا" میں نے کہا "بڑی خوشی سے ———
رات کو دیر تک میں امتحان کا منتظر رہا حتےٰ کہ مجھے نیند آگئی۔ رات کے
دو بجے تھے جودھا کی ماں نے مجھے جگا۔ کوٹھی میں روشنی نام کو نہ تھی
وہ مجھے باہر کوٹھی کے پچھواڑے لے گئی۔ نہ جانے پندرھویں کے
چاند کو کیا ہو گیا تھا اس کی سفید کرنیں سیاہی مائل سُرخ ہو کر
کائنات کو بھیانک بنا رہی تھیں۔ تھوہر کی جھاڑیاں دھندلی
روشنی میں بھوتوں کی طرح ناچتی ہوئی معلوم ہوتی تھیں ———
ہم دونوں تھوہر کے جنگل سے گزرتے ہوئے شکستہ گھاٹ پر
پہنچے۔ جہاں جگت بابو مع جودھا کے بیٹھے تھے دھندلی چاندنی میں
دریا اژدھا کی طرح پھنکارتا ہوا بہہ رہا تھا کہیں قریب ہی گیدڑوں
کی خوفناک آوازیں فضا میں گونج رہی تھیں دریا کے پار ایک چتا
جل رہی تھی جس کے سُرخ شعلے چاندنی میں نارِ جہنم کا نمونہ پیش
کر رہے تھے۔ یہ سماں کچھ ایسا ہیبتناک تھا کہ میرے رونگٹے کھڑے
ہو گئے۔ جگت بابو مجھ سے مخاطب ہو کر کہنے لگے "دیکھو امرت
چاند کو کیا ہوا؟" میں نے چاند کی طرف دیکھا تو وہ سُرخ آہنی گولے
کی طرح دہکتا ہوا دکھائی دیا۔ میں کانپ گیا ——— میری
بدحواسی دیکھ کر جگت بابو کہنے لگے "لوگ اسے چاند گرہن کہتے
ہیں مگر یہ اپنے پاپ کی آگ میں جل رہا ہے۔ امرت جب ایک
دیوتا کو پاپ کی ایسی سخت سزا مل سکتی ہے تو پھر انسان کیا چیز
ہے" جگت بابو کے منہ سے چاند گرہن کا لفظ سُن کر مجھے کچھ
ڈھارس ہوئی۔ گرچہ میں تعلیم یافتہ تھا مگر ماحول کے اثر سے اتنا
بدحواس تھا کہ مجھے چاند گرہن کا خیال ہی نہ آیا اور نہ ہی میں
نے آج سے پیشتر کبھی چاند کو گرہن لگتے دیکھا تھا ———
کامل سکوت کے بعد جگت بابو نے کہا "امرت میں چندر بنسی
خاندان کا سپوت ہوں۔ ہم لوگ کبھی چندر مہا دیوتا کی پرستش
کرتے تھے۔ آج سے پانچ ہزار پہلے جبکہ چندر بنسی خاندان کے

لوگ دن کو سوتے اور رات کو جاگتے تھے۔ انہیں بھگتی کے صلہ میں چندر مہادیوتا کی طرف سے ایک مقدس مہر ملی تھی اور ان کے اہم معاملات چاند گرہن کے موقع پر اس مہر کی مدد سے طے ہوتے تھے۔ یعنی جو شخص عہد کرتا اس کے جسم کے کسی حصے کو اس مہر سے داغ کر نشان بنایا جاتا ——— اس مہر کے داغ کی قسم کو دنیا کی کوئی طاقت نہ توڑ سکتی تھی۔ جو بد عہدی کرتا اسکے داغ میں چاند گرہن کے موقع پر جلن ہونے لگتی اس پر بھی اگر وہ باز نہ آتا تو وہ داغ ناسور بن جاتا اور اسی دکھ سے اس بد عہد کی موت واقع ہوتی۔ اُس زمانہ سے وہ مہر چندر بنسی خاندان کے سرداروں میں نسل در نسل منتقل ہوتی رہی ——— چنانچہ آج کل وہ مہر میرے قبضے میں ہے۔ آج چاند گرہن میں ہے میں چاہتا ہوں کہ تم اس مہر کو اپنے ہاتھ پر داغ کر جودھا سے پیمانِ وفاداری کرو۔ میں دولت کے لالچ سے اندھا ہو رہا تھا۔ میں نے اپنا ہاتھ اس کی طرف بڑھا دیا۔ جگت بابو نے موم بتی کی لو پر وہ مہر گرم کر کے جودھا کے ہاتھ میں دے دی اور میں اس وقت جب کہ میں اس سے وفاداری کا اقرار کر رہا تھا اس نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے مہر میرے ہاتھ پر لگا دی ——— چاند گرہن ہٹنے پر ہم لوگ اشنان کر کے واپس آ گئے۔ اسی ہفتے جودھا سے میری شادی ہو گئی اور ہم دونوں خوش و خرم زندگی بسر کرنے لگے۔ سال ڈیڑھ سال تک تو ہماری باہمی رفاقت قائم رہی۔ لیکن جگت بابو کی موت کے ساتھ ہی میری محبت کا بھی خاتمہ ہو گیا۔ اس عرصے میں میں نے بے شمار دولت جمع کر لی اور اب جودھا سے چھٹکارا حاصل کرنے کی فکر میں رہنے لگا۔ ایک دفعہ میں اور جودھا کشتی کی سیر کو جا رہے تھے۔ دریا کے کنارے میں نے ایک پتلی چٹان پر سے جس کے نیچے پانی بہت گہرا تھا جودھا کو دھکا دیکر دریا میں پھینک دیا اور خود چیخ چیخ کر لوگوں کو مدد کے لئے پکارنے لگا۔ مگر یہاں تھا ہی کون جو مدد کو آتا۔ جودھا کی ماں جو کچھ فاصلے پر ہمارے پیچھے آ رہی تھی رونے پیٹنے لگی لیکن بے سود جودھا ڈوب چکی تھی ——— تیسرے دن دریا کے بہاؤ پر ایک نعش ملی جس کا گوشت پوست دریائی جانوروں نے نوچ کر کھا لیا تھا اور اب صرف ہڈیوں کا ڈھانچہ باقی تھا۔ جودھا کی موت کے بعد میں نے اس کی ماں پر یہ ظاہر کیا کہ جودھا کے بغیر میری زندگی حرام ہو گئی ہے۔ اور اب سنیاس لینا چاہتا ہوں ——— اُس بڑھیا کو دھوکا دے کر میں یہاں چلا آیا اور کوٹھی خرید کر یہیں سکونت اختیار کی اب میں ایک دولتمند آدمی تھا تاہم میں نے روپیہ برباد نہ کیا دولت کے ساتھ عزت بھی لازمی چیز ہے سو عزت حاصل کرنے کیلئے میں نے قومی کاموں میں حصہ لینا شروع کیا۔ چونکہ میں عیاش بھی تھا اس لئے آشرموں کو دل کھول کر دان دیتا قوم میری مداح تھی میں اکثر آشرموں میں معائنہ کے لئے جاتا۔ جہاں مجھے معصوم لڑکیوں پر ڈورے ڈالنے کا موقع مل جاتا۔"

"جودھا کی موت کو کئی مہینے گزر چکے تھے ایک رات کو میرے اس داغ میں جلن ہونے لگی میں گھبرا کر باہر نکلا تو چاند کو گرہن لگا ہوا تھا جب تک چاند گرہن قائم رہا مجھے جلن برابر ہوتی رہی صبح دن چڑھتے ہی میرا خوف دور ہو گیا اور اسے واہمہ خیال کر کے اپنی کمزوری پر ہنسنے لگا۔ لیکن رات کو اکثر مجھے یہ خیال ستایا کرتا۔ ان دنوں زنانہ کالج میں حساب کے پروفیسر کی جگہ خالی تھی میں نے اپنی خدمات پیش کر دیں۔ اس سے میرا یہی مقصد تھا کہ حسین لڑکیوں کے جھرمٹ میں بیٹھ کر اپنا دل بہلاؤں ——— میری یہ تدبیر کامیاب رہی میں اپنے ہاتھ کے داغ کو ایک حد تک بھول گیا۔ میری طبیعت بہت کچھ بدل گئی مگر اس کے بعد ہر چاند گرہن کے موقع پر میرا یہ داغ جلتا رہا۔ اب میں اس جلن کا عادی ہو گیا اس کا احساس بالکل جاتا رہا۔ حتیٰ کہ جودھا کی موت کو سترہ سال گزر گئے اس سال پھر اکتوبر میں چاند گرہن ہوا ——— اس رات کو جلن سے مجھے بیحد تکلیف ہوئی چونکہ میں بہت مضطرب تھا اس لئے سویرے ہی کالج چلا آیا یہ وہ دن تھا جس دن یشودھا کالج میں داخل ہوئی۔ وہ اس وقت اکیلی برآمدے میں کھڑی تھی۔ اسے دیکھ کر میں سخت خوفزدہ ہوا کیونکہ وہ بالکل جودھا کی ہم شکل تھی میں نے گھبرا کر اس کا نام دریافت کیا اس نے یشودھا کہا ہوگا مگر میری سمجھ میں جودھا ہی آیا۔ خوف و ہراس سے میرے بدن میں رعشہ ہونے لگا۔ میں واپس چلا گیا اور دو دن کالج نہ آیا ——— یشودھا کے آنے سے میرا اضطراب بہت بڑھ گیا کیونکہ وہ ایسی پراسرار باتیں کرتی کہ میرا اعمالنامہ میری آنکھوں کے سامنے آ جاتا میں نے اپنا نظم غلط کرنے

ے تھے پھر عیاشی شروع کردی انہی ایام میں میری آشنائی ایک اچھوت
لڑکی سے ہوگئی۔ اس کے والدین کو جب یہ علم ہوا تو وہ مقدمہ کی دھمکی
دینے لگے چنانچہ ایک شخص کی معرفت میں نے روپیہ دیکر ان کا منہ بند
کردیا ———— جس دن مجھے اس لڑکی کے والدین سے معاملہ
طے کرنا تھا رات کو میں باغ میں اس شخص سے باتیں کررہا تھا یشودھا
سنگترے کی باڑ کے پیچھے چھپ کر میری سب باتیں سنتی رہی ————
اپنا راز اس کے ہاتھ میں پاکر میں بہت جھنجلایا اور اسی رات اُسے قتل
کرنے کے ارادے سے ہوسٹل میں گیا۔ مگر وہاں مجھ پر ایک عجیب
انکشاف ہوا میں نے قتل کا ارادہ ترک کردیا۔ اور اس دن سے اس
کے ساتھ نرمی کا برتاؤ کرنے لگا ———— اس کی پراسرار باتوں
میں مطلق فرق نہ آیا اور ان باتوں کا میری صحت پر بہت بُرا اثر ہوا
میرے دماغ میں ہروقت جلن رہنے لگی آخر کار میرا وہ داغ ناسور بن
گیا ———— ادھر ملیا کو (یعنی وہ اچھوت لڑکی جو میری آشنا
تھی) والدین نے ننہیال بھیج دیا وہ مجھے وہاں سے خط لکھتی رہی
اور میں اُن خطوں کے جواب دیتا رہا لیکن اس دن سے میری اس
کی پھر ملاقات نہ ہوئی۔ وہ لڑکی دو سال کے بعد واپس آئی تو حاملہ
تھی اب وہ مجھ سے پھر راہ ورسم پیدا کرنے کی خواہاں ہوئی میں نے
اسے دھتکار دیا میرے خط اس کے پاس تھے جب اُس کے بچہ
پیدا ہوا تو اس نے دشمنی کی بنا پر مجھے رسوا کرنے کی ٹھان لی اس
کا خیال تھا کہ شاید میری ان تحریروں کے ذریعے وہ اس بچے کو
میرا بچہ ثابت کرسکے گی۔ لیکن یشودھا اس وقت میرے آڑے
آئی اس نے میری اور اپنی تحریر ملتی جلتی پاکر سارا الزام اپنے سر
لے لیا" کیلاش خاموشی سے باتیں سنتا رہا اس کے چہرے پر
ایک رنگ آتا تھا ایک جاتا تھا۔ مجسم ایثار یشودھا کیساتھ بےانصافی
کرنے پر اُسکا دل اسے ملامت کررہا تھا۔

(۶)

وقت کا کیڑا سرعت سے زمانے کو چاٹ رہا تھا امرت
بابو کو کالج کی پروفیسری ترک کرکے گوشہ نشین ہوئے سال
بھر گزر چکا تھا ایک دن ڈاک میں اُسے ایک گلابی رنگ کا
لفافہ ملا اس نے فوراً لفافہ چاک کیا خط کی عبارت بالکل مختصر تھی۔

بابو جی نمسکار

مجھے آپ سے ایک ضروری کام ہے براہ مہربانی جلد از جلد فیروزپور
تشریف لائیں۔ کل سے ہر گاڑی کے موقعہ پر آپ کا انتظار کیا
جائے گا۔ آپ کی داسی یشودھا

اتنے عرصے کے بعد یشودھا کی خیریت کی خبر پاکر اُسے بہت خوشی
ہوئی اسے یشودھا سے ملنے کی بےحد آرزو تھی چنانچہ وہ دوسرے دن فیروز
پور روانہ ہوگیا۔ گاڑی کا سفر اس نے بمشکل کاٹا۔ ابھی گاڑی اسٹیشن پر پوری
طرح کھڑی بھی نہ ہونے پائی تھی کہ وہ کود کر باہر نکلا اسکا خیال تھا کہ یشودھا
اسٹیشن پر موجود ہوگی مگر بجائے اُسکے کیلاش کھڑا تھا امرت بابو نے بدحواسی
سے پوچھا "مسٹر کیلاش یہاں کیسے تشریف لائے۔ کیلاش نے مسکرا کر
جواب دیا "آپ کے استقبال کے لئے۔" "یعنی آپ مجھے لینے آئے
ہیں" امرت بابو نے حیرت سے کہا "ہاں آپ کو لینے آیا ہوں یشودھا
نے مجھے بھیجا ہے" کیلاش نے جواب دیا "کل یشودھا سے میری شادی
ہونے والی ہے ہم دونوں کی دلی آرزو تھی کہ آپ ہماری شادی میں شامل
ہوکر ہمیں آشیرباد دیں" ————

یشودھا کی شادی کا سن کر پہلے تو غم کی ایک ہلکی سی رَو امرت
بابو کے بدن میں دوڑ گئی مگر فوراً ہی اسے ایک پُرسکون مسّرت
محسوس ہوئی اسے اپنے دل سے ایک بوجھ سا اترتا معلوم ہوا۔
یشودھا کے ہاں پہنچ کر وہ بہت خوش ہوا۔ تمام دن یشودھا سے
باتوں میں گزر گیا رات کو یہ لوگ سویرے ہی اپنے اپنے کمروں
میں جا سوئے کیونکہ صبح تاروں کی چھاؤں میں شادی کی رسومات
ادا ہونے والی تھیں۔

آدھی رات کے قریب اس نے خواب میں دیکھا کہ جگت بابو
اسی خوفناک مہرے اس کا جسم داغ رہے ہیں۔ یکایک اُسکے
ناسور میں سخت ٹیس پڑی۔ وہ بےتحاشا چیخ مار کر اُٹھا مگر آنکھیں
کھولنے پر اسے خواب سے بھی زیادہ ہولناک منظر دکھائی دیا۔

میز پہ ایک چھوٹی سی موم بتی جل رہی تھی جس کی لَو گُل
ہونے کے قریب تھی اس مدھم روشنی میں ایک عورت جو بالکل ہڈیوں

کاڈھانچہ معلوم ہو رہی تھی اس کا ہاتھ پکڑے زخم کو کچل رہی تھی ـــــ امرت بابو درد کی شدت سے تلملا اٹھا اس نے جھٹکا دے کر اپنا ہاتھ چھڑایا جس پر اس عورت نے ایک خوفناک قہقہہ لگاتے ہوئے دھکا دے کر اسے پھر پلنگ پر گرا دیا۔ امرت بابو جس کا سر بری طرح پٹی سے ٹکرایا تھا بے ہوش ہو گیا۔

جب اسے ہوش آیا تو تین آدمی اس کے قریب بیٹھے تھے جن میں ایک ڈاکٹر تھا جو اس کے ہاتھ کی پٹی کر رہا تھا دوسرا کیلاش تھا اور تیسری ایک بوڑھی عورت تھی جس کی شکل وصورت کچھ شناسا معلوم ہوتی تھی۔ جب ڈاکٹر پٹی کر چکا تو بوڑھی عورت نے کمزور آواز میں کہا "اٹھو بابو یشودھا کے لگن کا وقت ہو چکا ہے۔ جا کر اپنے ہاتھ سے کنیا دان کرو" "کنیا دان" امرت بابو نے تڑپتے ہوئے کہا۔ "ہاں کنیا دان" عورت نے دوبارہ کہا "کیونکہ یشودھا تمہاری اور بدقسمت جودھا کی بیٹی ہے" جودھا کا نام سنتے ہی امرت بابو پھر بے ہوش ہو گیا۔ مگر ڈاکٹر کی دوائی سے اُسے بہت جلد ہوش آگیا "پرماتما کے لئے جلد ہی بتاؤ یہ کیا معاملہ ہے" اس نے گھبرا کر کہا "بابو تم نے مجھے پہچانا نہیں۔ میں جودھا کی ماں ہوں" بڑھیا نے کہا "جودھا کی ماں"؟ اُس نے کہا اور اسے دیکھ کر تھر تھر کانپنے لگا "ڈرنے کی کوئی بات نہیں میں ابھی تمہیں سارے معاملے سے آگاہ کئے دیتی ہوں" بڑھیا نے کہا "جب تم نے جودھا کو دریا میں پھینکا ـــــ" "میں نے پھینکا" امرت بابو نے زخمی کبوتر کی طرح پھڑکتے ہوئے کہا "آہ میں پاگل ہو جاؤں گا"

جودھا کی ماں اُسے تسلی دیتے ہوئے کہنے لگی "بابو جو کچھ ہونا تھا ہو چکا اب ذرا شانتی سے میری بات سنو۔ دریا میں ڈوب کر جودھا مری نہ تھی۔ دو میل کے فاصلے پر ایک ماہی گیر نے اسے پکڑ لیا اس کے دل کی خفیف سی حرکت ابھی جاری تھی ماہی گیر نے دیہاتی طریقے پر اس کا علاج کیا جس سے اس کی جان بچ گئی ـــــ جودھا کی جدائی سے میرا دل ٹوٹ گیا۔ میں اپنا غم غلط کرنے کے لئے دور دور تک جنگل میں نکل جاتی اس حادثہ کو پورے چار مہینے گزر چکے تھے ایک دن میں اپنے غم کی رَو میں بہتی ہوئی ایک گاؤں کی طرف جا نکلی جہاں ماہی گیروں کی جھونپڑیاں تھیں ایک جھونپڑی کے دروازے پر جودھا کھڑی تھی میں نے اسے پہچان لیا لیکن وہ مجھے نہ پہچان سکی کیونکہ وہ اپنی یادداشت بالکل کھو چکی تھی۔ ماہی گیر سے دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ آج سے چار ماہ پیشتر یہ لڑکی اسے دریا میں بہتے ہوئے ملی تھی"

"جودھا کو پا کر میری دنیا پھر آباد ہو گئی میں اُسے اپنے گھر واپس لے آئی وہ اس وقت سات ماہ سے حاملہ تھی میں نے بڑے بڑے قابل ڈاکٹروں سے اس کا علاج کرایا مگر کچھ فائدہ نہ ہوا اسی حالت میں اُسکے بچی پیدا ہوئی"

"چونکہ جودھا پاگل پنے میں ہر ایک کو دھکا دے کر قہقہہ لگاتی۔ اس لئے میں نے اندازہ لگایا کہ اسے دھکا دے کر دریا میں پھینکا گیا تھا چنانچہ اسی لئے میں نے آج تک تمہیں جودھا اور اس کی لڑکی کی اطلاع نہ دی حالانکہ تمہارا پتہ مجھے عرصہ سے مل چکا تھا۔ اسی حالت میں ایک عرصہ گزر گیا اتفاقاً ایک دن جودھا کو کہیں سے وہ مہر مل گئی جس سے تمہارا ہاتھ داغا گیا تھا اس مہر کو دیکھ کر نہ جانے اسے کیا خیال آیا کہ وہ دیر تک کچھ سوچتی رہی۔ اس دن سے وہ تمام دن خاموش رہتی ہے اور رات کو ایک ہاتھ میں موم بتی اور دوسرے ہاتھ میں مہر لے کر پھرتی رہتی ہے اور جو چیز اس کے سامنے آئے موم بتی سے مہر گرم کر کے اُسے داغ دیتی ہے۔ اسی طرح اس نے ایک دن یشودھا کا ہاتھ بھی داغ دیا ـــــ رات کو تم اپنے کمرے کا دروازہ بند کرنا بھول گئے تھے وہ اتفاقاً ادھر آنکلی اور تمہارے ناسور کو دوبارہ اس نے داغ دیا"

بڑھیا کی یہ بات سن کر رات والا خوفناک منظر اسکی آنکھوں کے سامنے پھر گیا اس کے ہاتھ میں زیادہ درد ہونے لگا۔ اس نے کراہتے ہوئے کہا "آہ اب کیا ہو گا اس نے میرا ہاتھ دوبارہ داغ دیا ہے" اُسے خوفزدہ پا کر بڑھیا نے کہا "امرت بابو اس مہر کا بالکل دشواش نہ کرو یہ جودھا کے پتاجی کی دماغی اختراع تھی۔

چونکہ وہ تمہاری طرف سے مطمئن نہ تھے اور میں مصر تھی کہ جودھا تمہیں کو ملے اس لئے انہوں نے ایک ڈراؤنے ماحول میں اس مہر سے ایک روایت منسوب کر کے اس کو تمہارے ہاتھ پر داغ کر تم سے پیمانِ وفا لیا یہ سب کچھ صرف تمہیں ڈرانے کے لئے تھا ورنہ اس کی کوئی حقیقت نہیں۔" "کیا یشودھا کو معلوم ہے کہ میں اس کا باپ ہوں" اس نے آہ بھر کر کہا۔ "ہاں معلوم ہے" بڑھیا نے کہا "اسی لئے وہ تمہارے کالج میں داخل ہوئی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ وہ تمہیں راہ راست پر لے آئے گی۔"

امرت بابو سخت شرمسار تھا لیکن بڑھیا کے کہنے پر اس نے کنیادان کی سب رسومات اپنے ہاتھ سے ادا کیں۔

(۷)

امرت بابو کے ملاپ سے رفتہ رفتہ جودھا کا پاگل پن جاتا رہا جس بیماری کو بڑے بڑے قابل ڈاکٹر نہ رفع کر سکے قدرت نے اس کا علاج کر دیا وہ دوبارہ صحیح الدماغ ہو گئی۔ امرت بابو کا ناسور بھی آہستہ آہستہ بھر گیا۔ ڈاکٹروں کا خیال تھا کہ یہ زخم جلانے سے اچھا ہو گیا ہے۔

بیساکھی کا تہوار تھا۔ کائنات کا دامن بہار کی رنگینیوں سے بھرپور تھا۔ ہوا نشہ برسا رہی تھی۔ ہر برگ و بار کیف میں ڈوبا ہوا تھا سبزہ کی دلکشی دلوں کو مسحور کر رہی تھی۔ جگت بابو کی قدیم کوٹھی میں شادمانی کے گیت گائے جا رہے تھے امرت بابو اپنے کنبے میں شاداں و فرحاں بیٹھا ہوا تھا۔ کیلاش اور یشودھا میں ایک مزیدار بحث چھڑی ہوئی تھی۔ کیلاش کا دعویٰ تھا کہ امرت بابو کا ناسور واہمہ کے اثر سے تھا۔ مگر یشودھا کہتی تھی کہ "نہیں یہ ماتاجی کی قوت ارادی کا کرشمہ تھا" ——— دونوں اپنی اپنی جگہ سچے تھے جودھا اور امرت بابو اپنے نونہالوں کی دلچسپ گفتگو سے باغ باغ ہو رہے تھے۔ آخر کار جودھا نے فیصلہ کرتے ہوئے کہا "تم دونوں غلطی پر ہو۔ یہ صرف ایک مہاپرش کی عاقلانہ تدبیر تھی جو ایک دن کامیاب ہو کر رہی۔"

جناب اختر ہوشیارپوری بی۔اے

آہ وہ دن

یاد ہے وہ تجھ سے رخصت ہو کے آنا یاد ہے
کشمکش کا وہ قیامت زا زمانا یاد ہے

یاد ہے وہ دل پہ کوہِ ضبط کا بارِ گراں
چپکے چپکے وہ ترا آنسو بہانا یاد ہے

یاد ہیں تیری معنبر سرد سانسیں اب تلک
ہر نفس پر نیشتر سا دل پہ کھانا یاد ہے

یاد ہے وہ صبحدم اٹھتے ہی تیری جستجو
وہ خدا سے پہلے تیرا یاد آنا یاد ہے

یاد ہے وہ جاتے جاتے میرا کہنا الوداع
اور وہ تیرا شرم سے نظریں جھکانا یاد ہے

یاد ہے وہ شوق میں ہوتے تکلم کا رکاؤ
خوفِ رسوائی سے تیرا سہم جانا یاد ہے

یاد ہے ہاں یاد ہے وہ باہمی گفت و شنید
ہائے وہ سارے جہاں کو بھول جانا یاد ہے

میری لاکھوں منتوں پر ڈرتے ڈرتے ایکبار
وہ بصد جرأت نگاہوں کو اٹھانا یاد ہے

ہنستے ہنستے کر کے ناممکن جدائی کا خیال
آنسوؤں سے آگ سینہ میں لگانا یاد ہے

گاہے گاہے مجھ کو مایوسِ وفا کر کے ترا
طرزِ نادانستگی سے مسکرانا یاد ہے

بھول سکتا ہے کہیں اختر وہ رنگیں ساعتیں
یاد ہے وہ تجھ سے رخصت ہو کے آنا یاد ہے

جناب طالب انصاری

گاؤں کا منظر

چاندنی رات کے آخری لمحات میں

ہیں لبِ جو گود میں سبزے کی تھوڑے سے مکاں　جن پہ ہے پچھلے پہر کی چاندنی چھائی ہوئی

ٹیڑھی ٹیڑھی تنگ گلیوں میں ہیں ایسے پیچ و خم　ابر کے دامن میں جیسے برق لہرائی ہوئی

ذرّے ذرّے پر مسلّط ہے ابھی شب کا خمار　جاگتے رستوں کو ہے کچھ نیند سی آئی ہوئی

موجزن ہے وہ نظر کے سامنے آبِ رواں　آخرِ شب میں ہے فطرت جوش پر آئی ہوئی

یوں دکھائی دے رہی ہے آبِ صافی کی جھلک　جیسے لاکھوں من کھری چاندی ہو پگھلائی ہوئی

ان کھلی آبادیوں کی سیر کرنے کے لئے　آسماں سے ہے زمیں پر چاندنی آئی ہوئی

رفتہ رفتہ پڑ گئی مدھم ستاروں کی چمک　ہر کلی گلزارِ قدرت کی ہے مرجھائی ہوئی

وہ افق پر جوش مارا نور کے سیلاب نے　چاندنی پھرنے لگی جانے کو گھبرائی ہوئی

ڈوبتا ہے صبح کے دریا میں تاروں کا جہاز　کشتیِ مہتاب ہے گرداب میں آئی ہوئی

کر دیا وہ صبحِ صادق نے اجالا ہر طرف　اپنے اصلی روپ میں ہر چیز ہے آئی ہوئی

کروٹیں لینے لگیں پیڑوں کی شاخیں بار بار　صبح کا پیغام ہے بادِ سحر لائی ہوئی

چومتی ہے منہ کو پھولوں کے نسیمِ جاں فزا　ننھی کلیوں کو جگانے کے لئے آئی ہوئی

طائرانِ صبح کے نغموں سے جنگل مست ہیں　ہے گھنے پیڑوں پہ کیسی بیخودی چھائی ہوئی

اوس کھا کر جوش پھر سبزے نے مارا باغ میں　پھر مزا دینے لگی ہر شاخ لہرائی ہوئی

دشت کی رگ رگ میں موجیں مارتا ہے خونِ گرم　قوتِ نشو و نما ہے جوش پر آئی ہوئی

اک طرف کھیتوں کا سبزہ اک طرف رنگ شفق — مل کے ان دونوں سے پیدا شانِ یکتائی ہوئی

اس طرف دیوار و در گاؤں کے بے نقش و نگار — اس طرف سبزے پہ فطری سادگی چھائی ہوئی

واہ کیا وہ خوش نما بیلیں دکھاتی ہیں بہار — ق کچھ درختوں پر ہیں کچھ دیوار پر چھائی ہوئی

فصل کی سوغات گھر گھر بانٹنے کے واسطے، — کچھ کے دامن میں ہیں پھل کچھ پھول ہیں لائی ہوئی

چل دیا ہل لیکے دہقاں اپنے کھیتوں کی طرف — وہ قدم اٹھتے ہوئے وہ چال گرمائی ہوئی

درہم و برہم سے ہیں اس کی سیہ ڈاڑھی کے بال — کچھ سپیدی ان سیہ بالوں میں ہے آئی ہوئی

کھل رہے ہیں سامنے سارے گریباں کے بٹن — آستیں سکڑی ہوئی ہے دوش تک آئی ہوئی

ہے توانائی کا پیکر اس کا پھرتیلا بدن — ابھرے ابھرے بازوؤں پر ہے سکت چھائی ہوئی

دیکھ کر سبزہ ہرے کھیتوں کا لہراتا ہوا، — تازگی اس کی ہے فطری جوش پر آئی ہوئی

جا رہا ہے آگے آگے راگنی گاتا ہوا، — پیچھے پیچھے خاک ہے ٹھوکر کی ٹھکرائی ہوئی

گاگریں کاندھوں پہ رکھ کر اپنے کمسن لڑکیاں — پانی بھرنے کے لئے پنگھٹ پہ ہیں آئی ہوئی

پنڈلیاں بھیگی ہوئی ہیں ہاتھ کہنی تک ہیں تر — سرخیاں دوشیزگی کی رخ پہ ہیں چھائی ہوئی

خوش ادا سینوں پہ ہے اٹھتی جوانی کا ابھار — زلف مشکیں کی درازی تا کمر آئی ہوئی،

چہل کرتی ہے کوئی اودھم مچاتی ہے کوئی — کوئی چپ ہے اور کسی کو ہے ہنسی آئی ہوئی

وہ ٹھٹھکنا غیر کی نظروں سے ان کا بار بار — وہ چھچھلتی سی نظر وہ آنکھ شرمائی ہوئی

یہ سماں، یہ لطف یہ تازہ ہوائیں چھوڑ کر
میں نہ جاؤں گا یہاں سے یہ فضائیں چھوڑ کر

مختصر افسانے اور اُن کی خصوصیات

جناب جمیل احمد کندھاپوری، بی۔اے

افسانہ کیا ہے؟ افسانہ نثر کی اس داستان کو کہا جاسکتا ہے جس کے مطالعہ میں کم سے کم نصف اور زیادہ سے زیادہ دو گھنٹے صرف ہوں"

———— یہ ہے ارشاد اس شخص کا جسے ہم مختصر افسانے کے علمبرداروں میں شمار کرتے ہیں اور جس کو دنیا ایڈگر ایلن پو (Edgar Allen Poe) کے نام سے جانتی ہے۔ لیکن افسانے کی فنی خصوصیات بیان کرنے کے لئے صرف اتنا ہی کہنا کافی نہیں۔ سب سے پہلی بات جو ہمیں اس سلسلے میں ذہن نشین کر لینی چاہیئے وہ یہ ہے کہ افسانہ نگار کو ایک لفظ بھی ایسا نہ لکھنا چاہیئے جو کسی نہ کسی طرح افسانے کی تعمیر پر اثر انداز نہ ہوتا ہو، خواہ وہ پلاٹ سے متعلق ہو یا کردار و فضا سے! اختصار بلاشبہ افسانے کا جزو لاینفک سمجھا جاسکتا ہے لیکن ہم اس کو کسی طرح بھی لازم قرار نہیں دے سکتے کیونکہ افسانوں کی ایسی مثالیں بھی بکثرت موجود ہیں جن کے حجم اچھے خاصے ناول سے کسی طرح بھی کم نہیں۔ مثال کے طور پر دور حاضر کے مشہور افسانہ نگار گالزوردی کے افسانے" سیب کا درخت " کو ہی لے لیجئے جس کا ترجمہ ہماری زبان میں ہو چکا ہے۔ یہ افسانہ طوالت میں ایک متوسط حجم کے ناول سے کم نہیں۔ پھر بھی ہم اسے مختصر افسانے کی صف میں جگہ دیتے ہوئے ذرا بھی پس وپیش نہیں کرتے کیونکہ اس کے اندر فن کی ہر وہ خصوصیت موجود ہے جو ایک کامیاب افسانے کیلئے لازمی قرار دی گئی ہے۔

افسانہ اور ناول میں فرق! بعض حضرات کا خیال ہے کہ افسانہ مختصر ناول کو کہا جاتا ہے یا پھر یہ کہ افسانہ ناول کی بگڑی ہوئی شکل ہے لیکن اس قسم کی خیال آرائیاں صرف عدم واقفیت پر مبنی ہیں۔ دراصل افسانے اور ناول میں اتنا ہی فرق ہے جتنا زمین و آسمان میں! آرٹ کے لحاظ سے دونوں چیزیں بالکل جدا جدا ہیں۔ اسی لئے دیکھا گیا ہے کہ بہت سے اچھے ناول نویس فنی اعتبار سے کامیاب افسانے نہ لکھ سکے اور اچھے ناول سپرد قلم کرنے کے سلسلے میں بعض ممتاز افسانہ نگاروں کی سعی مشکور نہ ہو سکی۔

زندگی اتنی متنوع اور تفصیل طلب ہے کہ اس کے ہر ہر واقعہ کو بیان کرنے کے لئے عمر خضر چاہیئے۔ انسان کی زندگی مجموعہ ہے واقعات کا۔ ہر روز، ہر ساعت، ہر لمحہ کوئی نہ کوئی واقعہ رونما ہوتا رہتا ہے۔ کوئی اچھا، کوئی بُرا، کوئی حزن و ملال میں ڈوبا ہوا، کوئی مسرت و شادمانی کا پرتو لئے ہوئے، کبھی انسان راحت و مسرت سے دوچار ہوتا ہے، کبھی رنج و الم سے، کبھی کامیابی اس کا قدم چومتی ہے اور کبھی ناکامی کا دیو اسے اپنا منحوس منہ دکھاتا ہے۔ اب ان تمام واقعات کو تفصیل کے ساتھ بیان کرنا افسانہ نگار کا کام نہیں، یہ ایک ناول نویس کا فرض ہے۔ افسانہ نگار اپنی محدود فضا کے اندر متنوع زندگی کے صرف کسی ایک واقعہ کی خیرہ کن جھلک دکھاتا ہے اور بس! اس سے زیادہ اس کے حیطۂ امکان سے باہر ہے لیکن وہ جھلک اپنی اثر خیزی کے لحاظ سے اتنی سیر حاصل اور مکمل ہوتی ہے کہ ہمیں تشنگی کا گمان نہیں رہتا۔

ناول کی حیثیت اس لحاظ سے بالکل جداگانہ ہے۔ ناول نویس کو حق حاصل ہے کہ وہ زندگی کے جتنے واقعات بھی چاہے درج کرے بشرطیکہ وہ پلاٹ سے خارج نہ ہوں۔ اس کو اختیار ہے کہ وہ اپنی تصنیف میں جتنے کردار بھی تخلیق کرے اور ان کی تفصیلات سے اپنے قارئین کو محظوظ کرے لیکن افسانہ نگار کو یہ آزادی حاصل نہیں۔ وہ تو اپنے افسانے میں صرف ایک ڈرامائی واقعہ کی تصویر دکھا سکتا ہے خواہ وہ حزنیہ ہو یا طربیہ، غم انگیز ہو یا قہقہہ آفریں۔ ناول نویس کی طرح اسے ہمیں متعدد کرداروں سے واقف کرانے کی اجازت نہیں۔ وہ تو ہمیں بیک وقت صرف ایک کردار سے متعارف کرا سکتا ہے اور بس! اسی ایک کردار کا مختصر سا جلوہ دکھانا افسانہ نگار کا فرض ہے۔

اس سے یہ غلط فہمی نہ ہونی چاہیئے کہ افسانہ نام ہے مختصر ناول کا۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ ایک زندگی کی مکمل داستان، تمام

ئیات کے ساتھ افسانے میں بیان تو کی جاتی ہے لیکن تفصیل سے نہیں، اختصار
ساتھ۔ لیکن اوپر بتایا جاچکا ہے کہ افسانے میں ایسا نہیں ہوتا۔ وہاں تو
انہ نگار ایک پوری زندگی میں سے صرف ایک واقعہ اپنی مرضی کیمطابق
نب کرتا ہے اور اسی کی بنیاد پر افسانے کی عمارت قائم کرتا ہے۔
شخص کے کیرکٹر کے صرف کسی ایک پہلو کو نہایت تیز اور خیرہ کن روشنی
ہمارے سامنے جلوہ گر کرتا ہے، اس طرح کہ وہ خفیف سا نظارہ بھی
رے دل و دماغ پر اپنا دیرپا نقش چھوڑ جاتا ہے۔ ناول نویس کی طرح
استقلال کے ساتھ رفتہ رفتہ اپنے کردار کے خدوخال واضح نہیں کرتا بلکہ
کی روشنی برق کی اس چمک کی طرح ہوتی ہے جس نے سرعت کے
تھ اپنا خیرہ کن جلوہ دکھایا اور غائب۔ اگر زندگی کو ایک ناٹک مان
جائے جیساکہ شکسپیئر اور دیگر ممتاز ادبا نے اکثر ظاہر کیا ہے تو افسانے کو
مائے حیات کا ایک ایکٹ سمجھ لیجئے، لیکن ایسا ایکٹ جس کی روح میں
لی محسوس نہ ہو اور ساتھ ساتھ اتحاد اثر بھی برابر برقرار رہے۔ چونکہ افسانہ
تنہا واقعہ سے متعلق ہوتا ہے اس لئے اس میں ایک ہلکے سے اضطراب،
خفیف سی بے چینی کی جھلک نظر آتی ہے اور جذبات کی شدت نیز تمام
سپیاں کسی خاص نقطہ پر مرکوز ہونے کے سبب سے اس کی رفتار ناول
مقابلے میں ذرا تیز ہوتی ہے جو اپنے تنوع اور طوالت کی وجہ سے
آہستہ آہستہ جنبش کرتا ہے۔

مانے کا ماحصل:- ایک کامیاب افسانے کے لئے لازمی ہے کہ اس کے
ٹ میں پیچیدگی نہ ہو بلکہ سادگی اور اختصار کے ساتھ ساتھ کردار نگاری
نصر بھی اچھی طرح نمایاں ہو۔ اسی لئے آرٹ کے نقطہ نظر سے وہ افسانہ زیادہ
ل قبول سمجھا جاتا ہے، جس میں کم سے کم کرداروں سے پاٹ کرایا گیا ہو۔
فسانے میں بھی ناول کی طرح متعدد کرداروں کو پیش کیا جائے تو افسانے
مار حسن خاک میں مل جائے گا اور فن کی نگاہ میں یہ ایک ناقابل تلافی
م تصور کیا جائے گا۔ لہٰذا جس افسانے میں جتنے کم کردار ہوں گے، وہ اتنا
زیادہ دلچسپ ثابت ہوگا۔ یہاں یہ لکھ دینا بھی ضروری معلوم ہوتا
کہ افسانہ نگار اپنے کردار کے تمام پہلوؤں سے بحث نہیں کرتا۔ وہ
س اس پہلو کو منعکس کرتا ہے جس کا بالواسطہ افسانے کے پلاٹ سے تعلق
ہوتا ہے۔ کردار کا تجزیہ نفسی بال کی کھال نکالنے کی حد تک افسانہ نگار
نہیں کرتا۔ کردار نگاری میں انسانہ نویس کو ذرا سرعت سے کام لینا چاہیئے۔
کیونکہ ناول کی طرح افسانے میں یہ موقع کہاں میسر کہ آہستہ آہستہ ٹھیر ٹھیر
کر کرداروں کے خدوخال قارئین پر واضح کئے جائیں۔

دوسری نہایت ضروری چیز افسانہ نگار کے لئے یہ ہے کہ اسے زبان پر
کافی عبور حاصل ہونا چاہیئے تاکہ وہ کم سے کم الفاظ میں اپنا مفہوم ادا کر سکے۔
مثلاً ناول نویس ایک منظر کو بیان کرنے میں تین چار صفحات صرف کر دیتا ہے،
لیکن افسانہ جیسی مختصر صنف ادب میں اتنی گنجائش کہاں! وہاں نہ تو بلا ضرورت
عبارت کو طویل دیا جاتا ہے اور نہ فضول بیانات سے قارئین کا وقت ہی
ضائع کیا جاتا ہے۔

چونکہ افسانے میں صرف ایک واقعہ، ایک جذبہ، ایک تحریک یعنی صرف
کسی ایک انفرادی شے سے بحث ہوتی ہے اس لئے افسانہ نگار کو زیادہ قوت
نظر اور باریک بینی سے کام لینا پڑتا ہے۔ نفسیات کا ماہر ہونے کے علاوہ
اس کے لئے لازمی ہے کہ اس کی قوت مشاہدہ نہایت تیز ہو تاکہ وہ اچھی اور بری،
مناسب اور غیر مناسب، ضروری اور غیر ضروری چیزوں میں امتیاز کر سکے۔
جب تک یہ نہ ہوگا، افسانہ نگار فنی حیثیت سے معیاری افسانے لکھنے میں
کامیاب نہ ہو سکے گا۔

افسانے کی چند اہم خصوصیات

(۱) **اتحاد اثر**:- مختصر افسانے کی سب سے نمایاں خصوصیت جو اسے ناول سے
علیحدہ کرتی ہے، اس کی یگانگی اثر ہے۔ افسانہ نگار کسی جذبہ، کسی واقعہ، یا
تحریک سے متاثر ہو کر اپنے افسانے کا پلاٹ تعمیر کرتا ہے۔ اور چاہتا ہے کہ
جو اثر اس نے خود قبول کیا ہے، وہی دوسروں تک بھی پہنچائے۔ ظاہر ہے کہ
اس صورت میں وہی ایک واحد اثر پورے افسانے میں کار فرما ہونا چاہیئے
لیکن اگر قارئین پر مختلف اثرات کام کرنے لگیں تو افسانہ بھونڈا ہو کر رہ جائیگا
اور ہم اس قسم کے افسانوں کو دنیائے افسانہ سے خارج کر کے قصے کا لقب دینے
پر مجبور ہوں گے۔ مگر اس کے برعکس اگر پڑھنے والے پر وہی جذبات اور کیفیات
طاری ہو گئے جو صاحب افسانہ پہنچانا چاہتا ہے تو بلاشبہ وہ مصنف ایک
کامیاب آرٹسٹ کہلائے جانے کا مستحق ہے۔ اس لئے افسانہ نگار کو چاہیئے
کہ جس مقصد کو لیکر اس نے اپنا افسانہ شروع کیا ہے، اس پر آخر تک

سختی سے قائم رہے اور کہیں ایک نقطہ بھی ایسا نہ ہو جو تعمیر افسانہ پر اثر انداز نہ ہوتا ہو۔ بعض مبتدی افسانہ نگار بیجا تفصیلات میں پڑجاتے ہیں جن سے اتحاد اثر یک قلم مفقود تو نہیں ہوتا البتہ دھندلا ضرور پڑجاتا ہے۔ اس لئے ایک کامیاب افسانہ نگار ہونے کے لئے لازمی ہے کہ لکھنے والا سختی سے اس اصول پر کاربند رہے اور کبھی بھولے سے بھی ایک سے زیادہ مقصد کو اپنے افسانے میں گھسنے نہ دے۔ ایڈگر ایلن پو ہی وہ پہلا افسانہ نگار تھا جس نے افسانے میں واحد اثر پر زور دیا اور خود بھی ایسے افسانے لکھے جو اس خصوصیت کے حامل ہیں۔

(۲) اتحاد مکاں و (۳) اتحاد زماں: افسانہ نگار کو چاہئے کہ افسانے کا پلاٹ کم سے کم وقت میں مکمل ہو یعنی واقعات کے ختم ہونے میں بہت کم وقت صرف ہو۔ جتنے کم وقت میں واقعات ختم ہونگے وہ افسانہ اسی قدر کامیاب سمجھا جائے گا۔ لیکن اتحاد زماں کو اتحاد اثر کی طرح کسی صورت میں بھی افسانے کے لئے لازمی قرار نہیں دیا جاسکتا۔ ورنہ ایسا کرنے سے بہت اچھے اور قابل ستائش پلاٹ افسانوی شکل میں آنے سے رہ جائینگے، کیونکہ ایسے صدہا پلاٹ موجود ہیں جن کے رونما ہونے میں سالہا سال کا وقفہ صرف ہوا ہے۔ اس قسم کے واقعات کو افسانے میں مرتب کرنے کے لئے لازمی ہے کہ واقعات کا اچھی طرح اندازہ کیا جائے اور انہیں چیزوں کا ذکر کیا جائے جن کا تعلق افسانے کے اولین مقصد سے ہے یعنی جس مقصد کو واضح کرنے کے لئے افسانہ لکھا گیا۔ باقی درمیانی گھڑیاں جو فضول ہوں، ان کو نظر انداز کر دینا چاہیئے۔

اتحاد زماں کے ساتھ ساتھ افسانہ نگار کو اتحاد مکاں کا بھی بطور خاص خیال رکھنا چاہیئے۔ ساتھ ساتھ یہ بھی دیکھنا چاہیئے کہ جس مقام کا ذکر وہ اپنے افسانے میں کر رہا ہے، اس کی خصوصیات کہاں تک جلوہ نما ہیں۔ اگر ایسا نہیں ہوا تو افسانے میں پیچیدگی پیدا ہو جانے کا اندیشہ ہے جو بہت بڑا عیب ہے۔

(۴) خاتمہ یا انجام: افسانے کا انجام نہایت ہی نازک مرحلہ ہے۔ اس کو زیادہ سے زیادہ سادہ، مختصر اور مؤثر ہونا چاہیئے۔ اس کے چند آخری جملے نہایت حیرت افزا، طلسمی اور ڈرامائی ہونے کے علاوہ تصور نما بھی ہونے چاہئیں تاکہ موقع اور کردار پر نہایت تیزی کے ساتھ روشنی پڑے اور کیرکٹر کی شخصیت قارئین پر اچھی طرح واضح ہو جائے۔

افسانہ اور ڈراما: افسانے اور ناول میں جس قدر تضاد ہے، اسی قدر افسانہ و ڈراما میں مماثلت پائی جاتی ہے۔ افسانے کی طرح ڈرامے میں بھی زندگی کے کسی ایک واقع کو پیش کیا جاتا ہے، اس کے صرف ایک پہلو کی ترجمانی کی جاتی ہے، اس میں بھی کم سے کم وقت میں زندگی کی خیرہ کن جھلک دکھانے کی کوشش کی جاتی ہے، لیکن ایسا جلوہ جو اپنی اثر خیزی کے لحاظ سے مکمل ہو۔ افسانے کی طرح یہاں بھی کرداروں کے تمام پہلو پر روشنی نہیں ڈالی جاتی بلکہ انہی خاص حصوں کو جلوہ گر کیا جاتا ہے جن کا تعلق براہ راست ڈراما نگار کے مقصد سے ہے۔ اس کے فنی لوازمات بھی تقریباً وہی ہیں جن کو افسانے کے لئے لازمی قرار دیا جاتا ہے یعنی یگانگی اثر، اختصار زماں، اور اختصار مکاں! دونوں افسانہ نگار و ڈرامانسٹ اپنی دماغی پیداوار میں اختصار سے کام لیتے ہیں اور بیجا تفصیلات سے حتی الامکان اجتناب کرتے ہیں۔

ادبیات عالم میں افسانے کا وجود اور اسکی تدریجی ترقی: مختصر افسانے کی تاریخ پیدائش اتنی ہی پرانی ہے جتنی کہ خود بنی نوع انسان کی۔ ہر ملک کے ادب میں ہمیں افسانوں کا پتہ بہت پہلے سے چلتا ہے۔ تہذیب و تمدن سے روشناس ہونے سے قبل بھی دنیائے قدیم قصہ خوانی میں دلچسپی لیتی تھی، چنانچہ عصر قدیم کا بیشتر لٹریچر انواع و اقسام کے مضمون سے پُر نظر آتا ہے۔ نہ صرف ہندوستان، ایران اور عرب بلکہ یہودیوں اور اہل یونان و روما تک کے ادبیات میں بھی ان مضامین کا کافی ذخیرہ موجود ہے، جن میں عام انسان کے علاوہ دیوتاؤں اور مافوق الفطرت واقعات انجام دینے والے جانبازوں کے کارہائے نمایاں درج ہیں۔ اس سلسلہ میں مثال کے لئے ہم اوپانیشد، انجیل مقدس، ایلیڈ، اوڈیسی اور داستان الف لیلہ کو پیش کرسکتے ہیں۔

مغرب میں افسانے کی پیدائش اور اس کی تدریجی ترقی کا حال بڑا پُرلطف رہا ہے۔ اگر ہم علم الاصنام کے متعلق داستانوں کو نظر انداز بھی کردیں جو یونان قدیم، روما اور سکینڈینیویا کا خاصہ رہی ہیں تو جب بھی ازمنہ متوسط میں ان قدیم حکایتوں سے دوچار ہوتے ہیں جو سراسر مذہبی رنگ میں ڈوبی ہوئی ہیں۔ اس قسم کی حکایتیں ممالک یورپ میں صدیوں رائج رہیں، یہاں

تک کہ ان کی رفتار ترقی تحریک "مذہبی اصلاح" (Reformation) کے ہاتھوں رُک گئی۔ ان قصوں کے ساتھ ساتھ فرانس اور اطالیہ میں ایسی کہانیاں بھی رواج پانے لگیں جن میں فطرت انسانی کی کمزوریوں کو بے نقاب کر کے ان پر نکتہ چینی کی جاتی تھی۔ اس قسم کی کہانیاں چاسر کی مقبول عام تصنیف ( ) میں منتہا ترقی کو پہنچ گئیں جنہیں فطرت انسانی کو مزاحیہ انداز میں نظم کیا گیا ہے۔ عہد الزبتھ میں جب کہ نثر قبولیت عامہ حاصل کرنے لگی تو انگریزی میں چند مختصر افسانے اطالیہ کے مشہور افسانہ نگار بوکیچیو کی زندہ جاوید تصنیف ( ) کو سامنے رکھ کر قلمبند کئے گئے لیکن اس عہد کے افسانوں کو ہم کسی طرح بھی طبعزاد نہیں کہہ سکتے۔ زیادہ سے زیادہ ہم انہیں ماخوذ کہہ سکتے ہیں کیونکہ ان میں سے چند تو غیر زبانوں کے تراجم ہیں اور باقی دیگر ادبیات کے افسانوں سے متاثر ہونیکے بعد لکھے گئے ہیں۔ ظاہر ہے ہم اس قسم کے افسانوں کو ہرگز طبعزاد کا لقب نہیں دے سکتے۔ علاوہ ازیں وہ افسانے حسن تخیل اور نزاکت بیان میں بھی بہت پست ہیں۔ ترتیب کی نفاست ان میں گویا آٹا میں نمک کے برابر ہے۔ صرف سولھویں صدی کے آغاز میں چند نہایت پاکیزہ افسانے ٹامس ڈیلونی نے قلمبند کئے اور ان میں غریب اور خستہ حال طبقے کے حالات کی عبرت انگیز تصویر کھینچی لیکن افسوس کہ اس مصنف کو لوگ جلد ہی فراموش کر گئے اور اس کے سٹائل کی تقلید کسی نے نہ کی۔ وجہ یہ ہوئی کہ انگریزی مصنفین سترہویں صدی میں کلاسی نمونوں سے بہت زیادہ متاثر ہوئے اور اسی طرز کی چیزیں پیش کرنے کی سعی کرنے لگے۔ پلاٹ اور سٹائل دونوں میں ان ادبائنے کلاسی ادب کی تقلید کی۔ اٹھارہویں صدی میں "رسالوی ادب" پیش ہونے لگا اور اس چیز نے از سر نو مختصر افسانے کی بنا ڈالی۔ اس عہد میں ایڈیسن، ڈیفو، جونسن اور گولڈسمتھ مختصر افسانے کے خاص لکھنے والے تھے لیکن یہ امر تعجب خیز ہے کہ انہوں نے افسانے اور مضامین میں کوئی فرق محسوس نہیں کیا اور اول الذکر کو مضامین کے اندر کی ایک چیز تصور کریں اور ان کے ذریعے سے اپنے اخلاقی قوانین کی تو سگالی کرنے لگے۔

مختصر افسانے نے جو شکل عصر حاضر میں اختیار کر لی ہے وہ بالکل ہی حال کی چیز ہے۔ انیسویں صدی میں تو اس کا روپ رنگ ہی بالکل بدل گیا اور اس کی شکل وہ نہ رہی جو قبل تھی۔ یعنی پہلے افسانے کو ایک مختصر ترین ناول سمجھا جاتا تھا جس میں چند واقعات کو جوڑ توڑ کر، دو چار کرداروں کے ساتھ افسانے کی شکل میں پیش کر دیا جاتا تھا۔ علاوہ ازیں انیسویں صدی سے قبل افسانوں میں اخلاقی جز و بیحد نمایاں ہوتا تھا لیکن اب اس چیز کو ترک کر دیا گیا ہے اور باوجود اس کے اس دور کے افسانوں میں ہمیں حسن ترتیب نظر آتا ہے اور ساتھ ساتھ کوئی اخلاقی نکتہ بھی بالواسطہ نہیں بلکہ بلاواسطہ اس کے اندر نظر آتا ہے۔

موجودہ افسانے کے حقیقی موجد ہو تھورن اور ایڈگر ایلن پو ہیں جن کا وطن امریکہ ہے۔ وہ اور ان کے فرانسیسی شاگردوں نے افسانے میں ایک خاص طرز کی بنا ڈالی جس میں حیات انسانی کے کسی ایک پہلو کو ڈرامائی طور پر جلوہ گر کیا جاتا ہے اور اس کا پس منظر ناول جیسا طویل نہیں ہوتا۔ اس کے بعد افسانے نے حیرت انگیز ترقی کی۔ افسانے کے میدان کو وسیع سے وسیع تر بنانے کی نہایت کامیاب کوشش کی گئی۔ یعنی پہلے اس کا موضوع محدود تھا لیکن اب کائنات کی ہر چیز کو اس کی وسیع دنیا میں شامل کیا جانے لگا۔

اُردو زبان میں افسانے کی پیدائش اور اُس کی تدریجی ترقی

جس طرح ادبیات عالم میں مختصر افسانے کا وجود زمانہ قدیم سے چلا آرہا ہے اسی طرح اردو میں بھی یہ کوئی نئی چیز نہیں۔ اس کے جراثیم بھی اسی وقت سے پائے جاتے ہیں جب کہ خود اردو زبان کی داغ بیل ڈالی گئی۔ البتہ یہ درست ہے کہ وہ قصے کہانیاں جو آگے چل کر مختصر افسانے کا پیش خیمہ ثابت ہوئیں، نئی نزاکتوں سے عاری تھیں کیونکہ اردو تو کیا دو صدی پیشتر ادبیات یورپ تک میں بھی ہمیں افسانے کہیں نظر نہیں آتے۔

قدیم اردو لٹریچر میں جس نوع کی کہانیاں پائی جاتی ہیں، وہ یہ ہیں:- داستان امیر حمزہ، طلسم ہوشربا، فسانہ عجائب، وغیرہ! اور اس کے سوا دوسری قسم کی چیزوں کی توقع اس عصر کے ادیبوں سے کی بھی نہیں جا سکتی تھی کیونکہ وہ عہد جس میں یہ چیزیں قلمبند کی گئیں، مسلمانوں کے انتہائی تنزل کا دور تھا۔ اہل اسلام اپنی روایتی شجاعت و بہادری کو کھو کر بدترین قسم کی رنگینیوں اور لہو لعب میں مصروف تھے، گویا وہ پستی اور انحطاط کی عمیق وادی سے گزر رہے تھے، ظاہر ہے، کہ ایسے وقت اس قسم کی لغو اور خلاف عقل کہانیوں میں وقت صرف کرنا ان کی فطرت اور ان کے مزاج کے

عین مطابق تھا۔ الغرض اس دور کی کہانیاں غیر فطری اور مافوق الفطرت باتوں پر قائم ہیں۔

اس کے بعد جس چیز نے کہانیوں میں زیادہ دخل دیا وہ مذہب تھا۔ وہی مذہب جو ہر زبان کے ابتدائی لٹریچر کا خاص طرہ امتیاز رہا ہے صرف اردو ہی نہیں بلکہ ہر لٹریچر میں یہ خصوصیت کے ساتھ کارفرما رہا ہے ظاہر ہے کہ ادب اردو اس کی زد سے کس طرح بچ سکتا تھا۔ اسی لئے مذہبی اور اخلاقی کہانیاں بھی ہماری زبان میں لکھی گئیں۔ اور خوب لکھی گئیں۔

حق ناشناسی ہوگی اگر اردو میں مختصر افسانے کی تدریجی ترقی کا حال بیان کرتے ہوئے، فورٹ ولیم کالج کا ذکر نہ کیا جائے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اس نے ہماری زبان پر ایسے احسانات کئے ہیں جن سے ہم کبھی سبکدوش نہیں ہو سکتے۔ اردو میں کہانیوں کو فروغ دینے کے لئے نوجوان گلکرسٹ نے ۱۸۰۳ء میں چھوٹے چھوٹے مضمون کا ایک مجموعہ "مشرق" کے نام سے شائع کیا جو غیر زبانوں کے افسانوں سے کسی نہ کسی طرح ماخوذ ہیں۔ اسکے بعد ہی کاظم علی جوان نے سعی پیہم سے نور بیتال پچیسی کو اردو نثر کا جامہ پہنایا۔ غرضکہ فورٹ ولیم کالج قائم ہونے کے بعد تقریباً نصف صدی تک مافوق الفطرت کہانیاں کثرت سے لکھی گئیں۔

غدر ۱۸۵۷ء کے بعد سارے ملک میں بیداری کی ایک عام لہر دوڑ گئی اور وہ لوگ جو خواب خرگوش میں مبتلا تھے یکایک چونک پڑے۔ اس چیز نے ملک کے ادب پر بھی اچھا خاصہ اثر پیدا کیا اور خلاف عقل مضمون کی جگہ ان کہانیوں نے لے لی جن میں گھریلو زندگی کے واقعات درج ہیں۔ خیال آرائی کی جگہ حقیقت نگاری نے لے لی جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ پرانی طرز کی کہانیوں کو خیرباد کہہ کر اب نئی طرز کے افسانے لکھے جانے لگے۔ اس قسم کی کہانیوں کی بنا ڈاکٹر نذیر احمد نے ڈالی جنہوں نے اردو میں سب سے پہلی مرتبہ چلتی پھرتی زندگی کی تصویر پیش کی اور خلاف عقل عناصر سے پرہیز کرنے کی کوشش کی۔ لیکن پھر بھی یہاں یہ کہہ دینا ضروری ہے کہ جو کہانیاں ڈاکٹر نذیر احمد اور ان کے مقلدین نے قلمبند کیں وہ عصر حاضر کے مختصر افسانوں کی مانند نہیں کیونکہ فنی افسانے اس وقت تک اردو میں ناپید تھے۔ وہ افسانے جو درحقیقت فنی خصوصیات کے حامل ہیں بالکل حال کی چیز ہیں یعنی انہیں موجودہ صدی کی پیداوار سمجھا جاسکتا ہے۔

اور اس کی خاص وجہ انگریزی زبان کا اثر قرار دی جاسکتی ہے۔ جہاں تک ہمارا خیال ہے اردو میں سب سے پہلے مختصر افسانے شائع کرنے کا سہرا اخبار اودھ پنچ کے سر باندھا جاسکتا ہے لیکن یہاں یہ عرض کردینا نہایت ضروری ہے کہ اس صدی کے ابتدائی دور میں بھی جو افسانے تصنیف کئے گئے وہ کوئی اپنی خاص امتیازی خصوصیت کے حامل نہیں۔ اس وقت جو افسانے لکھے گئے وہ یا تو انگریزی افسانوں کے تراجم ہیں یا پھر انگریزی و فرانسیسی شراب کو دنیائے اردو میں ڈھال دیا گیا ہے۔

اردو میں سب سے پہلے فنی مختصر افسانہ کس نے لکھا اس کا صحیح جواب دینا قریب قریب ناممکن ہے البتہ یہ ضرور ہے کہ حضرات راشد الخیری، سلطان حیدر جوش اور سجاد حیدر کو ہم اسکے علمبرداروں میں شمار کرسکتے ہیں۔

اس صدی کے آغاز ہی سے ہفتہ وار اور روزانہ اخبارات کے علاوہ اردو میں ماہوار رسالے شائع ہونا شروع ہوئے۔ اس کے لئے ایڈیٹروں کو سامان دلچسپی فراہم کرنے کا سب سے آسان ذریعہ افسانہ ہی معلوم ہوا چنانچہ ان رسالوں کی وجہ سے مختصر افسانے کثرت سے لکھے جانے لگے۔ لیکن اس سلسلے میں ایک قابل غور بات یہ ہے کہ اس عہد کے افسانے زیادہ تر اصلاحی پہلوئے ہوئے ہیں بلکہ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اس وقت جان بوجھ کر افسانوں کو اصلاحی مقاصد کی اشاعت کا آلہ بنایا گیا۔ اس دور میں جوش نے خصوصیت کے ساتھ ایک خاص قسم کے اصلاحی افسانے لکھے اور ان کے ذریعے سے مغربی تہذیب و تمدن کے خلاف علم بغاوت بلند کیا گویا مغرب پرستی کی جو ہر ملک میں اس وقت دوڑ گئی تھی، اس کے تدارک کے لئے اصلاحی افسانے لکھے۔ اس دور کے زیادہ تر افسانوں میں اصلاحی مقصد اس قدر نمایاں ہوگیا ہے کہ افسانے کا فنی حسن بالکل ہی معدوم نظر آتا ہے اور ان میں ہمیں وہ جاذبیت اور دلچسپی نظر نہیں آتی جو فنی مختصر افسانے کی خصوصیات ہیں۔

اس کے بعد مختصر افسانے کی تاریخ میں وہ زبردست دور آیا جب مغربی افسانے ہماری زبان میں کثرت کے ساتھ ترجمہ کئے جانے لگے۔ اس سے ہمارے لکھنے والوں کے لئے نئی نئی شاہراہیں ایجاد ہوگئیں اور وہ ہر قسم کے افسانوں سے دوچار ہوئے۔ یہ اسی

کا نتیجہ ہے کہ ایک مختصر سے عرصہ میں ہماری زبان نے افسانہ نویسی میں حیرت انگیز ترقی کر لی۔ اور اصلاحی افسانوں کے علاوہ دیگر نوع کے افسانے بھی پیش کئے جانے لگے۔ فنی خوبیاں جو پندرہ سال قبل افسانوں میں ناپید تھیں، اب پوری آب و تاب کے ساتھ نظر آنے لگیں۔ مقامی رنگ پر، جو افسانے کا خاص طرہ امتیاز ہے اور جو پہلے اردو میں یکسر معدوم تھا، اب پوری توجہ صرف کی جانے لگی۔ اور ملک کی تمام اہم خصوصیات کو شد و مد کے ساتھ افسانوں میں پیش کیا جانے لگا۔ مقامی رنگ کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ افسانے سے مقامی حالت کا کچھ اندازہ ہوتا ہے، چنانچہ یہ چیز انگریزی، فرانسیسی اور بالخصوص روسی ادب میں پوری طرح موجود تھی لیکن ہماری زبان میں اس کا وجود نہ تھا۔ راشد الخیری، سدرشن، پریم چند اور اعظم کریوی وغیرہ نے اپنے افسانوں میں مقامی رنگ کا خاص طور پر خیال رکھا اور اس لحاظ سے انکے افسانے نہایت ہی قدر و منزلت کے مستحق قرار دیئے جا سکتے ہیں۔

اس وقت مختصر افسانے نے ہماری زبان میں ایک امتیازی ترقی حاصل کر لی ہے۔ اور ہمیں یہ دیکھکر نہایت مسرت ہوتی ہے کہ مغربی زبانوں کی طرح ہمارا دامنِ ادب بھی افسانوں کے رنگا رنگ پھولوں سے پُر نظر آتا ہے اور ہر نوع کے افسانے ہمیں بھی دکھائی دیتے ہیں جو نہ صرف کافی دلچسپ بلکہ فنی بلندی کے اعتبار سے بھی اس لائق ہیں کہ ہم دیگر زبانوں کے مقابلے میں انہیں پیش کر سکیں۔ یہ ضرور ہے کہ عشقیہ افسانوں کی ہماری زبان میں کثرت ہے۔ تاہم معاشرتی، رومانی، کلاسی، مزاحیہ، ہیبتناک وغیرہ بھی ناپید نہیں۔ اب اشتراکیت اور بالخصوص ادبیات روس سے متاثر ہو کر ہمارے بعض افسانہ نگار ایک نئی قسم کے افسانے لکھنے لگے ہیں جن میں مزدورانہ جذبات کو ابھارا جاتا ہے، اور سرمایہ داری کی لعنت کی طرف توجہ مبذول کرائی جاتی ہے۔ اسے ہماری زبان کے لئے ایک نیک فال سمجھئے کہ اس نوع کے افسانوں سے ہمارے لکھنے والوں کے لئے ایک اور نئی راہ کھل گئی ہے

محترمہ زیب عثمانیہ گولڈ میڈلسٹ

نوائے خودی

جاہلِ مطلق رہی وہ قومِ افلاطوں نسب — تلخ تھا جس کا تمدن پست تھا جس کا ادب
کون پوچھے بیر ہے فطرت کو کیوں اس نام سے — مجھ سے جو ہر بار کہتی ہے کہ باطل سے نہ دب
عہدِ ظلمت میں جو اپنا رخ سوئے منزل رہا — یہ مرا ذوقِ نظر ہوگا تیرا ذوقِ طلب
میں نے اِن آنکھوں سے دیکھا ہے خدا کو بارہا — امر یہ شیخ و برہمن کے لئے ہوگا عجب
اہلِ دنیا حشر کا ہنگامہ کہتے ہیں جسے — اک زمانہ ہے دلوں سے درد سا اٹھتا ہے جب
عقل کو حاصل نہیں دونوں جہاں کا اعتماد — اس کے آگے طے نہ کرائے زیبؔ نا لوٹے ادب

جناب انور کمال

شکستہ آئینہ

وہ آہستہ آہستہ سیڑھیوں پر چڑھا۔ چابی تالے میں ڈالی مگر اسے گھمانے سے پیشتر رک گیا اور دم لینے کے لئے سیڑھیوں پر بیٹھ گیا۔ دروازے پر ایک تختے کے اوپر اس کا نام جلی حروف میں کندہ تھا۔

وہ دیر تک وہاں چپ چاپ بیٹھا رہا۔ پھر آہستہ آہستہ اٹھا۔ دروازہ کھولا۔ بجلی جلائی اور اپنے آپ کو بجھی ہوئی انگیٹھی کے سامنے رکھی ہوئی آرام کرسی پر گرا دیا۔ وہ تھکا ہوا تھا۔ اس کی تھکن کی وجہ کوئی بھی تو نہ تھی۔ پھر بھی وہ تھکا ہوا تھا۔ ایک قسم کا خمار اس کے دل و دماغ پر طاری تھا۔

"میرا خیال ہے۔ میں بوڑھا ہو رہا ہوں۔ میں ضرور بوڑھا ہو رہا ہوں" کرسی پر بیٹھ کر وہ بڑبڑایا اور درحقیقت وہ ایک بوڑھا تھا۔ ایک کبڑا اور جھریاں پڑے ہوئے چہرے والا بوڑھا۔ اس کی عمر ساٹھ سال سے تجاوز کر چکی تھی۔ وہ پھر بڑبڑایا۔

"میں یقیناً بوڑھا ہو رہا ہوں"

اسے اپنی زندگی کا ایک ایک واقعہ نظر آ رہا تھا۔ اور وہ سوچ رہا تھا کہ وہ ہمیشہ ہر کام میں ناکام و نامراد رہا ہے دنیا کی کسی چیز نے اسے فائدہ نہ دیا تھا کسی چیز کو بھی وہ حاصل نہ کر سکا تھا۔

"کوئی چیز بھی میں نے نہیں پائی مگر ایک لمبی عمر" وہ بڑبڑایا۔

وہ خاموش تھا۔ ناامید تھا اور آج کی رات خاص طور پر اس کے لئے مایوس کن رات تھی۔ ایک اندھیری اور بے کیف رات۔

اس کی کرسی سے ایک دو گز کے فاصلے پر ایک میز پڑی تھی۔ جس پر شراب کی ایک بوتل چند سوڈے کی بوتلیں اور ایک گلاس رکھا ہوا تھا اس نے خمار آلود نظروں سے ان کی طرف دیکھا۔ مگر جب اس نے پینے کے لئے اٹھنے کی کوشش کی تو ناکام رہا۔ شراب کا ایک گھونٹ اس کو نئی زندگی دے گا! اسے طاقت دے گا۔ اس کی تھکن دور کر دیگا مگر یہ خیال بے سود تھے۔ . . . . !!

پھر اسے اپنے دوستوں کا خیال آیا جو آدھ گھنٹہ پہلے اس کے ساتھ ہوٹل میں کھانا کھا رہے تھے۔ مگر اس کو ایسا محسوس ہوا۔ جیسے ان سے بچھڑے ہوئے کئی سال کا عرصہ گذر چکا ہے۔ اس کی زندگی ساری زندگی تکلیفوں میں گذری تھی۔ اگر اس نے اپنی زندگی میں کچھ دن ہنسی خوشی گذارے ہوتے تو وہ آسانی سے ان تکلیفوں کو برداشت کر سکتا تھا۔

اگر اس کی زندگی ایک کیف آور زندگی ہوتی تو وہ اس کی دشواریوں کو نظر انداز کر دیتا۔ مگر اس کی زندگی ایک خشک زندگی تھی۔ پھیکی اور رنج والم سے بھرپور زندگی۔ اس نے نہ تو کچھ اپنے لئے کیا تھا اور نہ کوئی کام دوسروں کی بھلائی کے لئے۔ مگر آج وہ تھکا ہوا تھا۔ بالکل تھکا ہوا۔

کالج چھوڑنے کے وقت لوگوں کو اس سے بڑی بڑی امیدیں تھیں اور وہ اپنے آپ کو بڑے بڑے عظیم الشان کاموں کے قابل سمجھتا تھا۔ وہ ذہین تھا اور محنتی بھی۔ وہ نام پیدا کرنا چاہتا تھا۔ اس نے کئی دن خون پسینہ ایک کئے رکھا۔ کئی راتوں کا آرام اپنے لئے حرام سمجھا — شہرت حاصل کرنے کے لئے اس نے کتابیں لکھیں مگر اس کی طرز تحریر بالکل پسند نہ کیا گیا اور اس کا نام حرف غلط کی طرح مٹا دیا گیا۔ ناکامی کا مایوس کن نقطہ اسکے تھکے ہوئے دماغ کو اذیت پہنچا رہا تھا۔ اس نے آج تک جس چیز کو حاصل کرنا چاہا اسی نے اسے فریب دیا۔

اس نے اپنے ہاتھوں کی طرف دیکھا۔ جو جھریاں پڑنے سے بالکل بدشکل ہو گئے تھے۔ اس کی نظریں وہیں جم گئیں اس نے بڑے غور سے اپنے ہاتھوں کو جو نحیف اور کمزور ہو چکے تھے۔ دوبارہ دیکھا ——— !

"اے میرے معبود۔ یہ کتنے سفید ہیں ان پر کتنی جھریاں پڑی ہوئی ہیں" وہ بڑبڑایا۔ اس کی نسیں نیلی تاروں کی طرح گوشت پر جمی تھیں کھال ڈھیلی ہو کر ایک جگہ جمع ہو گئی تھی۔ وہ اس کی طرف دیکھتا

رہا حتیٰ کہ اس کی آنکھیں بند ہو گئیں۔ وہ سو نہیں رہا تھا صرف تھکا ماندہ تھا۔ اس نے اپنا سر اٹھایا اور اپنی حالت کو تبدیل کرنے کی کوشش کی۔ وہ سردی محسوس کر رہا تھا۔ مگر بستر تک جانے یا آگ جلانے کی نسبت سردی برداشت کرنا بہت آسان تھا۔

دنیا کتنی خاموش تھی۔ کمرہ کتنا خالی اور چپ چاپ تھا۔

اس پر تنہائی نے گہرا اثر کیا۔ یہاں کوئی انسان نہیں ہے۔ اگر وہ مر گیا یا اسے کسی قسم کی مدد کی ضرورت محسوس ہوئی۔ تو کیا ہوگا۔ آواز دے مگر کون سنے گا۔ ہاں صبح نو بجے ملازم چائے دینے آئے گی اور اگر اتنے عرصے میں ہی اسے کچھ ہو گیا تو اس کے سوا اور کچھ نہ ہوگا۔ کہ اس کی لاش اتنی دیر پڑی رہے۔ افسوس اگر وہ شادی کر لیتا تو اس کے بچے ہوتے۔ ایک بیوی ہوتی۔ ایک گھر ہوتا۔ مگر اب یہ سنسان۔ ایک بوڑھے کنوارے کا اجڑا ہوا کمرہ تھا۔ اگر وہ سچ مچ شادی کر لیتا یہ خیال گویا اس کے افسوس کا سرچشمہ تھا اور اسے رہ رہ کر افسوس آ رہا تھا۔ کہ اس نے شادی کیوں نہ کی۔ مگر وہ کر ہی کیا سکتا تھا۔ اس نے جس لڑکی کو اپنا بنانے کی کوشش کی وہ اس کی بیوی نہ بن سکی۔ ہائے ناکامی۔

زہرہ اگر اس کی بیوی بن جاتی تو دنیا کی کوئی چیز بھی اسے رنج نہ پہنچا سکتی تھی۔ وہ رنج و غم۔ تکالیف و مصائب کو قدرت کا مذاق سمجھتا مگر یہ اس کی از حد بدقسمتی تھی۔ کہ وہ زہرہ کو نہ حاصل کر سکا۔ وہ سب سے پہلے زہرہ کو اس وقت ملا۔ جب وہ اٹھارہ سال کی تھی۔ اور وہ خود بائیسویں برس میں ——— اسے اس کا چمکتا ہوا چہرہ۔ خوبصورت بال اور کالی آنکھیں یاد آ رہی تھیں۔ مکمل بارہ سال تک اس نے اسے جیتنے کی کوشش کی اس سے شادی کی امید رکھی۔ اسے چاہتا رہا۔ مگر بے سود۔ وہ اس کے باپ کے مکان پر جاتا۔ جہاں اس کی خاطر و مدارات ہوتی۔ زہرہ اس سے باتیں کرتی۔ اس کے ساتھ تماشہ دیکھنے کے لئے سینما جاتی۔ غالباً زہرہ کے باپ کے پاس بیٹی کی شادی کے لئے روپیہ نہ تھا یا زہرہ نے شادی سے انکار کر دیا تھا۔ مگر زہرہ نے دوسری شادی بھی نہ کی تھی۔ اسے بلایا گیا۔ جب وہ سخت بیمار تھی۔ اس کے بعد اس کی زندگی کا منحوس دور شروع ہو گیا۔ اس کے راستے میں مصیبتوں کی ندی آ گئی۔ تکلیفوں اور کلفتوں سے بھری ہوئی اندھی ندی۔ اور پھر اس کے بعد موت کی سی خاموشی۔ اسے بتایا گیا۔ کہ زہرہ مر گئی ہے۔ وہ اس کے کمرے میں گیا۔ اس کا آخری دیدار کرنے کے لئے اور پھر وہ اس کے عزیز و اقارب کے ساتھ جنازے میں شریک ہوا۔ اس دن موسم ناگوار تھا۔ ہر طرف اداسی چھا رہی تھی۔ جنازہ گاہ سے واپس آنے پر اس کی ماں بولی۔

"کیا تم میری پیاری بیٹی کی کوئی چیز بطور نشانی لینا چاہتے ہو؟"

میز پر ایک آئینہ ہاتھی دانت کے فریم میں جڑا ہوا رکھا تھا۔ اُس نے اپنا چہرہ اس میں کئی ہزار مرتبہ دیکھا ہوگا۔ سینکڑوں دفعہ مانگ نکالی ہوگی۔ یہی خیال تھا۔ جو اس کے دماغ میں رہ رہ کر آتا۔ کوئی نہ کوئی چیز تو اس بے جان آئینے نے میری پیاری محبوبہ کے حُسن کو دیکھ کر جذب کر لی ہوگی۔ یہ سوچتے ہوئے اُس نے آئینہ کو مضبوطی سے اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ اور آہستہ آہستہ قدم بڑھاتا ہوا زہرہ کے مکان سے باہر نکل گیا۔ اُسکی حالت اُس جواری کی سی تھی جو اپنا سب کچھ ہار چکنے کے بعد تھوڑی سی نقدی کو اپنا سب کچھ جان کر جوا خانہ سے باہر آ گیا ہو۔

وہی آئینہ اس وقت سامنے ہاتھی دانت کے فریم میں جڑا ہوا میز پر چمک رہا تھا۔ وہ ٹھیک اپنی جگہ پر تھا۔ بُڑھے نے اپنی کرسی کو آگے کی طرف جھکایا۔ اور آئینہ کی طرف دیکھا۔ اسکی نظریں آئینہ پر جم کے رہ گئیں وہ بڑبڑایا "اگر وہ مجھ سے شادی کر لیتی تو کبھی نہ مرتی۔ میری محبت۔ میرا عشق۔ میرا اندھا پریم اُسے کبھی نہ مرنے دیتا۔ وہ کبھی نہیں مر سکتی تھی" وہ اس فقرے کو بار بار دُہرا رہا تھا۔ یہ شاید اسکی تھکن کی وجہ تھی۔ کہ جس چیز کی طرف وہ دیکھتا تھا۔ اُسکی نظریں اُسی پر جم جاتی تھیں۔ اور جو فقرہ وہ بڑبڑاتا اُسے وہ دیر تک دُہراتا رہتا۔ وہ تھوڑا آگے کی طرف جھکا۔ اور ہاتھ بڑھا کر شیشے کو اپنے ہاتھوں میں لیا۔ مگر اس کے ہاتھ کانپنے۔ دل لرزا۔ دماغ چکرایا۔ شیشہ اس کے ہاتھ سے گر گیا۔ اس کے گرنے کی آواز آئی

اور وہ چکنا چُور ہو گیا۔ اس کے گرنے کی آواز اس کے لئے ایک روحانی تکلیف تھی۔ اُس نے پھر اپنے آپ کو کرسی پر گرا دیا۔۔۔۔ آنکھیں بند کر لیں۔ اس کا دل اس طرح دھڑک رہا تھا۔ جیسے چور کا چوری کرتے وقت دھڑکتا ہے۔ ٹوٹے ہوئے آئینے کے شیشے زمین پر اُس کے پاؤں میں پڑے تھے۔ وہ بڑی سردی محسوس کر رہا تھا۔ اُس کا دماغ سُن ہو رہا تھا۔ اُس کے کانوں میں بلند آوازیں آ رہی تھیں۔ اُس کے ہاتھ ایک مرتبہ اُٹھے۔ اور پھر گر پڑے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ جیسے وہ کسی کو مدد کے لئے بُلا رہا ہے۔ وہ کسی لمبے سفر پر جا رہا تھا۔

"ہاں یہ مر گیا ہے"

"اسے مرے ہوئے کئی گھنٹے ہو چکے ہیں۔ یہ آرام کرسی پر لیٹا ہوا آرام سے مر گیا ہو گا"

"بیچارہ غریب انسان"

خادم نے کہا۔

"یہ ٹوٹا ہوا آئینہ بتا رہا ہے۔ کہ اس کا دل جو شیشے کی مانند تھا۔ ٹوٹ گیا ہو گا"

جناب سید ضمیر جعفری بی۔ اے

یاد ہے

"تجلیوں" سے کھیلنے والی نگاہو! یاد ہے؟
ایک بستی دامنِ "منگلا"[۱] میں بھی آباد ہے!

آہ' وہ بستی کہ جس کے سبزہ زاروں میں کبھی
آہ' جس کی سانولی راتوں کی نرم آغوش میں
آہ' جس کے مد بھرے ساون کی برساتوں میں ہم
جس کے بے ترتیب' سادہ اور بے ڈھنگے مکاں
جس کے آسیبی "ذخیرے" کے درختوں کے تلے
آہ' جس کی لہلہاتی کھیتیوں کے سائے میں
جس کی' بدصورت' گھنیری بیریوں کی چھاؤں میں
جس کے' پتھریلے' چٹانی راستوں میں بیٹھ کر
جس کی' خود رو' پست قامت جھاڑیوں کے سلسلے
جس کا ہر چپہ مقدس' جس کا ہر ذرہ حسیں

موجِ نکہت بن کے آوارہ تھی روحِ دوستی
جذب ہو جاتے تھے ہم اک "نغمۂ خاموش" میں
غرق ہو جاتے تھے روحانی ملاقاتوں میں ہم
کہہ رہے ہیں عشق کی پاکیزگی کی داستان
ہم سنا کرتے تھے ننھے طائروں کے زمزمے
ہم نے مل کر کچھ دیہاتی گیت اکثر گائے ہیں
بارہا کانٹے چبھے ہیں تیرے نازک پاؤں میں
گفتگو کرتے تھے اکثر "گردشِ ایام" پر
گونجتے رہتے تھے "پیلو" کے پہاڑی گیت سے
جس کی مٹی بھی ہے سونا' جس کے پتھر بھی نگیں

مرے شہری دوست! سچ کہنا تجھے کیا یاد ہے؟
آہ وہ بستی' جو اب "ویران سی آباد" ہے!

[۱] منگلا جہلم میں ایک پہاڑی ہے۔

جناب سید امتیاز علی تاج
(بی اے)

لیل و نہار از طالب بنارسی

طالب بنارسی اپنے وقت میں اردو کے مشاق شاعر اور نثر نویس تھے۔ اُس زمانے کے کئی ادبی رسائل میں بھی ان کا کلام شائع ہوتا رہتا تھا۔ لیل و نہار سے پہلے یہ دلیر و شیر، نادان اور کئی اور ڈرامے تصنیف کر چکے تھے۔ لیکن ان ڈراموں میں اپنے زمانہ کے دوسرے ڈراموں سے جدا کوئی نمایاں اور غیر معمولی بات نہ تھی۔ ان کی ڈرامانویسی کے جوہر لیل و نہار ہی میں کھلے جو اگرچہ ان کا آخری ڈراما تھا۔ مگر اردو کے پرانے ڈراموں میں سے ہے

سنا ہے اسی کھیل کا پلاٹ انہوں نے لارڈ لٹن کے ناول رننگ اینڈ نائٹ سے اخذ کیا تھا۔ پلاٹ کہیں سے لیا ہو۔ یا ان کا طبع زاد ہو۔ بہرحال طویل اور پیچیدہ ہے۔ مگر اس کے مناظر نہایت ہوشمندی سے اس طرح قائم کئے گئے ہیں۔ کہ باوجود اپنی پیچیدگی کے فسانہ دل میں اترتا چلا جاتا ہے۔ اور وضاحت کے لئے نہ غیر ضروری مناظر کی کثرت ہے۔ اور نہ تفصیلی انداز کی تقریروں کی

پلاٹ بہت ہی مختصر طور پر یہ ہے۔ کہ جہاں سیر کے چچا نے یہ لکھا تھا۔ کہ اگر جہاں سیر نے اس کی مرضی کے خلاف شادی کی تو حصہ ترکے سے ایک کوڑی بھی نہ پائے گا۔ پردیس میں جہاں سیر نے چچا سے پوشیدہ شادی کر لی۔ اور اسے اس خوبی سے چھپایا کہ اس کا بڑا لڑکا جوان ہو گیا مگر وطن میں کسی کو اس کی خبر نہ ہونے پائی چچا کا ڈھ پا چکنے کے بعد گھوڑے سے گر کر جہاں سیر کا اچانک انتقال ہو گیا اس کے بیوی بچوں نے اپنے آپ کو جہاں سیر کا وارث کہا۔ مگر جہاں سیر کے بھائی فلک سیر نے سب کچھ جانتے ہوئے شہناز کو جہاں سیر کی بیاہتا بیوی ماننے سے انکار کر دیا۔ ان کی خانہ تلاشی ہوئی۔ قاضی اور گواہ ڈھونڈے گئے لیکن اتفاق سے کچھ بھی نہ ملا۔ اور ثبوت نہ ہونے کی صورت میں جہاں سیر کے بیوی بچے گھر سے نکال دیئے گئے

اور غربت کی مصائب نے شاہناز کا کام تمام کر دیا بچے طرح طرح کی مصائب میں گرفتار ہوئے۔ اور جب ان کی مشکلات انتہا کو پہنچ گئیں۔ تو محض حسن اتفاق کی بدولت نکاحنامہ مل گیا۔ جسے دکھا کر جہاں سیر کی اولاد اس کی جائداد کی وارث قرار پائی۔

پلاٹ کی بنیاد کسی اہم بات پر نہیں۔ بلکہ محض ایک حادثہ پر قائم ہے۔ کہ ایک وقت نکاحنامہ نہیں ملتا۔ اور دوسرے وقت اتفاق سے مل جاتا ہے۔ لیکن اگر اس بنیادی کمزوری سے قطع نظر کر لی جائے۔ تو یہ ڈراما اپنے زمانے کے ڈراموں میں بے حد ممتاز معلوم ہوتا ہے

اس کی سب سے نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اردو کے پہلے ڈراموں کی طرح اس کا تعلق بادشاہوں اور نوابوں کی زندگی پر نہیں، بلکہ ایک متمول شخص کے خاندانی حالات سے ہے۔ اور وہ سب حالات اسی نوع کے ہیں جن میں کوئی بھی انوکھی یا عجیب بات نہیں۔ ایسے زمانہ میں جب کہ لوگ رومانوی انداز کے واقعات دیکھنے کے عادی اور متمنی تھے۔ طالب کا اس حد تک سادہ ڈراما لکھ دینا ایک ایسا اقدام تھا۔ جس کی اہمیت کو کسی طرح نظرانداز کرنا ممکن نہیں ہے

معلوم ہوتا ہے۔ ان کی طبیعت میں اس زمانہ کے رومانوی ڈراما کے خلاف ردعمل پیدا ہوا۔ اور انہوں نے پوری کوشش کی کہ لیل و نہار کو اس قسم کے تمام اثرات سے پاک رکھیں اس خیال کو اس بات سے اور بھی تقویت پہنچتی ہے۔ کہ اس کھیل میں عشق و محبت کے جذبات اسی مقدار میں ہیں جیسے آٹے میں نمک۔ تین ایکٹ اور اٹھارہ سین کے ڈرامے میں صرف دو طویل مناظر کے ذرا ذرا سے حصے ہیں۔ جس میں ہیرو اور ہیروئن

عشق و محبت کے گنتی کے چند فقرے بولتے ہیں۔ ڈرامے کی یہ خصوصیت واضح طور پر کہتی ہے کہ طالب تمام مروجہ معمولی باتوں سے ہٹ کر ایک نئے انداز کا ڈرا لکھنا چاہتے تھے۔ انہوں نے نہ صرف واقعات ڈرامہ میں سے رومانوی عنصر نکالا۔ بلکہ مکالمات میں سے بھی اسے بڑی حد تک خارج کر دیا اور بے حد سادہ نثر لکھی جس میں قافیہ بھی زبردستی نہیں، بلکہ عموماً محض اتفاق سے آجاتا ہے اور اشعار بھی مقابلتاً بہت کم ہیں۔

کھیل کی کامیابی کے لئے طالب نے تمام تر بھروسہ اس بات پر کیا۔ کہ تماشائیوں کو اس میں روزمرہ زندگی کا عکس نظر آئے۔ وہ ایسے واقعات دیکھیں، جو اکثر امیر گھرانوں کے متعلق سننے میں آتے رہتے ہیں۔ ایسے کیرکٹروں سے دوچار ہوں جن سے انہیں زندگی میں عموماً واسطہ پڑتا رہا ہے۔ ڈراما کی فضا ایسی ہو جو سٹیج کی زندگی سے بہت قریب کی چیز بنا کر دکھا دے۔

پہلے ہی منظر میں عورتوں کے گانے بجانے کے بعد جہاں سیر داخل ہوتا، اور بیوی سے کہتا ہے "کیوں صاحب رتجگے سے فراغت پالی؟"

شہناز۔ جی ہاں رتجگا تو ہو چکا۔ اب درگاہ کی منت چڑھانی ہے

جہاں سیر۔ جاؤ منت چڑھاؤ جلدی جاؤ۔

اتنے میں بڑا بیٹا فیروز اور چھوٹا بیٹا انور داخل ہو کر آداب بجالاتے ہیں۔ فیروز کہتا ہے "ابا جان درگاہ کی سواری تیار ہے"

ننھے میاں کہتے ہیں "ابا جان درگاہ میں بھی جاؤں گا۔

جہاں سیر۔ (مسکرا کر بولتا ہے) او ہو آپ بھی جائیے گا؟ اچھا جاؤ تم بھی زیارت کر آؤ۔ (بڑے لڑکے کو ہدایت دیتا ہے) سب نوکر ساتھ جائیں گے۔

فیروز۔ جی ہاں ہمایوں بھائی بھی ساتھ آئیں گے۔

(ہمایوں آتا اور شرمایا شرمایا چچی کو سلام کرتا ہے)

ہمایوں۔ چچی جان آداب عرض ہے

شہناز۔ جیتے رہو بیٹا۔ شرماتے کیوں ہو؟

جہاں سیر۔ نئے نئے آئے ہیں، اس لئے شرماتے ہیں۔ ہل مل جائیں گے تو نہ شرمائیں گے

شہناز (جہاں سیر سے پوچھتی ہے) باغ سے آپ اکیلے آئے۔ چھوٹے میاں کو ساتھ نہ لائے؟

جہاں سیر۔ وہ ابھی تک وظیفہ پڑھ رہے ہیں۔

شہناز۔ اخاہ! بڑے اللہ والے ہیں۔

جہاں سیر۔ ہاں رات تھکے ماندے سفر سے آئے۔ وہیں باغ میں سو رہے ہیں۔ یہاں نہ آسکے۔ تو جاؤ۔ دیر نہ لگاؤ۔

جس زمانہ میں یہ ڈراما لکھا گیا تھا۔ اس کا خیال کیجئے۔ اور میاں بیوی اور بچوں کی اس گفتگو کو دیکھئے کس قدر بے ساختگی اور گھریلو فضا موجود ہے۔ جدید انگریزی ڈراما کا ذوق عام ہو جانے کے بعد آج بھی یہ مکالمہ کسی طرح معیار سے کم نہیں معلوم ہوتا۔ کردار نگاری میں طالب نے جس اختصار سے کام لیتے ہوئے اپنا کمال دکھایا۔ فلک سیر کے کیرکٹر میں دیکھئے۔ یہ حضرت بگلا بھگت ہیں۔ ہاتھ میں تسبیح رکھتے ہیں۔ دن رات وظیفہ پڑھنے سے کام ہے۔ لیکن دل کے اندر زر و مال کی ہوس گھر کئے ہوئے ہے۔ اپنے مرحوم بھائی کی زبانی معلوم کر چکا ہے۔ کہ شاہناز ان کی بیاہتا بیوی ہے۔ اور نکاحنامہ کہیں کاغذوں میں ادھر ادھر ہو گیا ہے۔ لیکن بھائی کے آنکھیں بند کرتے ہی بھابی کو رکھی ہوئی رنڈی قرار دے دیتے ہیں جسے ترکے میں سے اسے کچھ نہیں دینا چاہئے۔ صرف اس کا ایک وظیفہ مقرر کر دینے کا تہیہ کر لیتے ہیں۔ عالم سوز وکیل اور مرحوم جہاں سیر کے وفادار ملازم اشرف کو ساتھ لے نکاحنامہ کی تلاش میں گھر کے کاغذات ملاحظہ فرما رہے ہیں۔

عالم سوز وکیل کچھ کاغذات دیکھ کر کہتا ہے۔ جناب ان کاغذوں کو بند کر کے مہر لگا دیجئے۔

فلک سیر (آہ بھر کر بولتا ہے) عالم سوز کیا مہر لگائیں۔ جی پر جو گزرتی ہے کیا بتائیں۔

اشرف کے منہ سے بے اختیار آہستہ سے نکل جاتا ہے۔

"جھوٹے کے منہ میں خاک"

فلک سیر اس کا فقرہ سنتا نہیں مگر اسے بولتا دیکھ کر پوچھتا

ہے۔"کیوں بھئی کچھ کہنا ہے؟"

اشرف "جی ہاں یہ فرمائیے۔ کہ بڑی سرکار کے نوکر جاکر بحال رہیں گے یا جواب پائیں گے۔"

بگلا بھگت فلک سیر کہتا ہے: "بھائی نوکر رہیں گے تو بھائی کی یاد دلائیں گے۔ ہمارے دکھے دل کو اور دکھائیں گے۔"

منہ پھٹ اشرف فلک سیر کو خوب سمجھ چکا ہے۔ کہتا ہے۔ "بے شک اور اس بھاری ملکیت کے ملنے کی یاد بھی دلائیں گے"

یہ سن کر فلک سیر آگ بگولا ہو جاتا ہے: "بے ادب، بدگمان دو کوڑی کا آدمی، اور گز بھر کی زبان۔"

اشرف بھی گرم ہو جاتا ہے۔ "بے شک میں دو کوڑی کا فرد ہوں، مگر ایمان کا سچا اور اپنی وفاداری پر مغرور ہوں۔"

فلک سیر "نکل جا میرے مکان سے۔ عالم سوز حساب چکا دو"

اشرف "بڑی عنایت ہے۔ مجھے خود ایسی جگہ سے نفرت ہے"

عالم سوز "باہر بیٹھو، میں آتا ہوں۔ تمہاری باقی دلاتا ہوں۔"

اشرف باہر ہو جاتا ہے فلک سیر غصے کی اس بے اختیاری کا اثر کم کرنے کے لئے آہ بھر کر کہتا ہے: "عالم سوز! اس آتش غم کو کیونکر بجھائیں۔"

میز پر شراب کی بوتل رکھی ہے۔ عالم سوز جواب میں ایک پیالہ بھر کر پیش کرتا ہے: "اس گرم پانی سے بجھائیے۔"

فلک سیر پیالہ لے لیتا ہے۔ مگر اب بھی کہتا ہے: "کیسی بشر کی زندگی ناپائدار ہے۔" (پیالہ چڑھا کر بولتا ہے) "آہا یہ شراب بہت خوشگوار ہے۔"

عالم سوز ۔
شیراز کی شراب ہے شیریں ہے لال ہے
زاہد کو بھی اگر یہ ملے تو حلال ہے

بس شراب کا دور شروع ہو جاتا ہے۔ سٹیج پر جواہر خاں کا کیرکٹر بھی اسقدر مقبول ہو چکا ہے۔ کہ اس کا بالکل ذکر نہ کرنا نامناسب ہے۔ یہ ایک پرانی وضع کا کاروباری شخص ہے سخت مزاجی، اور رحم دلی کی ایک عجیب دلچسپ معجون ہے ناس سونگھتے ہیں تکیہ کلام "آیا خیال شریف میں" استعمال فرماتے ہیں۔

شہناز اپنے غریبانہ مکان میں بستر مرگ پر پڑی ہے۔ کہ مکان کا کرایہ وصول کرنے نازل ہو جاتے ہیں۔ "فیروز کچھ دو دلاؤ گے یا آج بھی بالا بتاؤ گے۔"

شہناز غریب کہتی ہے۔ "بھائی کچھ روز اور ٹھہر جاؤ۔ ہمارے حال پر ترس کھاؤ۔"

جواہر خان۔ بی بی ترس کھانے سے پیٹ نہیں بھرتا۔ لاؤ کچھ دلاؤ میں آجکل ہوں بڑی تکلیف میں۔ آیا خیال شریف میں؟

اتنے میں عالم سوز وکیل آپہنچتا ہے۔ کہتا ہے۔ "بندگی"

جواہر خاں فرماتے ہیں: "بندگی۔ جناب آیئے۔ بیٹھ جایئے ناس قبول فرمائیے۔"

عالم سوز پوچھتا ہے: "جواہر خاں آپ کہاں؟"

جواہر خاں۔ کرائے کے لئے آیا۔ چار مہینے سے ایک پیسہ نہیں پایا"

عالم سوز۔ یہ ماں بیٹے مان جائیں۔ تو عمر بھر آرام پائیں۔

فیروز کہتا ہے۔ وظیفہ لے کر باپ کی آبرو مٹائیں۔ ماں کو رکھی ہوئی رنڈی ثابت کرائیں۔

عالم سوز۔ ثابت کرانے میں اب کیا رہا۔ اب تو عدالت سے بھی ثابت ہو چکا۔

جواہر خاں اس جھگڑے میں نہیں پڑتا، کہتا ہے: "لاؤ بھائی روپے دلاؤ۔ کرایہ چکاؤ۔ میں کہہ چکا ہوں، کہ اب تاب نہیں اس نحیف میں آیا خیال شریف میں۔"

فیروز تنگ آکر کہتا ہے۔ خانصاحب! تاب نہیں، تو میرا اسباب اٹھا لے جایئے۔"

جواہر خان چڑ کر بولتا ہے۔ میاں تن پر نہیں لتہ، نہ پیٹ کو بھتہ پھر بھی مزاج اتنا تتا۔

یہ حضرت اس وقت تو فیروز سے چڑے ہوئے ہیں، لیکن جب فیروز کی غیرت نوکر کی امداد قبول کرنا گوارا نہیں کرتی، تو اس سے خوش ہو کر اسے اپنے ہاں ملازمت دے دیتے ہیں۔ ملازمت کے دوران میں اس کی مصائب پر اس سے ہمدردی فرمایا کرتے رہتے ہیں بھائی صبر چاہیئے تکلیف میں آیا خیال شریف میں۔ لیکن جب ماں کی شدید

علالت کی خبر پاکر فیروز ان سے چند پیسے کی امداد طلب کرتا ہے تو فرماتے ہیں "کس لئے پیسے۔ آتے ہی بگاڑے کیسے؟" ادھار مانگتا ہے تو کہتے ہیں "ادھار دینا نادانی ہے۔ انسان فانی ہے۔" رحم کی استدعا پر جواب دیتے ہیں "کہ ہم نے تیرے گھر بھر کا ٹھیکہ لے لیا ہے۔" خدا کی راہ پر مدد طلب کرتا ہے۔ تو فرماتے ہیں "ہاتھ میں پیالہ لوں۔ اور بازار میں مانگوں"

طالب کے لیل و نہار نے ڈراما کے افسانے کیرکٹر اور فضا میں تو انقلاب کیا ہی تھا۔ گانوں میں بھی ایک انقلاب کر دیا.... لیل و نہار سے پہلے جتنے ڈرامے لکھے گئے۔ ان میں غزلوں کے علاوہ سب گانے ٹھیٹھ ہندی زبان میں ہوتے تھے۔ طالب کی شستگی ذوق کو یہ اچھا نہ معلوم ہوا۔ کہ اردو بولتے بولتے ایک ایکٹر یک لخت گانا ہندی میں شروع کر دے۔ چنانچہ انہوں نے ڈراموں میں پہلی مرتبہ گیت اردو زبان میں لکھے۔ ابتدائی حمد لکھی "تیری عالی شان لایزالی شان، واہ کیا دیکھی بھالی شان" شراب نوشی کا گیت لکھا:

"واہ پری پیاری انسان کی، دشمن ہے جان کی۔ کہتے ہیں ہم تو ایمان کی دشمن ہے"، "رنج و مصیبت کا گانا لکھا" "ہم ہیں گردش کے مارے، بچارے آوارے" "عشق و محبت کا گانا لکھا" "نہ گل ہے تو بھائے جبل کو کیا لالہ زار" وغیرہ۔

مناظر قائم کرنے میں فن کے اعتبار سے طالب کو جو قدرت حاصل تھی۔ وہ لیل و نہار کے دوسرے ایکٹ کے پہلے سین سے خوب نمایاں ہوتا ہے۔ اس سین میں دیکھنے کی بات یہ ہے۔ کہ وہ کتنے بہت کیرکٹر اور واقعات ایک ہی جگہ پر سلیقہ سے لے آتے ہیں کامیاب ہوتے ہیں۔

قبرستان کے پیچھے ایک مکان نظر آرہا ہے۔ اس مکان میں ایک جعلی سکے بنانے والا شخص اکرام رہتا ہے۔ جسے فلک سیر کے عزیز اور ہمراز سفیر جاہ کے بعض راز معلوم ہیں۔ پردہ اٹھتے ہی سفیر جاہ اور عالم سوز وکیل داخل ہوتے ہیں۔ اور اکرام کو گرفتار کرانے کا مشورہ کرتے ہیں۔ سامنے جو قبرستان ہے۔ اس میں شہناز کی قبر ہے۔ اور فیروز اور انور اس پر پھول چڑھانے آتے ہیں۔ سفیر جاہ عالم سوز سے کہتا ہے۔ کہ یہاں قبرستان میں موقع پاکر کسی طرح انور کو اڑا دو اور فلک سیر کے ہاں پہنچا دو۔ یہ ہدایات دیکر سفیر جاہ چلا جاتا ہے۔ عالم سوز فیروز اور انور کی آمد کے انتظار میں دوسری طرف نکل جاتا ہے۔ اتنے میں وہاں اکرام کی منہ بولی بیٹی دل افروز اپنی دونوں سہیلیوں سمیت آ جاتی ہے۔ دل افروز قبرستان میں فیروز کو آتے دیکھ کر اس پر مائل ہو چکی ہے۔ اور ہر روز اس کی آمد کا انتظار کرتی ہے۔ مگر اسی وقت اندر سے اکرام کے بلانے پر لڑکیاں گھر میں چلی جاتی ہیں۔ فیروز اور انور داخل ہوتے ہیں۔ ماں کی قبر پر پھول چڑھانے کے بعد فیروز اکرام سے ملنے اس کے مکان میں جاتا ہے۔ اکرام اسے کئی دفعہ اپنے ہاں مدعو کر چکا ہے۔ فیروز انور کو پھولوں کی چنگیر دے کر گھر جانے کو کہہ دیتا ہے۔ فیروز کے اندر جاتے ہی عالم سوز یہاں آ پہنچتا ہے اور بہلا پھسلا کر انور کو اپنے ساتھ لے جاتا ہے۔ ادھر یہ روانہ ہوتے ہیں کہ اکرام اور فیروز باتیں کرتے ہوئے باہر نکل آتے ہیں۔ اکرام دل افروز کو بلاتا اور اس سے پان لانے کو کہتا ہے۔ خود فیروز کو وہیں چھوڑ کر اپنی ٹولی کے ایک شخص نثار کو جو ایک ضروری ہدایت دینے جاتا ہے۔ فیروز اکیلا ہے۔ کہ دل افروز آ پہنچتی ہے۔ اور دونوں میں محبت کی چند باتیں ہوتی ہیں۔ اسی وقت اکرام فیروز کو اندر بلا لیتا ہے۔ دل افروز اکیلی ہے۔ کہ نثار تاڑی پیئے وہاں آ جاتا اور دل افروز سے اظہار محبت کرتا اور اس سے کہتا ہے۔ کہ اگر میری محبت کا جواب محبت سے نہ ملا۔ تو میں تمہارے باپ کی جعلی سکہ سازی کا راز افشا کر دونگا دل افروز کوئی قطعی فیصلہ کرنے کے لئے اس سے مہلت مانگتی اور جاتی ہے۔ اتنے میں اکرام اندر سے آ جاتا ہے۔ اور اکرام اور نثار کی اہم گفتگو ہوتی ہے۔ اس کے بعد یہ سین ختم ہو جاتا ہے۔

لیل و نہار کی خصوصیات پر ایک مختصر سی بحث بھی بہت زیادہ طوالت و تفصیل کی محتاج ہے۔ جس کا یہاں موقع نہیں مختصر یوں سمجھیئے۔ کہ اردو ڈراما کے تصنع و تکلف اور رومانی انداز بیان کے خلاف جو ردعمل ہوا وہ لیل و نہار میں اپنے معراج کمال پر نظر آتا ہے۔ اور اردو سٹیج پر اب تک کوئی ایسا ڈراما نہیں آیا جو ہمہ رومانی انداز کے واقعات اور اظہار بیان سے تراشا ہو کر کھلا ہو کر بھی لیل و نہار سے ۔

جناب اثر صہبائی ایم اے
ایل ایل بی

کیفِ جاوداں

تیر پر تیر بھی سینے پہ بہت کھائے ہیں
زمزمے عیش و طرب کے بھی بہت گائے ہیں

رنج پر رنج بھی ہیں مَیں نے اٹھائے لاکھوں
جام پر جام بھی ہیں میں نے اڑائے لاکھوں

ہجر میں دیدۂ پرخوں سے بہائے دریا
وصل میں بادۂ گلگوں کے چڑھائے دریا

شبِ عصیاں کی سیاہی بھی ہے دیکھی میں نے
آہ! اس دل کی تباہی بھی ہے دیکھی میں نے

گلعذاروں سے ہم آغوش رہا ہوں اکثر
بادۂ عیش سے مدہوش رہا ہوں اکثر

کعبہ و دیر میں بھی سجدے کئے ہیں میں نے
آہ! یہ داغ بھی ماتھے پہ لئے ہیں میں نے

پرچمِ حق و صداقت بھی اٹھایا میں نے
گردنِ لشکرِ باطل کو دبایا میں نے

لیکن اب میرے لئے غم نہ خوشی باقی ہے
کفر و اسلام نہ نیکی نہ بدی باقی ہے

اب نہ وحشت نہ تجسس ہے نہ حیرانی ہے
اب محبت نہ عداوت کی پریشانی ہے

میں ہوں اور اک ابدی رقصِ طربِ کیف سرور
اہرمن ہے۔ نہ خدا ہے نہ عدم ہے۔ نہ وجود

منشی پریم چند مرحوم کا ایک غیر مطبوعہ افسانہ

دفینہ

(۱)

بابو ہری داس اینٹوں کا روزگار کرتے تھے۔ ان کا پزادہ شہر سے متصل تھا، قرب وجوار کے دیہاتوں سے سینکڑوں مرد، عورتیں اور بچے روزانہ آتے اور پزاوے سے اینٹیں سروں پر اٹھا اٹھا کر اوپر قطاروں میں لگاتے، ایک آدمی پزاوے کے دروازے پر ایک ٹوکری میں کوڑیاں لئے بیٹھا رہتا تھا، مزدوروں کو اینٹوں کی تعداد کے اعتبار سے کوڑیاں تقسیم کرتا، جتنی زیادہ اینٹیں ہوتیں، اتنی ہی زیادہ کوڑیاں ملتی تھیں، اس لالچ میں اکثر مزدور اپنی قوت برداشت کی بھی پرواہ نہ کرتے تھے۔ بوڑھی عورتیں اور کمسن بچوں کو اینٹوں کے بوجھ سے اکڑے ہوئے دیکھنا کشمکش حیات کا بڑا عبرتناک نظارہ تھا کبھی کبھی ہری داس خود آکر کوڑی والے کے پاس بیٹھ جاتے، اور مزدوروں کو اور زیادہ اینٹیں لانے کا بڑھاوا دیتے۔ یہ نظارہ اور بھی عبرتناک ہو جاتا تھا۔ جب اینٹوں کو کسی خاص ضرورت سے جلد باہر نکالنے کی ضرورت درپیش ہو جاتی، اس وقت مزدوری ڈیوڑھی کر دی جاتی۔ اور مزدور اپنے مقدور سے دوگنی تعداد لے کر چلتے۔ ایک قدم چلنا دشوار ہو جاتا۔ سر سے پاؤں تک پسینہ میں شل، پزاوے کی راکھ سے رنگے ہوئے اینٹوں کا ایک پہاڑ سر پر لئے ایک ایک قدم سنبھل کر رکھتے، گویا سر پر ہوس کا بھوت سوار ہے۔ سب سے دردناک صورت ایک لڑکے کی تھی۔ جو ہمیشہ اپنی عمر کے لڑکوں سے ڈیوڑھی اینٹیں اٹھاتا۔ اور سارے دن ایک لمحہ کے لئے بھی دم نہ لیتا، اس کے چہرہ پر ایک دردناک مسکینی چھائی رہتی تھی، جسم کی لاغری نے صورت کو اور بھی قابل رحم بنا دیا تھا۔ اس میں طفلانہ شوخی و شرارت زندہ دلی اور کھلاڑی پن کا شائبہ تک نہ تھا۔ اس کے ہونٹوں پر کبھی ہنسی نہ آتی، اور لڑکے دو چار کھیپ کے بعد آرام کرتے، کوئی بنئے کی دکان سے گڑ لاکر کھاتا، کوئی چبینہ کھاتا، کوئی سڑک پر آنے جانے والوں یکوں اور موٹروں کا تماشا دیکھتا۔ اور کوئی معرکہ میں اپنے دست و بازو کے جوہر دکھاتا۔ لیکن یہ غریب لڑکا مایوسانہ عزم اور سرایۂ متانت کے ساتھ مصروف کار رہتا تھا۔ بابو ہری داس کو اس پر ترس آتا، کبھی کبھی کوڑی والے کو اشارہ کر کے اینٹوں کی تعداد سے زیادہ کوڑیاں دلا دیتے۔

ایک دن انہوں نے اس کو بلا کر اپنے پاس بٹھایا۔ اور اس کے حالات پوچھنے لگے۔ معلوم ہوا کہ اس کا گھر قریب کے ایک موضع میں ہے۔ گھر میں ایک بڈھی ماں کے سوا اور کوئی نہیں ہے۔ اور وہ بھی کسی کہنہ مرض میں مبتلا ہے۔ گھر کا سارا دارومدار اسی لڑکے کے سر ہے کوئی اسے روٹیاں پکا کر دینے والا بھی نہیں، یہاں سے شام کو جاتا ہے تو اپنے ہاتھوں سے کھانا پکاتا ہے۔ اور ماں کو کھلاتا ہے۔ ذات کا ٹھاکر ہے مگن سنگھ نام ہے۔ ایک زمانہ میں اس کا خاندان سارے علاقہ میں ممتاز تھا لین دین ہوتا تھا۔ شکر اور گڑ کا کاروبار بھی تھا مگر بھائیوں کی رقابت اور حسد نے گردش تقدیر کے ساتھ مل کر اسے اب نانِ شبینہ کو بھی محتاج کر دیا ہے۔

ہری داس نے پوچھا۔ "گاؤں کے لوگ تمہاری کچھ مدد نہیں کرتے؟"

مگن سنگھ۔ ان کا بس چلے تو مجھے مار ڈالیں۔ سب سمجھتے ہیں کہ میرے گھر میں روپے گڑے ہوئے ہیں۔ انہیں مار ڈالیں تو روپے مل جائیں۔

لڑکا ذہین اور فہیم تھا، اس کے اخلاق نے بابو صاحب کو گرویدہ کر لیا۔ دوسرے دن سے انہوں نے اس کی تنخواہ مقرر کر دی۔ اور اسے کوڑیاں تقسیم کرنے کا منصب ملا۔ پزاوے کے منشی جی کو تاکید کر دی کہ اس لڑکے کو کچھ پڑھایا کیجئے۔ بیکس کے نصیب خفتہ بیدار ہو گئے۔

(۴)

مگن بڑا حاضر باش وقت کا پابند لڑکا تھا۔ ملازمت کرتے ایک سال سے زیادہ عرصہ ہو گیا تھا۔ مگر ایکدن بھی ناغہ نہیں کیا نہ ایک دن کی رخصت لی۔

برسات کے دن تھے۔ پڑاوے کا کام بند تھا۔ مگن متواتر تین دن سے غیر حاضر تھا۔ ہری داس کو اندیشہ ہوا کہیں بیمار تو نہیں ہوا، اس پر انہیں کامل اعتماد تھا۔ اینٹوں کا سارا اسٹاک اس کے اعتبار پر چھوڑ دیا تھا۔ کئی آدمیوں سے دریافت کیا۔ پر کچھ تحقیق نہ معلوم ہوا۔ چوتھے دن وہ پوچھتے پوچھتے مگن سنگھ کے گھر پہنچے یہ مکان وقتی کسی زمانہ میں محل ہوگا۔ گو اسوقت اس کا بیشتر حصہ کھنڈر ہو گیا تھا۔ ان کی آواز سنتے ہی مگن باہر نکل آیا۔ ہری داس نے پوچھا کئی دن سے نہیں آئے، طبیعت کیسی ہے؟

مگن سنگھ کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ بولا۔ اماں آج کل بہت بیمار ہیں۔ کہتی ہیں۔ اب نہ بچونگی۔ کئی بار آپ کو بلانے کے لئے مجھ سے کہہ چکی ہیں۔ میں مارے لحاظ کے آپ کے پاس نہ جاتا تھا۔ اب آپ آ گئے ہیں تو چل کر ذرا دیکھ لیجئے۔ ان کو ذرا تسکین ہو جائے گی۔

بابو ہری داس اندر گئے در و دیوار سے بے کسی ٹپک رہی تھی، سرخی، کنکر اینٹ کے ڈھیر جا بجا پڑے ہوئے صرف دو کمرے گزر کے قابل تھے۔ ویرانی کی زندہ صورت تھی۔ مگن سنگھ نے انہیں ایک کوٹھڑی میں آنے کا اشارہ کیا۔ وہ اندر گئے۔ تو دیکھا، ایک بوسیدہ ٹاٹ پر مریضہ پڑی ہوئی ہے۔ نقاہت اور نحافت بے کسی کے آغوش میں منہ چھپائے ہوئے تھی۔ مگن سنگھ بنئے کی دوکان پر شکر لانے گیا۔ کہ بابو صاحب کو شربت پلا دے، اتنی ہی خاطر سہی اور وہ کس قابل تھا!

ہری داس کی آہٹ پاکر مریضہ نے آنکھیں کھولیں تو فوراً سے پہچان گئی۔ ضعیف آواز میں بولی۔ آپ آ گئے۔ آپکے درشن کرنے کو بہت جی چاہتا تھا۔ میرے لاوارث لڑکے کے وارث آپ ہی ہیں۔ جیسے آپ نے اب تک اس کی پرورش کی ہے۔ وہی آگے بھی رکھیئے گا۔ میری مصیبت کے دن پورے ہو گئے۔ میری مٹی کو ٹھکانے لگا دیجئے گا۔ اس گھر پر ایک دن لچھمی کی نگاہیں تھیں۔ جب سے دن برے آئے، انہوں نے بھی آنکھیں پھیر لیں، بزرگوں نے اسی دن کے لئے کچھ روپے دھرتی ماتا کو سونپ دیئے تھے۔ جگہ کا پتہ اس بیجک سے چلے گا مگن کے باپ نے بہت دکھ سہے پر یہ بیجک نہ ملا۔ ان کی تقدیر میں آرام کرنا نہ لکھا تھا۔ ان کے مرنے کے بعد ردی کے بوروں میں مجھے یہ بیجک مل گیا۔ تب سے اسے چھپا رکھے ہوئے ہوں، میرے سرہانے جو صندوق ہے۔ اسی میں رکھا ہوا ہے۔ سب پتہ ٹھکانا اس میں لکھا ہوا ہے۔ اسے کھدوائیے گا اگر دشمن لوگ اکھاڑ نہیں لے گئے ہیں۔ تو روپے ضرور ملیں گے۔ مگن کو دے دیجئے گا۔ میں نے یہ بھید اس سے اب تک نہیں کھولا ہے۔ اس کے گن سبھاؤ کو دیکھتی تھی۔ کپوت دیکھتی، تو بیجک اپنے ساتھ لے جاتی پر آپ کی دیا سے لڑکا ہونہار دھن پا جائے گا۔ تو ایکبار پھر اپنے خاندان کا نام روشن کر دے گا۔

ہری داس نے اس بیجک کے راز کو پوشیدہ رکھا۔ مگن سنگھ کا تو ذکر ہی کیا۔ اپنے گھر میں بھی کسی سے نہ کہا۔ نیت میں فتور آ گیا۔

اس مکان سے میل بھر پچھم کی طرف ایک مندر کے چبوترے کے نیچے ایک تہ خانہ میں دفینہ رکھا ہوا تھا۔ بیجک میں مفصل پتہ درج تھا۔

ہری داس دفینہ پر تصرف کرنا چاہتے تھے۔ اور اس طرح کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو۔ کام مشکل تھا۔ نیکنامی پر حرف آنے کا اندیشہ تھا۔ جو دنیا میں سب سے بڑی سزا ہے۔ شام کو سیر کرنے کے بہانے نکل جاتے۔ جب چاروں طرف سناٹا چھا جاتا۔ تو مندر کے چبوترے پر آ بیٹھتے۔ پہلو میں ایک تیز کدال چھپی رکھتے تھے۔ چبوترہ کو اس سے کھودنا شروع کرتے۔ دن کو بھی ایک دو بار ادھر تاک جھانک کرتے۔ کہ کسی کی نگاہ چبوترہ پر تو نہیں پڑ رہی ہے۔ رات کو اندھیرے میں اینٹوں کو ہٹاتے ہوئے انہیں خوف ہوتا تھا۔

چبوترہ لمبا چوڑا تھا۔ اسے کھودنے میں ایک مہینہ لگ گیا۔ آجکل ان کی حالت ایک چلہ کش کی سی تھی۔ ہمیشہ سم گم رہتے۔

اگر کوئی چھیڑ کر باتیں کرتا۔ تو جھنجھلا پڑتے کسی خیال میں محو رہتے۔ پزاوے کی طرف بہت کم جاتے۔ اصول پرست آدمی تھے بار بار دل اس سعی فاسد سے نفور ہوتا۔ اپنے کو نفرین کرتے۔ مگر شام ہوتے ہی ان پر ایک وارفتگی کا عالم طاری ہو جاتا۔ بلاکشان محبت کی طرح کوئے یار کی طرف روانہ ہو جاتے۔ یہاں تک کہ دوسرے مہینہ کا آخری دن آپہنچا آج انہیں معمول سے زیادہ محنت کرنی پڑی۔ منزل مقصود سامنے نظر آرہی تھی۔ دوسرے دن کے لئے پھر کیوں زحمت باقی رہے۔ بارہ بجے رات تک وہ اسی چبوترے پر بیٹھے اینٹیں نکالتے رہے۔ اتنی شدید محنت کے بعد تہ خانہ کی سطح سنگیں نظر آئی۔ علم کو عین الیقین کا درجہ حاصل ہوا۔

گھر کی طرف چلے تو باوجود سخت تکان کے ان کی طبیعت شگفتہ تھی۔ تخیل سنہری خواب دیکھنے میں مصروف تھا۔ پزاوے میں اب اینٹیں نہ پکائی جائیں گی۔ نئی ایجاد کے مطابق ریت کو باریک پیسکر اینٹیں بنائی جائیں گی۔ اس کے لئے مشینری یورپ سے منگائی جائیگی۔ تھوڑے دنوں میں "ہری داس اینڈ سنس" کا نام بچہ بچہ کی زبان پر ہوگا۔ مگن سنگھ اس کارخانہ میں شریک کر لیا جائیگا۔ سو روپے ماہوار کی تنخواہ اس کی پرواز فکر سے کہیں زیادہ ہوگی۔ لوٹ کھسوٹ پر تو ہستی کا نظام ہی قائم ہے۔ اس سے کیونکر گریز ہو سکتی ہے۔ فی الواقع روزگار کوئی ہو۔ اخلاق کے کتابی اصولوں کی اطاعت کر کے سرسبز نہیں ہو سکتا۔ یوں اگر دیکھا جائے۔ تو اصولاً کسی انسان کو اس سے زیادہ پر تصرف کرنے کا استحقاق نہیں ہے جو اس کی فطری ضروریات کے لئے کافی ہو۔ اس سے زیادہ جو کچھ ہے۔ وہ سرقہ ہے غنیمت ہے۔ مگر اس اصول کی پابندی کون کرتا ہے۔ انہیں دلائل سے اپنے نفس کو بہلاتے ہوئے بابو ہری داس مکان پر پہنچے۔ اور کھانا کھا کر لیٹے۔ ذرا دیر میں ان کے سر میں درد ہونے لگا۔ سمجھے تکان ہے۔ ایک گھنٹہ میں بخار چڑھ گیا۔ اسے بھی تکان سمجھے۔ بخار کی شدت بڑھتی گئی صبح ہوتے ہوتے ان کی حالت ردی ہو گئی۔ ڈاکٹر نے دیکھا دوا دیکر چلا گیا مگر کسی دوا سے فائدہ نہ ہوا۔ تین دن وہ ایک نیم غشی کی حالت میں پڑے رہے۔ چوتھے دن پروانہ آپہنچا۔ بیماری کے دوران میں جب ذرا طبیعت سنبھلتی اور ہوش آتا۔ تو انہیں گمان ہوتا۔ عجب نہیں یہ میری نیت خام کی سزا ہو۔ جی میں آتا مگن کو بیجک دیدیں۔ اس سے عذر تقصیر کریں۔ مگر افشائے راز کا خوف مانع تھا۔

(۴)

ہری داس کی وفات کے بعد ان کے نوجوان صاحبزادے بابو پربھوداس کو کارآمد کاغذوں میں بڑی احتیاط سے رکھا ہوا بیجک ملا۔ بیجک مگن سنگھ کے بزرگوں کا لکھا ہوا ہے دفینہ اس کے بزرگوں کا ہے۔ اس میں کوئی شک نہ تھا۔ بابو ہری داس کی نیت بھی ظاہر ہو گئی۔ والد کی کج باطنی پر تعجب ہوا کتنے راستباز دیانت پرور آدمی تھے۔ لوگ ان کا کتنا اعتبار کرتے تھے۔ انہوں نے اس بیجک کا راز پوشیدہ رکھا تو کچھ سمجھ کر ہی میں اس میں شاخسانے کیوں نکالوں۔ نوجوان آدمی تھے۔ دل میں عروج اور ثروت کے ولولے تھے۔ دفینہ ہاتھ آجائے۔ تو زندگی کتنے آرام سے گزرے۔ لاکھوں روپے ہونگے۔ ممکن ہے دس پانچ لاکھ ہوں پھر تو شہر میں میں ہی نظر آؤنگا۔ اچھے اچھے رئیسوں کا سر جھکا دونگا۔ اور دکھا دوں گا کہ دولت کا بہترین استعمال کس طرح ہونا چاہیئے۔ ارادہ مضبوط ہو گیا۔ شام ہوتے ہی گھر سے نکلے۔ وہی وقت وہی تیز کدال۔ وہی چوکنی نگاہیں۔ معلوم ہوتا تھا۔ بابو ہری داس کی مردہ آرزوؤں نے یہ صورت اختیار کر لی ہے۔

چبوترے کی سطح پہلے ہی کھد چکی تھی۔ اب سنگین تہ خانہ تھا۔ جوڑوں کا ہٹانا مشکل۔ پرانے زمانہ کا مسالہ تھا۔ کدال اچٹ اچٹ کر لوٹ آتی تھی۔ کئی دنوں میں اوپر کی درازیں کھلیں۔ مگر چٹانوں کا ہٹانا دشوار۔ بہت زور لگایا مگر تختوں میں ذرا بھی جنبش نہ ہوئی۔ پائے ثبات تھا۔ جو کسی طرح ہلتا ہی نہ تھا۔ کسی کی مدد خارج از بحث تھی سب کچھ اپنے ہی ہاتھوں کرنا تھا۔ رات گزرتی جاتی تھی۔ یہاں تک کہ رات کے بارہ بج گئے۔ پر تختوں میں ذرا بھی جنبش نہ ہوئی۔ نوشتہ تقدیر کی طرح اٹل تھے۔

اس حالت میں دفینہ کو چھوڑ کر جانا بھی مشکل تھا۔ کسی کی نگاہ پڑ جائے تو دل کی تمنا دل ہی میں رہ جائے۔ یہ مرحلہ آج ہی طے کرنا تھا قسمت کی بازی آج ہی کھیلنی تھی۔ وہ تھک کر اسی تختہ پر بیٹھ رہے اور سوچنے لگے۔ کیا کروں۔ گھر کے لوگ متفکر ہونگے۔ کوئی علاج نہیں

دفعتاً انہیں خیال آیا۔ کیوں نہ بارود سے کام لوں۔ فوراً بازار کی طرف چلے۔ دو میل کا راستہ ہوا کی طرح طے کیا۔ مگر دکانیں بند تھیں۔ آتشباز نے غرضمند دیکھا حیلے کرنے لگا۔ اس وقت بارود نہیں مل سکتی۔ دوکان بند ہے۔ رات کو سودا بیچنا سرکاری حکم کے خلاف ہے۔ آپ کون ہیں؟ بارود لے کر کیا کیجیئےگا۔ کہیں کوئی حادثہ ہو جائے۔ تو اس کا ذمہ وار کون ہوگا؟ پربھوداس نے منت والتجا سے کام لیا۔ انہیں اپنے ضبط کو بھی اس قدر پابند عنان نہ کرنا پڑا تھا۔ آخر روپے کی سُریلی جھنکار نے اسے رام کیا۔ پربھوداس یہاں سے چلے تو معلوم ہوتا تھا مرادوں کی دلآویز صدائیں کانوں میں آ رہی ہیں۔ مندر کے پاس پہنچے تو دو بج چکے تھے۔ ہو کا عالم تھا۔ رات بھی اندھیری تھی۔ انہوں نے دروازوں میں بارود رکھی۔ فلیتہ لگایا اور بھاگے۔ ایک لمحہ میں زور کا دھماکا ہوا۔ چٹان اڑ گئی۔ اندھیرا غار سامنے منہ کھولے ہوئے تھا۔ یہ لحد تھا یا آشیانۂ آرزو۔ ظلمت کی طرح تاریک مگر آبِ حیات سے پُر جیسی لالٹین روشن کی اور تہ خانہ کی طرف جھانکا۔ پختہ فرش تھا۔ سی چشمہ کے سطح بلوریں کی طرح صاف خس و خاشاک کا نام نہیں نہ کیڑے مکوڑوں کا گزر۔ بےخوف غار میں کود پڑے۔ پر اندر پہنچتے ہی ان پر ہراس کا غلبہ ہوا۔ کہیں کوئی آکر مجھے اندر بند نہ کر دے انہوں نے غار کے دروازے کو ایک ہاتھ سے پکڑے پکڑے اندر کا جائزہ لیا۔ دو بڑے خم دکھائی دیئے۔ منہ پر سے ڈھکنا اٹھایا۔ اشرفیاں بھری ہوئی تھیں۔

(۵)

صبح کا وقت تھا۔ پربھوداس اپنے کمرے میں لیٹے ہوئے تھے سامنے لوہے کے صندوق میں پوری دس ہزار اشرفیاں رکھی ہوئی تھیں۔ ماں سرہانے بیٹھی پنکھا جھل رہی تھی۔ پربھوداس کو شدت کا بخار تھا۔ کروٹیں بدلتے تھے۔ کراہتے تھے۔ مگر آنکھیں آہنی صندوق کی طرف لگی ہوئی تھیں۔

مگن سنگھ نے اب پڑادہ کا منشی تھا۔ آکر بولا۔ پڑادے چلے گا۔ گاڑی کھنچواؤں؟ پربھوداس نے اس کی طرف آنکھیں اٹھائیں اور رو پڑے۔ پھر دم لے کر بولے نہیں۔ تم بھی جلد چلے آنا میری طبیعت اچھی نہیں ہے۔

مگن سنگھ نے ان کے چہرہ کا رنگ دیکھا۔ ہوش اڑ گئے۔ ڈاکٹر کو بلانے دوڑا۔ ڈاکٹر نے آکر رسم ادا کی۔

پربھوداس کا بخار بڑھتا گیا۔ دس بجتے بجتے چہرہ پر مردنی چھا گئی۔ ماں نے اسکی صورت دیکھی۔ ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ ہری داس کی حالت نزع کی صورت آنکھوں میں پھر گئی۔ وہ روتی تھی اور پربھوداس کی حسرتناک آنکھیں اسی صندوق کی طرف لگی ہوئی تھیں۔

پربھوداس کی بیوی سامنے آکر کھڑی ہو گئی۔ اسکے چہرے پر وحشت چھائی ہوئی تھی۔ دیر تک شوہر کے پائنتی کی طرف کھڑی روتی رہی۔ پربھوداس کے اعضا سرد ہو گئے تھے۔ حرارت لمحہ بہ لمحہ غائب ہوتی جاتی تھی۔ آنکھیں پتھرا گئی تھیں۔ رُوح نکل گئی تھی۔ صرف حسرت باقی تھی۔ مگر حسرت بار نگاہیں صندوق کی طرف لگی ہوئی تھیں۔

شام ہو گئی محلہ کے یار و اغیار کمرہ میں جمع تھے۔ بابو ہری داس کا ذکر خیر ہر ایک زبان پر تھا۔ بھگوان کو دنیا منصف کہتی ہے مگر سچ پوچھو تو اسکے دربار میں انصاف نہیں۔ ورنہ کیا اس خاندان پر یہ آفت آتی۔ باپ اور بیٹے دونوں کا مزاج ایک تھا۔ شکل و صورت کتنی ملتی تھی۔ باپ کو نہ دیکھو بیٹے کو دیکھو مہینہ دو مہینہ کے اندر خاندان کا چراغ گل ہو گیا! اب کوئی نام لیوا اور پانی دیوا بھی نہیں!! افسوس ایسہ نیرنگیٔ روزگار ہے۔ اسی اثنا میں ڈاکٹر دوبارہ آئے۔ مریض کو دیکھکر مایوسانہ انداز سے سر ہلایا۔ اسکا جسم بیجان تھا۔ رُوح ایک تمنا کی صورت میں آنکھوں میں جھلک رہی تھی۔ دونوں آنکھیں صندوق کی طرف جمی ہوئی تھیں۔

اسی اثنا میں مگن سنگھ سامنے آیا۔ آنکھیں تر تھیں۔ کچھ پوچھنا چاہتا تھا۔ اسے دیکھتے ہی پربھوداس کے اوسان بجا ہو گئے۔ ایک لمحہ کیلئے انکے جسم میں حیات کی ایک برقی رو دوڑ گئی۔ انہوں نے تکیے کے نیچے سے ایک کاغذ نکال کر مگن سنگھ کی طرف بڑھا دیا۔ تب آنکھیں بند کر لیں۔ ایک ہی لمحہ کے بعد گھر سے ماتم کی دلخراش صدائیں بلند ہو گئیں۔

وہ کاغذ وہی بیجک تھا۔ اسکے پشت پر پربھوداس نے یہ الفاظ لکھے تھے میں نے تمہارا حق غصب کرنا چاہا تھا۔ اس کیلئے معاف کرنا۔ تمہاری دولت آہنی صندوق میں محفوظ رکھی ہوئی ہے۔ تم اسکے مالک ہو۔ اس غریب خاندان کی پرورش کا بار تمہارے سر ہے۔

ساقی کو مایوس دیکھ کر

جناب ضیا فتح آبادی
ایم۔ اے

یہ شاید مستیٔ ناکام کا انجام ہے ساقی
کہ تیری مے ترا میخانہ تو بدنام ہے ساقی

بہت دیں گردشیں پیمانۂ پر بادہ کو تو نے
مگر دنیا ابھی تک بندۂ اوہام ہے ساقی

یہ تیری اپنی ہی کوتہ نگاہی کا نتیجہ ہے
تری تخریب پر آمادہ مست جام ہے ساقی

بچا سکتا ہے تجھ کو کون اب مرگ جہالت سے
تجھے بھی ہو گیا یہ وہم، تو ناکام ہے ساقی

یہ تو نے کیا کیا خود اپنی بنیادیں ہلا ڈالیں
جو بادہ خاص تھا پہلے وہی اب عام ہے ساقی

بہاریں ہو چکیں رخصت، کہاں وہ عالم عشرت
خزاں آئی چمن پھر مرکز آلام ہے ساقی

دکھا اُن کو بھی شاید تیرے دشمن زیر ہو جائیں
جو تیرے ذہن میں محفوظ رقص جام ہے ساقی

مخالف ہے زمانہ کیا ہوا، تو کیوں ہے پژمردہ
ترا مٹ جانا دنیا سے خیال خام ہے ساقی

تو چاہے تو بدل سکتا ہے نقشہ بزم عالم کا
زمانہ درحقیقت اب بھی زیر دام ہے ساقی

نہ ہو مایوس، کر تجدید دور ساغر و مینا
جہاں کو اب بھی تیری مستیوں سے کام ہے ساقی

پلا دے ہوشیاروں کو ملا کر ساغر مے میں
ترے ہونٹوں پہ جو رنگینیٔ الہام ہے ساقی

دیا انسانیت کو جس نے درس ارتقا اب وہ
ترا پیغام وقف پستیٔ انجام ہے ساقی

براہ راست ہے جس کو تعلق روح انساں سے
نشاط و کیف پرور وہ ترا پیغام ہے ساقی

پیالوں میں اسے بھر کر پلا تو دے زمانے کو
صراحی میں جو تیری بادۂ گلفام ہے ساقی

یہی ہوں گے طلبگار معافی ایک دن تجھ سے
عداوت اہل دنیا کی فنا انجام ہے ساقی

مگر کیا ہو گیا تجھ کو کہ تو مستی سے ہے بدظن
زمانہ تو ترا دشمن برائے نام ہے ساقی

سمجھتے ہیں ترے رتبہ کو دنیا میں وہی جن کو
تلاش مستیٔ جاوید صبح و شام ہے ساقی

علامہ ظریف

بیوی سے پہلی جھڑپ

اس سُرخی پر آل انڈیا ریڈیو اسٹیشن لاہور نے ہم سے ایک مزاحیہ مضمون لکھنے کی فرمائش کی تھی۔ چونکہ ریڈیو سٹیشن پر کنواری مخلوق کا تسلط ہے۔ اس لئے یہ لوگ خود تجربہ کرنے سے پہلے ازدواجی زندگی کے متعلق شادی شدہ میاؤں کے تجربات سے فائدہ اُٹھانے کی فکر میں لگے رہتے ہیں۔ ہم کنوارے شادی شدہ ہی نہیں۔ بلکہ خاندانی روایات کے زیرِ اثر شادی پیشہ واقع ہوئے ہیں۔ اس لئے ازدواجی مسئلے پر دوسرے یک رفیقے شوہروں کی بہ نسبت بجا طور پر ہماری رائے زیادہ مستند سمجھی جاتی ہے۔

ہم نے بھی اصلاح مجرداں کی اہمیت کو محسوس کرتے ہوئے دوسری بیوی سے پہلی جھڑپ کی داستانِ عبرت کو بے کم وکاست قلم بند کر دینے میں مضائقہ نہ سمجھا۔ تاکہ "من نہ کردم شما حذر بکنید" کے سماجی فریضے کی ادائیگی سے سبکدوش ہو جائیں۔ کنواری دنیا میں دو چار کنواروں کے لئے بھی اگر یہ مضمون راہِ زندگی کی شمع بن سکا۔ تو ہم سمجھیں گے۔ ہماری محنت ٹھکانے لگی۔ یہ داستان اجمال در اجمال کے بعد بھی اس قدر دامن دراز ہو گئی کہ ریڈیو اسٹیشن والوں کے بخشے ہوئے "پندرہ منٹ" میں اسکی وسعتیں نہ سما سکیں۔ مجبوراً پروگرام منیجر کی عطاری نے اپنی کتر بیونت سے اسے "نشستند و گفتند و برخاستند" کی حد تک بے مبتدا و بے خبر بنا کر بے مزا کر دیا۔

شاہکار میں اسکی اشاعت کے متعدد اعلان کئے گئے۔ مگر ہم ریڈیو کے خلاصہ نویسوں کی اصلاحِ ناروا سے اس قدر بددل تھے۔ کہ اصل داستان پر نظرِ ثانی کرنا ہمارے لئے زحمتِ ناگوار بن گیا۔

ادبِ لطیف کے جابر مدیر میرزا ادیب بی۔ اے کے سخت گیر تقاضوں نے مجبور کیا۔ اور اس افسانۂ پریشان کے اوراقِ منتشر کو جمع کر کے ایک مستقل مضمون کی زحمتِ تحریر صرف کی گئی۔ اور اس طرح میرزائے موصوف کے "استحصال بالجبر" کی مصیبت سے ہمیں رستگاری نصیب ہوئی۔

بدقسمتی سے اس جنگنامے کی اطلاع کسی عزیزہ کے ذریعہ ہماری حریفِ جنگ بیوی کو بھی مل گئی۔ اور اس طرح یہ بیان جنگ سامانِ جنگ بن گیا۔ اس سلسلے میں میانِ مصحفی اور مصحفن "بو معرکہ" کارزار برپا ہُوا۔ وہ بجائے خود عبرتِ چشم و گوش تھا۔ لیکن پہلی جنگ میں چونکہ فتح ہمارے حصے میں آئی تھی۔ اس لئے فتح کی خوشی میں ہم نے کوائفِ جنگ کو قاف تا قاف براڈکاسٹ کر دیا۔ لیکن کارکنانِ قضا و قدر کو ہمارا فاتحانہ غرور کچھ پسند نہ آیا۔ اور سزائے جُرم میں غیر متوقع طور پر ہمیں اس سپلیمنٹری وار میں شکست دیکر "غرور کا سر نیچا" کے قانون کو نافذ کر دیا۔ اب یہ ایثار ہم سے نہ ہوگا۔ کہ اپنی داستانِ شکست کو بھی قلم بند کر کے ایک نبرد پیشہ میاں کی بنی بنائی عزت کو بٹہ لگائیں اس لئے "خموشی معنئی دارد کہ در گفتن نمی آید" کے مطابق چُپ سادھنے ہی میں اپنی خیریت تصور کرتے ہیں۔

اصل داستان ادبِ لطیف کے سالنامے اور شاہکار کے جنوری نمبر میں بیک وقت شائع کی جا رہی ہے۔

قارئین میں جو حضرات اس سے درسِ عبرت پائیں۔ ہمیں دعائے خیر میں یاد رکھیں۔ اور قاریات میں جو محترمات اس سے نصیحت پکڑیں۔ ہماری بیوی سے اظہار ہمدردی فرمائیں۔

(علامہ ظریف)

وقت چشمکِ برق کی طرح قلیل ہے۔ اور یہ داستان فسانۂ غم کے برابر طویل۔ پھر معاملہ بالکل ذاتی ہے۔ یعنی دو شریف میاں بیوی کا پرائیویٹ راز اور سننے والے بیاہے اور کنوارے تماشائیوں کا ہجوم بے انت۔ ادھر گھڑی کی سوئی رینگنے کی بجائے بھاگتی دکھائی دیتی ہے۔ دوسری طرف دائیں بائیں دو منکر نکیر آہستہ پڑھنے پڑھنے کے تقاضوں سے بدحواس کئے ہوئے ہیں۔ کہیں تو کیا کہیں اور سنائیں تو کیا سنائیں! لطف یہ کہ ہر گھر میں یہ تماشا ہوتا ہے۔ کہیں روزانہ کہیں ماہانہ اور ایسا گھر تو کوئی بھی نہ ہوگا۔ جہاں سال میں ایک آدھ بار یہ گھریلو میلہ نہ لگتا ہو۔ مگر جس جوڑے سے پوچھئے۔ انکاری۔ کوئی میاں اور کوئی بیوی کتنے ہی سچے ہوں۔ خانہ جنگی کا ذکر چھیڑا جائے۔ تو کانوں پر ہاتھ رکھیں گے۔ گویا وہ انسان ہی نہیں دیوی دیوتا ہیں۔ یا فرشتہ اور فرشتن۔ سب جانتے ہیں، سب پر گذر چکی ہے، گزرتی رہتی ہے، ہر گھر کے در و دیوار حواس باطنی سے دیکھتے اور سنتے ہیں۔ کہ گھر کے لیلیٰ مجنوں میں۔ مشقِ ناز و نیاز کے ساتھ کبھی کبھی آپ سے تم تم سے تُو تک کے چرکاروں کا تبادلہ ہوجایا کرتا ہے۔ مگر میاں بیوی کا کوئی جوڑا اپنے جنگ نامۂ محبت کا کبھی ہلکا سا اعتراف بھی کرنے کو آمادہ نہ ہوگا۔ سچ ہے چھوٹا کل سنسار۔

حقیقتِ حال تو یہ ہے۔ کہ کوئی فاقہ مست فقیر ہو یا بادہ مست شہریار۔ کوئی ہو اکسی ملک کا ہو "بُور کے لڈو"[۲] کھانے کی عقلمندی کر چکا ہے۔ تو دیانت داری کے ساتھ یہ دعویٰ نہیں کر سکتا۔ کہ اُس میں اور اُس کی رفیقِ زندگی میں کبھی روٹھ رٹھول نہیں ہوئی کون یہ دعوےٰ کر سکتا ہے۔ کوئی نہیں کرے گا۔ میاں بیوی کسی ہمزاد کے دو روپ تو نہیں ہوتے۔ کہ اُن میں چپقلش کا امکان ہی نہ ہو۔ اگر وہ دونوں انسان ہیں، انسانوں کی خو بُو رکھتے ہیں، تو انسانوں کی طرح محبت بھی کریں گے۔ اور لڑائی بھی، الاگ بھی رکھیں گے۔ اور لگاؤ بھی۔ صنّاعِ قدرت نے ہر انسان کی فطرت جدا بنائی ہے۔ کوئی سے دو انسان بھی ایک فطرت کے مالک نہیں ہوتے، کچھ نہ کچھ مختلف ہوتے ہیں، پھر یہ کیونکر ممکن ہے۔ کہ دو انسان خواہ وہ پہلے مجنوں ہی کیوں نہ ہوں، زندگی بھر ایک ساتھ رہیں۔ اور اُن میں کبھی کسی بات پر اختلاف رائے تلخی اختیار نہ کرے۔ زناشوئی کے تعلقات کی بنیاد محبت ہی پر ہوا کرتی ہے۔ اور سب جانتے ہیں۔ کہ محبت میں کبھی کبھی بگاڑ بھی پیدا ہو جایا کرتا ہے۔ پیار اور بگاڑ کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ جہاں پیار ہوگا بگاڑ ضرور ہوگا۔ دراصل بگاڑ بھی محبت کی طرح فطرت کا ایک قانون ہے اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ باہمی جنگ باہمی محبت کا ایک ثبوت ہوا کرتی ہے۔ بلکہ ہم تو یہاں تک کہنے کو آمادہ ہیں۔ کہ محبت کے جلوہ ہائے رنگارنگ میں آپس میں روٹھنا اور لڑنا بھی ایک جلوۂ نیرنگ ہے۔ بقول شاعر ؎

بگاڑ اکثر کمالِ عشق میں ہوتا ہے آپس میں
لڑائی میں بھی اک پہلو نکلتا ہے محبت کا

اور سچ پوچھئے۔ تو بگاڑ ہی کے ساتھ آپس کے پیار کا بھی کچھ مزہ ہے۔ ورنہ نرا پیار اوّل سے [illegible] کر آخیر تک پیار ہی پیار روح کو سزا اور زندگی کو اجیرن بنا [illegible] ہے۔ روٹھنے والے جب من جاتے ہیں۔ تو محبت میں ملکو[illegible] پیدا ہو جاتا ہے۔ اس لذت سے کچھ وہی آشنا ہیں۔ جو کبھی روٹھ کر مل چکے ہوں۔

مختصر یہ کہ اس آسمانِ تفرقہ پرداز کے نیچے آج تک میاں بیوی کا کوئی ایسا جوڑا پیدا نہیں ہوا۔ جس میں ساری ازدواجی زندگی میں کبھی محبت کی حدت نے آتشیں جلوے نہ دکھائے ہوں۔ اور اگر دنیا کے آباد یا غیر آباد جغرافیے کے کسی کونے کھترے میں انسانی نسل کے کوئی ایسے فوق الفطرۃ میاں بیوی بھی موجود ہیں۔ جن کی زندگی میں باہمی ناز و نیاز

؎۲۔ شادی

نے ایک لمحہ کے لئے بھی کبھی حریفانہ انداز اختیار نہ کیا ہو۔ تو ایسے "سُپر نیچرل" جوڑے کی موزوں قیام گاہ وہ جگہ نہیں جہاں وہ دُنیا والوں کی نگاہ سے الگ زندگی گزار رہا ہے۔ اُنہیں چاہیئے اور وہ نہ چاہیں تو اُس علاقے کی حکومت کا فرض ہے۔ کہ اپنے چڑیا گھر میں اُن کی بود و باش کا انتظام کرے ورنہ "جنگل میں مور کس نے دیکھا!"

ہاں تو میاں بیوی خواہ فقر کی کُٹیا میں رہتے ہوں، یا شاہی محل میں۔ محبت کی دیوانگی میں مبتلا ہوں، یا عقل کی فرزانگی کے سرمایہ دار۔ کوئی ہوں، کہیں ہوں، کیسے ہی ہوں، یہ نہیں ہو سکتا۔ کہ اُن کے تعلقاتِ زناشوئی نے کبھی زندگی کا ثبوت نہ دیا ہو۔

اپنی اپنی سطح اور اپنی اپنی پسند کے مطابق ہر میاں بیوی کبھی کبھی اُلجھ بھی پڑا کرتے ہیں۔

البتہ مہذب اور تربیت یافتہ جوڑے کی رسہ کشی حریفانہ رنگ میں چند سوال و جواب، پھر کچھ دیر یا کچھ دن روٹھنے کے بعد جلد محبت کی گرم جوشی میں تبدیل ہو جاتی ہے اور ان گھڑ قسم کے جوڑے خصم لڑائی میں زبانوں کے ساتھ ساتھ پاؤں کو بھی شریکِ جنگ بنا لیا کرتے ہیں۔ خلاصہ یہ ہے۔ کہ ہر میاں بیوی میں ہاتھ پاؤں کے ساتھ تبادلۂ خیالات ہو۔ یا زبانی زور آزمائی جو کچھ بھی ہو، کچھ نہ کچھ ہوتا ضرور ہے۔ اور جو اس سے انکار کرے وہ یا تو جھوٹا ہے یا کنوارا۔ جھوٹا ہے تو ناقابلِ اعتبار اور کنوارا ہے تو ناتجربہ کار۔ اس مسئلے میں دونوں کے دعوے غلط اور بیکار ہیں۔

لہٰذا اصل دعوٰے ثابت کہ ہر میاں بیوی میں جنگ ضرور ہوتی ہے۔ اور ایک جنگ ہی پر کیا منحصر ہے۔ ہر اجتماعی ہنگامہ جو دو جانداروں میں واقع ہو سکتا ہے۔ ہر میاں بیوی میں بھی بپا ہوتا ہے، ہو سکتا ہے، ہوتا رہتا ہے اور جب تک دنیا قائم اور شادی بیاہ ضروری ہیں۔ ہوتا رہے گا۔

اسلئے آج اگر ہم اپنی بیوی سے پہلی جنگ کا افسانہ سُناتے ہیں تو کسی میاں بیوی کو ہم پر یہ آوازہ کسنے کا حق نہیں۔ کہ تم غیر مہذب معاشرت کے آداب سے ناآشنا یا بیوی کے حق میں ظالم ہو کیونکہ "ایں گناہیست کہ در شہر شما نیز کنند"

ہم اور آپ خانہ جنگی کے اس حمام میں سب ننگے ہیں۔

ہم بھی آپ کی طرح کے ایک انسان ہیں۔ انسان جذبات کا ایک پُتلا ہوتا ہے۔ انسانی جذبات میں محبت کی طرح غرور منفی بھی شامل ہے۔ بیوی کے غرورِ نسوانی نے ہماری غیرتِ مردانہ کو چیلنج کیا تھا۔ وہ چیلنج منظور کر لیا گیا۔ لڑائی ہوئی۔ اور خوب جم کر ہوئی۔ اب یہ حُسنِ اتفاق کہیئے۔ کہ اس جنگ میں میدان ہمارے ہاتھ رہا۔

آپ ہی ذرا انصاف کیجیئے۔ کہ ہم محبت تو ان سے کرتے ہیں۔ پھر غصہ اتارنے کہاں جائیں؛ پھر یہ امر مشکل اور مشکل سے زیادہ غیر منصفانہ بھی ہے۔ کہ محبت کا اظہار تو کریں بیگم صاحبہ سے اور غصہ اُتارنے کے لئے کسی پڑوسی یا پڑوسن کو ڈھونڈیں بھئی جو ہماری ساری محبت کی تنہا مالک بن رہی ہے۔ اُسے ہمارے تھوڑے سے غصے کا حصہ دار بھی بننا چاہیئے۔ یہ کیا کہ "میٹھے میٹھے ہپ ہپ اور کڑوے کڑوے تھو تھو"

بیوی آخر بیوی ہے، رفیقِ زندگی کہلاتی ہے۔ ہر مہینے کی پہلی تاریخ ہم سے ہماری تنخواہ اس انداز سے وصول کرتی ہے جیسے ہم اُس کے نادہندہ قرضدار ہیں۔ پھر کیا مجال جو اُس سے استفساروں میں بھی یہ پُوچھ سکیں۔ کہ تنخواہ مرحوم کا کیا حشر ہوا تو انصاف یہ چاہتا ہے۔ کہ اگر ہم دن بھر دفتر کی چکی پیس کر تھکے ماندے گھر میں آئیں۔ اور بیرونی کوفت کو کبھی کبھی ذراسی تلخ نوائی سے ہلکا کرنے کی کبھی کبھار چھوٹی موٹی کوشش کر لیا کریں۔ تو گھر کی ملکہ کو ہماری شوہرانہ حکومت کا خندہ ضبط سے خیر مقدم کرنا چاہیئے! اور اگر اسے اُن کا بیویانہ غرور برداشت نہ کرے۔ تو ہمارے ساتھ ایک آدھ لڑائی لڑ لیا کریں چنانچہ

وہ بے چاری جیسا موقعہ دیکھتی ہے۔ ضبط اور جنگ میں سے ایک پہلو اختیار کر لیتی ہے۔

انصاف کیجئے۔ کہ بے انصافی کی بات ٹھیک نہیں ہوتی آپ ہی سوچئے کہ بیوی کی محبت کے اگر کچھ حقوق ہم پر نہیں تو ہمارے غصّے کو بھی اُس سے زحمت پذیرائی کی توقع کرنا بیجا نہیں۔ تالی دونوں ہاتھوں سے بجا کرتی ہے۔ ایک ہاتھ سے کبھی نہیں بجی۔

مختصر یہ کہ ہم میں اور ہماری بیوی کے درمیان زندگی میں ورائٹی پیدا کرنے کے لئے کبھی کبھی لڑائی بھی ہو جایا کرتی ہے

اب رہا بیوی سے پہلی جنگ کا سوال! ہمارے لئے ذرا ٹیڑھا سوال ہے کیونکہ ہم خوش قسمتی یا بد قسمتی سے دو بیویوں کے شوہر اور دو کے منگیتر ہیں۔ آپ یہ فقرہ سُنکر چونک پڑے ہوں گے۔ کہ ایں یہ کیا؟ نئی روشنی میں یہ اندھیر کیسا! ایک نہ دو اکٹھی چار بیویاں۔ ہمارا صاف جواب ہے۔ اور بے لاگ بات یہ ہے۔ کہ ہمارا خاندان (جس میں ددھیال اور ننھیال دونوں شاخیں شامل ہیں) اصلاح معاشرت کا شروع سے حامی رہا ہے۔ ہر سال کی "ایر بک" اُٹھا کے دیکھ لیجئے! ہندوستان میں عورتوں کی تعداد کئی صدی سے مردوں سے بہت زیادہ چلی آتی ہے۔ اب اگر ایک ایک میاں ایک ہی ایک بیوی پر اکتفا کرنے لگے۔ تو بے چاری کروڑوں عورتیں "کنوار کوٹلے" ہی میں گھٹ گھٹ کر مر جایا کریں۔ ہمارے مورث اعلیٰ سے ملکی خواتین کی یہ بے بسی اور بے کسی نہیں دیکھی گئی۔ اور اُنہوں نے ایک وصیت نامہ لکھ کے خاندان کے ہر مرد کے ذمے یہ ڈیوٹی لگادی۔ کہ وہ "تعددِ ازدواج" کی حمایت کرنا اپنا انسانی فرض خیال کرے۔ ننھیال میں چونکہ امارت کے ساتھ آزاد مشربی رہی ہے۔ اس لئے ہمارے ہر نانا ماموں کم سے کم چار اور زیادہ سے زیادہ "حسب فتوحات" بیویوں کی پرورش کا بار اُٹھاتے چلے آئے ہیں۔ البتہ ددھیالی سلسلے میں مذہب اور ملاؤں کا ہر عہد اور ہر پشت میں زور رہا ہے۔ اس لئے ہمارے ہر پیڑھی کے دادا نے مذہب کے احترام اور خاندانی مُلّوں کے خوف سے صرف چار بیویوں ہی سے کنبہ چلایا ہے۔ ہم خود اپنے والد مرحوم کی چوتھی بیوی کی یادگار ہیں۔ جب ہم اپنے پَر پُرزوں سے اُڑنے کے قابل ہوئے۔ تو خاندانی سنت کو قائم رکھنے کے لئے ہم نے اپنے لئے یہ پروگرام تجویز کیا کہ جب کبھی ہماری آمدنی میں پچیس روپے ماہانہ کا اضافہ ہوگا۔ ایک عدد شادی رچالیں گے۔ جس وقت چار بیویوں کی پالگت ہماری آمدنی سے متعلق ہو جائے گی۔ تو آمدنی کی باقی ترقیاں چار بیویوں کے درجنوں زندہ ضمیموں پر صرف کیا کریں گے۔

ہمیں پہلی نوکری پچیس روپے ماہانہ کی ملی۔ اگرچہ وہ عارضی تھی۔ لیکن ہم نے تن بہ تقدیر پروگرام کے مطابق پہلی شادی کر لی۔ چند سال کے بعد ہماری تنخواہ پچاس ہوئی۔ تو ہمیں پھر شادی کے جھمیلے میں پھنس جانا پڑا۔ ہمارے دماغ اور ضمیر دونوں نے مل کر بڑا زور لگایا۔ کہ شرع کی رو سے دونوں بیویوں میں مساوات قائم رکھنی چاہیئے۔ مگر جناب! دل بڑا نٹ کھٹ ہے، کم بخت بڑا جذباتی۔ ٹس سے مس نہ ہوا۔ دماغ کی سُنی نہ ضمیر کی۔ پہلی بیوی بے چاری کو تھوڑی سی پنشن دیکر مصلے اور تسبیح کے حوالے کیا۔ اور ہم بے چاروں اور ہماری تنخواہ غریب کو دوسری بیگم کے چارج میں دے دیا۔ ادھر ہم سے یہ غلطی ہوئی۔ کہ خاندانی روایات کی تکمیل کی خاطر دو کو چار بنانے کے لئے دو شریف خاتونوں کو زبان دے بیٹھے جب سے اب تک بہتیرا زور لگا رہے ہیں۔ کہ کسی طرح پچاس روپے ماہانہ کی آمدنی اور بڑھ جائے۔ تو ان دوسری کو بھی جو ایک نہ دو اکٹھے نو بچوں کی ماں بننے کے سبب کافی حد تک محترمہ بن چکی ہیں۔ تھوڑی سی پنشن دیکر پہلی بیوی کے پاس حق ہُو کرنے کے لئے بٹھادیا جائے۔ اب دقت یہ ہے کہ پہلی بیوی، ہم اور ہماری دونوں منگیتریں یہ چاروں

درویش مل کر دعائیں کر رہے ہیں۔ منتیں مان رہے ہیں تعویذ گنڈے بھی کرتے رہتے ہیں۔ کہ کسی طرح ہماری آمدنی بڑھے۔ تاکہ وہ دو معصوم جانیں جو اللہ میاں سے لو لگائے ہماری سہرابندی کا انتظار کر رہی ہیں۔ منگیتری کے قفس کو توڑ پھوڑ کر ہماری شوہری کے سبز باغ میں آزادانہ پرواز کریں۔ مگر جناب ہم چاروں مخلص بندوں میں سے اللہ میاں کسی کی نہیں سنتے۔ اور سنتے ہیں تو کس کی پہلی دوسری سسرال والوں کی۔ ہمارے اِس سسرال میں ایک سے ایک بڑھ چڑھ کر نمازن بڑھی درجنوں بھری پڑی ہیں۔ سب کمبختوں کو ہماری تنخواہ سے وظیفہ مل رہا ہے۔ مگر ان کی دعائیں ہماری آمدنی کے خلاف جا رہی ہیں۔ صرف یہی نہیں بلکہ ہمیں پتہ لگا ہے۔ کہ یہ وظیفہ خوار بوڑھیاں جس پیر فقیر سے ملتی ہیں یہی کہتی ہیں "شاہ جی ہماری نواسی لاہور میں بیاہی ہے اور جس مردوے سے بیاہی ہے۔ اُسے جڑ دیں کر نیکی مار دُعا کریں۔ اس کی تندرستی تو قایم رہے۔ مگر آمدنی میں ایک پائی کا بھی اضافہ نہ ہو۔ اُس کی دو منگیتریں مُرداریں آنے کو تیار بیٹھی ہیں۔ کوئی ایسا تعویذ دو! کہ دونوں چڑیلیں جوان ہی مر جائیں۔ اور ہماری نواسی کے گھر میں انہیں آنا نصیب نہ ہو"۔ ان کم بختوں کی بد دعاؤں کا یہ اثر پڑا ہے۔ کہ جو کار و بار ہم آمدنی بڑھانے کے لئے شروع کرتے ہیں۔ اُس میں گھاٹا پڑ جاتا ہے۔ بلکہ ہماری تنخواہ بڑھنے کی بجائے دفتری تخفیف کی زد میں آگئی ہے۔ یعنی پچیس بڑھنے کی بجائے پچیس روپے کی تخفیف ہو گئی ہے۔ آٹھ پہر اسی اُدھیڑ بن میں گزارتے ہیں۔ کہ منگیتریں بے چاریں کب تک ہماری آمدنی کا انتظار کریں گی۔ دس سال کچھ تھوڑے تو نہیں ہوتے اودھر ہماری داڑھی مونچھوں نے رنگ بدلنا شروع کر دیا ہے۔ اگر ہمارے اقتصادی زوال نے اور دس پانچ سال ڈیرے ڈالے رکھے۔ تو ہم منگیتروں سے سُرخرو ہونا تو درکنار، ان کے لئے "مخدوم و محترم قبلہ" بن کر خانہ آبادی ہی کے کھڑاگ سے دست بردار نہ ہو جائیں رضینا بالقضا!

مختصر یہ کہ ہم خیر سے دو بیویوں کے شوہر اور دو خاتونوں کے منگیتر ہیں۔ اپنی منگیتروں بے چاریوں سے تو ہمارے اس افسانے کا کوئی تعلق ہی نہیں۔ کہ وہ ابھی تک ہماری بیویاں نہیں بن سکیں۔ پھر اُن سے پہلی جنگ اور آخری جنگ کا کیا واسطہ! جب کبھی خدا اُن کے دن پھیرے گا۔ یا ہمارے نصیب جاگیں گے۔ اُس وقت دیکھا جائیگا۔ بظاہر اُمید تو نہیں کہ وہ ہم سے یا ہم اُن سے کوئی جنگ کریں گے۔ خدا انہیں رہتی دُنیا تک زندہ رکھے۔ بڑی شریف اور مخلص خاتونیں ہیں۔ صوم و صلوٰۃ کی پابند ہیں۔

پہلی بیوی اُن سے ہم نے بہ کثرت لڑائیاں لڑی ہیں۔ سب لڑائیوں کا حال لکھا جائے۔ تو چار سو صفحے کا ایک جنگنامہ مرتب ہو سکتا ہے۔ لیکن ایک تو ان کی ہماری شادی کو ۲۲ سال ہو چکے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں وہ مکرمہ سے محترمہ اور محترمہ سے مخدومہ کے درجے کو پہنچ چکی ہیں۔ ان کے روٹھنے منانے کا حال لکھنا بیکار ہوگا۔ کہ

وقتِ پیری شباب کی باتیں
ایسی ہیں جیسے خواب کی باتیں

اس سے یہ مطلب نہ نکال لیجئے۔ کہ اُن کے ساتھ خدانخواستہ ہم بھی بوڑھے ہو رہے ہیں۔ ہرگز نہیں ہم بدستور جوان ہیں۔ اور مرتے دم تک جوان رہنا چاہتے ہیں۔ چاہتے کیا ہیں خدا نے چاہا جوان ہی رہیں گے۔ ہمارا دل جوان، دل کی اُمنگیں جوان، شریانوں میں خون جوان۔ ارادے جوان ایڑی سے چوٹی تک ہم جوان ہیں۔ آپ ہنس رہے ہیں۔ ہنسئے، خوب ہنسئے۔ ہنستے جائیے! آپ کی ہنسی ہماری جوانی بلکہ نوجوانی کو بڑھاپے میں تبدیل نہیں کر سکتی۔ رہے ہمارے سر کے بال ان نامعقولوں کا اعتبار نہ کیجئے۔ جھوٹ۔ یہ سپید جھوٹ بول رہے ہیں۔ دیکھئے ہماری دوسری بیوی کبھی جھوٹ نہیں بولتی۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ پہلی بیوی ہمیشہ جھوٹ بولتی رہتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ دوسری بیوی زیبِ داستان کے لئے جھوٹ یا مبالغے کو گناہ تصور کرتی ہے۔ تو یہ صادق البیان خاتون بشرطیکہ ہم سے روٹھی ہوئی نہ ہو۔ ہمیں جوان بتاتی ہے۔ اودھر لاہور کی ہمہ

کمپنی بیس سال سے اپنے رجسٹروں میں ہمیں جوان لکھتی چلی آئی ہے۔ آپ جانتے ہیں۔ بیمہ کمپنی کے ایجنٹ بڑے سچے لوگ ہوتے ہیں تو پہلی بات تو یہ ہے۔ کہ پہلی بیوی سے ہماری محبت اب عقیدت میں تبدیل ہو چکی ہے۔ ہمارے لئے اُس سے چھیڑ چھاڑ کرنا گستاخی میں داخل سمجھی جانے لگی ہے۔ دوسرے یہ کہ وہ اور ہم اب صرف قاضی کے رجسٹر نکاح خوانی میں میاں بیوی لکھے ہوئے ہیں ورنہ اُس کا ہمارا تعلق اب صرف اتنا رہ گیا ہے۔ کہ ہر ماہ کی پہلی کو یہاں سے منی آرڈر جاتا ہے۔ تو وہ سمجھ لیتی ہوگی کہ شوہر نامدار ابھی آنجہانی نہیں ہوئے اور وہاں سے منی آرڈر کی رسید آتی ہے تو ہم خیال کرتے ہیں کہ "ابھی دلی دور ہے"

بیچاری تمت پانسو میل بیٹھی ہوئی ہمارے تقوے کی نمازیں بھی پڑھتی رہتی ہے۔ بھلا اس کی اپنی پہلی جنگ کا حال کیا سنائیں اور کیوں سنائیں۔ بقول داغ: "جس سے مطلب نہ ہو۔ پھر اُس کو سنانے بھی نہیں"

رہیں دوسری بیگم اُن سے ہماری ہم چخ کبھی کبھار ہو جاتی ہے۔ ورنہ عام طور پر باہم صلح صفائی رہتی ہے۔ اب سے دوراُن سے ہماری پہلی جنگ ۱۹۲۵ء میں ہوئی تھی یہ جنگ بڑی دلچسپ بڑی شاندار اور بڑے معرکے کی جنگ تھی۔ اس جنگ میں ان کے حصے میں شاندار پسپائی اور ہمارے نصیب میں یادگار فتح آئی تھی۔ اس فتح کا افسوسناک پہلو یہ ہے۔ کہ تاوان جنگ ہمیں کو ادا کرنا پڑا تھا۔ اب ذرا اس اجمال کی تفصیل و بیان دے کر سنئے۔ اس وقت اس تاریخی خانہ جنگی کا فاتح حریف ریڈیو پر بول رہا ہے اور شکست خوردہ غنیم ریڈیو اسٹیشن سے ایک میل کے فاصلے پر اطمینان سے نماز ادا کر رہا ہوگا۔ کیونکہ اُس کی اطلاع کے بموجب ہم اس وقت اپنے دفتر میں ایک افسر کی الوداعی دعوت میں شریک ہیں۔

اب سے دوراُن سے ہماری پہلی جنگ ۱۹۲۵ء میں ہوئی تھی۔ یہ جنگ بڑی دلچسپ، بڑی شاندار اور بڑے معرکے کی جنگ تھی۔

اب یہ ہماری بیوی کا بھولا پن اور ناتجربہ کاری تھی۔ کہ اپنے شوہر پر جو سو فیصدی شوہر ہے ایسے منتر آزمانے لگیں۔ بھابی جان رسالے اور اخبارات زیر مطالعہ رکھتی ہیں۔ آپ جانتے ہیں۔ آجکل کے زنانہ پرچوں کی مضمون نگار خواتین ہر مضمون کی ابتدا عموماً ان فقروں سے کیا کرتی ہیں۔

"اور یہ ظالم مرد، ہم مظلوم عورتوں پر ظلم توڑنے والے مرد" وغیرہ۔ "یہ حقوقِ نسوانی کو پامال کرنے والے مرد" وغیرہ وغیرہ۔

بیوی۔ اس فرائض نامے کو ختم بھی کروگے یا نہیں؛ ہم نے تو سُنا تھا کہ مذہب میں عورت مرد کے حقوق مساوی ہیں۔ تمہاری باتوں سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ بیوی میاں کی بندور ہوتی ہے۔

ہم۔ جب عورت مرد ہی برابر نہیں۔ تو اُن کے حقوق مساوی کیوں کر ہو سکتے ہیں۔ عورتیں مذہب کی رو سے مردوں کی محکوم ہیں۔ اس سے زیادہ ان کی کوئی حیثیت نہیں۔

بیوی۔ شکریہ تم نے یہ نہیں کہہ دیا۔ کہ عورت گھر کے فرنیچر میں شامل ہے اور اُس کی ضرورت صرف اتنی ہی ہے جتنی گھر کے سامان کی۔

ہم۔ بیگم گھر کے سامان میں تو عورت سے بھی بہت زیادہ ضرورت کی چیزیں ہوتی ہیں مثلاً شوہر کے مطالعے کی کتابیں۔ روشنی۔ فونٹین پن۔ کاغذ میز کرسی وغیرہ۔

بیوی۔ گویا تمہارے ہاں کوئی مہمان آئے۔ تو تم ڈرائنگ روم کے سامان کے ساتھ نایاب چیزوں کے سلسلے میں بیوی کو بھی انٹروڈیوس کراؤگے؟۔

ہم۔ ایسا کوئی مہمان آ جائے۔ جس سے تمہارا پردہ کرانا ہم ضروری خیال نہ کریں۔ تو یقیناً اُس سے اسی قسم کی باتیں کریں گے۔ جناب یہ ہال کمرے میں جو قالین بچھ رہا ہے۔ کشمیر کا ہے۔ ۵۰ روپے خریدا ہے پہلے ۸۰ روپے میں آتا تھا۔ یہ چائے کا سٹ ہے۔ ۱۲ کا کبھی اکیس روپے اس کی قیمت تھی۔ یہ تصویر پونا بلکہ کوشن سے سستے داموں ہاتھ آگئی ہے۔ مشہور مصور راوی دریا کا منظر ہے۔ یہ پیچھے جرمن سلور کے ہیں۔ ان پر قلعی کی ضرورت نہیں پڑتی اور یہ ہماری بیوی ہیں بریانی اور متنجن بڑا اچھا پکاتی ہیں۔ یا تو زیادہ نہ ہوتیں۔ تو خوب چیز تھیں۔

بیوی۔ تو ہم آپ کے گھر کا فرنیچر ہیں گویا بیوی آپ کے نزدیک فرنیچر میں شمار ہوتی ہے۔ آپ حاکم ہیں اور میں محکوم۔ کیا قرآن میں لکھا ہے یہ؟

ہم ۔ وہی قرآن جو رسول اللہ پر نازل ہوا تھا جو کتبوں، مسجدوں،
جزدانوں اور دین محمد تاجر کتب کی دکانوں میں رکھا رہتا ہے۔
وہی جس کی ہم کبھی کبھی اور پولیس کے گواہ آئے دن عدالتوں میں
قسم کھایا کرتے ہیں۔

بیوی ۔ ہمارے قرآن میں تو یہ لکھا ہے کہ مرد عورتوں کے محکوم ہیں۔

ہم ۔ ضرور لکھا ہوگا۔ مگر وہ قرآن کسی عورت پر نازل ہوا ہوگا۔ اور
عورت کو تو آج تک پیغمبر بنائی نہیں گئی۔ اس لئے اسکی پیغمبری
کی طرح وہ قرآن بھی مصنوعی ہوگا۔

بیوی ۔ تو گویا میں تمہاری محکوم اور بندہ رہوں؟

ہم ۔ محکوم تو قطعی ہو۔ باقی بندہ رہو یا نہ رہو کی بابت ہم صاف لفظوں میں
کچھ کہہ نہیں سکتے۔ صرف اتنا سمجھ لو کہ میاں، اور خاوند اردو میں آقا
کے لئے استعمال ہوتے ہیں۔ اب آگے تم ذہن لڑاؤ کہ خاوند آقا ہو
تو بیوی اس کی کیا کہلائے گی؟

بیوی ۔ پہلے منہ تو بنوا لو حاکم بننے کا۔ حاکم۔ آقا۔ بس لفظ ہی یاد کر رکھے
ہیں۔

ہم ۔ منہ بنا بنایا ہے۔ دیکھو ہمارے چہرے سے کیسا حاکمانہ اقتدار
برستا ہے۔ ہر صاحب نظر دور ہی سے ہمارے چہرے مہرے کو
دیکھ کر دل میں کہہ اٹھتا ہوگا "کسی بیوی کے بادشاہ آرہے ہیں"! تمہیں
جب ہوش پر ہوتی ہو نہیں کہا کرتیں، کہ تم سو آدمیوں کے درمیان
بھی اپنے چہرے کی وجاہت سے پہچانے جاتے ہو۔

سنو بیگم، ہم ہیں شوہر اور شوہر ہوتا ہے آدمی۔ اور خدا فرماتا
ہے کہ خدا نے آدمی کو اپنی صورت پر بنایا ہے۔ اسی لئے تو وہ اشرف المخلوقات
کہلاتا ہے۔ اور صرف اسی سے خدا نے اسے اپنی امانت خاص سپرد کی۔
یعنی خلافت الہیہ۔ گویا دنیا میں خدا کا جانشین مرد ہے۔ اور باقی ساری
کائنات اور عورت اس کی خدمت کے لئے پیدا کی گئی ہے۔

بیوی ۔ تو گیا عورت آدمی نہیں ہوتی۔

ہم ۔ ایں!! کیا عورت بھی آدمی ہوتی ہے؟ کل کو کہنے لگو گی کہ عورت
اشرف المخلوقات کہلاتی ہے۔ اور تم سے کیا تعجب ہے۔ کبھی اس کا
دعوے بھی کر بیٹھو کہ عورت خدا کی خلافت اور خلق خدا پر حکومت کرنے
کے لئے پیدا کی گئی ہے۔ بیگم دیکھو۔ خدا کا خلیفہ ہے انسان اور انسان
سے مراد ہے آدمی۔ اور آدمی مذکر ہوتا ہے۔ عورت بیچاری تو عورت
ہوتی ہے۔ کائنات کی ہر چیز کی طرح عورت بھی مرد کی اطاعت اور خدمت
کے لئے پیدا کی گئی ہے۔

دیکھو! کائنات کا سورج آدمی کو روشنی بخشتا ہے، چاند اسکی
کھیتیاں پکاتا ہے۔ ہوا اور پانی اسے زندہ رکھتے ہیں۔ تارے اس کیلئے
جگمگاتے ہیں۔ پرندے اسے اپنے رسیلے گیت سناتے ہیں۔ پھول اسکی
خاطر فضا کو مہکاتے ہیں۔ کلیاں اسے دیکھ کر مسکراتی ہیں۔ سبزہ اس کی
نگاہوں کے واسطے لہلہاتا ہے۔ گھنگھور گھٹائیں اس کے دل کو لبھاتی
ہیں۔ اسی طرح عورت اس کا دل بہلاتی ہے۔ اس کے بچے پالتی ہے
اس کے باورچی خانے کا انتظام کرتی ہے۔

مختصر یہ کہ جہان کائنات اور عالم عرفان خلیفۃ اللہ یعنی
آدمی یعنی مرد کے لئے خدا نے پیدا کیا ہے۔ مرد نہ ہوتا۔ تو نہ کائنات عالم
وجود میں آتی۔ نہ عورت نہ بیوی نہ تم۔

بیوی ۔ اور عورت نہ ہوتی تو مرد کس طرح پیدا ہوتا؟ خالی آٹے
سے؟

ہم ۔ مرد چونکہ خلافت الہیہ اور کائنات پر حکومت کرنے کے لئے
پیدا ہوا ہے۔ اس لئے اس کا پیدا ہونا تو ضروری تھا۔ عورت نہ پیدا ہوتی
تو چاند سورج کے لئے مرد کو جننا ضروری ہو جاتا۔ ستارے اسے جنتے۔
جنت کی حوروں کو اسے پیٹ میں رکھنے اور دودھ پلانے کا شرف حاصل
ہوتا۔ عورت کا تو یہ بڑا فخر ہے۔ کہ اسے مرد کی ماں اور اسکی بیوی بننے
کی سرفرازی حاصل ہوئی۔

بیوی ۔ تم نے کسی بڑے آدمی کا قول نہیں سنا۔ کہ جو ہاتھ پنگوڑا
ہلاتا ہے۔ وہ حکومت کی باگ تھامنے کی بھی صلاحیت رکھتا ہے۔

ہم ۔ یہ قول کسی بڑے آدمی کا نہیں۔ کسی خود فراموش بڑی عورت کا
معلوم ہوتا ہے۔ یا پھر کسی یورپین یا کسی مغرب زدہ انگلینڈ ملٹری ہندوستانی
کا ہوگا۔ وہاں حقوق طلب عورتوں نے مردوں کو دبا لیا ہے۔ یوں بھی وہ

برفانی ملک ہیں۔ نیاز مند شوہروں اور زن مرید میاؤں کی سرزمین کہلاتے ہیں۔ وہاں کے ہر شوہر میں پانچ فیصدی سے زیادہ شوہریت نہیں ہوتی۔ ہم ٹھیرے سرزمینِ مشرق کے باشندے۔ سو فیصدی مرد اور سو فیصدی شوہر ہمارے ہاں تو جو ہاتھ پنگوڑا ہلاتا ہے ہمیشہ سے ہمیشہ تک پنگوڑا ہی ہلاتا رہیگا۔ سلطنت کی باگ تو درکنار اُسے گھوڑے کی لگام پکڑنے کی بھی اجازت نہیں دی جاسکتی۔

بیوی۔ دُنیا میں عورتوں کی تعداد مردوں سے بہت زیادہ ہے۔ عام نسوانی بیداری پیدا ہو رہی ہے۔ عورتوں کو ووٹ کا حق مل چکا ہے۔ وہ زمانہ قریب ہے۔ جب پنگوڑا مرد ہلایا کرینگے۔ بچوں کی پرورش اور باورچیخانے کی ماماگیری اُن کا فرض ہوگا۔ اور عورت دنیا اور مردوں پر حکومت کریگی۔ یہ زمانہ کچھ دور نہیں تمہاری ہماری زندگی ہی میں آجائیگا۔ جب تک یہ مُبارک دور آئے عورتوں کو چاہیئے کہ مردوں کا بائیکاٹ کردیں۔

ہم۔ دنیا میں عورتوں کی تعداد مردوں سے کئی گنا زیادہ ہے۔ یہ سچ ہے مگر یہ کوئی اتفاقی امر تو نہیں، قدرت نے جان بوجھ کر عورتوں کی تعداد بڑھائی ہے۔ اُسکا یہ حُسنِ خلاقی قابلِ داد ہے۔ اِس میں لطیف اشارہ یہ ہے۔ کہ عورت مرد کی خدمت کے لئے پیدا کی گئی ہے۔ ہر مرد اگر چاہے۔ تو ایک سے لیکر چار تک شادیاں کرسکتا ہے۔ رہا ووٹ کا حق یہ مغرب کے نیاز مند شوہروں کی شکست کا نتیجہ ہے۔ ہم تو اِس کے شروع سے خلاف ہیں۔ خدا نہ کرے کبھی عورتوں کا عہدِ حکومت آگیا۔ تو ہم تو بیوی کچھ کھاکے سو رہیں گے۔ ہم سے تو تم پنگوڑا ہلانے کی امید نہ رکھو۔ باقی مردوں کے بائیکاٹ کا سوال۔ ہاں ہم بھی اس کی بزور تائید کرتے ہیں۔ وہ بڑا مبارک زمانہ ہوگا جب عورتیں مردوں کا پیچھا چھوڑ دیں گی۔ مرد اپنی نیند سوئیں گے اپنی بھوک کھائیں گے۔ جو کچھ کمائیں گے اپنے اوپر اُٹھائیں گے۔ کوئی تنخواہ کا دعویدار نہ رہیگا۔ سُسرال کے جاںداروں کی یالگت سے بچ جائیں گے۔ زیورات، زرق برق زنانہ پوشاک، تیل پھلیل، گوٹے ٹھپے، مِسّی سُرمہ، لونڈر اور پاؤڈر کے جھنجٹ سے چھُٹکارا پائیں گے۔ تم اس بائیکاٹ کی تحریک کی لیڈر بن جاؤ۔ مضامین لکھ لکھ کر ہم دیں گے۔ اپنے نام سے شایع کراؤ اور سب سے پہلے اس نیک تحریک کا آغاز ہمارے بائیکاٹ سے کرو۔ خدا تحریک میں بڑی برکت دے گا۔ ہم خوش ہمارا خدا خوش۔

بیوی۔ سُسرال والا کون تمہارے ہاں موٹھ بوٹ آرہا ہے! ایک لے دیکے میرا بھائی ہے۔ وہی تمہاری آنکھوں میں کانٹے کی طرح کھٹکتا ہے۔ وہ تو جب تک میں جیتی ہوں۔ ضرور آئیگا! ہزار بار آئیگا، جم جم آئیگا۔ تمہارے گھر والے زہرہ پھاڑ کے مرجائیں۔ اُسے آنے سے کون روک سکتا ہے؟ مت لیا کرو سُسرال کا نام میرے سامنے! بڑے آئے بیچارے۔ مُنہ پر ہر وقت سُسرال کا نام رکھ چھوڑا ہے اِس اُجڑی سُسرال میں اب کون رہ گیا ہے۔ میری تین جوان بہنوں کو ٹُک ٹُک کر تو کھا چکے۔ اماں تمہارے سبز قدم جانے سے پہلے ہی اللہ کو پیاری ہوگئیں۔ ایک بُڑھا باپ رہ گیا ہے۔ وہ بھی گئے دن اور کے رات کا۔ باپ کی نشانی بھائی ہے۔ اللہ رکھے۔ اُس کو میرے پاس آنے سے روکنے والا کون ہے؟ روک کے تو دیکھے۔

ہم۔ ہمیں تو معلوم ہے تمہارا بھائی ضرور آئے گا ہزار بار آئے گا، بلکہ آگیا تو جانے کا نام نہ لے گا۔ اسے بھلا کون روک سکتا ہے؟ شکر ہے تمہاری بہنیں ہمارے گھر آکر نہ مریں ورنہ تم ہمیں پولیس کے حوالے کردیتیں اب تم کبھی مرنے لگو تو خدا کے لئے میکے چلی جانا! نہیں سُسرال والے تمہارا خون ہمارے سر تھوپ دیں گے۔

بیوی۔ مجھ سے کیوں بیزار ہوگئے ہو؟ میں زیادہ جینے والی نہیں میری کسی بہن کو جوانی پرانی نہیں ہوئی جوان ہوتی گئیں مرتی گئیں۔ میں بھی کوئی دن کی مہمان ہوں۔ میرے خاندان میں عورتیں کالے جوڑے لیکر سدھار جاتی ہیں۔

ہم۔ آہ بیوی ہم ایسے خوش نصیب کہاں ہیں؟ تم اگر کسی اور گھر جاتیں تو جوان مرگی کے متعلق تمہاری خاندانی روایات ضرور قائم رہتیں۔ اب تو تم ہمارے گھر آئی ہو بے خطر رہو۔ تمہارا یہ کالا چونڈا کالے سے بھورا اور بھورے سے چٹا اور چٹے سے خدا جانے کیا کیا رنگ بدلیگا۔ موت تم سے مایوس ہوچکی ہے۔ بس ہمیں کو مرنا پڑیگا۔ تب کام چلے گا۔ تم جم جم جئے جاؤ

بیوی۔ میں تمہیں مار کے مروں گی۔ کیا مُنہ بھر بھر کے مجھے کوس رہے ہیں۔ کوئی سُنے تو کیا کہے؟

ہم۔ نہیں بے فکر رہو ہمیں مار کے بھی تم جیتی ہی رہو گی تم مرنے والی اسامی نہیں ہو۔

بیوی۔ نانی اماں کو خدا غارت کرے مجھے اس جہنم میں جھونک دیا اس پردیس میں کوئی یہ بھی پوچھنے والا نہیں۔ کہ مجھ پر کیا گذر رہی ہے یہ کہہ کے ساتھ ہی رونا شروع کر دیا۔ کہ آپ بیوی والے ہی تو جانتے ہوں گے۔ کہ عورت جب اپنی غیر منطقی گفتگو میں ہارنے لگتی ہے تو پھر آنسوؤں کے آخری ہتھیار سے حربہ کرتی ہے۔ عورت کے آنسو سے زیادہ تیز ہتھیار آج تک نہیں بنایا گیا۔ اس حربے کو روکنے کے لئے چونکہ ہمارے پاس کوئی ڈھال نہ تھی۔ اس لئے دفتری کی حاضری کے نام سے پسپا ہو گئے۔

سارے دن دوستوں میں گھوم پھر کر گھر میں گھسے۔ تو ہمارے کشمیری نوکر نے جو اردو کو صحیح بولنا کشمیری زبان کی ہتک سمجھتا ہے۔ گھر میں قدم رکھتے ہی یہ دردناک خوشخبری سنائی۔

میاں تو کہاں گئی تھی۔ ہم تجھے سارا دہاڑی
کھوجتا رہا۔ بیگم صاحب آج بوت مدوتا رہا۔ کانا بی نہیں
کایا۔

اس خبر نے ہمیں اپنے مرکز سے ہلا دیا۔ آیت الکرسی پڑھتے ہوئے بیگم کے پاس پہنچے۔ وہ بظاہر سو رہی تھیں۔ مگر درحقیقت انہوں نے سونے میں جان ڈال رکھی تھی۔ ہم نے کہا بیگم۔ بیگم یہ کیا وقت ہے سونے کا سوئے چلی جاؤ گی اُٹھو۔ ہماری آواز سے وہ کسمسا کر اُٹھیں۔

بیوی۔ کیا ہے۔ کیوں مجھے تنگ کیا جا رہا ہے۔

ہم۔ تم نے کھانا کھا لیا؟

بیوی۔ تم کون پوچھنے والے۔

ہم۔ ہم کون۔ تمہارے پیارے شوہر۔

بیوی۔ صورت گم کرو۔ اپنی مجھ سے مت کلام کرو۔ کیوں لے فضلو! دلی کو گاڑی کس وقت جاتی ہے؟

ہم۔ کیوں خیر تو ہے کہاں کا ارادہ ہے۔ دلی کیوں چلیں؟

بیوی۔ جہاں سینگ سمائیں گے وہاں جائیں گے۔

ہم۔ سینگ تو یہاں بھی سما سکتے ہیں۔ اور نہ سما سکیں۔ تو تھوڑے تھوڑے ترشوا لو۔

بیوی۔ یہ چھیڑ خوانی مجھے اچھی نہیں لگتی۔ میں اپنے میکے جا رہی ہوں۔ شام سے پہلے سوا لاکھ روپے کا انتظام کر دو۔

ہم۔ سوا لاکھ! جل جلالہٗ۔ سوا لاکھ۔ دس نہ بیس اکٹھے سوا لاکھ!! دلی کا کرایہ تو پونے چار روپے ہے۔ سوا لاکھ کیا کرو گی بیوی؟

بیوی۔ کچھ کروں گی تمہیں کیا۔ میرا مہر دو۔

ہم۔ مہر!۔

بیوی۔ ہاں مہر! سوا لاکھ کے مہر بندھے تھے نہیں! مکر جاؤ۔ کہہ دو نہیں بندھے تھے!

ہم۔ بالکل نہیں بندھے تھے۔ اور بندھے ہوں گے تو رسمی طور پر۔ ہماری حیثیت تو سوا لاکھ پیسوں کی بھی نہیں۔

بیوی۔ میں نہیں جانتی حیثیت ویثیت کو۔ اسی لئے ابا نے کچا کام نہیں کیا تھا۔ نکاحنامے کی رجسٹری کرائی تھی۔ یہ تمہیں اُگلنے پڑیں گے جناب!

ہم۔ ہم نے نگلے ہوتے تو آج اُگل دیتے۔

بیوی۔ میں نے کچی گولیاں نہیں کھائیں۔ مہر تم سے ایک ایک کوڑی وصول کروں گی۔ یاد رکھنا۔ میں عالی جاہ بیگم کی بھتیجی ہوں۔ جانتے ہو میری پھوپی کو۔ الٰہ آباد تک مقدمہ لڑی تھی۔ خسر اور خاوند کو لال پھاٹک پہنچوا کر دم لیا تھا۔ ساری جائیداد نیلام پر چڑھوا دی۔ اور اپنے مہر کا ٹکہ ٹکہ وصول کر لیا۔ تب جا کے اُن دونوں کو جیل سے نکلنا نصیب ہوا میرے مہر تم ہضم نہیں کر سکتے۔ تمہارے پیر سے بھی رکھوا لوں گی۔

ہم۔ ہمارے پیر تو دس سال گذرے۔ اللہ کو پیارے ہو چکے۔ اُن کی قبر پر سمن کی تعمیل کراتی پھرنا۔ رہے ہم ہمارے پاس دو چار جوڑی کپڑے کرنال شاپ کا سستا سا جوتا۔ ڈربی کی لاٹری کا ٹکٹ۔ قرضخواہوں کی دو چار ڈگریاں۔ دو ہزار کا قرضہ۔ اور کرایہ کا مکان ہے۔ یہ سب کچھ سامان اور ذمہ واریاں تم بغیر مقدمہ کئے بھی لے سکتی ہو۔

بیوی۔ اور تنخواہ کہاں پٹ ہو گئی۔ اس کا ذکر نہ کیا ڈگریاں ہی

گنوانی آتی ہیں۔

ہم۔ جب تم جارہی ہو۔ تو ہم نوکری کرکے کیا کرینگے۔ کمبخت پرانی تابعداری یہ سب جھنجٹ تو تمہارے کارن کر رہے تھے۔ ادھر تمہارا تانگہ اسٹیشن سدھاریگا۔ اُدھر ہمارا استعفےٰ دفتر روانہ ہو جائے گا۔

بیوی۔ اور یہ پلّے کیا زہر مار کریں گے؟

ہم۔ ہم تو ان پلوٹھوں کے خریدار بنتے نہیں۔ اِس کباڑ کو بھی ساتھ لیتی جانا۔ ان کی آٹھ پہر کی ہاہاکار سے ہم پہلے ہی اُکتائے ہُوئے ہیں۔

بیوی۔ کیوں میں جہیز میں انہیں ساتھ لائی تھی؟

ہم۔ ہم بھی چڑھاوے کے ساتھ انہیں نہیں لے گئے تھے۔

بیوی۔ بس اپنی علّت کو سنبھالو۔ میں میکے سے تنہا آئی تھی۔ تنہا ہی جاؤں گی۔ اللہ رکھے میرے باپ کے ہاں میرے لئے سب کچھ ہے

ہم۔ یہ علّت ہے یا بیماری۔ جو کچھ بھی ہے۔ تمہارے قدموں کا صدقہ ہے۔ ہم تو جب کنوارے تھے چھڑے چھٹانک تھے۔ چھڑے چھٹانک ہی رہنا چاہتے ہیں۔ اللہ رکھے تمہارے باپ کے ہاں سب کچھ ہے جہاں بیٹی کو پالیں گے۔ نواسی نواسوں کو بھی بھوکا نہ دیکھ سکیں گے۔

بیوی۔ واہ کیا کہنے۔ نری مری اخور میں کیوں ہیٹنے لگی تھی۔ اِس گھر مرات ہوئے ہیں کیسی منحوس گھڑی آئی تھی۔ ساری جوانی غارت کر دی میرا گلاب سا رنگ اُلٹے توے سے بدل گیا۔

ہم۔ ہمارے نے بھی تمہارا آنا کچھ راس نہیں آیا۔ تمہارے تشریف لانے سے پہلے ہم بھی جوان رعنا تھے۔ جس طرف کو نکل جاتے تھے۔ وہ گلیاں سج جاتی تھیں۔ کبھی محفل کا سنگھار سمجھے جاتے۔ جوانی پھٹی پڑتی تھی۔ صحت عضو عضو سے پھوٹ رہی تھی۔ لوگ ہماری تصویریں اُتارتے تھے رستہ چلتے ہمیں گھڑی بھر دیکھنے کو کھڑے ہو جاتے تھے۔ وہی ہم ہیں اب ہمیں کوئی دیکھے تاک پکڑے سے دم نکلتا ہے۔ آٹھویں دن ڈاکٹر یوسف انجکشن کی شیشی نئے دکھائی دیتے ہیں۔ ۲۹ تاریخ عید کا چاند سب سے پہلے ہم دیکھا کرتے تھے۔ اب عینک میں بھی ایک ایک حرف کے چار چار نظر آتے ہیں۔ دو قدم چلتے ہیں تو دم پھول جاتا ہے اپنی اور تمہاری زندگی کا نتیجہ بن کر رہ گئے ہیں۔ تمہارے قدموں کی برکت سے جوانی خاک میں مل گئی۔ ہم کس سے شکایت کریں! مُنہ کے دانت ایک ایک کرکے ڈاکٹر اے جلال دین نے نکال لئے۔

بیوی۔ میرے قدم ـــــ! میرے قدم تو ایسے ہیں کہ ۱۲۰ اُپلی سے دوسو پارے ہو۔ جوانی اپنے کوتکوں سے خاک میں ملائی ہو گی۔ میں اِس ذق ذق بق بق کو سُننا نہیں چاہتی۔ ریل کا وقت آرہا ہے۔ میرا مہر دلواؤ اسی دم ہاتھ سے۔

ہم۔ کہہ تو دیا۔ کہ ہم تمہاری دُعا سے دو ہزار کے قرضدار ہیں۔ اپنے ساتھ انہیں بھی لے چلو۔ قرضداروں اور ڈگریوں سے تو پیچھا چھوٹے گا۔ ہمارے کو تنک تو بیگم فرشتوں سے بھی اچھے ہیں تم نہ آتیں تو برہمچاری پیر مشہور ہو کر پجا کرتے۔

بیوی۔ تمہارا کیا اچار ڈالوں گی لے جا کر؟

ہم۔ بدمزہ تو نہیں ہوگا۔ ہماری باتوں سے زیادہ چٹ پٹا ہمارا اچار ہوگا۔

بیوی۔ میں کوئی خدا نہ کرے آدم خور ہوں۔

ہم۔ ہمیں تم آدمی کب سے سمجھنے لگیں؟ بیوی!۔

بیوی۔ چلو کیسی بیوی! کس کی بیوی، ہو گی کوئی چڑیل تمہاری بیوی مجھے بیوی بیوی مت کہا کرو۔

ہم۔ کیوں تم سے ہمارا نکاح نہیں ہوا تھا۔ اور بیوی نہیں ہو تو مہر کاہے کا مانگتی ہو۔ تم سچ کہتی ہو۔ ہماری بیوی کو ہمارے گھر کی عورتیں بھی چڑیل ہی بتاتی ہیں۔

بیوی۔ مہر ـــــ مہر تو تم سے ایسے رکھوالوں گی۔ جیسے آج کا دن۔ نہیں تو پہنچواؤں گی لال پھاٹک میں۔ چکی پیستے پیستے ہاتھوں میں گھٹے پڑ جائیں گے۔ میاں ہو کس ہوا میں۔ بڑے علامہ ظریف بنے پھرتے ہو۔ سب علامگی ولاگی بھول جاؤ گے۔ تمہارے گھر والیاں ہی چڑیلیں ہوں گی میں کیوں چڑیل ہونے لگی تھی۔

ہم۔ یہ پنجاب ہے پنجاب بیگم۔ اتحادی پارٹی کی حکومت ہو رہی ہے۔ قرضہ نہ دے سکنا یہاں جُرم نہیں۔ نہ مقروض کو لال پھاٹک

دیکھنے اور چکّی پیسنے کا خطرہ۔ ہم اپنی علاّ لگی بھولیں یا نہ بھولیں۔ مگر کسی طرح تم ہمیں بھول جاؤ۔ جب تم ہماری بیوی ہی نہیں۔ تو چڑیل کے لفظ سے بُرا کیوں مانتی ہو۔ ہم تو اپنی بیوی کو چڑیل بتا رہے ہیں۔ تم نے بھی تائید کر دی ہے۔

بیوی۔ میں تو مقدمہ دلّی میں کروں گی۔ پنجاب سے مجھے کیا واسطہ وہاں تو اتحادی حکومت نہیں۔

ہم۔ کسی پڑھے لکھے کے سامنے یہ مت کہہ بیٹھنا۔ تمہیں یہ بھی خبر نہیں کہ دلّی پنجاب میں داخل ہے؟ وہاں کی عدالتیں ہائی کورٹ کے ماتحت ہیں بیگم!

بیوی۔ خدا نہ کرے دلّی پنجاب میں داخل ہو۔ وہاں شاہ جارج پنجم کی حکومت ہے۔ دلّی پرائی راجدھانی ہے۔ میں ان چکموں میں نہیں آؤں گی میاں!

ہم۔ یک نہ شد دو شد۔ شاہ جارج پنجم کو فوت ہوئے کئی سال ہو گئے۔ ان کے پیچھے بعد دیگرے دو بادشاہ گدی پر بیٹھ چکے ہیں جارج پنجم کی حکومت تو شاید اب دوسری دنیا میں قائم ہوئی ہو گی۔ بس پھر وہیں مقدمہ دائر کر دینا۔ مگر اس کے لئے تمہیں یہ چولا بدلنا پڑیگا کیونکہ ان کی حکومت کی سرحد قبر سے آگے شروع ہوتی ہے۔

بیوی۔ مرنے سے پہلے تمہیں زندگی میں کنوئیں جھکواؤں گی۔ پھر مروں گی۔ اور حشر میں تو میرا ہاتھ ہوگا اور تمہارا گریبان۔ جب تک جہنم رسید نہ کرا دوں گی۔ دم نہ لوں گی۔

ہم۔ کنوئیں تو جتنے کہو ہم جھانکنے کو تیار ہیں۔ باقی حشر میں گریباں گیری کی دھمکی بھی بیکار ہے۔ ہم وہاں کوئی قمیص پہن کر تھوڑا ہی جائیں گے نہ گریبان ہوگا نہ تمہارے ہاتھ کو زحمت کرنی پڑے گی۔ اچھا تم وہاں سب کچھ کر لینا۔ کسی طرح مرنے کا تو سامان کرو!

بیوی۔ میں تو سمجھے ہوئے ہوں۔ خوب جان چکی ہوں تم مجھے گور کے گڑھے تک پہنچاؤ گے۔ جب تمہارا کلیجہ ٹھنڈا ہوگا۔ اچھا پھر یوں ہی سہی۔ مر کے بھی دکھائے دیتی ہوں۔ تم نے میری زندگی اجیرن بنا رکھی ہے۔ اس پر بھی تمہیں صبر نہیں تو یہ کھٹکا بھی مٹائے دیتی ہوں" "تم پہ قابو نہیں دل پر تو ہے قابو اپنا!"

ہم۔ ارے تم تو شاعری کا ذوق بھی رکھتی ہو۔ واہ بیوی اب بتایا ہے۔ جب مرنے کا ارادہ کر رہی ہو۔ دو ایک گھنٹے میں مرحومہ بن جاؤ گی۔ پہلے سے معلوم ہوتا تو دونوں مل کے شاعری کیا کرتے۔ ایک اور ایک گیارہ بنتے ہیں۔ دونوں کی مشترکہ شاعری کا بلب گیارہ کینڈل پاور کی روشنی دیتا۔

بیوی۔ تم اب آخری وقت مجھ سے کسی کا خون کراؤ گے۔ خدا کے لئے مجھے چین سے مرنے دو۔ اپنی کہیں صورت گم کرو۔ اس زبان کو لقوہ مارے مٹی۔ چلے ہی جاتی ہے۔

ہم۔ اچھا لو جاتے ہیں۔ اپنی صورت گم کئے لیتے ہیں۔

بیوی۔ کہیں باہر نہ چلے جانا۔ مجھے ایک آخری بات کرنی ہے

ہم۔ کہو تو یہیں بیٹھے رہیں؟

بیوی۔ خدا کے واسطے صورت گم کرو اپنی۔ میں آپ بلالونگی

ہم۔ کسی پہلو راضی نہیں عجب ضیق میں جان ہے۔

یہ کہکر ہم باہر بیٹھک میں جا بیٹھے۔ جانے کو چلے تو گئے مگر ہمارے دل و دماغ پر جو گزر رہی تھی۔ وہ ہمیں جانتے ہیں۔ بیوی کی قوت ارادی کا ہمیں بارہا تجربہ ہو چکا تھا۔ وہ بات کی پکی۔ حوصلے کی بلند۔ اور ضد کی پوری ہیں۔ اُن کی عادات و صفات پر جتنا غور کرتے تھے۔ دماغ چکر کھانے لگتا تھا۔ دل کلاک کے پینڈولم کی طرح ہل رہا تھا۔ اپنے مرکز ثقل سے ہم دور جا پڑے تھے۔ بار بار سوچتے تھے۔ اب کیا ہوگا؟ بیوی سے ہمیں محبت بھی ہے۔ یہ محبت اس وقت طوفانی صورت اختیار کر رہی تھی۔ ادھر سسرال والوں کے قانونی پروٹسٹ، تماشا پسند پبلک کی ہنگامہ آرائی، خدائی فوجدار پولیس کی جبری آستاں گیری، بلیک میلر اخبارات کی جلی سرخیاں یہ خطرات بھیانک مستقبل کے بھیس میں ہمیں لرزا رہے تھے۔ گھر میں بدقسمتی سے کوئی بڑھی بوڑھی نہ تھی۔ جو دونوں کو بزرگانہ انداز میں ڈانٹ ڈپٹ کر صلح کرا سکتی۔

انہیں خیالات میں غلطاں پیچاں تھے۔ کہ اندر سے

ملازم نے آکر کہا۔

ملازم۔ میاں! بیگم صاب بُلاتا ہے! تو جلدی چلے گی!"

ملازم کا یہ فقرہ کانوں پر گھن کی طرح بجا اور ہم سورۂ اخلاص پڑھتے ہوئے گھر جا پہنچے۔ دیکھا تو بیوی لباس فاخرہ بدلے، نوک پنجے سے لیس ہماری منتظر ہیں۔ جیسے ہی کمرے میں گھسے انہوں نے اُٹھ کر کمرے کا دروازہ بند کر لیا تھا۔ یہ وہ کٹھن گھڑی تھی۔ کہ ہمارے دل کی غیر معمولی حرکت میں آواز پیدا ہو رہی تھی۔ کواڑ بند کرنے سے ہمیں ایک شبہ اور اس کے ساتھ ایک خطرہ پیدا ہو گیا۔ شبہ تو یہ گذرا کہ کہیں اپنے ساتھ ہمیں بھی تو لاش میں تبدیل نہیں کرنا چاہتیں۔ دل کے وسوسے یقین بن کر ڈرانے لگے۔ ہمیں خواہ مخواہ یہ محسوس ہونے لگا۔ کہ ان کے پاس وہ لامبا خنجر نما چاقو ہے۔ جو پچھلے سال ہم وزیر آباد سے خرید کر لائے تھے۔ اب کوئی دم جاتا ہے۔ کہ یہ اپنی جگہ سے جست کر کے وہ سموچا خنجر ہمارے سینے میں اتار دیں گی اور پھر اُسی سے اپنی مشکل بھی آسان کر لیں گی۔

اپنے آپ کو دل ہی دل میں ملامت کرنے لگے۔ کہ یہ نامراد خنجر خریدنے کی بیہودگی کیوں کی تھی؟ ہائے کیا اسی لئے اِس خوبصورت موت پر دو روپے صرف کئے تھے۔ کہ سب سے پہلے خریدار ہی پر اس کا وار ہو گا۔

خطرہ یہ پیدا ہُوا۔ کہ اگر بیوی نے زہر کھا کر ہماری جان بخشی کر بھی دی۔ تو اس کی خودکشی کی تحقیقات کے سلسلے میں یہ بدبخت کشمیری نوکر پولیس کے ہتھے چڑھ کر عدالت میں پولیس کی بولی بولنے لگے گا۔ اور عینی شاہد کی پوزیشن میں اپنی غلط سلط اردو سے ہماری نظیم ہستی کو تتر بتر کر کے چھوڑے گا۔ نقاش خیال نے فوراً ہمارے دماغ میں سشن جج کی عدالت تعمیر کر دی۔ جس میں سیاہ پوش وکیلوں کی دردناک چہل پہل تماشائیوں کی آرجار۔ لال پگڑیوں کی بھرمار، ملزم بیڑی ہتھکڑی سے آراستہ۔ پریس کے رپورٹروں کا ہجوم۔ سشن جج کے چہرے پر موت کا سا جلال۔ سرکاری وکیل کے خوفناک دلائل۔ اپنے وکیل کی بے بسی۔ نوکر کی عینی شہادت کہ

"ہاں حضور! بیگم صاب سے میاں بروبارٹی لڑتی تھی۔ اُسے سوٹی سے مارتی تھی۔ بیگم صاب ہر ویلے روتا تھا۔ کانا نہیں کاتا تھا۔ میاں لڑائی میں اُس سے کہتی تھی ہم تجھے کاچو سے حلال کر دیگا۔ زہر دے کر مار یگا میاں نے اُس دہاڑی ہم سے ایک بوتل توڑ کر کانچ پسوایا۔ پھر ہمیں حکم دیا۔ یہ کانچ بیگم صاب کے کانے میں ڈال دو۔ ہم انکار کیا" وغیرہ وغیرہ۔ یہ ہولناک ٹاکی فلم اپنی ساری تفصیلوں کے ساتھ ہمارے پردۂ دماغ پر گردش کر رہی تھی۔ ہم پر خوف و ہراس نے خود فراموشی طاری کر رکھی تھی کہ بیوی نے کہا۔

"قلم دوات لاؤ اور کاغذ"

ہم نے جیب میں سے فونٹن پن نکالا۔ اور نوٹ بک میں سے کاغذ۔ کہنے لگیں لکھو!

ہم۔ بتاؤ کیا لکھیں؟

بیوی۔ لکھو کہ:۔

میں اپنی رضا و رغبت سے خودکشی کر رہی ہوں۔ اور اپنے شوہر کو معاف کرتی ہوں میرے بعد میرا کوئی عزیز رشتہ دار مہر کا مطالبہ نہ کرے۔

ہم نے اوسان قایم رکھتے ہوئے کہا۔

"خدا تمہارا دونوں جہان بھلا کرے۔ تمہیں جنت کی بیوی بنائے تمہاری یہی نیکیاں ہمیشہ یاد آئیں گی"!

بیوی۔ مجھے یہ چکنی چپڑی باتیں اچھی نہیں لگتیں۔ بس چپ بیٹھے رہو اور جو لکھایا ہے لکھ دو!

ہم نے اوپر کی عبارت لکھ دی۔ تو انہوں نے کاغذ اور قلم لیکر اپنے دستخط کر دیئے۔ اور کاغذ جُوں کا توں ہمارے حوالے کر کے جیب میں سے ایک پُڑیا نکالی اور ہمیں پُڑیا دکھا کر بولیں۔

"یہ پسا ہوا کانچ ہے۔ میں اسے پھانک کر زندگی ختم کرنا چاہتی ہوں"!

"پُڑیا دیکھ کر تو ہماری روح کپکپانے لگی۔ یہ انچھر وہ ہماری بھاوج سے تازہ تازہ سیکھ کر آئی تھیں۔ ہماری بھاوج نے جب بھائی صاحب

کرکانچ کی پُڑیا دکھائی تھی۔ تو وہ انہوں نے فوراً ان کے سامنے ہاتھ جوڑ دیئے تھے۔ حالت ہماری بھی دگرگوں ہوگئی۔ اور قریب تھا۔ کہ ہم بھی بھائی صاحب کی پیروی کرتے ہوئے اس میدان سے پس پا ہو جائیں۔ مگر خدا نے ہماری بڑی مدد کی۔ اور ہمیں اُس وقت الہام سا ہُوا کہ اس وقت ہار مان گئے۔ تو یاد رکھنا بڑے گھٹنے کھاؤگے۔ آٹھویں دن پڑیا کا تماشا ہُوا کرے گا۔ تمام شوہرانہ اختیارات سے ہاتھ دھو بیٹھوگے۔ اور اِس ابتدا کی انتہا تمہیں اُس شہزادے کا ہم قسمت بنا دے گی۔ جو شرطِ شادی کی ادائیگی کے طور پر صبح بیوی کے ہاتھ سے ناشتے کی بجائے سو جوتیاں کھایا کرتا تھا۔ اس لئے عافیت چاہتے ہو۔ تو گربہ کشتن روزِ اول کے اصول پر کاربند ہو کر میدان میں ڈٹے رہو۔"

یہ خیال آتے ہی ایک منٹ کی چوتھائی میں ہم نے فیصلہ کر لیا کہ چاہے کچھ بھی ہو۔ ہم ہار نہیں مانیں گے۔ یہ دل میں ٹھان کر ہم نے کہا "بیوی ذرا ٹھیرو" اور دوڑ کر صراحی سے ایک گلاس پانی بھر لائے اور بیوی کی طرف بڑھا کر کہا۔ لو بسم اللہ کرکے یہ سفوفِ مشکل کشا پھانک کر اوپر سے پانی کا گلاس ڈگڈگا کر پی جاؤ۔ تاکہ گلے میں اٹکنے نہ لگے۔ اور پڑیا اپنے جلوے دکھانے میں دیر نہ کرے۔ بیوی کے اُستادِ ازل یعنی ہماری بھابی جان نے ہتھکنڈے سکھاتے ہوئے غالباً یہ ہدایت کر دی تھی کہ اس کرتب کو دھمکی کی حدود سے آگے نہ بڑھنے دینا یا پھر یہ بات ہے کہ جان بڑی پیاری ہے۔ اور جان پہ کھیل جانا سب سے مشکل کھیل ہے جو کچھ بھی ہوا ہوا یہ کہ خلافِ توقع پُڑیا انہوں نے ہمارے مُنہ پہ ماری۔ گلاس دیوار پہ پٹخا اور چمک کر کہتی کیا ہیں۔

"تمہیں جو مرجاؤں!"

اعترافِ شکست نے ہمارے خون میں مسرت کی لہر دوڑا دی قریب تھا کہ سرورِ فتحمندی میں ہم رقص کرنے لگیں۔ روحِ پسرجدید کی سی کیفیت طاری ہو گئی۔ اور ہم نپولین کے فاتحانہ انداز میں بولے۔

"با ـــ س ـــ تری تمام شد۔ ذرا سی پُڑیا بھی نہ پھانکی گئی۔ ہم نہ کہتے تھے۔ کہ پنگوڑا ہلانے والا ہاتھ نہ صرف پنگوڑا ہی ہلا سکتا ہے نہ ہوئے ہم تمہاری جگہ ایک کی بجائے چار پڑیاں پھانک کر دکھا دیتے

اب تو مانو گی کہ مرد خدا کا خلیفہ ہے۔ بیوی کا حاکم ہے۔ اشرف المخلوقات کہلانے کا حقدار ہے۔

بیوی۔ مرے مرنے کے ساتھ راہ چلتے کے ساتھ مرنا بیوقوفی ہے تمہارا کیا ہے میں مرجاؤں گی کوئی اور مستنڈی لا بٹھاؤ گے۔ میں مفت میں اپنی جان گنوا بیٹھوں؟ کس نے کہا ہے؟ تمہارے نزدیک میری زندگی کی کوئی قیمت نہیں۔ میرے باپ بھائی سے تو پوچھو۔ اس وقت انہیں کے خیال نے میرا خیال پلٹایا ہے۔ بوڑھے باپ کو تین جوان بیٹوں کی موت نے پہلے ادھ مؤا کر دیا ہے۔ میری موت کا غم اُسے مار ہی ڈالتا اِدھر ماں جایا بھائی سر پیٹ لیتا۔ تمہارا کیا جاتا میرے ساتھ اُجڑا میکہ بھی مٹ جاتا۔ تم مرجاؤ تو تمہارے میکے میں تم جیسے پلٹنوں بھرے پڑے ہیں تمہاری کمی کسی کو محسوس نہ ہوگی۔

یہ کہکر وہ اُٹھیں اور دوسرے کمرے میں جا کر انہوں نے کواڑ بند کرلئے۔ ہمیں شبہ ہے۔ کہ انہیں بھوک نے بہت ستا رکھا تھا۔ اُس کمرے میں دودھ کی کھیر بھری پتیلی رکھی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے۔ انہوں نے سارا غصہ غریب کھیر پر اُتارا۔ یہ شبہ یقین تک اس لئے ترقی کر گیا کہ ہمارے شام کے کھانے پر سب کچھ تھا۔ مگر کھیر مرحوم نہ تھی۔ انجام کار دو تین دن وہ روٹھی رہیں۔ ندامتِ شکست کا اثر مہینوں باقی رہا۔ گفتگو بھی کچھ مدت بند رہی۔ ہم سے کچھ کہنا ہوتا۔ تو دیوار کو انٹرپریٹر بنا کر ہماری طرف سے مُنہ پھیر کر کہتیں۔ ہم بھی دیوار ہی کو بات کا جواب دے دیا کرتے۔ جب اِس ان ڈائرکٹ بات چیت سے تنگ آگئیں۔ تو ایک دن ڈائرکٹ گفتگو کا افتتاح کرتے ہوئے بولیں۔

"بات کرنے کو جی تو نہیں چاہتا۔ مگر کیا کروں۔ بہشتی زیور میں رسول اللہ کی حدیث پڑھی ہے۔ کہ کسی مسلمان بھائی کو دوسرے مسلمان بھائی سے تین دن سے زیادہ گفتگو بند کرنی جائز نہیں۔ خدا کا خوف اور رسول اللہ کا ڈر نہ ہوتا۔ تو تم سے زندگی بھر نہ بولتی

ہم نے کہا "تم نے ہم سے ناحق بات چیت شروع کی۔ رسول اللہ نے دو مسلمان بھائیوں کا لفظ استعمال کیا ہے۔ میاں بیوی بھائی بھائی تو نہیں ہوا کرتے۔ تم اگر بول چال یونہی بند کئے رکھو

تو ہمیں مطلق تکلیف نہ ہوگی۔ اور نہ رسول اللہ ناراض ہونگے۔ آٹھو پہر زبان چلاتے ہی کا یہ نتیجہ ہے۔ تمہاری جیتی جان جاتی۔ اور خیر ہمارا کیا بگڑتا۔ اور بگڑنے کی بات بھی سچی ہے۔ تمہارے چالیسویں تک گھر سُونا پڑا رہتا۔ بچوں کو تم اور ہمیں تمہاری نیکیاں یاد آ آ کر انگ تکلیف پہنچاتیں۔ خودکشی کی حرام موت تمہیں جہنم رسید کرکے تمہاری عاقبت بھی خراب کرتی۔ یہ مانا کہ کچھ دن تعزیت کے مہمانوں سے چہل پہل ضرور ہو جاتی۔ پھر تمہاری قائم مقام کے خیر مقدم کی تیاری کو میں ہمارا جی بہل جاتا۔ مگر تم تو سو فیصدی نقصان میں رہتیں۔ اس لئے مصلحت اسی میں ہے۔ کہ ہم دونوں گونگے کا گڑ کھا لیں۔ بس دیوار ہی کے ذریعہ گفتگو ہوا کرے۔ احتیاط اسی میں ہے۔

بیوی۔ میری موجودگی میں کوئی قائم مقام گھر میں قدم تو رکھ کے دیکھے۔ نیبانی کی کرچیں کاٹ کے رکھ دوں۔ کیسی مصلحت کس کی احتیاط۔ ہم ضرور بولیں گے۔ تمہیں بولنا پڑے گا۔

ہم۔ خیر تمہیں اصرار ہے۔ تو تمہاری خاطر یہ ایثار بھی گوارا کر لیں گے۔

صُلح کی گفتگو جاری ہی تھی۔ کہ گھڑی کا الارم زور سے بجا۔ ہماری آنکھ کھل گئی۔ بڑبڑا کے لاحول پڑھتے ہوئے اُٹھ بیٹھے۔ اتنے میں بیگم کی محبت پاش آواز کان میں آئی۔ اجی آج کب تک سوئے چلے جاؤ گے۔ نوکر کب سے چائے لئے کھڑا ہے۔ اُٹھو بھی کلی کر کے ناشتہ کر لو۔ چائے ٹھنڈی ہوئی جاتی ہے۔

ع

" تھا خواب میں خیال کو تجھ سے معاملہ
جب آنکھ کھل گئی نہ زیاں تھا نہ سُود تھا "

وشوامتر عادل بی۔ اے
"مدیر راوی"

اُلفتِ رفتہ

حُسن کے نغموں سے معمور فضا ہے لیکن
دعوتِ عشق تو دیتی ہیں وہ نیلی آنکھیں

قصرِ اُمید بنایا تھا کبھی جو میں نے
بربطِ شوق کے جب تار نہیں ہیں باقی

خواہشِ درد نہیں رُوح کو کرتی بے چین
پیار کی باتوں میں کچھ بھی نہیں لذت باقی

مجھ الم دیدہ سے اب ذکرِ محبت کیوں ہو!
ولولے خاطرِ افسردہ میں کیوں پیدا ہوں؟

مرمریں بانہوں کو سینے سے مرے لپٹا کر
پُونچھے ریشمی آنچل سے یہ سیمیں آنسو

چاندنی راتوں کے رنگین فسانے کہہ کر
حسرتیں لیتی ہیں آ آ کے بلائیں میری

صدمۂ الفتِ ناکام بھلاؤں کیسے؟
میں مگر سوئے ہوئے دل کو جگاؤں کیسے؟

اب ہے ویرانہ، تو ہستی کا لبانا بے سُود
دل کے غم خانے میں الفت کا ترانا بے سُود

پھر تمناؤں کو مجبورِ وفا کیا کرنا؟
حُسن کی سرد نگاہوں کا گلا کیا کرنا؟

دل ہو پھر خوگرِ آزار۔ کہاں یہ ممکن؟
پھر مجھے حسن سے ہو پیار۔ کہاں یہ ممکن؟

کس لئے مجھ کو دکھاتی ہے سرابِ الفت؟
سو گیا ہے دلِ غمگین میں خوابِ الفت!

اے حسین دوست! گنہگار نہ کر اب مجھ کو
آہ! تو بھولے سے بھی پیار نہ کر اب مجھ کو

ایڈگر ایلن پو
(امریکن مصنف)
مترجمہ جناب قیصر عثمانی

"محبوبہ"

کئی برس کی بات ہے۔ کہ ایک حسین دوشیزہ
سمندر کے کنارے
پُروقار، باحشمت مملکت میں
اپنی پُرشباب اور رومانی زندگی کے خوشگوار دن گذار رہی تھی۔
جس کا واحد مقصد "محبت کرنا" اور "محبت کئے جانا" تھا
میں بچہ تھا۔
اور وہ بھی بچہ ہی تھی!
لیکن ہم دونوں کی محبت والہانہ تھی۔
ایک ایسی لافانی محبت جسکی مثال دُنیائے محبت میں نہیں مل سکتی
یہاں تک کہ آسمانی پردار فرشتے بھی ہمیں للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتے تھے۔
اور شاید یہی وجہ تھی۔ کہ چند سال پیشتر
اسی سرزمین میں
بدلیوں سے
ایک ایسی ہوا نکل کر چلی
کہ میری رعنائیوں کی دیوی سرد ہو گئی۔
اس کے رشتہ دار آئے
اور میری پیاری کو مجھ سے چھین کر لے گئے۔
مقبرہ میں مقید کر دینے کے لئے
اسی سمندر کے کنارے ——— !
ملائیک
جو آسمان میں شاید ہی خوش رہتے ہوں
مجھ سے
اور میری محبوبہ سے
عداوت رکھتے تھے۔
ہاں یہی بات تھی کہ رات کے وقت
ابر سے
وہ سراسیمہ کُن جان لیوا ہوا چلی۔
جس نے نازک حسین دوشیزہ کے لب پر
ہمیشہ کے لئے مُہر سکوت ثبت کر دی
مگر ہم دونوں کی محبت کا رشتہ مضبوط تھا اور مستحکم
اس لئے آسمانی فرشتے
اور بحری ابلیس
ہم دونوں کی پاکیزہ روحوں کو
ایک دوسرے سے جُدا کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے!
کیونکہ ماہتاب
سُنہری اور شیریں خواب کی رنگین اور بہشت آئین وادی میں۔
محبوبہ کے ساتھ مجھے سیر کرائے بغیر نہیں چمکتا
اور درخشاں ستاروں میں تو میں اسکی چمکتی ہوئی خوبصورت آنکھیں ہی دیکھتا ہوں۔ مختصر یہ کہ تمام رات میں اپنی سرمایۂ حیات رفیقۂ زندگی کے نرم و نازک پہلو میں بسر کر دیتا ہوں۔
شور افزا سمندر کے کنارے!
مقبرہ کے اندر!!

جناب مقبول حسین احمد پوری
بی اے ایل ایل بی

(تراجم)

دُھوپ چھانوں

(الف) ترشول :-

۱:- اَے ترا بَا ہَر دِلے رَازِ دِگر
ہر گدُا رَا بَر دَ رَت نَازِ دگر

ایک سے ایک ہے بھید ترا جو سب کے دلوں میں تو نے رَچایا[1]
ایک سے ایک انوکھی دھج سے تیرا بھکاری ہے اِترایا

۲:- مَسازم نا امید از خود چو گشتم مبتلائے تو
کہ محروم از تمامی خوبرویانم برائے تو
عرفی

آس نہ توڑے پریم کی اپنے ہردے میں آپ کی دھن ہے سَمائی
چھوڑ کے سارے جگ کے سُندر[2] آپ سے ہم نے آس لگائی

۳:- خیز و شرابِ حیرتم زاں قدِ جلوہ سازدہ
رُوئے بروئے عشق کن دَست بَدستِ نازدہ
عرفی

اُٹھ اور بھر دے پریم کی مَدرا[3] سُندرتا[4] سے چندر بَدن کی
پریم کے سَنکھ[5] لا کے بٹھادے پریم سے لوٹ لے مایا من کی

[1] قائم کیا [2] حسین [3] شراب۔ [4] حسن و خوبصورتی [5] سامنے

(ب) برہا کے پھول:-

دردا کہ یار ما را دردے عجب رسیدہ ہم دِل ز دست رفتہ ہم جاں بلب رسیدہ
آں ماہرو کہ با من شبہا بروز کردے رفتست و در فراقش روزم بہ شب رسیدہ

ہلالی

کِس کو سُناؤں میں دُکھ جیون کے
جَان بھی بس میں نہیں اب تن کے
رُوٹھ گیا من بھی جیون سے
سب ہوئے سَاتھی دل کی دُھن کے
کِس کو سُناؤں میں دُکھ جیون کے

سَاتھ ہیں جن کے تھا رین بسیرا
کرتے تھے رین کو مِل کے سویرا
اَب وُہی شِیام ہوئے پَردیسی
برہا نے لوٹ لئے سُکھ من کے
کِس کو سناؤں میں دُکھ جیون کے

جناب فضل حق قریشی دہلوی۔

آغا حشر سے مُلاقات

[یہ مضمون کسی قدر اختصار کے ساتھ "حشر ڈے" کے موقعہ پر ۲ اپریل ۱۹۳۸ء کو ریڈیو اسٹیشن دہلی سے نشر ہُوا تھا۔ اُس وقت بعض حصّے اِس لئے حذف کر دیئے گئے تھے۔ کہ یُوں بھی وُہ محکمہ کی نظرِ احتساب میں لائقِ تنسیخ ٹھیرا دیئے جاتے۔ اور اب بھی بہت سے حضرات اِس کو شروع سے آخر تک پڑھ تو لینگے۔ لیکن ذرا ناک بھُوں چڑھا کر۔ کیونکہ سچ بات کڑوی معلوم ہوتی ہے۔ لیکن اگر آغا صاحب اپنی سوانح حیات خود اپنی قلم سے لکھتے۔ تو وُہ یقیناً ان سے بھی زیادہ تلخ حقیقتوں کی حامل ہوتی۔ جو ان کی زبانی سُن کر مَیں نے پیش کی ہیں۔ بلند مرتبہ افراد کی لائقِ وقعت زندگی کے درخشاں پہلوؤں کا مطالعہ اگر ہمارے خیالات میں رفعت، اور دوسری خوبیاں پیدا کر سکتا ہے۔ تو یہ بھی حقیقت ہے۔ کہ انہی کی زندگی کے تاریک واقعات ہمیں ان کمزوریوں سے بچنے کا سبق دے سکتے ہیں جن کو عینِ فطرت سمجھا جاتا ہے۔ اس اصول کے ماتحت یہ مضمون لکھا گیا ہے۔ اور بہتر ہے۔ کہ قارئینِ کرام بھی اسی نظر سے پڑھیں]

(فضل حق قریشی دہلوی)

موسم بہار کی ایک خوشگوار صبح تھی۔ جبکہ مَیں اور میرے چند احباب آغا صاحب کے عشرتکدے پر چائے پینے کے لئے مدعو تھے۔ خود اُنہوں نے نو بجے کا وقت مقرر کیا تھا۔ لیکن ہم لوگ ایک گھنٹہ قبل ہی اس جگہ پر پہنچ گئے۔ کیونکہ ہم نے ایک فوٹوگرافر کو بھی اپنے ہمراہ لے لیا تھا۔ آرزو تھی۔ کہ آغا صاحب کی معیت میں ایک ایسا گروپ کھنچ جائے۔ جو دُنیائے ادب میں لائق یادگار ثابت ہو۔ تصویر میں اُن کے ساتھ ہم نشینی ہم سب کے لئے باعثِ فخر تھی۔ لیکن آغا صاحب نے اس تجویز کو کسی عنوان منظور نہ کیا۔ انفرادی اور اجتماعی طور پر ہم سب نے انتہائی اصرار کے ساتھ درخواست کی۔ مگر دُنیائے شاعری کے ضدّی معشوق کی طرح اُن کا اِنکار بصورت اقرار نہ بدل سکا۔ اُن کا عذر بھی معقول تھا۔ وُہ اپنی زندگی کے دَورِ خزاں کا کوئی نقشِ مضمحل صفحہ ہستی پر چھوڑ جانا نہیں چاہتے تھے۔ خود اُن کے قول کے مطابق فراوانی عیش و عشرت نے اُن کو قبل از وقت بوڑھا بنا دیا تھا۔ اِس لئے عہدِ پیری کی جملہ علامات دُوسروں کے مقابلے میں ان پر زیادہ شدت کے ساتھ ظاہر ہو رہی تھیں ـــ٥

آنکھ بَیٹھی، گال پچکا، رُخ پہ صفّائی نہیں
اِس لئے تصویرِ جاناں، ہم نے کھنچوائی نہیں

یہ ہے وُہ شعر جو خود آغا صاحب نے سُنایا۔ اور ایک قہقہہ کے ساتھ تصویر کشی کے اصل موضوعِ بحث کو بدل دیا۔ مجھے مخاطب کر کے فرمانے لگے :۔

"غالباً آپ کی نظر میرے مختصر سے لباس کی طرف ہے۔ ریشمی تہمد جس کے دونوں سروں کو جوڑ کر ایک طرف نیفے میں کمربند ڈال لیا ہے۔ یقیناً ساری کے نیچے استعمال ہونے والے پیٹی کوٹ کی طرح معلوم ہوتا ہوگا۔ اور پھر یہ سیدھی سادی پُرانی وضع کی ریشمی قمیض ـــ بس یہی میری زرق برق پوشاک ہے۔ سال میں اِس قسم کے چار جوڑے بنواتا ہوں۔ اور کثرتِ استعمال سے ان کو برابر کر دیتا ہوں۔ لیکن اِس سے یہ مت سمجھیئے۔ کہ مَیں مفلس و نادار ہوں۔ میرا ماہوار خرچ ڈھائی ہزار روپے سے کم نہیں۔ آٹھ سو روپے کی رقم صرف باورچی خانے کے لئے وقف ہے"۔

اور اس میں شک نہیں۔ کہ اُن کا یہ اِدعا بلا مُبالغہ تھا۔ اُن کی فیاضی اور دَریا دلی کا ہر شخص کو اعتراف ہے۔ بیسیوں بیوائیں

اور یتیم ولاوارث بچے اُن سے وظیفہ پاتے تھے۔ کئی دیرینہ ملازم کسی قسم کا کام کاج نہ کرنے کے باوجود اُن کے در پر پڑے ہوئے تھے آغا صاحب نے بتایا۔ کہ یہ لوگ چُونکہ زندگی کا بیشتر حصّہ میرے ساتھ لبسر کر چکے ہیں۔ اس لئے مجھے گوارا نہیں۔ کہ اب اِنکو اپنے سے جُدا کر دوں۔ مرتے دم تک یہ میرے ساتھ رہیں گے۔ یہ ان کے بلند کردار کا ایک ادنیٰ نمونہ ہے۔

آغا صاحب کی آمدنی بہت کافی تھی جس کا اندازہ اُن کے اپنے ہی بیان سے نہیں۔ بلکہ اخبارات میں شائع ہونیوالے اعداد و شمار سے بھی لگایا گیا ہے۔ بعض فلموں کی سالانہ رو ائیلٹی اُن کو بیس بیس ہزار روپے تک ملی ہے۔ اور اس سے بھی زیادہ حیرت انگیز بات اُن کی زبانی معلوم ہُوئی۔ کہ بعض کمپنیاں جو تامل اور تلیگو زبان کے فلم تیار کرتی ہیں۔ فلم کی تیاری سے قبل مکالمہ کا مسودہ آغا صاحب کو محض اظہارِ رائے اور مناسب ترمیم و تنسیخ کے لئے پیش کرتی تھیں۔ اور اِس طرح صرف اِن کمپنیوں سے اُن کی ماہوار آمدنی تقریباً ایک ہزار روپیہ تھی۔ اس کے باوجُود اُنہوں نے کبھی ایک پائی تک پس انداز نہیں کی۔ یہ خود اُن کا بیان ہے۔ اُنہوں نے فرمایا۔ کہ "میرے عزیز و اقارب اور دوست و احباب نے میری بالکل مدد نہیں کی۔ مَیں نے اپنی زندگی کی تعمیر خود اپنے ہاتھوں کی ہے۔ لہٰذا مَیں بھی کسی کے واسطے کچھ چھوڑ جانا پسند نہیں کرتا۔ "کھاؤ، پیئو اور مزے اُڑاؤ"۔ والا اصول میرے پیشِ نظر ہے"۔ لیکن شاید اُنہوں نے کبھی محسوس بھی نہ کیا ہوگا۔ کہ کچھ نہ چھوڑنے پر بھی وُہ ایک ایسا مستقل سرمایۂ ادب اپنی قوم کے لئے چھوڑ جائینگے جس کے مقابلے میں ہفت اقلیم کی دولت بھی حقیر ہے۔

آغا صاحب نے اپنے مساوی آمد و خرچ کے سلسلے میں بطورِ مزاح یہ بھی فرمایا۔ "کہ اگر اتفاق سے میرا انتقال دہلی پہنچ کر وقوع میں آیا۔ تو لازمی طور پر وہاں کی مجلس بلدیہ کو میری تجہیز و تکفین کا انتظام کرنا پڑے گا۔" لاہور میں رہتے ہُوئے خصوصیت کے ساتھ دہلی کا ذکر آغا صاحب نے اِس لئے کیا تھا۔ کہ مَیں اور میرے احباب دہلی کے رہنے والے ہیں۔

یہ اُن دنوں کا ذکر ہے۔ جبکہ آغا صاحب کی نگاہِ حُسن نواز کے سامنے مختار بیگم کی قسمت کا ستارہ چمک رہا تھا۔ چنانچہ اُس وقت بھی وُہ شریکِ محفل تھیں۔ دَورانِ گفتگو میں چند ایکٹروں اور ایکٹرسوں کا ذکر آ گیا۔ آغا صاحب نے کسی قدر طنز کے ساتھ فرمایا۔ کہ "بہت سی ہستیوں کی شہرت میرے دم کی رہینِ منّت ہے۔ میری سر پرستی نے اُن کو مقبولِ عوام بنا دیا"۔ چنانچہ مثال کے طور پر اُنہوں نے مختار بیگم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ کہ اِسی کو دیکھ لو۔ امرتسر میں مُختارن کے نام سے معمولی طوائف کی زندگی بسر کر رہی تھی۔ آغا حشر نے اس کو بلبلِ پنجاب مختار بیگم بنا دیا۔ اور اگر آج میری دُنیائے فلم کا ڈائرکٹر تک اِسے مختاری کہدے۔ تو اس گستاخی کی پاداش میں اس کی زبان کھینچ لوں۔ اس کی یہ قدر و منزلت میری نگاہ میں صرف اُس وقت تک ہے۔ جب تک کہ کسی دوسری جاذبِ نظر ہستی سے واسطہ نہ پڑے۔ اس صورت میں اس کا ہاتھ چھوڑ کر اس کا دامن پکڑ لوں گا۔ مَیں اپنی بساطِ عشق پر ہمیشہ نئے مہرے دیکھنے کا دلدادہ ہوں"۔

مَیں نے محسوس کیا۔ کہ اس حقیقت کی تلخی کا کوئی ناگوار اثر مختار بیگم پر نہیں ہُوا۔ بلکہ وُہ یہ کہنے کے لئے مجبور ہوئیں۔ کہ آغا صاحب بالکل سچ کہتے ہیں۔ اِس سے یہ ثابت نہیں ہوتا۔ کہ آغا صاحب کے دِل میں مختار بیگم کی جگہ نہیں تھی۔ وُہ اُس کی محبّت میں سرشار نظر آتے تھے۔ چنانچہ ایک دِلچسپ واقعہ سے اس امر پر روشنی پڑ سکتی ہے۔ جس کی تفصیل اِس طرح ہے۔ کہ جب تمام سامانِ خورد و نوش میز پر چُن دیا گیا۔ اور آغا صاحب نے چائے بنانے کے لئے چائے دانی کا ڈھکنا اٹھایا۔ تو پانی کبُوتر کے خون کی مانند سُرخ تھا۔ اور ذائقہ کے اعتبار سے نہایت تلخ۔ ایک دم اُن کے غصّے کا پارہ تیز ہوگیا۔ ہر ایک ملازم کا نام لے کر بلا مبالغہ پچاس پچاس گالیاں سنا ڈالیں۔ اور گالیاں بھی ایسی بے نقط کہ محض ان کی سماعت سے کانوں کے پردے متعفن ہو گئے۔ آتشِ غضب کسی عنوان سرد نہ پڑتی تھی۔ کہ اچانک مختار بیگم نے مُسکراتے ہُوئے اُن کی مشتعل رگوں کو یہ کہکر دبا دیا :-

"آغا صاحب! ان بیکس ہستیوں کو ڈانٹنے سے کیا حاصل۔ کبھی ہم پر غصّہ کا اظہار کیجیئے۔ تو ہم ترکی بہ ترکی جواب دیں۔"

یہ الفاظ شکستِ طلسم کی عبارت سے زیادہ سریع الاثر ثابت ہوئے۔ غصّے سے تمتمائے ہوئے چہرے کی کیفیات ایک دم بدل گئیں۔ گویا تیز آندھی پر پانی کا چھینٹا پڑ گیا۔ آغا مسکرائے بغیر نہ رہ سکے۔ اور ساتھ ہی یہ بھی کہا "کہ حشر میں اگر کوئی کمزوری ہے۔ تو صرف یہی۔ کہ عورت کے دلفریب تبسم سے زچ ہو کر بہت جلد مات کھا لیتا ہے" (لیکن ایسی شکست کسے نہیں ہوتی؟)

آغا صاحب کے کردار کا سب سے زیادہ نمایاں پہلو اُن کی صاف گوئی تھی۔ وُہ اپنی زندگی کے تاریک رُخ کو پیش کرتے ہوئے بھی بالکل نہ ہچکچاتے تھے۔ میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب اُنہوں نے اپنی ابتدائی زندگی کا لفظی خاکہ بیان کیا۔ کہ کس طرح وُہ دہلی کے ایک نانبائی کی دکان پر جھوٹے برتنوں کو دھوکر، آٹا گوندھ کر، اور میلے فرش کو صاف کر کے روزی کماتے تھے۔ اور جب رات ہوتی۔ تو اسی دکان کی تاریک فضا میں تنور کے قریب سو جاتے تھے جس کی ہلکی تپش اُن کو موسم سرما کی خنک ہوا سے محفوظ رکھتی تھی۔ کیونکہ اس وقت ان کا نہ کوئی گھر تھا۔ اور نہ گزارے کا سامان۔

اسی طرح بمبئی میں ایک تھیئٹریکل کمپنی سے اُن کے ابتدائی تعلق کی نوعیت کچھ کم حیرت انگیز نہیں ہے۔ کمپنی کے مالک کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہ آئی ہوگی۔ کہ وُہ نوعمر لڑکا جو آج طرح طرح کے روپ بدل کر اپنی حماقت آمیز نقل و حرکت کے ساتھ تھیئٹر کے اشتہار سر بازار تقسیم کیا کرتا ہے۔ کل جوان ہو کر ڈرامہ کی دُنیا میں ہندوستان کا شیکسپیئر کہلائے گا۔

آغا صاحب نے اعتراف کیا۔ کہ اُنہوں نے ہر قسم کے لہو و لعب میں زندگی بسر کرنے کے علاوہ ہر نوع کے گناہ کا ارتکاب کیا ہے۔ لیکن کبھی اس کو گناہ نہ سمجھ کر، بلکہ اس احساس کیساتھ کہ میں جس ماحول میں پل کر جوان ہُوا ہوں۔ اس کا تقاضا یہی ہے کہ میں مستقبل کے ہر گناہ سے بچنے کے لئے حال کے ہر گناہ میں گھر جاؤں۔ لہٰذا اس نظریئے کے ماتحت اُن کی زندگی کی مقدس معصیتیں قابلِ اعتراض نہیں سمجھی جا سکتیں۔

اس گناہ آلود طرزِ زندگی سے قطع نظر اُن کے کردار کا دُوسرا رُخ کہ فطرتاً وُہ ایک حد تک متقی و پرہیزگار بھی تھے۔ خاص طور پر توجہ کے لائق ہے۔ اس کی تفصیل خود اُن کے ایک بیان سے واضح ہوتی ہے۔ جسے سُن کر ہم سب لوگ ورطۂ استعجاب میں غرق ہو گئے تھے۔

وُہ اس زمانے کا واقعہ ہے۔ جب آغا صاحب کا مستقل قیام بمبئی میں تھا۔ اور وُہ ایک تھیئٹریکل کمپنی میں "منشی" کے فرائض انجام دیتے تھے۔ ایک روز ایک نوجوان بیوہ خاتون جس کے چہرے سے شرم و حیا اور خاندانی شرافت ظاہر ہو رہی تھی۔ آپ سے ملنے آئی۔ اور ایکٹرس بن جانے کی دلی تمنا ظاہر کی۔ کیونکہ بیوہ ہونے کے باعث سماج میں اُس کے لئے کوئی ایسی جگہ نہیں تھی۔ جہاں رہ کر وُہ اپنا گزارہ کر سکتی۔ اُنہوں نے اس کو سمجھایا۔ کہ وُہ اس خیالِ خام سے باز رہے۔ ایک ایکٹرس کی دُنیا جن مکروہات سے عبارت ہوتی ہے۔ اُن کو آغا صاحب سے زیادہ کون جانتا تھا۔ ساتھ ہی کچھ رقم دے کر اُنہوں نے وعدہ کیا۔ کہ ہر ماہ گزرِ اوقات کے لئے وُہ مناسب امداد دیتے رہیں گے۔ مگر تاکید کی۔ کہ وُہ آئندہ بذات خود اُن سے ملنے کی کوشش نہ کرے۔ موعودہ رقم کسی دوسرے ذریعہ سے اس کے پاس برابر پہنچتی رہے گی۔ کیونکہ وُہ جوان تھی۔ اور ایک حد تک حسین بھی۔ اس لئے آغا صاحب کو اندیشہ تھا۔ کہ مبادا خود اُن سے لغزش ہو جائے۔ گناہ کا یہ فلسفہ ان کی زبان سے سُنا۔ کہ انسان اُس عورت پر نگاہِ بد نہ ڈالے۔ جو معصوم فضا میں رہنے کی کوشش کر رہی ہو۔ اس کے برعکس جو جان بوجھ کر اپنی زندگی کو گناہ آلود کر لینے پر تُلی ہوئی ہو۔ اُسے روکا نہ جائے۔ بلکہ اس بھیانک غار میں اور زیادہ دھکیل

دیا جائے۔ ورنہ اس کا وجود سماج کے لئے زیادہ خطرناک ثابت ہوگا۔

وُہ خاتون آغا صاحب کی ہدایت کے خلاف غیر معقول عُذروں کے ماتحت کئی بار اِن سے ملنے آئی۔ اَور ایک مرتبہ ایسے موقعہ پر جبکہ وُہ نشے میں چُور اپنے آپے سے باہر تھے۔ اُسے دیکھکر بہت غصہ آیا۔ مگر چونکہ اس وقت طبیعت پر قابو پانا مشکل ہی نہیں۔ بلکہ غیر ممکن تھا۔ اس لئے وُہ اُن کی نفسانی خواہشات کی شکار بن گئی۔ جس کی ذمہ واری کسی طرح بھی اُن پر عاید نہیں ہوسکتی۔

ابھی گفتگو کا سلسلہ جاری ہی تھا۔ کہ ملازم نے ایک مُلاقاتی کارڈ لاکر پیش کیا۔ جس کے ساتھ ہی ہندوستان کے ایک بہت بڑے آدمی کی سفارشی چِٹھی بھی تھی۔ آغا صاحب جُزبُز تو بہت ہُوئے۔ مگر نوَ وارد کو اندر طلب کر لیا۔ طالب علم کی قسم کے ایک سادہ لوح نوجوان جن کے سبزۂ خط کا بھی ہنوز آغاز نہیں ہوا تھا۔ اندر تشریف لائے۔ اور بالکل فدویانہ طریقہ پر سلام کر کے ایک طرف بَیٹھ گئے۔ کچھ دیر کمرے کی فضا پر سکوت طاری رہا۔ پھر آغا صاحب نے اُن سے دریافت کیا:۔

"بتلیئے! آخر فلم ایکٹر بننے کا خیال آپ کے دماغ میں کیونکر پیدا ہُوا؟ اَور اِس خیال کو عملی جامہ پہنانے کے لئے کیا آپ اپنے اندر وُہ کمالات پَیدا کر چکے ہیں۔ جو ایک کامیاب ایکٹر کی نجی زندگی کے لئے نہایت ہی ضروری ہیں"؟

ظاہر ہے۔ کہ آغا صاحب کا استفسار کسیقدر مُبہم تھا۔ اس لئے اُنہوں نے خود ہی ذرا واضح طور پر کہنا شروع کیا:۔

"ممکن ہوسکتا ہے۔ کہ کالج میں رہ کر آپ نے خوب جمناسٹک کی ہو۔ مختلف کھیلوں میں حِصّہ لینے سے جسم میں چُستی و چالاکی بھی موجُود ہو۔ گھوڑے کی سواری، موٹر چلانا، تیرنا، کشتی چلانا وغیرہ بھی آپ کو آتا ہو۔ آپ کا لب و لہجہ بتا رہا ہے۔ کہ آپ کے گلے میں کچھ رس ہے۔ اَور ذرا سی کوشش سے آپ کچھ الاپ لیا کریں گے۔ آپ کے جسم کا چھریرا پن ناچنے میں تھوڑی بہت مدد دے سکیگا۔ لیکن یہ سب بہت معمولی باتیں ہیں۔ اَور اِن صفات کے حامل سینکڑوں افراد ہندوستان میں موجود ہونگے۔ لیکن وُہ ایکٹر نہیں بن سکتے۔ آپ زیادہ سے زیادہ زنانہ رُوپ بدل کر سہیلیوں میں پارٹ کر سکتے ہیں۔ ایکٹر بننا آسان کام نہیں ہے۔ آپ یہ بتایئے! کہ عیاشی کے فن میں آپ نے کِن کِن نعمتوں سے لُطف اُٹھایا ہے؟ شراب کے کتنے پیپے ایک ماہ میں خالی کر دیتے ہیں؛ کتنی بازاری عورتیں آپ کی زینتِ آغوش بن چکی ہیں؟ قمار خانے میں کتنی بار آپ پٹے ہیں؛ اِن کے علاوہ کیا آپ اپنے ضمیر کو بالکل مُردہ کر چکے ہیں؟ کیا آپ گوارا کرلیں گے۔ کہ ڈائرکٹروں کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے اُن کی محبوب نظر ایکٹرسوں کی گالیاں سُن لیں؟ یا خود اپنا کوئی مقصد نکالنے کے لئے اُن کے پاؤں دبا دیا کریں گے؟ ان باتوں کو بھی چھوڑیئے۔ کیا آپ جذبۂ خودداری کو فنا کر کے ایک اوّل نمبر کے سزا یافتہ بدمعاش کو "پتاجی" اَور ایک بازاری چھِنال کو "ماتاجی" کہہ کر مخاطب کرنا گوارا کر لیں گے۔ اگر اتنی پست سطح پر رہ کر زندگی بسر کرنا آپ کے بس کی بات نہیں ہے۔ تو آپ ایکٹر نہیں بن سکتے۔ لہٰذا ابھی یہاں سے چلے جایئے۔ اَور اِس دنیا میں پھر کبھی قدم رکھنے کی کوشش نہ کیجئے۔ لیکن اگر آپ مُصر ہیں۔ تو مجھے تھوڑی سی آزمائش کر لینے دیجئے۔ اچھّا ذرا اپنی جگہ سے اُٹھیئے۔ اور ان تمام حضرات کی موجودگی میں جن سے آپ ناواقف ہیں۔ اپنے سامنے بیٹھی ہُوئی مختار بیگم کے نازک گالوں کا ایک بوسہ لیجئے۔ تاکہ مَیں معلوم کر سکوں کہ آپ میں یہ تھوڑی سی جرأتِ رندانہ بھی موجُود ہے۔ یا نہیں"۔

اِس گفتگو کا جو اثر اس صاحبزادے پر ہُوا۔ وُہ ظاہر ہے۔

گفتگو کے دَوران میں آغا صاحب کے ڈراموں کا بھی ذکر چھِڑ گیا۔ اَور یہ سُن کر افسوس ہُوا۔ کہ فلم کمپنیوں کے ڈائرکٹر اداکاروں کی سہولت اَور چار آنے والے تماش بینوں کے ذَوق کا لحاظ رکھتے ہوئے اپنی مرضی کے مطابق مکالمہ کی قطع و برید کر لیا کرتے تھے۔ اَور اس طرح آغا صاحب کا حقیقی اندازِ بیان قائم نہ رہتا تھا۔ بلکہ تمام عبارت بڑی حد تک مسخ ہو جاتی تھی۔ چنانچہ مثال کے طور پر انہوں نے "عورت کا پیار" نامی ڈرامے کا کچھ حِصّہ اصل مسودے سے پڑھ کر سنایا۔ جس میں فصاحت و بلاغت کے وُہ جوہر کُوٹ کُوٹ کر بھرے ہوئے تھے۔ کہ تعریف نہیں کی جا سکتی۔ اِس کے

مقابلے میں فلم کمپنی کا پیش کردہ ڈرامہ کوئی وقعت ہی نہیں رکھتا۔ معلوم ہوا۔ کہ اُن کے تقریباً ہر ڈرامے پر اسی طرح عمل جرّاحی کیا گیا ہے۔

اس سے اندازہ لگایئے۔ کہ جس پیکر کے صرف ڈھانچ کی قدر و منزلت کرتے ہوتے پبلک نے آغا صاحب کی خداداد ذہانت و قابلیت کا لوہا مانا ہے۔ اگر وُہ پیکر اپنے اصلی رُوپ میں نظر آجائے۔ تو پھر اُن کا مرتبہ دُنیائے ادب میں کتنا بلند ہو جائیگا۔ میرے اس اِستفسار پر کہ آخر اُنہوں نے قطع و برید کی اجازت ہی کیوں دی۔ آغا صاحب نے بتایا۔ کہ بڑھے ہوئے اخراجات پُورا کرنے کے لئے اُنہیں روپے کی سخت ضرورت رہا کرتی تھی اس لئے اعتراض کرنے یا نہ کرنے کا کبھی خیال تک اُن کے دل میں پیدا نہ ہُوا۔

اور اسی غرض کے ماتحت ان کے ڈراموں کے مذاقیہ حصّوں میں مزاح لطیف کی بجائے سوقیانہ رنگ نظر آتا ہے۔ جس کی بڑی ذمّہ داری خود قوم کے گرے ہُوئے مذاق پر عاید ہوتی ہے ٭

جناب عزیز احمد صاحب

کسان

حسین جلوے شفق کے چھپ رہے تھے شامِ رنگیں سے
نقابِ شب سرکتی جا رہی تھی روئے پرویں سے

پرندے چہچہاتے آشیانوں کی طرف آئے
تھکے ماندے مسافر بھی مکانوں کی طرف آئے

وُہ کوئی آ رہا ہے ہل اٹھائے اپنے کاندھوں پر
تھکن سے چُور، مُنہ پر گرد، آہوں میں چھُپے نشتر

قدم گھر کی طرف ہیں، دِل میں بیچینی بڑی اُلجھن ہے
مقدّر بھی غریبِ ناتواں کا اُس سے بدظن ہے

کبھی اولوں کا ڈر ہے، کثرتِ باراں کا خطرہ ہے
کبھی آندھی کا دھڑکا ہے۔ کبھی طوفاں کا خطرہ ہے

کبھی فکرِ مویشی جان سے بیزار رکھتی ہے
کبھی غمناک ہستی رات بھر بیدار رکھتی ہے

یہ وُہ ہے جسکی محنت سے رگوں میں خُون بھرتا ہے
مگر اس مفلس و بیکس کو ناداری نے گھیرا ہے

اسی کے دم سے یہ روشن چراغِ بزمِ ہستی ہے
سرُور و کیف کے جلسوں میں رنگینی برستی ہے

کبھی تاروں کی محفل میں حیات افزا ترانے ہیں
کبھی پھُولوں کی بزمِ ناز میں پُرکیف گانے ہیں

کبھی برقِ تپاں مدہوش ہے چشمِ غزالاں پر!
تڑپ کر لوٹ جاتی ہے گھٹا زلفِ حسیناں پر

پسینہ ہے کسانِ بے نوا کا یہ پسینہ ہے
کڑکتی دھوپ سے حاصل شدہ اس کا خزینہ ہے

جناب حفیظ ہوشیارپوری ایم اے

حُسنِ کلام

اب کوئی آرزو نہیں ذوقِ پیام کے سوا
اب کوئی جستجو نہیں شوقِ سلام کے سوا

کوئی شریکِ غم نہیں اب تری یاد کے بغیر
کوئی انیسِ دل نہیں اب تیرے نام کے سوا

تیری نگاہِ مست سے مجھ پہ یہ راز کھل گیا
اور بھی گردشیں ہیں کچھ گردشِ جام کے سوا

جلوۂ صد ہزار رنگ حسن کی کائنات ہے
عشق کے پاس کچھ نہیں حُسنِ کلام کے سوا

کاش آرزو سہی حاصلِ زندگی! مگر
حاصلِ آرزو ہے کیا سوزِ مدام کے سوا

آہ! کوئی نہ کر سکا چارۂ تلخیٔ فراق
نالۂ صبح کے بغیر گریۂ شام کے سوا

رنگِ بہار پر نہ بھول! اُجڑے چمن سے درگذر!
یہ بھی ہیں خوشنما فریب دانہ و دام کے سوا

مر کے حیاتِ جاوداں عشق کو مل گئی حفیظ
جی کے ہوس کو کیا ملا مرگِ دوام کے سوا!

جناب راجندر سنگھ بیدی

پان شاپ

بیگم بازار کی منحوس دکان میں ایک دفعہ پھر بیل دار مُشجّر دسُوتی کے بھاری بھاری پردے لٹکنے لگے۔ مُوجد "دافع چنبل و داد" اور جاپانی کھلونوں کی دُکان ـــــ اوساکا فیبٹر (جاپان سے متعلق) کے ملازم استعجاب سے بھارُو لال فوٹو گرافر کو اوک پلائی کا ڈارک رُوم بناتے دیکھکر اُس کے تاریک مستقبل پر آنسو بہانے لگے۔

"ایک ماہ سے زیادہ چوٹ نہ سہے گا.... بیچارہ!"

"دکان کیا ہوگی.... بازار سے کچھ ہٹ کر ہے نا۔ نظر اُسے سامنے نہیں پاتی۔ اور بس....."

ـــ ایک ماہ، دو اور چار..... بھارُو لال وہیں تھا۔ موجد "دافع چنبل و داد" اور اوساکا فیبٹر کے ملازموں نے حیرت سے انگلیاں منہ میں ڈال لیں جب کہ ۱۱۔ اگست کی صُبح، کو انہوں نے ایک جہازی سائز کا سائن بورڈ بھارُو کی دُکان پر آویزاں دیکھا۔ ۶ × ۱۲ فٹ سائز کے سائن بورڈ پر دیو صورت حروف خالص صنعتی انداز سے ناچتے ہوئے "انٹرنیشنل فوٹو سٹوڈیو" کی شکل اختیار کر رہے تھے۔

اوساکا فیبٹر کے منتظم صمیم (خانزادہ) نے سیلُولائیڈ کی ایک بڑی سی گڑیا کے اندرونی فیتے کو اُس کے اندرونی قلابوں سے احتیاط کے ساتھ باندھ دیا (تاکہ گاہک کو شکایت کا موقعہ نہ ملے)۔ اور پھر بھارُو کی دکان کے آویزاں سائن بورڈ کو دیکھ کر مسکرانے لگا:۔

"انٹر.... نیشنل فوٹو سٹوڈیو!"

بھارُو کا کام بیگم بازار، اُس کے نواح کے تین محلّوں، سامنے کے نشیبی چوک یا چھاؤنی کے ہائی سکول تک محدود ہوگا۔ مگر وُہ اپنی دکان کو ایک بین الاقوامی کاروبار سے کم نہیں دیکھنا چاہتا۔ کیا عجب جو اُسے کسی دن پیٹرو گراڈ، ٹمبکٹو، یا ہونو لولو سے فوٹو کا مال مہیا کرنے کے آرڈر ملنے لگیں .....

بہرحال بین الاقوامی نام رکھنے میں حرج بھی تو کوئی نہیں۔ اس نام سے دوکاندار کی فطری رجائیت ٹپکتی ہے۔

مگر افسوس! سودے کی بدعت ترقی پسند ہندوستانی دوکاندار کو بیگم بازار کے نواحی تین محلّوں، سامنے کے نشیبی چوک اور چھاؤنی کے ہائی سکول سے دُور کیا جانے دیگی۔ وہ ہر جائز و ناجائز طریقہ سے گاہک کو پھنسانے کی کوشش میں کسب کمال کی تو دھجیاں اُڑا دیتا ہے۔ گویا اپنے پاؤں میں آپ بیڑیاں ڈالتا ہے۔ اور یُوں زیادہ آمدنی کی توقع میں طبعی آمدنی بھی معدوم ـــ بھارُو کی دکان پر اس جہازی قد کے سائن بورڈ کے نیچے ایک اور ٹین کی پلیٹ پر "جدید عینک ساز" بھی لکھا تھا۔ ترقی پسند مگر بھولے بھارُو نے جدید عینک سازی محض سودے کی بدعت یا نقل میں شروع کی تھی۔ کیونکہ اس کا پڑوسی دوکان دار جرابوں کے کارخانہ کے ساتھ "بیٹا گھر" کا غذ بھی فروخت کرتا تھا

۱۱۔ اگست کی شام کو اوساکا فیبٹر کا منتظم صمیم (خانزادہ) اور بھارُو کچھ اداس خاطر ہو کر ملے۔ دونوں کی آمدنی کا بیشتر حصّہ تعطیلاتِ گرما یا سرکاری دفاتر کے شملہ کی طرف کوچ کی نذر ہو چکا تھا۔ ان دنوں میں سٹوڈیو کے سامنے پان شاپ پر بہت رونق رہتی تھی۔

پان شاپ کے پیتے دار تختوں میں کھڑیا مٹی سے صاف کئے ہوئے شیشے بہت ہی خوبصورت دکھائی دیتے تھے ایک ہلکی سبز جھلک رکھنے والے شیشے کے پیچھے ایک ٹِک ٹِک کیساتھ ایک نفیس طلائی سیکنڈس گھڑی لٹک رہی تھی۔ اس کے نیچے قانون و فقہ کی کتابیں بے ترتیبی سے پڑی تھیں۔ شاید کوئی قانون کا بے قانون اور فضول خرچ طالب علم اتنی قیمتی کتابیں کوڑیوں

کے ہول گروی رکھ کر پیسے لے گیا تھا۔ کتابوں کے پیچھے ایک پرانی سنگر مشین پڑی تھی۔ اسے گروی رکھنے والے کو اتنی ضرورت یا اتنی جلدی تھی۔ کہ اس نے مشین پر سے دھاگہ کی گولی بھی نہ اٹھائی تھی۔

پان شاپ کے ایک کونے میں کانسی اور پیتل کے، فلسطینی پیالوں کی شکل کے گلدستے اور لمبی لمبی ٹانگوں والے کلنگ پڑے تھے۔ فرنیچر کی دو قطاروں میں اخروٹ کی لکڑی میں کشمیری تراش کا ایک کیوپڈ بھی پڑا تھا۔ اور دیوار کے ساتھ پان شاپ کا مالک ایک آہنی صندوقچی پر اپنی کہنیاں رکھے ہوئے اپنے کسی گاہک سے باتیں کر رہا تھا۔

دو بلاوردی سپاہی پان شاپ کے مالک سے اجازت پاکر برآمدے میں پڑے ہوئے سائیکلوں کے نمبر دیکھ رہے تھے۔

"اے۔ ۱۱۷۸۵ ——— نہیں"

"اے۔ ۲۲۲۳۱۲ ——— یہ بھی نہیں"۔

"ایچ۔ ۱۰۴۹۷ ——— یہ بھی نہیں۔ کوئی بھی نہیں۔ چلو"۔

ایک عیسائی لڑکی دو دفعہ بیگم بازار میں پان شاپ سے نشیبی چوک اور نشیبی چوک سے پان شاپ کی طرف واپس آئی۔ وہ بار بار غور سے پان شاپ کے اندر دیکھتی تھی۔ شاید وہ چاہتی تھی۔ کہ پان شاپ کے اندر بیٹھے ہوئے دو ایک آدمی چلے جائیں۔ اور سپاہی اپنا کام کرکے رخصت ہوں۔ تاکہ وہ تخلیہ میں آزادانہ اپنا کاروبار کر سکے۔ یا شاید وہ اپنا مال گروی رکھتے ہوئے جھجکتی تھی۔ اگرچہ اس کے پاس گروی رکھنے کے لئے کوئی چیز دکھائی نہ دیتی تھی۔ .... اس کے قدرے عمدگی سے تراشے ہوئے کسمی لب پھڑکتے دکھائی دیتے تھے۔ اور اس کی بے خواب اور بھاری آنکھیں بے قراری سے پپوٹوں میں حرکت کر رہی تھیں۔ پسینہ سے سفید ململ کا فراک اس کی پشت پر چمٹ گیا تھا۔ اور پشت کی جانب سے اس کی انگیا کے تناؤ کے ریشمی فیتے شانوں پر گول چکر کاٹتے ہوئے صاف دکھائی دے رہے تھے۔

"آج اتنی گرمی ہے ——— شام کو ضرور بارش ہوگی"۔ ادساکا فیئر کے منتظم نے کہا۔

تھارو نے یہ بات نہ سُنی۔ وہ بہت انہماک سے پان شاپ کے اندر دیکھتا رہا۔ پھر یکایک کانپتے ہوئے اٹھا اور بولا:۔

"اس سے تو میں بھوکا مرجانا پسند کرتا ہوں ......"

"ضرورت مجبور کر دیتی ہے۔ ورنہ کوئی خوشی سے تھوڑا ہی"۔

لڑکی پان شاپ سے باہر آئی۔ اس کے بُشرہ سے صاف عیاں تھا۔ کہ گروی مال پر اس کے اندازے اور ضرورت سے اُسے بہت ہی کم روپیہ ملا تھا۔ نہیں تو اطمینان اور خوشی کی تحریر اس کے چہرے پر ضرور دکھائی دیتی .... وہ اپنے بیمار خاوند پر اپنا سب کچھ لٹا چکی تھی۔ اب اس کے پاس سنہری بالوں کے سوا گروی رکھنے کے لئے رہا ہی کیا تھا۔ کاش ان حلقے دار لمبی لمبی سنہری زلفوں کی ہندوستان میں کچھ قیمت ہوتی!

لڑکی نے اپنا دایاں ہاتھ اوپر اٹھا کر ایک انگلی کو جڑ سے مسلنا شروع کیا۔ انگلی پر ایک زرد سا حلقہ نظر آرہا تھا۔ ہو نہ معلوم کتنی ضرورت سے مجبور ہو کر اس نے اپنی عزیز ترین چیز، اپنی رومانی حیاتِ معاشقہ کی آخری نشانی پان شاپ میں گروی رکھ دی تھی۔

اس نے اپنے "رنڈوے" ہاتھ سے اپنی سنہری زلفوں کو نفرت سے پیچھے ہٹا دیا۔ کیونکہ ان کی کوئی قیمت نہ تھی۔ اور پان شاپ کے پہیئے دار تختوں میں کھڑیا مٹی سے صاف کئے ہوئے خوبصورت شیشوں میں اس نے اپنے حسین چہرے کے دھندلے عکس کو دیکھا۔ اور رونے لگی ...... کیونکہ وہ حسن فروش نہ تھی۔

× × × × × × × × × × × × ×

لوہے کی ایک خوردبین نما نال میں تھارو گرکس کا ایک ہلکا سا محدب شیشہ ڈال کر نصف گھنٹہ سے ایک بوڑھے کی آنکھوں کے سامنے نچا رہا تھا۔ بوڑھے کے سامنے کچھ دور ایک طاق کے ساتھ اردو کے حروفِ تہجی آویزاں تھے۔

ٹھارُو بار بار اس نالی کی درز میں کسی نئے اَور ہلکے سے محدب شیشے کو رکھ دیتا۔ بوڑھا کہتا:۔

"اب 'م'، تمہارے کوٹ سے بھی بڑی دکھائی دیتی ہے"۔

"اب 'ظ' سے شعاعیں سی نکل رہی ہیں"۔

"اب 'ع' دُھندلی دُھندلی اور پرچھائیں دار نظر آتی ہے"

"اب سب حروف دکھائی تو ٹھیک دیتے ہیں ــــ مگر بہت ہی چھوٹے چھوٹے .... تمہارے کوٹ کے بٹن سے بھی چھوٹے"،

وُہ بوڑھا کیا جانے کہ اگر کسی محدب شیشے میں سے تمام حروف بھی اپنے قد وقامت کے دکھائی دینے بھی لگیں۔ تو بھی وُہ ٹھارُو لال ــــ جدید "عینک ساز" اور "فوٹوگرافر" سے ایک دیدہ زیب سیلولائیڈ کا فریم کیا ہُوا چشمہ لگوا کر ہمیشہ کے لئے اندھا ہوجائے گا۔

ڈیڑھ گھنٹہ کی دیکھ بھال کے بعد ٹھارُو نے شیشے کا نمبر ایک کاغذ پر لکھا۔ اَور عینک بوڑھے کو دے دی۔

بُوڑھا ان گاہکوں میں سے نہیں تھا۔ جو تھوڑے سے پیسوں کی ادائیگی کے لئے بھی کل کا وعدہ کیا کرتے ہیں۔ پیسے اس کی مُٹھی میں تھے۔ ٹھارُو لال کے مانگنے پر اس نے چند پسینہ سے شرابور سکّے کونٹر پر بکھیر دئے۔ ان سکّوں کو دیکھنے سے گھِن آتی تھی۔ ٹھارو نے ایک حریصانہ انداز سے سکّے اُٹھا کر اپنی جیب میں ڈال لئے اَور اپنا ہاتھ پتلُون سے پونچھنے لگا۔

ٹھارو نے ایک مغرورانہ انداز سے پان شاپ کیطرف دیکھا۔ ایک ادھیڑ عمر کا شریف آدمی جس کا منہ کان تک تمتا رہا تھا آہستہ آہستہ پان شاپ کے سامنے کی تین سیڑھیوں سے نیچے اُتر رہا تھا نیچے اُترتے ہوُئے اُس نے پان شاپ کے پہیئے دار تختوں میں کھڑیا مٹی سے صاف کئے ہوُئے خوبصورت شیشوں میں سے اپنے پُرشرافت چہرے کے دُھندلے عکس کو دیکھا۔ اَور بہت غمزدہ ہوگیا ــــ کیونکہ وُہ بدمعاش نہیں تھا!

"پان شاپ کا مالک چار دِن میں بھی اتنا سود جمع نہیں کرسکتا"۔ ٹھارُو نے اپنی جیب میں سکّوں کی کھنکار پیدا کرتے ہوئے کہا۔

پھر ٹھارُو ایک بے سود، بے حاصل غرور کے جذبہ کے ساتھ آس پاس کے دوکانداروں کی آمدنی کا اندازہ لگانے لگا۔

اِس لاحاصل جمع خرچ میں بیگم بازار کے لبالطیبوں کا کوئی دخل نہ تھا۔ اُن کی آمدنی لامحدود تھی۔ اَور ٹھارو کے محدود تخمینہ سے بہت ہی پرے۔

ہاں! "موجد" دافع چنبل و داد کے نسخہ کی قیمت زیادہ سے زیادہ دو آنے ہوگی۔ گندھک، رال، سہاگہ، پھٹکڑی ہر ایک حِصّہ اَور نیلا تھوتھا ½ حِصّہ اور ایک مخفی چیز جو اُس نسخہ کی کامیابی کی کلید ہے۔ اَور جس نے اس عطار کو مُوجد کا خطاب دیا ہے۔ وُہ بھی ایک آدھ پیسہ میں آجاتی ہوگی ــــ اس پر وُہ کماتا کیا ہے؟ اوساکا فیبرک کے منتظم کو کمیشن بٹّہ کی بنا پر ملتا ہی کیا ہوگا؟ .... ہیئر کٹنگ سیلون والے فی حجامت چار آنے ..... پانچ آنے کما لیتے ہونگے ....

ٹھارو نے ایک دفعہ پھر چمکتی ہوئی آنکھوں سے پان شاپ کی طرف دیکھا۔

اس کی پتلون کی جیب میں پسینہ میں شرابور سکّے اس کی رانوں کو گیلے گیلے لگنے لگے۔

اس وقت اوساکا فیبرک کا منتظم آیا۔

ہفتہ بھر اس کی دُکان پر سوائے پرچون کے چند گاہکوں کے اور کوئی نہ آیا تھا۔ دسہرہ، شب برات، یا دیوالی میں ابھی اڑھائی تین ماہ باقی تھے۔ کیا اوساکا کا بڑا آفس اکتوبر تک انتظار کریگا۔ صیمم (خانزادہ) کا چہرہ قدرے سیاہ ہوگیا تھا۔ اور اسکے گذشتہ ایک ڈیڑھ ہفتہ میں اتنے معمر دکھائی دینے کی کوئی خاص وجہ تھی۔

صیمم نے اپنے آپ کو آرام کرسی میں گرا دیا۔ ٹھارو بولا۔

"یہ پان شاپ کا کام .... ہمارے کاموں سے بہ وقت اچھا بھی ہے۔ اَور بُرا بھی"۔

"اچھا کیسے؟"

آمدنی ——— ہم کرکس کے چشمے اور فریم خریدتے ہیں۔ عکس لینے کے لئے منفی اور مثبت پلیٹیں لاتے ہیں۔ کبھی کبھی ہمارا نقصان بھی ہو جاتا ہے پان شاپ میں پلّے سے کیا خرچ کرنا پڑتا ہے۔ اگر کوئی میعاد کے بعد لی ہوئی رقم سے تگنی رقم کی چیز چھڑانے نہ آسکے۔ تو سب کچھ اپنا۔

. . . . . اور ایک بڑا ساؤ کار یا "

"بڑا کیسے ؟"

"بڑا . . . . بڑا ! اس میں دھوکا کا خطرہ ہے۔ یہ لوگ دوسرے کا مال اپنے پاس گروی رکھتے ہوئے اور بغیر محسوس کئے ہوئے اپنا ضمیر اپنے گاہک کے سامنے گروی رکھ دیتے ہیں۔ اور یہاں سے کبھی کبھی کوئی حسین لڑکی اپنی رومانوی حیاتِ معاشقہ کی عزیز ترین اور آخری نشانی دیکر حسرت کے عالم میں اپنے رنڈوے ہاتھ کو مسلتی ہوئی چلی جاتی ہے اگر ہمارے ہاں سنہری زلفوں کی کوئی قیمت ہو۔ تو یہ حریص آدمی ان کو بھی گروی رکھ لیا کریں۔ اگر کسی شریف ادھیڑ عمر کے آدمی کی شرافت بکاؤ ہو . . . . . تو یہ لوگ اسے بھی گروی رکھنے سے گریز نہ کریں "

اور تھارو مسکرا کر غرور سے سکے اپنی جیب میں اچھالنے لگا۔

دو گھنٹے سے تھارو نے چند منفی پلیٹیں برفیلے پانی میں ڈال رکھی تھیں۔ اب وہ ان سے مثبت کاغذ پر عکس اتارنا چاہتا تھا۔ اس نے پانی میں ہاتھ ڈال کر دیکھا۔ پانی گرم ہو چکا تھا۔ اور منفی پلیٹوں پر مصالحہ پگھل کر لاوہ کی صورت اختیار کر گیا تھا۔ تھارو کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔

وہ کچھ نہ بولا . . . . . وہ کچھ بول ہی نہ سکا۔

یہ اسے چھ روپے کا نقصان تھا۔ ایک عینک کی بچت سے تین گناہ زیادہ نقصان !

تھارو ایک انگڑائی لے کر صیم کے پاس بیٹھ گیا۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے ایک لمحہ میں اس کی سکت اس کے جسم سے کھینچ لی گئی ہو۔

تھارو ٹکٹکی باندھ کر پان شاپ کی طرف دیکھتا رہا۔ شیشے کے پیچھے طلائی سیکنڈس قانون و فقہ کی کتابوں پر لٹک رہی تھی ایک کونے میں کانسی اور پیتل کے فلسطینی پیالوں کی شکل کے گلدستے اور لمبی لمبی ٹانگوں والے کلنگ پڑے تھے۔ فرنیچر کی دو قطاروں میں اخروٹ کی لکڑی میں کشمیری تراش کا ایک کیوپڈ بھی دکھائی دے رہا تھا۔ اور ایک دیوار کے ساتھ پان شاپ کا مالک ایک آہنی سیف پر اپنی کہنیاں رکھے

× × × × × × × × ×

× × × × × × × × × × × ×

اوک پلائی کے ڈارک روم میں دم گھٹ جانے پر تھارو نے ایک گہرا سانس لیا۔ اور پھر مثبت کاغذ پر نقش کو مستقل کرنے والے مرکب کو ہلاتا رہا۔ اس وقت پسینہ اس کی کمر سے ہو کر گھٹنوں کی پشت پر قطرہ بہ قطرہ ٹپک رہا تھا۔

شاید تھارو اوک پلائی کے ڈارک روم میں پگھل کر اپنی جان دے دیتا اگر صیم اپنی دوکان کو بند کرتے ہوئے ادھر نہ آنکلتا۔ تھارو نے صیم کی آواز پر باہر آتے ہوئے آہستہ آہستہ اپنی قمیص اتاری۔ اس میں سے پسینہ نچوڑا اور قمیص کو پانی کے ایک ٹب میں ڈال دیا۔ اور ہانپتے ہوئے بولا۔

"آج کل ایمانداری کے کام میں پڑا ہی کیا ہے ؟ . . . "

——— اور بین الاقوامی کاروبار کے شائق تھارو نے ایک بالکل پھٹی ہوئی بنیان آہستہ آہستہ سر سے نیچے اتار لی۔

پانی کے ٹب میں تھارو کی قمیص کی جیب میں سے کاغذ کا ایک پرزہ نکل کر پانی پر تیرنے لگا۔ اس پر تحریر تھا۔ تین آنے کا مرکب، دو آنے یونین کا چندہ، ایک پیسے کی گنڈیریاں۔ کل سوا پانچ آنے۔

تھارو بولا "یہ میری تمام دن کی آمدنی اور خرچ ہے . .

. . . . . تم مجھے کنوارا دیکھ کر مذاق کرتے ہو . . . . . پیارہ . . . .

محبت کتنی میٹھی چیز ہے۔ مگر خالی معدے میں تو پانی کی سی نعمت بھی جا کر تڑپا دیتی ہے "

ادساکا فیشر کا منتظم مبہوت بنا تھارو کے غمزدہ چہرے کی طرف دیکھتا رہا۔ اور بولا . . . .

"تم ٹھیک کہتے ہو۔ بھائی . . . . ایمانداری کے کام میں پڑا ہی کیا ہے . . . . ادساکا سے چٹھی آئی ہے۔ اگر چھ ماہ کے اندر نفتہ کیفیت میں آمدنی کی مد بھاری یا کم از کم خاطر خواہ دکھائی نہ دی تو یہ دوکان دہلی کے دفتر سے ملحق کر دی جائے گی "

چند لمحات کیلئے دونوں خاموش رہے۔ پھر تھارو بولا۔

"وہ پان شاپ کا مالک دس سے لے کر پلے ۱۲ فیصدی منافع پر

بیٹے ہوئے روپوں میں سے کاٹ لیتا ہے۔ عام طور پر نیشنل بنک اور پانسے کے سونا پر ایک پیسہ فی روپیہ سود لیتے ہیں۔ . . . مگر ادھر دیکھو صمیم تصویر کی طرف مت دیکھو۔ تمہیں وہ لڑکی یاد ہے نا جس نے مجبوری اور حسرت کے عالم میں اپنی عزیز ترین چیز پان شاپ کے مالک کو دے دی تھی۔ . . اس کی انگشتری کی قیمت اسّی روپے تھی۔"

خان زادہ اچھل پڑا۔ . . . نقارد بولا . .

"پان شاپ کے مالک نے خود مجھے بتایا ہے۔ . . . اسکی قیمت اس نے تیس روپے ڈالی . . . صرف تیس . . . میں سچ کہتا ہوں تیس روپے اور ایک آنہ فی روپیہ سود لگایا۔ میعاد ۳۱ اگست تک ہے۔ . . . . یکم بھی نہیں . . . . اس کے بعد وہ انگوٹھی اسی لٹیرے اور رنڈیے کی ہوگی۔"

ایک چیتھڑے سے کسی تصویر کی پشت کو کبوتروں کی بیٹ صاف کرتے ہوئے نقارد بولا۔

"میری جیب میں کچھ کوڑی بھی نہیں۔ . . . دوکان میں نہ منفی پلیٹیں ہیں نہ مثبت . . . میں کام کیسے کر سکتا ہوں؟"

خان زادہ نے اوساکا سے آئی ہوئی چٹھی جیب سے نکالی اور اسے دوبارہ پڑھنے لگا۔

کچھ دیر غور و فکر میں غرق رہنے کے بعد نقارد نے تصویر اور چیتھڑے کو میز پر رکھ دیا اور بولا۔

"بیگم بازار کی منحوس دوکان پھر اپنی کہاوت کو دہرائیگی . . . . عنقریب ہی خالی ہو جائے گی۔ انٹرنیشنل فوٹو سٹوڈیو کا کام بیڑہ غرق، ٹیکنٹو یا ہولو لو تک وسیع ہوتا تو ایک طرف رہا وہ تو بیگم بازار سے نیشبی چوک تک پہنچنے سے بھی قاصر رہا . . . اور کیا بھائی! . . . آج کل ایمانداری کام میں رکھا ہی کیا ہے؟ . . ."

صمیم نے سر اٹھا کر دیکھا۔ سامنے نقارد کھڑا تھا۔ نقارد جس کا جسم و روح دونوں ارتقا پذیر ہو چکے تھے!

× × × × × × × ×

پان شاپ کا مالک اور نقارد مقامی کاٹن مل کے ھڑتالی مزدوروں کا مظاہرہ دیکھ رہے تھے۔ یکایک پان شاپ کے مالک نے نقارد کو دوکان کے اندر لے جا کر ایک چھوٹا سا کاغذ سامنے رکھ دیا۔

نقارد کا چہرہ کان تک تمتما اٹھا۔ اس کی آنکھوں میں خون کے آنسو اتر آئے۔ ہکلاتے ہوئے اس نے کہا

"دس فیصدی! د . . د . . . دس فیصدی تو بہت ہے۔"

"تمہیں یہ خاص رعایت ہے . . . . ورنہ بارہ سے کم نہیں۔"

"تم کیمرہ کو فرنیچر میں کیوں گنتے ہو؟"

"اور وہ زیورات میں بھی تو شمار نہیں ہو سکتا۔"

نقارد لال نے پھر ایک دفعہ کاغذ پر نظر ڈالی۔ اور پھر اپنی شعلہ فگن آنکھوں کو اوپر اٹھاتے ہوئے کہا۔

"۳۱ اگست نہیں . . . تم مجھے لوٹنا چاہتے ہو . . . . یکم کی شام تک۔ بابو لوگ یکم کو ہی پیسے دیتے ہیں۔"

"بات صرف یہ ہے۔ ۳۱ اگست کی رات کو میں شملہ جا رہا ہوں ——— ورنہ یکم ہو جاتی تو کیا پروا تھی . . . . عموماً اس معاملہ میں گاہکوں کی رضامندی ہمیں مطلوب ہوتی ہے . . . . مگر . . ."

مقامی کاٹن مل کے ھڑتالی مزدوروں کے ہجوم کو چیرتے ہوئے ایک شخص باہر نکلا۔ انگلی سے پیشانی پر سے پسینہ پونچھتے ہوئے اس نے پان ٹکٹ نکالی۔ اور بیالیس روپے پان شاپ کے مالک کی میز پر رکھ دیئے۔ اور سینگر مشین چھڑوا کر لے گیا۔

نقارد نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے کاغذ پر دستخط کر دیئے۔

پان شاپ کے مالک نے ایک ڈبیہ کو کھولتے اور بند کرتے ہوئے کہا۔

"ایک گواہی بھی ڈلوا دو نا . . . . خی خی . . . . . رسمیہ طور پر ضرورت ہوتی ہی ہے نا . . . . خی خی . . . "

"گواہ کس کو لاؤں؟"

"اوساکا فیشر کے منتظم کو لے آؤ۔"

نقارد کے ہاتھ زیادہ کانپنے لگے۔ وہ بھی صمیم کی طرح معمر نظر آنے لگا۔ نقارد کھنگارتے ہوئے بولا۔

"مگر میں صمیم کے سامنے روپیہ لینا نہیں چاہتا۔"

پان شاپ کا مالک ڈرامائی انداز سے ہنسنے لگا۔ ہنستے ہوئے اس نے سامنے لٹکتے ہوئے چھوہروں کی طرف اشارہ کیا۔ اور بولا۔

"وہ صیم کی ہوی کے ہیں؟"

اب تھارو نے جانا، کہ کیوں صیم ایک ہفتہ میں ہی متمول دکھائی دینے لگا تھا۔ اس نے چپکے سے سند پر بھی دستخط کر دیئے۔ پان ٹکٹ ہاتھ میں لیا۔ اور کسی دوسرے دوکاندار کی گواہی ڈلوادی۔

پھر وہ پان شاپ کے پیچھے دار تختوں میں کھڑیا مٹی سے صاف کئے ہوئے خوبصورت شیشوں میں اپنے معمر اور دیانتدار چہرے کے دھندلے عکس کو دیکھتے ہوئے پان شاپ کی سیڑھیوں پر سے اترا اس کی آنکھیں پرنم ہو گئیں ——— کیونکہ وہ ایمان فروش اور بد قماش نہیں تھا۔

۳۱ اگست تک تھارو سوکھ کا کانٹا ہو گیا۔ وہ اس رسی کی مانند ہو گیا تھا۔ جو جل جانے کے بعد بھی ویسی ہی صورت رکھتی ہے اسے کسی طرف سے آمدنی کی کوئی صورت نظر نہ آتی تھی۔ اس پر سکرات کی سی وہ کیفیت طاری ہو گئی۔ جب کہ آدمی مایوس ہو کر آسمان کی طرف سر اٹھا دیتا ہے . . . . ایماندار کی خدا مدد کرتا ہے . . . .

ایمان کی کمائی . . . . ایمان کی کمائی میں برکت . . . ایمان . . . . لعنت! . . . .

اوساکا فیشن کا منتظم تھارو کے پاس آیا۔ مایوسی کے انداز سے اس سے اپنے آپ کو ایک کرسی پر گرا دیا۔ اور بولا۔

"پان شاپ . . . میں ایک کمرہ دکھائی دیتا ہے"

تھارو لال نے شرمندہ ہو کر سر اٹھایا۔ اور ایک گہری نظر سے پان شاپ میں دیکھتے ہوئے بولا . . .

"ہاں ——— دکھائی دیتا ہے . . . . اور جھومروں کی ایک جوڑی بھی . . . ."

خان زادے نے ایک سرد آہ بھرتے ہوئے کہا۔

"کتنی میعاد ہے؟"

"۳۱ اگست تک"

"اور تمہاری؟"

"۳۱ اگست"

"کوئی سبیل؟"

"کوئی نہیں"

"اور تمہاری؟"

"اوں ہوں"

اور دونوں نے ایک سرد آہ بھرتے ہوئے سر گرا دیا۔

جناب تنویر نقوی

چنگاریاں

آنکھوں میں رہ کے دل میں سمانے لگے ہو تم
یہ کیا فسونگری سی دکھانے لگے ہو تم!

ہوتی ہے دیکھیں کونسی خدمت سپرد عشق
اب اپنے ناز آپ اٹھانے لگے ہو تم

نبضیں چھٹی چھٹی سی ہیں تاروں کی دیکھنا
کیوں آسماں پہ آنکھ اٹھانے لگے ہو تم

مرکز میں اپنے اپنے سمٹنے لگے ہیں نور
سب کائنات حسن پہ چھانے لگے ہو تم

پر درد گر نہیں ہے مری داستانِ غم
کیوں چپکے چپکے اشک بہانے لگے ہو تم

ہر اشک کی جبیں پہ لرزتا ہے تیرا عکس
چھپ کر بھی سامنے نظر آنے لگے ہو تم

تنویر تیرے لفظوں میں چنگاریاں ہیں کیا
دیپک کے خفتہ راگ جگانے لگے ہو تم

محترمہ گوہر اقبال حور

اَے دل

(۱)

اے مضطرو پریشاں دل!
اے پریشاں اور ہراساں دل!
اے سکوں ناشناس و حیراں دل!
اے فگار و نزار، ویران دل!
کیوں تجھے آرزوئے عشرت ہے؟

(۲)

محبسِ غم فزائے دنیا میں
ایسی ظلمت سرائے دنیا میں
آہ! اس تنگنائے دنیا میں!
اور ہنگامہ ہائے دنیا میں
جستجوئے سکون و راحت ہے!

(۳)

کوئی بھی خوش ہے ایسی پستی میں
کوئی ہنستا ہے دُکھ کی بستی میں
عمر جاتی ہے غم پرستی میں!
پھر تجھے کارگاہِ ہستی میں
کیوں حصولِ خوشی کی حسرت ہے!

(۴)

نارِ دوزخ میں جنتیں کیسی؟
آہ! کانٹوں میں نکہتیں کیسی!
غمِ ہستی میں راحتیں کیسی!
زندگی میں مسرّتیں کیسی؟
وہ تو خود رنج سے عبارت ہے

پروفیسر سید اختر اورینوی
(ایم اے)

ایک ایکٹ کا المیہ

زوالِ کینٹن

افرادِ تمثیل

۱:- فاہیان:- ایک محب وطن نوجوان
۲:- ای آیا:- ایک نوجوان لڑکی، فاہیان کی منسوبہ
۳:- کواوچانگ:- ایک اور نوجوان۔
۴:- چن:- ای آیا کا باپ، اُدھیڑ عمر کا
۵:- ای کوفو:- چن کی بیوی۔ ادھیڑ عمر کی
۶:- ایک بوڑھا شخص- چن کا باپ۔
۷:- تین چینی سپاہی:- (پہرے دار)
۸:- "حزب دفاع قومی" کے تھوڑے نوجوان
۹:- جاپانی افسر اور تھوڑے سپاہی
۱۰:- کچھ عوام الناس (رکشا والے، قلی دکاندار، شہری وغیرہ)
۱۱:- ایک خادمہ- سچن نامی
۱۲:- ——————

منظرِ اول

[شام کا وقت، کینٹن میں سربازار مکان کا ایک کمرہ۔ کمرے کے وسط میں ایک چھوٹی سی میز کے گرد- صوفوں پر ایک نوجوان عورت، ایک ادھیڑ عمر کا مرد، ایک اسی عمر کی عورت اور دو نوجوان مرد بیٹھے ہوئے باتیں کر رہے ہیں۔ کمرے کے ایک گوشے میں پیانو رکھا ہوا ہے جس پر خوشنما کشیدہ کڑھا ہوا میز پوش ہے۔ اور اس پر نازک سا گلدان جس میں خوشرنگ گلابی زرد اور فالسئی پھول سلیقے سے آراستہ ہیں۔ آتشدان پر کوڑیاں، مونگے، اور چھوٹے چھوٹے چینی کھلونے رکھے ہوئے ہیں، اور ان کے وسط میں برما کا بنا ہوا ہاتھی دانت کا مہاتما بودھ کا ایک مجسمہ رکھا ہوا ہے۔ کمرے کے ایک دوسرے گوشے میں ایک بوڑھا شخص آرام کرسی پر لیٹا ہوا افیون کے نشہ میں اُونگھ رہا ہے۔ یہ لوگ چین کے متوسط طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔]

فاہیان:- (ایک نوجوان بند گلے کا کوٹ اور پتلون پہنے ہوئے . . . . . کوٹ میں سن یات سین کی تصویر کا لاکٹ لگائے چھوٹی چھوٹی، نہایت ہی روشن آنکھیں، چھریرا بدن نسبتاً نازک تراش کا چہرہ، جوش کیساتھ باتیں کرتا ہوا) چین کو اس کی فرسودہ خیالی نے تباہ کیا۔ ہمیں اسوقت زمانہ کی ہمعنانی کا خیال آیا، جب وقت بہت آگے پرواز کر چکا تھا۔ کاش اب بھی ہمیں ہوش آ جاتا۔ اور ہم اپنے اختلافات مٹا کر پورے طور پر وطن کی حفاظت کرتے اور جاپان کو شکست فاش دیکر اپنے پیارے وطن کی تعمیرِ نو میں مشغول ہو جاتے۔

کواوچانگ:- (دوسرا نوجوان۔ فربہ اندام نمایاں پھیلے ہوئے جبڑے، بہت ہی بلند پیشانی مغربی وضع کا لباس پہنے ہوئے) کیوں ہم لوگ جاپان کے مقابلہ میں متحد نہیں ہیں؟

فاہیان:- چانگ! تمہیں معلوم نہیں کہ چیانگ کائی شیک نے کتنی دشواری سے قومی اتحاد پیدا کیا تھا۔ خانہ جنگی میں مصروف جرنیلوں نے ملک میں طوائف الملوکی مچا رکھی تھی۔ اور چین کو

ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا تھا۔ اور آج بھی چیانگ خفیہ تنظیموں اور خود غرضانہ چالوں سے پریشان ہے۔

کواو چانگ :۔ واقعی چیانگ ایک سچا محبِ وطن ہے۔۔۔۔!

(ذرہ رک کر) تو کیا ابھی تک اختلافات موجود ہیں؟

فاہیان :۔ ہاں اختلافات موجود ہیں۔ مگر مجموعی طور پر ہمارا ملک جاپان کا مقابلہ کرنے میں متحد ہے۔ کاش! یہ خود غرض رؤساء بھی چیانگ کے پورے طور پر مطیع ہو جاتے۔ جنگ کے ہزار برے پہلو سہی مگر اسی جنگ نے چین کی روحِ اتحاد کو بیدار کر دیا ہے۔ جنگ دپیکار کے آتشیں شعلوں کی حدت میں تپ کر قوم کے مختلف اجزا متحد و منضبط ہو جائیں گے۔

ای آیا :۔ (نوجوان عورت۔ بادامی آنکھیں ابھرے ہوئے گال، زعفرانی رنگت درمیانہ قد، سرخ نازک لب شاخ مرجان کی طرح، پتلی پتلی لانبی انگلیاں اور انداز کی نفاست اس کے صناع ہونے کی شہادت دے رہی ہیں۔ اس کی آنکھوں سے ایک خاص قسم کی وارفتگی جھانکتی ہے۔ جو اس کی وفا شعاری کی دلیل ہے۔)

فاہیان :۔ تم جنگ کے فضائل بیان کر رہے ہو۔ حالانکہ جنگ ایک ابدی لعنت ہے۔ انسانیت سوز، اخلاق کش، جنگ انسانی اخوت و محبت کو آگ لگا دیتی ہے۔

کواو چانگ :۔ ہم نے جنگ کی ابتدا نہیں کی جاپان نے ہم پر ظلم و جور سے حملہ کر دیا۔ ہم حفظِ وطن میں جنگ کر رہے ہیں۔

ای آیا :۔ کیا بدی کا مقابلہ بدی سے کیا جاتا ہے؟ کیا شر کا علاج شر ہے؟ نہیں اور ہرگز نہیں! جاپان کے حملہ کا مقابلہ "ستیاگرہ" سے کرنا چاہیئے تھا۔ چین اگر ارادہ کرے تو تباہ ہو جائے تو ہو جائے مفتوح نہیں ہو سکتا۔ "اہمسا" اور سچائی سے چین انسانیت کے دل کو فتح کر سکتا ہے۔

کواو چانگ :۔ (لاجواب ہوتے ہوئے) یہ "ستیاگرہ" کی عجیب و غریب اصطلاح آپ "وشوا بھارتی" سے تحفتاً لائے ہیں؟ آپ کا قیام ہندوستان تو بہت بابرکت ثابت ہوا! پہلے ہند سے صرف افیون آتی تھی اور اب ستیاگرہ کی درآمد بھی ہونے لگی (خوب زور سے قہقہہ لگاتا ہے)

ای آیا :۔ (قدرے جھنجلاتے ہوئے) چانگ! تم کو تو غور و فکر سے بہت دوری ہے۔ میں فاہیان سے باتیں کر رہی تھی۔ بیشک میں "ستیاگرہ" اور "اہمسا" کا تحفہ ہندوستان سے لائی ہوں میں نے "وشوا بھارتی" میں صرف ہندوستانی مصوری اور ویدانت کا مطالعہ نہیں کیا۔ بلکہ مہاتما گاندھی کے بیتال فلسفہ کے متعلق بھی معلومات حاصل کئے۔

کواو چانگ :۔ (جواب تک ہنستا جا رہا ہے) ہی۔ ہی۔ ہی۔ ہا ہا۔ ای آیا! فاہیان سے تم ہمیشہ باتیں کرتی ہو۔۔۔ کبھی مجھے بھی تو اس کا شرف حاصل ہو۔۔۔۔ (پھر ہنسنے لگتا ہے)

ای آیا :۔ (شرماتے ہوئے) مینڈک سے بھی لوگ باتیں کرتے ہیں؟

فاہیان :۔ (مسکراتے ہوئے) تم لوگ تو ناحق لڑنے لگے۔۔۔۔۔ تو ہاں ای آیا! تم گاندھی کے "اہمسا" اور "ستیاگرہ" کی قائل ہو تمہارا یہ خیال ہے۔ کہ شر کا مقابلہ شر سے نہیں کرنا چاہیئے بدی بہرحال بدی ہے۔ مگر بات یہ ہے کہ جنگ نہ شر ہے اور نہ خیر۔ اس کا باموقعہ اور بےموقعہ استعمال اسے اچھا یا برا بنا دیتا ہے۔ کائنات میں شر کا کوئی اثباتی وجود نہیں۔ دنیا کی ہر شے بذاتہٖ اچھی یا بری نہیں۔ زہر بھی تریاق ہو سکتا ہے اور شہد بھی سم بن جاتا ہے۔ اگر اعمال کا جائزہ لیا جائے تو ان کا بھی یہی حال ہے۔ چوری اس لئے چوری ہے۔ کہ وہ روزی کمانے کے جذبہ کا غلط استعمال ہے۔ جھوٹ اس لئے جھوٹ ہے۔ کہ وہ خود حفاظتی کے فطری رجحان کا نامناسب اظہار ہے۔ کبھی محبت بھی برائی بن جاتی ہے۔ مال کی بےجا محبت بخل ہے۔ اور جان کی بےجا محبت بزدلی اور غداری جنگ اگر حرص و آز کے لئے کی جائے تو وہ قتل و غارت ہے۔ اور حفاظتِ ناموس و حمایتِ مظلوم کی خاطر جنگ جرأت اور سعادت ہے۔

ای آیا:- اگر حفاظت ناموس و حمایت مظلوم پُر امن ستیا گرہ سے ہو سکے۔ تو پھر جنگ کی کیا ضرورت ہے؟ جنگ سے دنیا میں منافرت بڑھتی ہے۔ یہ ایک وحشیانہ طریقۂ دفاع ہے جب محبت و صداقت کے ذریعہ مردم خور وحشیوں کو بھی رام کیا جا سکتا ہے تو کیا۔ ہم ۔ ۔ بہت پڑھے لکھے جاپانیوں کو راہ پر نہیں لایا جا سکتا۔؟ فاہیان دنیا میں امن سے بڑھکر کوئی نعمت نہیں ظالم و مظلوم کی محبت سے بھرے ہوئے سینہ پر گولیاں کھا کر مر جانا، بہت بڑی جرأت و سعادت ہے۔

[ادھیڑ عمر کا مرد، ای آیا کا باپ، نوجوانوں کی بحثوں سے اکتا کر اپنے پہلو سے اخبار اٹھا کے پڑھنے لگتا ہے اور ادھیڑ عمر کی عورت، جو اس کی بیوی ہے۔ خادمہ یچن کو پکارتی ہوئی کمرے سے باہر چلی جاتی ہے۔ بوڑھا مرد کمرے کے گوشے میں بدستور اونگھ رہا ہے]

فاہیان:- مقصدِ حیات نہ امن ہے نہ جنگ۔ زندگی کا مقصد تطہیر خودی ہے اور اس کا معیار و منہاج اجتماعی فلاح و بہبود ہے کبھی امن ذریعۂ اظہار ہوتا ہے اور کبھی جنگ۔ ۔ ۔ ۔

ای آیا:- (بات کاٹتے ہوئے) اسی خودی نے تو دنیا کو تباہ کیا ہے!

فاہیان:- بے صبر مت بنو۔! خودی کے معنی خود غرضی نہیں خودی نام ہے شر کے مقابلہ میں اپنی اعلیٰ صفات کے اظہار کا اور اپنی خصوصیات کے ساتھ خود زندہ رہنے اور دوسروں کو زندہ رہنے دینے کا۔ خیالات و مقاصد کو پُر امن طریقہ سے پھیلانے کی مکمل آزادی ہونی چاہیئے۔ آزادی کے کچلنے والوں کا جرأت سے مقابلہ کرنا تحفظِ خودی ہے۔ کبھی جنگ امن سے زیادہ متبرک ہوتی ہے۔ شر کا مقابلہ نہ کرنا بھی شر ہے۔ یہ ظالم اور مظلوم دونوں کے ساتھ ناانصافی ہے۔ "اہمسا" کے فلسفہ سے ظالم زیادہ دلیر گنہگار بن جاتا ہے۔ تم جنگ کو وحشیانہ طریقۂ دفاع کہتی ہو! ہر انسانی عمل کیطرح جنگ بھی وحشیانہ بن سکتی ہے سارے فطری رحجانات کا یہی عالم ہے۔ اگر انہیں اخلاقِ فاضلہ کے قبضہ سے آزاد کر دیا جائے۔ تو وہ وحشت و بہیمیت بن جاتے ہیں، مثلاً کھانا، پینا، سونا، نفرت، محبت وغیرہ سب بہیمانہ ہو سکتے ہیں۔ اگر ان پر سے پابندیاں اٹھا دیجائیں اگر اخلاقی پابندیوں کے ساتھ جنگ کیجائے۔ تو اس میں بہیمیت نہ پیدا ہو۔ ایسی جنگ منافرت نہیں پھیلاتی، بلکہ منافرت کے ساتھ ظلم کا بھی سدباب کرتی ہے۔ جنگ محض ایک فطری جذبۂ دفاع و بقا ہے۔ فطری رحجانات کو مٹانا مہلک ہے۔ ہاں انسانیت کی سرحد وہاں سے شروع ہوتی ہے، جہاں سے فطری رحجانات اخلاق کے ماتحت آجاتے ہیں، اور میں کہہ چکا ہوں کہ اخلاق کا معیار انسانیت کی مجموعی فلاح ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

کواد چانگ:- (قطع کلام کرتے ہوئے) ایسی گفتگو سے سر میں درد ہو جانا یقینی ہے۔ ای آیا دیکھنا ہر کام کے پہلے فلسفہ کا مطالعہ کر لیا کرنا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور فلسفۂ محبت کی تو آپ ماہر ہی ہیں۔ (خود بخود زور سے ہنستا ہے)

ای آیا:- خالی ڈھول! (کواد چانگ کو ایک چپت لگاتی ہے)

فاہیان:- (مسکراتے ہوئے) دیکھو ای آیا، یہ عدم تشدد کے خلاف ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ تو ہاں تم نے وحشیوں کو رام کرنے کی مثال دی تھی نہ؟ ——— ہوتا یہ ہے۔ کہ چند نیک دل مشنری وحشیوں کو مہذب بنانے جاتے ہیں اس کوشش میں کبھی ان کی جان بھی چلی جاتی ہے مگر وہ کامیاب ہو جاتے ہیں لیکن اس سے یہ کہاں پتہ چلتا ہے۔ کہ وہ اس وقت بھی جب ان پر کوئی مردم خور حملہ آور ہوتا ہے تو "اہمسا" اور "ستیا گرہ" پر کرتے ہیں جاپانیوں نے ہم پر حملہ کر دیا ہے۔ انہیں آپ لاکھ عدم تشدد کا فلسفہ سمجھائیے، وہ ظلم کئے جاتے ہیں۔ کیا ہم ستیا گرہ سے ان کے مظالم کو روک سکتے ہیں؟ سارے چین کے نہتے جان دے دینے سے بھی جاپانیوں کا پشیمان ہونا کوئی ضروری نہیں۔ تاریخ میں اس کی ایک مثال نہیں کہ مجموعی طور پر ظالم قوم، مظلوموں کے پُر امن صبر و استقامت کے باوجود، اپنے جور و جفا سے باز آئی ہو۔ کم از کم ظالم اس طرح عدم تشدد پر کبھی ایمان

نہیں لائے۔ صبر ایک اعلیٰ اخلاق ہے۔ کیونکہ یہ ارادہ کی قوت مضبوط کرتا ہے۔ مگر صبر اسوقت بزدلی ہو جاتا ہے۔ جب مظلوموں پر خدا کی دنیا تنگ ہو رہی ہو۔ جس طرح اپنے کیمپ پر مردم خوروں کے حملہ کے وقت مشنری بھی دفاع میں گولیاں چلا لیتے ہیں۔ اسی طرح مردم شکار جاپانیوں کے ظالمانہ حملہ کو روکنے کے لئے چین بھی برسرپیکار ہے۔

[ادھیڑ عمر کی عورت ای کو فو کمرے میں واپس آتی ہے۔ اس کے پیچھے پیچھے نوجوان خادمہ میجن چا کا طشت لئے داخل ہوتی ہے۔ کو او چانگ خادمہ کو حریصانہ گھورتا ہے۔ وہ میز پر طشت رکھ کر چلی جاتی ہے۔ اور چانگ اس کے ننھے ننھے خوبصورت پاؤں کو دیکھتا رہ جاتا ہے۔]

ای کو فو:۔ (صوفہ پر بیٹھتے ہوئے) لو بچو چائے پی لو۔ بغیر بخشش کرنا!

فاہیان: یہ لوبینگ کی بھنی ہوئی ٹانگ ہے۔ ای آیا نے اس کو تمہارے لئے بڑے جتن سے پکایا ہے۔

[فاہیان کی طرف بڑھاتی ہے۔ وہ شکریہ کیساتھ قبول کرتا ہے]

کو او چانگ:۔ (منہ بناتے ہوئے) میرے لئے کوئی ایک ٹڈی کی ٹانگ بھی نہیں ابا لنا۔

(ای آیا چانگ کی طرف ہونٹ کے غصے سے دیکھتی ہوئی مسکراہٹ کو روک رہی ہے]

ای کو فو:۔ مت رو میرے ننھے سے بچے! تمہارے لئے یہ دوسری ٹانگ رہی۔ یہ لو!

[ای کو فو۔ ای آیا اور اپنے شوہر کی طرف چائے بنا کر بڑھاتی ہے۔ اور چانگ کو بینگ کی دوسری ٹانگ دیتی ہے۔ پھر ایک پیالی چائے۔ اور مٹھائی طشتری لیکر گوشے میں بیٹھے ہوئے بوڑھے کی طرف جاتی ہے۔ بوڑھا مٹھائیوں کی خوشبو سے متاثر ہو کر مینگ سے چونک کر اٹھتا ہے۔ اور حریصانہ کھانے لگتا ہے۔ ای کو فو واپس آکر خود چائے پی لیتی ہے۔ سب چائے پی رہے ہیں]

ای آیا:۔ ہاں یہ تو صحیح ہے فاہیان کہ مہاتما گاندھی کا فلسفہ بالکل نیا ہے انہوں نے خود ہی حال میں لکھا ہے کہ "میرے[1] علم میں اس کی کوئی تاریخی مثال نہیں ہے۔ لہٰذا میں اپنے تجربہ کی جدت کا مدعی ہوں"۔ مہاتما بودھ نے بھی "اہنسا" کی تعلیم دی تھی۔ مگر مہاتما گاندھی نے اس اصول کو عالمگیر وسعت دیدی ہے۔ انہوں نے قومی و بین القومی سیاسیات میں بھی اسے داخل کرنا چاہا ہے اور یہی ان کی بزرگی کی دلیل ہے۔ اگر اسی خوبصورت اصول پر عمل کیا جائے تو دنیا سے جنگ و جدال مٹ جائے! انسانی آئیڈیل (نصب العین) کو ہمیشہ بلند ہونا چاہیئے۔ ایسا نہیں، کہ جو بات اب تک نہ ہو سکی ہو، کبھی نہ ہو سکے۔

فاہیان:۔ گاندھی کی بزرگی سے مجھے کوئی غرض نہیں، مگر اس دُور دراز ملک میں رہ کر بھی مجھے اتنی واقفیت ہے، کہ گاندھی کے اقوال میں اختلاف نمایاں ہے۔ گاندھی نے چیانگ کائی شیک کو مبارکباد بھی تو دی ہے، مہاتما بودھ پر یہ اعتراض وارد نہیں ہوتا۔ بہرحال جہاں تک اصول "اہنسا" کا تعلق ہے، مہاتما بودھ اور گاندھی دونوں کی تعلیم ناقص ہے . . . . .

ای کو فو:۔ (بیجر درح ہوتے ہوئے چونک کر) یہ نئی روشنی کے نوجوان تو نیرے بدعقیدہ ہو کر رہ گئے ہیں۔ تبھی تو اتنی مصیبتیں ہیں . . . .

چین:۔ (ای کو فو کا شوہر اخبار رکھتے ہوئے) مہاتما بودھ نے دفاعی جنگ سے منع نہیں کیا ہے۔ آجکل کے نوجوان صرف جذباتی ہوتے ہیں۔ غور و تامل سے انہیں کوئی بحث نہیں (اپنے کو ذرا بلند محسوس کرتے ہوئے) میں نئی تعلیم

[1] ہریجن

کا مخالف نہیں، مگر مذہبی واقفیت بھی بہت ضروری ہے

فاہیان:- (سلسلۂ کلام جاری کرتے ہوئے) مگر جناب! میں تو روزمرّہ کی زندگی میں بھی "اہمسا" کا قائل نہیں۔ یہ سب محض خوبصورت باتیں ہیں۔ ہاں ابھی ای آیا نے بھی تو کہا ہے۔ کہ خوبصورت اصول "خوبصورت مگر ناقابلِ عمل۔

چن:- (خود فریب تسکین کے انداز میں) تم لوگوں نے سمجھا نہیں،
(پھر اخبار پڑھنے لگتا ہے اور ایک پیالی چائے اور طلب کرتا ہے)

ای کو فو! ایک اور پیالی!

(ای کو فو خفا سی ہے۔ چائے بنا کر چن کو دیتی ہے)

فاہیان:- (ان باتوں کو ٹالتے ہوئے) ای کو فو! تم نے آئیڈیل کی بلندی کے بارے میں کہا تھا۔ نصب العین بلاشبہ بلند ہونا چاہیئے۔ مگر میں فرشتوں اور ارواح کی دنیا میں پرواز کے قابل نہیں، جو فرشتوں کے لئے مناسب ہے، انسانوں کے لئے مضر ہے۔ کسی انسانی اصول کو فطری رجحان کے خلاف نہیں ہونا چاہیئے۔ صرف رجحانات کی تہذیب و تربیت کے سلسلے میں، ہماری نظر کا وسیع، غائر اور بلند ہونا ضروری ہے — یہی نصب العین کی بلندی ہے۔

کواوچانگ:- (جو اب تک چائے ناشتہ میں مشغول تھا، ان باتوں میں کب تک الجھے رہوگے؟ چلو سیر کرنے چلیں!
(اٹھ کر پیانو کے پاس جاتا ہے۔ اور کچھ یونہی دو چار پٹریاں بجانے لگتا ہے۔ پھر کمرے میں ٹہلتے ہوئے سیٹیاں بجاتا ہے)

ای آیا:- نہیں فاہیان! مہاتما گاندھی کی باتیں بڑی بھلی لگتی ہیں۔ کاش! تم میں تھوڑی سی روحانیت پیدا ہو سکتی!

فاہیان:- "دنیا" "شانتی نیکیاں" یا شبگاؤں نہیں ای آیا۔

چن:- (اخبار رکھتے ہوئے) جاپانی کینٹن کے قریب پہنچتے جا رہے ہیں۔ مگر اطلاع یہ ہے کہ ہماری فوجیں انہیں روکے رکھنے کی پوری طاقت رکھتی ہیں۔

فاہیان:- لیکن ہوائی حملہ کا ہر وقت خطرہ ہے۔ چلو چانگ دفتر اطلاعات سے تازہ حالات دریافت کئے جائیں۔

(فاہیان اور چانگ چلے جاتے ہیں۔ ای آیا اور ای کو فو بہت فکرمند معلوم ہوتی ہیں۔ چن بھی بہت سنجیدہ ہے۔ کمرے کے گوشہ میں بوڑھا افیونی چن کا باپ اسی طرح اونگھ رہا ہے)

(پردہ)

منظر دوم

[صبح سویرے کینٹن کا بازار، چن کے مکان کے سامنے۔ سڑک پر لوگ بھاگے پھر رہے ہیں۔ ہر طرف چیخ و پکار۔ ”دھوپ“ آپا دھاپی ہے۔ مکانوں اور دوکانوں کے سامنے گھر کا اسباب۔ بستر، ٹرنک، اور دوسرے ضروری سامانوں کا ڈھیر ہے۔ کچھ سامان قلیوں کے سر پر ہیں کچھ رکشوں پر سوار ہیں۔ یہ سب لوگ شہر خالی کر کے قرب و جوار کے گاؤں کو جان بچانے کے لئے پناہ ڈھونڈنے جا رہے ہیں۔ سبھوں کے چہروں پر دہشت اور گھبراہٹ برس رہی ہے۔ دھماکوں کی آوازیں مختلف سمتوں سے آرہی ہیں۔ کیونکہ چین کی حکومت، سرکاری دفاتر، صنعتی اداروں، پلوں، اور دوسری اہم عمارتوں کو بارود سے اڑوا رہی ہے جاپانی حملہ کا قطعی یقین ہو چکا ہے۔ چینی فوجیں پسپا ہو رہی ہیں۔ ان دھماکوں سے شہریوں میں اور خوف و ہراس بڑھ رہا ہے۔ ہوائی تاخت کے خطرے کا ”سائرن“ سمع خراش چیخ پیدا کر کے مجموعی ہیبت ناک فضا کو اور زیادہ مہیب بنا رہا ہے۔ نادار آوارہ گرد اور چند بھلے مانس بھی دکانوں کی لوٹ میں مشغول ہیں۔ ”گرگ بچے“ ہر طرف لوٹ میں شریک ہیں۔ ایک بغلی دوکان پر

[بہت سے انیونی انیون خریدنے آتے ہیں، کہ نہ معلوم پھر کب ملے۔ ای آپا اپنے مکان کے دروازے پر سراسیمہ آتی ہے۔ انتظار کرتی اور چلی جاتی ہے۔ ایک بار سڑک پر فاہیان کو دیکھ کر اس کی طرف بے تحاشا دوڑتی ہے۔ فاہیان لوگوں کی امداد میں مشغول ہے]

ای آپا:۔ (پریشان حال) پیارے فاہیان! تم نے مجھے تنہا چھوڑ دیا! تم بخیریت ہو فاہیان؟ (فاہیان سے لپٹ کر رونے لگتی ہے) میں گھنٹوں سے تمہاری منتظر تھی۔ ابا، اماں اور سب لوگ بھاگنے کے لئے تیار بیٹھے ہیں۔ چلو فاہیان...... جلد چلو...! (روتی جاتی ہے)

فاہیان:۔ (ای آپا کو گلے لگاتے ہوئے) پیاری آپا! ـ بہت اچھا ہوا تم سے ملاقات ہوگئی... مجھے بالکل فرصت نہیں ملی جاپانی حملہ کی اطلاع یک بیک آئی۔ آدھی رات سے ہم لوگوں کی مجلس "خدمت خلق" شہر چھوڑنے والوں کی امداد میں مشغول ہے۔ تمہارے ملازمین نے سب سامان درست کر لیا ہوگا، ہم لوگ کمزوروں، ناداروں اور مجبوروں کی مدد کرنے میں منہمک تھے...... آؤ ای آپا، میری اپنی پیاری آپا، ہم لوگ رخصت ہو لیں کون جانتا ہے ہماری ملاقات پھر ہو یا نہ ہو۔ (ای آپا کو گلے لگاتے ہوئے پیار کرتا ہے)

ای آپا:۔ تو کیا ہم لوگوں کے ساتھ نہ چلو گے؟ چانگشے میں تمہارے والدین بھی تمہارے بیقراری سے منتظر ہونگے۔

فاہیان:۔ کیسے جا سکتا ہوں، پیاری شہر خالی ہو جانے کے بعد بھی مجھے یہاں رہنا ہے۔

ای آپا:۔ (روتے ہوئے) فاہی پیارے! تم یہاں رہ کر کیا کرو گے؟ تمہیں مجھ سے محبت نہیں رہی؟ ایسے کٹھن وقت میں تم مجھے چھوڑ دو گے....؟ چلو فاہی تمہیں میری محبت کا واسطہ....!

فاہیان:۔ آپا! میں نہیں جا سکتا میرا رہنا بہت ضروری ہے تم جاؤ پیاری! گھر پر سب لوگ تمہارے منتظر ہیں۔ وہ دیکھو!

ای آپا:۔ آخر یہاں تمہارا کیا کام ہوگا فاہی؟

فاہیان:۔ میں نہیں بتا سکتا آپا!

ای آپا:۔ فاہی! اچھا نہ بتاؤ، مگر چلو میرے ساتھ!

فاہیان:۔ میری خوبصورت آپا! جاؤ!

ای آپا:۔ میری محبت اتنی بے اثر؟

فاہیان:۔ میری اور تمہاری محبت سے ایک اور اعلیٰ و ارفع محبت مجھے یہاں رہنے پر مجبور کرتی ہے۔

ای آپا:۔ (قدرے مایوس ہوتے ہوئے) پھر مجھے بتاؤ، فاہی تم ویران کینٹن میں رہ کر کیا کرو گے؟ اچھا فاہی ہم لوگ مل کر ضرورتمندوں کی مدد کریں۔ پھر سب کے چلے جانے کے بعد ہم چلے چلیں گے ہے نہ؟

فاہیان:۔ نہیں آپا! تم چلی جاؤ۔ ویران کینٹن میں میرا رہنا لازمی ہے

ای آپا:۔ پھر تم بتاتے کیوں نہیں، کہ یہاں رہ کر کیا کرو گے؟

فاہیان:۔ وہ ایک راز ہے میں نہیں بتا سکتا مصلحت خاموش رہنے کو کہتی ہے۔

ای آپا:۔ مجھ سے بھی راز پیارے (خاموش ہوتے ہوئے) ای آپا سے؟

فاہیان:۔ ہاں مجبوراً تم سے بھی۔

ای آپا:۔ (رونے لگتی ہے) یہاں.... تو... کوئی بھی نہیں رہیگا تم تنہا یہاں کیا کرو گے؟

فاہیان:۔ ادائے فرض۔

ای آپا:۔ میرے اور تمہارے فرائض ایک ہیں، میں بھی تمہارے ساتھ رہوں گی

فاہیان:۔ نہیں آپا پیاری! تم جاؤ.... تمہارا رہنا نامناسب بلکہ نقصان رساں ہوگا۔

ای آپا:۔ میرے دل میں شبہات پیدا ہوتے ہیں، فاہیان کیا تم نے کسی اور سے وعدہ کر لیا ہے؟

فاہیان:۔ بدگمان آپا! فاہیان تیرا ہے۔ اور مرتے دم تک تیرا رہیگا (اس کی آنکھیں پرنم ہو جاتی ہیں)

ای آپا:۔ (فاہیان سے لپٹ کر بے قرارانہ رونے لگتی ہے) میرے فاہی! اپنی آپا کو مت چھوڑو۔ میں تمہارے ساتھ زندہ رہوں اور تمہارے ساتھ مرونگی۔

(ای آیا کا باپ چن آتا ہے)

چن :- چلو فاہیان! چلو آیا!... جلدی کرو!... جاپانی طیارے بم برسائیں گے۔ اچھا ہوا تم مل گئے فاہیان! چلو آؤ... فوراً! رکشوں پر سامان لادے جا چکے۔ آؤ دیر نہ کرو۔

(ای آیا اور فاہیان علیحدہ ہو جاتے ہیں)

فاہیان :- جاؤ ای آیا! اچھا رخصت! رخصت جناب چن۔

ای آیا :- (چن سے) فاہیان نہیں جاتے ابا جان!

چن :- (متعجبانہ) کیوں؟ کیا؟ نہیں جاتے؟

فاہیان :- میں مجبور ہوں جناب!

چن :- جاپانیوں کا خیر مقدم کرنا ہے (نیم طنزیہ لہجے میں) چلو فاہیان جلد چلو!

فاہیان :- جناب میں نہیں جا سکتا۔

چن :- (حیرت سے) ہوش کی باتیں کرو (چلتے ہوئے) میں کہتا ہوں عجلت کرو۔

ای آیا :- میں بہت کہہ چکی ابا جان! یہ کہتے ہیں میرا ویران کینٹن میں رہنا ضروری ہے۔

چن :- کیوں فاہیان! کیا بات ہے؟

فاہیان :- آپ لوگ تشریف لے جائیں۔ میں چانگشا آکر آپ لوگوں سے ملوں گا

چن :- میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔ (چونک کر) جاپانی طیارے! آڑ بھاگو!

فاہیان :- نہیں جناب! وہ ہمارے اپنے ٹینکوں کے چلنے کی آواز ہے۔ پوری فوج کینٹن چھوڑ رہی ہے۔ بہر حال آپ لوگوں کو جلد چلے جانا چاہیے۔

چن :- عجیب بات ہے۔ تم یہاں کیا کرو گے؟

فاہیان :- جاپانی فوج کے سامنے "ستیاگرہ" کر کے مروں گا اور دشمن کو پشیمان ہونے موقعہ دونگا۔ (مسکراتے ہوئے) ہے نہ ای آیا؟

چن :- (بگڑتے ہوئے) یہ مذاق کا وقت نہیں۔ جلد بتاؤ کیوں نہیں چلتے؟

(نہایت سنجیدگی سے)

فاہیان :- جناب عالی! "حزب دفاع قومی" کے رکن کی حیثیت سے مجھ پر چند فرائض عائد کئے گئے ہیں، تفصیل بتانا ممنوع ہے

ای آیا :- میں بھی تمہارے ساتھ رہ کر اپنے ملک کی خدمت کرونگی

فاہیان :- یہ بالکل ناممکن ہے (گھڑی دیکھتے ہوئے) مجھے اب جانا چاہیے۔ اچھا رخصت! خدا حافظ! (جانے لگتا ہے)

ای آیا :- (زور زور سے روتی ہوئی) میں بھی چلوں گی (آگے بڑھتی ہے چن اسے روکتا ہے) میں بھی چلوں گی فاہیان!

(فاہیان تیزی سے مجمع میں غائب ہو جاتا ہے۔ ای آیا روتی رہ جاتی ہے۔ چن اسے لیکر اپنے گھر کی طرف جاتا ہے)

(پردہ)

منظر سوم

[شام کا وقت کینٹن کی ایک ویران شدہ سڑک۔ مکینوں سے خالی مکانات، لٹی ہوئی دکانیں بکھرے ہوئے سامان۔ چار پانچ نوجوان، سڑک پر دکھائی دیتے ہیں۔ دو چینی سپاہی پہرہ دے رہے ہیں۔ نوجوان ایک مکان کے اندر بارود کے پیپے لیجاتے ہیں۔ چند نوجوان مکان سے نکلتے ہیں۔ ہر شخص رائفلوں سے مسلح ہے۔ باہر آنے والے نوجوانوں میں ایک فاہیان ہے]

ایک نوجوان :- افسوس سرنگ بہت دیر میں تیار ہوسکی۔ دشمن کے حملہ آور ہونے کا ہر وقت خطرہ ہے۔ اور ابھی سڑک کے نیچے صرف پرلی جانب ہی بارود بچھایا جا سکا ہے۔

دوسرا نوجوان :- ہمیں تیزی سے کام جاری رکھنا چاہیے۔

(سب لوگ چلے جاتے ہیں۔ کچھ اور نوجوان بارود کے پیپے لے کر آتے اور مکان میں داخل ہو جاتے ہیں)

ایک پہرہ دار:- چینی سپاہی - جاپانی یہاں سے صرف تیرہ میل کے فاصلہ پر ہیں۔ دشمن، جا کر بڑھ آیا۔

دوسرا پہرہ دار:- وہ اب تک اور قریب آ پہنچے ہوں گے۔

پہلا پہرہ دار:- یہ سرنگ تیار ہو جاتی تو ہم لوگ دشمن کی فوج کے ایک کثیر حصہ کو جہنم واصل کر دیتے!

دوسرا پہرہ دار:- ہاں اس سڑک پر سرکاری دفاتر واقع ہیں۔ دشمن ضرور اس راہ سے گذرے گا۔ اگر سرنگ اڑائی جا سکی تو غنیم کو سخت چرکا لگے گا۔

(نوجوانوں کی ٹولی بارود لئے آتی اور مکان کے اندر داخل ہو جاتی ہے)

پہلا پہرہ دار:- ایک اطلاع یہ بھی ہے کہ دشمن کا ہراول شہر سے صرف تین میل کے فاصلہ پر پوری فوج کا انتظار کر رہا ہے۔

دوسرا پہرہ دار:- کنٹن کے بعد حریف ہینکو کا رخ کرے گا۔ خبر آئی ہے کہ دشمن کے طیاروں نے آج تین بار کئی کئی گھنٹے ہینکو پر بمباری کی۔

پہلا پہرہ دار:- اگر ہماری قسمت پلٹی تو ہم لوگ اس کا بدلہ ضرور لیں گے بدنہاد جاپانیوں نے ہمارے ملک میں آگ لگا دی ہے۔ خدا ہمارے چیانگ کو سلامت رکھے۔ ہم لوگ مٹ جائیں گے مگر شکست قبول نہ کریں گے۔

دوسرا پہرہ دار:- کبھی نہیں، آخر کار فتح ہماری ہوگی۔

(فاہیان والی ٹولی بارود لے کر آتی اور سرنگ کے رستہ والے مکان میں داخل ہو جاتی ہے)

دوسرا پہرہ دار:- (چونک کر) یہ گھڑگھڑاہٹ کیسی ہے؟

پہلا پہرہ دار:- جاپانی میکانکی دستہ!

(ایک چینی سپاہی دوڑتا ہوا سڑک کی ایک جانب سے آتا ہے)

نیا سپاہی:- دشمن شہر میں داخل ہو گیا۔

(ایک پہرہ دار دوڑ کر سرنگ والے مکان میں جاتا ہے تاکہ نوجوانوں کو دشمن کی آمد کی اطلاع دیدے کچھ نوجوان آتے ہیں)

دوسرا پہرہ دار:- دشمن شہر میں داخل ہو گیا۔

(سب لوگ تلاش پناہ میں ادھر ادھر چلے گئے ہیں تھوڑے سے وقفہ کے بعد پہلا پہرہ دار مکان سے نکلتا ہے اور اس کے پیچھے حزب دفاع قومی کے نوجوان۔ ان کے نکلتے ہی جاپانی فوج کا ایک دستہ سامنے آنکلتا ہے)

فاہیان:- (حزب دفاع کے نوجوانوں سے) دوستو! وطن کی خاطر آراستہ ہو کر دشمن پر گولیاں چلاؤ---!

(دونوں جانب سے گولیاں چلتی ہیں۔ فریقین کے افراد پٹ پٹ کر رہے ہیں۔ تھوڑی دیر کی لڑائی کے بعد حزب قومی میں سے صرف فاہیان بچ جاتا ہے جاپانی سپاہی ایک ہلہ میں اسے گرفتار کر لیتے ہیں۔ اس پر ہر طرف سے رائفلوں کی نالوں کی مار پڑنے لگتی ہے)

جاپانی افسر:- اسے مارو مت یہاں لاؤ (سپاہی اطاعت حکم کرتے ہیں) اے نوجوان اگر تم مجھے چینی فوج کی نقل و حرکت کی اطلاع بہم پہنچاؤ گے تو میں تمہیں آزاد کر دوں گا۔ اچھا اور یہ تو بتاؤ کہ تم لوگ یہاں کیا کر رہے تھے؟

فاہیان:- (چڑھے ہوئے تیور کے ساتھ) میں کچھ نہیں بتا سکتا۔

افسر:- اگر نہیں بتلاؤ گے تو گولی سے اڑا دیئے جاؤ گے۔ (اپنے سپاہیوں سے) چند سپاہی اس مکان کی اور قریبی مکانوں کی تلاشی لیں (کچھ سپاہی چلے جاتے ہیں) بولو اے نوجوان! مجھے اپنی سازشوں سے آگاہ کرو ورنہ . . . .

فاہیان:- (بات کاٹ کر) ورنہ موت، جو ایک بہادر کے لئے محض کھیل ہے۔ میں اپنے پیارے وطن کی غداری کرنے سے موت کو ہزار بار ترجیح دیتا ہوں۔

افسر:- (سپاہیوں سے) اس بدقسمت شخص کے غرور کو رائفل کے کندوں سے مٹاؤ!

(سپاہی فاہیان کو زدوکوب کرتے ہیں)

فاہیان:۔ جاپانی کتو! خونیں بھیڑیو! فرزندانِ چین بزدل نہیں

(دو سپاہی ایک لڑکی کو پکڑے لئے آتے ہیں)

فاہیان:۔ ای آپا!۔۔۔۔ ای آپا!۔۔۔ پیاری ای آپا!۔۔۔ تم!!

ای آپا:۔ (روتے ہوئے) میرے فاہی! تمہاری آپا تمہیں کینٹن میں تنہا چھوڑ کر نہیں جاسکتی۔

(ای آپا دوڑ کر فاہیان سے بغلگیر ہونا چاہتی ہے۔ مگر جاپانی سپاہی مزاحم ہوتے ہیں)

افسر:۔ فاہیان! اگر تم مجھے حالات اور سازشوں سے آگاہ کردو تو میں تم دونوں کو آزاد کرسکتا ہوں۔

فاہیان:۔ یہ ہرگز نہیں ہو سکتا۔

(سامنے کے مکان سے جاپانی سپاہی واپس آتے ہیں)

افسر:۔ سارے مکان کا جائزہ لے لیا؟

ایک سپاہی:۔ جی ہاں جناب! وہاں کوئی ایسی بات نہیں معلوم ہوئی۔

(فاہیان کے چہرے پر اطمینان کی جھلک پیدا ہوتی ہے)

افسر:۔ فاہیان! میں آخری بار تمہیں موقع دیتا ہوں مجھے اپنے راز بتاؤ!

فاہیان:۔ ہمارے دلوں میں صرف ایک راز ہے، وطن کی محبت! اور یہ تم سے پوشیدہ نہیں۔

افسر:۔ (سپاہیوں سے) اسے گولی سے اڑا دو!

ای آپا: (بے تاب ہو کر زار زار رونے لگتی ہے) خدا کے لئے میرے فاہیان کو چھوڑ دو!

(سپاہی فاہیان کو ایک ستون سے باندھ کر اس کا نشانہ لیتے ہیں۔ اور حکم کے منتظر ہیں)

افسر:۔ اس لڑکی کو دوسری طرف لے جاؤ!۔۔۔۔۔

ای آپا:۔ میرے فاہیان کو چھوڑ دو! افسر ہمارا کوئی راز نہیں۔ (زار زار رو رہی ہے) میرے فاہی کو چھوڑ دو! خدا کیلئے!! تمہیں مہاتما بودھ کا واسطہ!

افسر:۔ اسے لے جاؤ!

(ای آپا بجلی کی سرعت سے سپاہیوں کی گرفت سے آزاد ہو کر ایک سپاہی کی رائفل چھین لیتی ہے اور افسر اور سپاہیوں پر گولیاں چلاتی ہے۔ افسر بچ جاتا ہے۔ دو سپاہی مجروح ہو کر گرتے ہیں۔ سب مل کر ای آپا کو دوبارہ گرفتار کر لیتے ہیں)

افسر:۔ اسے بھی گولی سے اڑا دو!

(سپاہی ای آپا کو دوسرے ستون سے باندھ کر اس کا بھی نشانہ لیتے ہیں۔ فاہیان کے چہرے پر انتہائی کرب کے آثار ہیں فاہیان اور ای آپا ایک دوسرے کو دل دوز نگاہوں سے دیکھتے ہیں)

ای آپا:۔ پیارے فاہی! میرے فاہی!!۔۔۔ میرے فاہی۔۔۔!!!

فاہیان:۔ پیاری آپا!۔۔۔۔۔ میری آپا۔۔۔۔ پیاری آپا!!! میری اور تمہاری محبت اور وطن کی محبت سے مل کر لازوال اور مقدس ہو گئی۔۔۔۔

افسر:۔ فائر!

(سپاہی گولیاں چلاتے ہیں فاہیان اور ای آپا دونوں کی روح پرواز کر جاتی ہے) ——— پردہ!

جناب حکیم آزاد انصاری

غزل

وہ رشکِ گل شریکِ بزمِ نائے و نوش ہوتا ہے　　مقدر شاہدِ مقصد سے ہم آغوش ہوتا ہے
اٹھو پھر دورِ جامِ بادۂ سرجوش ہوتا ہے　　بڑھو پھر شاہدِ شوقِ طرب گلپوش ہوتا ہے
وہ دل جو واقفِ اسرارِ عقل و ہوش ہوتا ہے　　یکے از بندگانِ ساقیٔ مے نوش ہوتا ہے
مرے دل کو اب اُن بیہوشیوں کی جستجوئیں ہیں　　کہ جن بیہوشیوں پر اعتبارِ ہوش ہوتا ہے
جو اس عالم میں نائے و نوش کی قسمت نہیں لاتا　　وہ اُس عالم میں بھی محرومِ نائے و نوش ہوتا ہے
گلستاں پر جب ابرِ کیف ساماں گھر کے آتا ہے　　گلستاں کا گلستاں میکدہ بردوش ہوتا ہے
وہ شغلِ میکشی کے بعد جب بربط اٹھاتے ہیں　　تو پھر کانوں کے رستے سامعہ مے نوش ہوتا ہے
ہجومِ بے خودی کو پھر نویدِ فتح یابی دو　　کوئی پھر عازمِ ترکِ حواس و ہوش ہوتا ہے
کمالِ ہوش پر تھوڑا بہت غرہ بجا لیکن　　کمالِ ہوش آغازِ زوالِ ہوش ہوتا ہے

تم آزادِ زباں آور مجاہد ہو نہیں سکتے
مجاہد تیغ در دست و کفن بردوش ہوتا ہے

جناب سعادت حسن منٹو

ٹیڑھی لکیر

(ایک سٹڈی)

اگر سڑک سیدھی ہو —— بالکل سیدھی تو اس پر اس کے قدم منوں بھاری ہو جاتے تھے۔ وہ کہا کرتا تھا کہ یہ زندگی کے خلاف ہے جو پیچ در پیچ راستوں سے بھری ہوئی ہے۔ جب ہم دونوں باہر سیر کو نکلتے تو اس دوران میں وہ کبھی سیدھے رستے پر نہ چلتا۔ اسے باغ کا وہ کونہ بہت پسند تھا جہاں لہراتی ہوئی روشیں بنی ہوئی تھیں

ایک بار اس نے 'اپنی ٹانگوں کو سینے کے ساتھ جوڑ کر' بڑے دلکش انداز میں' مجھ سے کہا تھا "عباس! اگر مجھے اور کوئی کام نہ ہو تو بخدا میں اپنی ساری زندگی کشمیر کی پہاڑی سڑکوں پر چڑھنے اترنے میں گذار دوں —— کیا پیچ ہیں! —— ابھی تم مجھے نظر آرہے ہو اور ایک موڑ مڑنے کے بعد میری نظروں سے اوجھل ہو جاتے ہو —— کتنی پُراسرار چیز ہے! —— سیدھے راستے پر تم ہر آنے والی چیز کو دیکھ سکتے ہو، مگر یہاں آنے والی چیزیں تمہاری آنکھوں کے سامنے بالکل اچانک آئیں گی —— موت کی طرح اچانک —— اس میں کتنا مزا ہے!"

وہ ایک دبلا پتلا نوجوان تھا بے حد دبلا۔ اس کو ایک نظر دیکھنے سے اکثر اوقات یہ معلوم ہوتا تھا کہ ہسپتال کے کسی بستر پر سے کوئی زرد رُو بیمار اٹھ کر چلا آیا ہے۔ اس کی عمر بمشکل بائیس کے قریب ہوگی مگر بعض اوقات وہ اس سے بہت زیادہ عمر کا معلوم ہوتا تھا اور یہ عجیب بات ہے کہ کبھی کبھی اس کو دیکھ کر میں یہ خیال کرنے لگ جاتا تھا کہ وہ بچہ بن گیا ہے۔ اس میں ایکا ایکی اس قدر تبدیلی ہو جایا کرتی تھی کہ مجھے اپنی نگاہوں کی صحت پر شبہ ہونے لگتا تھا۔

آخری ملاقات سے دس روز پہلے جب وہ مجھے بازار میں ملا تو میں اسے دیکھ کر حیران رہ گیا۔ وہ ہاتھ میں بڑا سیب لئے اسے دانتوں سے کاٹ کر کھا رہا تھا۔ اس کا چہرہ بچوں کے مانند ایک ناقابلِ بیاں خوشی کے باعث تمتمایا ہوا تھا۔ اس کا سارا چہرہ گواہی دے رہا تھا کہ سیب بہت لذیذ ہے۔

سیب کے رس سے بھرے ہوئے ہاتھوں کو بچوں کے مانند اپنی پتلون سے صاف کر کے اس نے میرا ہاتھ بڑے جوش سے دبایا اور کہا۔۔ عبّاس، وہ دو آنے مانگ رہا تھا، مگر میں نے ایسے ایک ہی آنے میں خریدا۔"

اس کے ہونٹ ظفر مندانہ ہنسی کے باعث تھرتھرانے لگ گئے۔ پھر اس نے جیب سے ایک چیز نکالی اور میرے ہاتھ میں دے کر کہا "تم نے لٹو بہت دیکھے ہونگے، پر ایسا لٹو کبھی دیکھنے میں نہ آیا ہوگا —— اوپر کا بٹن دباؤ —— دباؤ۔۔۔۔ ارے دباؤ!"

میں سخت متحیر ہو رہا تھا، لیکن اس نے میری طرف دیکھے بغیر لٹو کا بٹن دبا دیا اور وہ میری ہتھیلی پر سے اچھل کر سڑک پر تھرکنے لگ گیا۔ اس پر خوشی کے مارے میرے دوست نے اچھلنا شروع کر دیا۔

"دیکھو، عباس، دیکھو، اس کا ناچ"

میں نے لٹو کی طرف دیکھا جو میرے سر کے مانند گھوم رہا تھا ہمارے ارد گرد بہت سے آدمی جمع ہو گئے تھے شاید وہ یہ سمجھ رہے تھے کہ میرا دوست دوائیاں بیچے گا۔

"لٹو اٹھاؤ اور چلیں —— لوگ ہمارا تماشا دیکھنے کے لئے جمع ہو رہے ہیں!"

میرے لہجے میں شاید تھوڑی سی تیزی تھی، کیونکہ اسکی ساری خوشی ماند پڑ گئی اور اس کے چہرے کی تمتماہٹ غائب ہو گئی۔ وہ اٹھا

اور اس نے میری طرف کچھ اس انداز سے دیکھا کہ مجھے ایسا معلوم ہوا۔ ایک ننھا سا بچہ رونی صورت بنا کر کہہ رہا ہے، میں نے تو کوئی بُری بات نہیں کی، پھر مجھے کیوں جھڑکا گیا ہے؟

اس نے لٹو وہیں سڑک پر چھوڑ دیا اور میرے ساتھ چل پڑا۔ گھر تک میں نے، اور اس نے کوئی بات نہ کی۔ گلی کے نکڑ کے قریب پہنچ کر میں نے اس کی طرف دیکھا ——— اس قلیل عرصے میں اسکے چہرے پر ایک انقلاب پیدا ہو گیا تھا۔ وہ مجھے ایک تفکر زدہ بوڑھا نظر آیا۔

میں نے پوچھا "کیا سوچ رہے ہو؟"

اس نے جواب دیا "میں یہ سوچ رہا ہوں، اگر خدا کو انسان کی زندگی بسر کرنی پڑ جائے تو کیا ہو؟"

وہ اسی قسم کی بے ڈھنگی چیزیں سوچا کرتا تھا۔ بعض لوگ یہ سمجھتے تھے کہ وہ اپنے آپ کو نرالا ظاہر کرنے کے لئے ایسے خیالات کا اظہار کرتا ہے، مگر یہ بات غلط تھی۔ دراصل اس کی طبیعت کا رجحان ہی ایسی چیزوں کی طرف رہتا تھا جو کسی اور دماغ میں نہیں آتی تھیں۔

آپ یقین نہیں کریں گے۔ مگر اس کو اپنے جسم پر رِستا ہوا زخم بڑا پسند تھا۔ وہ کہا کرتا تھا اگر میرے جسم پر ہمیشہ کے لئے کوئی زخم بن جائے تو کتنا اچھا ہو ——— مجھے درد میں بڑا مزا آتا ہے۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ سکول میں ایک روز اس نے میرے سامنے اپنے بازو کو اُسترے کے تیز بلیڈ سے زخمی کیا، صرف اس لئے کچھ روز اس میں درد ہوتا رہے۔ ٹیکہ اس نے کبھی اس خیال سے نہیں لگوایا تھا کہ اس سے ہیضے، پلیگ یا ملیریا کا خوف نہیں رہتا۔ اسکی ہمیشہ یہ خواہش ہوتی تھی کہ دو تین روز اس کا بدن بخار کے باعث تپتا رہے۔ چنانچہ جب کبھی وہ بخار کو دعوت دیا کرتا تھا تو مجھ سے یہ کہا کرتا تھا "عباس میرے گھر ایک مہمان آنے والا ہے۔ اس لئے تین روز تک مجھے فرصت نہیں ملے گی۔"

ایک روز میں نے اس سے پوچھا کہ تم آئے دن ٹیکہ کیوں لگواتے ہو تو اس نے جواب دیا "عباس، میں تمہیں بتا نہیں سکتا کہ ٹیکہ لگوانے سے جو بخار چڑھتا ہے، اس میں کتنی شاعری ہوتی ہے۔ ——— جب جوڑ جوڑ میں درد ہوتا ہے اور اعضا شکنی ہوتی ہے تو بخدا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تم کسی نہایت ہی ضدی آدمی کو سمجھانے کی کوشش کر رہے ہو ——— اور پھر بخار بڑھ جانے سے جو خواب آتے ہیں، واللہ کس قدر بے ربط ہوتے ہیں ——— بالکل ہماری زندگی کے مانند! ——— ابھی تم یہ دیکھتے ہو کہ تمہاری شادی کسی نہایت ہی حسین عورت سے ہو رہی ہے، دوسرے لمحے یہی عورت تمہاری آغوش میں ایک قوی ہیکل پہلوان بن جاتی ہے۔"

میں اس کی ان عجیب و غریب باتوں کا عادی ہو گیا تھا، لیکن اس کے باوجود ایک روز مجھے اس کے دماغی توازن پر شبہ ہونے لگا۔ گذشتہ مئی میں میں نے اس سے اپنے استاد کا تعارف کرایا، جس کی میں بے حد عزت کرتا تھا۔ ڈاکٹر شاکر نے اس کا ہاتھ بڑی گرمجوشی سے دبایا اور کہا۔

"میں آپ سے مل کر بہت خوش ہوا ہوں"

"اس کے برعکس، مجھے آپ سے مل کر کوئی خوشی نہیں ہوئی"

یہ میرے دوست کا جواب تھا جس نے مجھے بے حد شرمندہ کیا۔ آپ قیاس فرمایئے کہ اس وقت میری کیا حالت ہو گی۔ شرم کے مارے میں اپنے استاد کے سامنے گڑا جا رہا تھا اور وہ بڑے اطمینان سے سگرٹ کے کش لگا کر ہال میں ایک تصویر کی طرف دیکھ رہا تھا۔

ڈاکٹر شاکر نے میرے دوست کی اس حرکت کو بُرا سمجھا اور تخلیئے میں مجھ سے بڑے تیز لہجے میں کہا "معلوم ہوتا ہے کہ تمہارے دوست کا دماغ ٹھکانے نہیں"

میں نے اس کی طرف سے خود معذرت طلب کی اور معاملہ رفع دفع ہو گیا۔ میں واقعی بے حد شرمندہ تھا کہ ڈاکٹر شاکر کو میری وجہ سے ایسا سخت فقرہ سُننا پڑا۔

شام کو میں اپنے دوست کے پاس گیا، اس ارادے کے ساتھ کہ اس سے اچھی طرح باز پُرس کرونگا اور اپنے دل کی بھڑاس نکالونگا۔ وہ مجھے لائبریری کے باہر ملا۔ میں نے چھوٹتے ہی اس سے کہا، "تم نے آج ڈاکٹر شاکر کی بہت بے عزتی کی ——— معلوم ہوتا ہے کہ تم نے مجلسی آداب کو خیر باد کہہ دیا ہے!"

وہ مسکرا دیا "اسے چھوڑو اس قصے کو ——— آؤ، کوئی اور کام کی بات کریں"

یہ سن کر میں اس پر برس پڑا۔ خاموشی سے میری تمام باتیں سن کر اس نے کہا، "لیکن کیا میں جھوٹ بولتا ----- اس سے مل کر مجھے قطعاً خوشی نہ ہوئی۔ اس لئے میں نے اس سے صاف صاف کہہ دیا ----- اگر مجھ سے مل کر کسی شخص کو خوشی حاصل ہوتی ہے تو یہ ضروری نہیں، کہ اس سے مل کر مجھے بھی خوشی حاصل ہو ----- اور پھر پہلی ملاقات پر صرف ہاتھ ملانے سے میں نے اس کے دل میں خوشی پیدا کر دی! ----- یہ میری سمجھ میں نہیں آتا ----- تمہارے ڈاکٹر صاحب نے اس روز پچیس آدمیوں سے تعارف کیا اور ہر شخص سے انہوں نے یہی کہا کہ اس سے مل کر انہیں بڑی مسرت حاصل ہوئی ہے ----- کیا یہ ممکن ہے کہ ہر شخص ایک ہی قسم کے تاثرات پیدا کرے! ----- تم مجھ سے ایسی فضول باتیں نہ کرو ----- آؤ اندر چلیں!"

میں ایک سحر زدہ آدمی کی طرح اس کے ساتھ ہو لیا اور لائبریری کے اندر جا کر اپنا سب غصہ بھول گیا۔ بلکہ یہ سوچنے لگ گیا کہ میرے دوست نے جو کچھ کہا تھا صحیح ہے۔ لیکن فوراً ہی میرے دل میں ایک حسد سا پیدا ہوا کہ اس شخص میں اتنی قوت کیوں ہے کہ وہ اپنے خیالات کا اظہار بے دھڑک کر دیتا ہے! ----- پچھلے دنوں میرے ایک افسر کی دادی مر گئی تھی اور مجھے اس کے سامنے مجبوراً اپنے اوپر غم کی کیفیت طاری کرنی پڑی تھی اور اس سے اپنی مرضی کے خلاف دس پندرہ منٹ تک افسوس ظاہر کرنا پڑا تھا۔ اس کی دادی سے مجھے کوئی دلچسپی نہ تھی، اس کی موت کی خبر نے میرے دل پر کوئی اثر نہ کیا تھا، لیکن اس کے باوجود مجھے نقلی جذبات تیار کرنے پڑتے تھے۔ اس کا صاف مطلب یہ تھا کہ میرا کیرکٹر اپنے دوست کے مقابلے میں بہت کمزور ہے۔ اس خیال ہی نے میرے دل میں حسد کی چنگاری پیدا کی تھی اور میں اپنے حلق میں ایک ناقابل بیان تلخی محسوس کرنے لگ گیا تھا۔ لیکن یہ ایک وقتی اور ہنگامی جذبہ تھا، جو ہوا کے ایک تیز جھونکے کے مانند آیا اور گزر گیا۔ میں بعد میں اس پر نادم بھی ہوا۔

مجھے اس سے بے حد محبت تھی، لیکن اس محبت میں غیر ارادی طور پر کبھی کبھی نفرت کی جھلک بھی نظر آتی تھی۔ ایک روز میں نے اس کی صاف گوئی سے متاثر ہو کر اس سے کہا تھا، "یہ کیا بات ہے کہ بعض اوقات میں تم سے نفرت کرنے لگ جاتا ہوں؟" اور اس نے مجھے یہ جواب دے کر مطمئن کر دیا تھا، "تمہارا دل جو میری محبت سے بھرا ہوا ہے، ایک ہی چیز کو بار بار دیکھ کر کبھی کبھی تنگ آ جاتا ہے اور کسی دوسری شے کی خواہش کرنے لگ جاتا ہے ----- اور پھر اگر تم مجھ سے کبھی کبھی نفرت نہ کرو تو مجھ سے ہمیشہ محبت بھی تو نہیں کر سکتے ----- انسان اسی قسم کی الجھنوں کا مجموعہ ہے۔"

میں اور وہ اپنے وطن سے دور تھے، ایک ایسے بڑے شہر میں جہاں زندگی تاریک قبر سی معلوم ہوتی ہے، مگر اسے کبھی ان گلیوں کی یاد نہ ستاتی تھی، جہاں اس نے اپنا بچپن اور اپنے شباب کا زمانۂ آغاز گزارا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ اسی شہر میں پیدا ہوا ہے۔ میرے چہرے سے ہر شخص یہ معلوم کر سکتا ہے کہ میں غریب الوطن ہوں مگر میرا دوست اپنے جذبات سے یکسر عاری ہے۔ وہ کہا کرتا تھا، وطن کی یاد بہت بڑی کمزوری ہے، ایک جگہ سے خود کو چپک دینا ایسا ہی ہے جیسا ایک آزادی پسند سانڈ کو کھونٹے سے باندھ دیا جائے۔

اس قسم کے خیالات کے مالک کی جو ہر شے کو ٹیڑھی عینک سے دیکھتا ہو اور مروجہ رسوم کے خلاف چلتا ہو، باقاعدہ نکاح خوانی ہو، یعنی پرانے رسوم کے مطابق اس کا عقد عمل میں آئے تو کیا آپ کو تعجب نہ ہوگا! ----- مجھے یقین ہے کہ ضرور ہوگا۔

جب ایک روز شام کو وہ میرے پاس آیا اور اس نے بڑے سنجیدہ انداز میں مجھے اپنے نکاح کی خبر سنائی تو آپ یقین کریں کہ میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ اس حیرت کا باعث یہ چیز نہ تھی کہ وہ شادی کر رہا ہے، نہیں مجھے تعجب اس بات پر تھا کہ اس نے لڑکی کو بغیر دیکھے، پرانے خطوط کے مطابق نکاح کی رسم میں شامل ہونا کیسے قبول کر لیا، جبکہ وہ ہمیشہ ان مولویوں کا مضحکہ اڑایا کرتا تھا جو لڑکی اور لڑکے کو رشتۂ ازدواج میں باندھتے ہیں۔ وہ کہا کرتا تھا، "یہ مولوی مجھے ایسے بڈھے اور گٹھیا کے مارے ہوئے پہلوان معلوم ہوتے ہیں جو اپنے اکھاڑے میں چھوٹے چھوٹے لڑکوں کی کشتیاں دیکھ کر اپنی حرص پوری کرتے ہیں۔"

اور پھر وہ شادی یا نکاح پر لوگوں کے جھگڑے کا بھی تو قائل نہ تھا، مگر ۔ ۔ ۔ ۔ اس کا نکاح پڑھا گیا، میری آنکھوں کے سامنے مولوی

نے ـــــــ اس مولوی نے جس سے اس کو سخت چڑ تھی اور جس کو وہ بوڑھا طوطا کہا کرتا تھا، اس کا نکاح پڑھا، چھوہارے بانٹے گئے اور میں ساری کارروائی کو یوں دیکھتا رہا، گویا سوتے میں کوئی سپنا دیکھ رہا ہوں۔

نکاح ہو گیا، دوسرے لفظوں میں اَن ہونی بات ہو گئی اور جو تعجب مجھے پہلے پیدا ہوا تھا، بعد میں بھی برقرار رہا، مگر میں نے اس کی بابت اپنے دوست سے ذکر نہ کیا، اس خیال سے کہ شاید اسے ناگوار گزرے، لیکن دل ہی دل میں میں اس بات پر بہت خوش تھا کہ آخر کار اُسے اس دائرے میں لوٹنا پڑا جس میں دوسرے زندگی بسر کر رہے ہیں۔

نکاح کر کے میرا دوست اپنے اصولوں کے ٹیڑھے مینار سے بہت بُری طرح پھسلا تھا اور اس گڑھے میں سر کے بل آ گرا تھا جس کو وہ بے حد غلیظ کہا کرتا تھا۔ جب میں نے یہ سوچا تو میرے جی میں آئی کہ اپنے کج رفتار دوست کے پاس جاؤں اور اتنا ہنسوں، اتنا ہنسوں کہ پیٹ میں بَل پڑ جائیں، مگر جس روز میرے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی اسی روز وہ دوپہر کو میرے گھر آیا۔

نکاح کو تین مہینے گزر گئے تھے اور اس دوران میں وہ ہمیشہ اُداس اُداس رہتا تھا، مگر اس وقت وہ بہت تر و تازہ معلوم ہوتا تھا۔ اس کا چہرہ پگھلے ہوئے تانبے کے مانند چمک رہا تھا اور اسکی ناک جو چند روز پہلے بھدی نیام کے اندر چھپی ہوئی تلوار کا نقشہ پیش کرتی تھی، اس کے چہرے پر سب سے زیادہ نمایاں نظر آ رہی تھی۔

وہ میرے کمرے کے اندر داخل ہوا اور سگرٹ سلگا کر میرے پاس بیٹھ گیا۔ اسکے ہونٹوں کے انتہائی کونے کپکپا رہے تھے۔ ظاہر تھا کہ وہ مجھے کوئی بڑی اہم بات سُنانے والا ہے۔ میں ہمہ تن گوش ہو گیا۔

اس نے سگرٹ کے دھوئیں سے چھلّہ بنایا اور اس میں اپنی انگلی گاڑتے ہوئے مجھ سے کہا "عباس میں کل یہاں سے جا رہا ہوں"

"جا رہے ہو؟" میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔

"میں کل یہاں سے جا رہا ہوں، شاید ہمیشہ کے لئے، میں اس خبر سے تمہیں مطلع کرنے کے لئے نہ آتا، مگر مجھے تم سے کچھ روپے لینا ہیں۔ جو تم نے مجھ سے قرض لے رکھے ہیں ـــــ کیا تمہیں یاد ہے؟"

میں نے جواب دیا "یاد ہے، یاد ہے، پر تم جا کہاں رہے ہو؟ . . . . . اور پھر ہمیشہ کے لئے . . . . . ؟"

"بات یہ ہے کہ مجھے اپنی بیوی سے عشق ہو گیا ہے۔ اور کل رات میں اسے بھگا کر اپنے ساتھ لئے جا رہا ہوں . . . . . وہ تیار ہو گئی ہے!"

یہ سن کر مجھے اس قدر حیرت ہوئی کہ میں بے وقوفوں کی مانند ہنسنے لگ گیا اور دیر تک ہنستا رہا۔ وہ اپنی منکوحہ بیوی کو جسے وہ جب چاہتا انگلی پکڑ کر اپنے ساتھ لا سکتا تھا، اغوا کر کے لے جا رہا تھا ـــــ بھگا کر لے جا رہا تھا، جیسے، جیسے . . . . . میں کیا کہوں کہ اس وقت میں نے کیا سوچا . . . . . در اصل میں کچھ سوچنے کے قابل ہی نہ رہا تھا۔

مجھے ہنستا دیکھ کر اس نے ملامت بھری نظروں سے میری طرف دیکھا، "عباس یہ ہنسنے کا موقعہ نہیں، کل رات وہ اپنے مکان کے ساتھ والے باغ میں میرا انتظار کرے گی اور مجھے سفر کے لئے کچھ روپیہ فراہم کر کے اس کے پاس ضرور پہنچنا چاہئے، وہ کیا خیال کرے گی اگر میں اپنے وعدہ پر قائم نہ رہا . . . . . تمہیں کیا معلوم کہ میں نے کن کن مشکلوں کے بعد رسائی حاصل کر کے اس کو اس بات پر آمادہ کیا ہے!"

میں نے پھر ہنسنا چاہا مگر اس کو غایت درجہ سنجیدہ و متین دیکھ کر میری ہنسی دب گئی اور مجھے قطعی طور پر معلوم ہو گیا کہ وہ واقعی اپنی منکوحہ بیوی کو بھگا کر لئے جا رہا تھا۔ کہاں؟ . . . یہ مجھے معلوم نہ تھا۔

میں زیادہ تفصیل میں نہ گیا اور اُسے وہ روپے ادا کر دئے جو میں نے عرصہ ہوا اس سے قرض لئے تھے اور یہ سمجھ کر ابھی تک نہ دیئے تھے کہ وہ نہ لے گا۔ مگر اس نے خاموشی سے نوٹ گن کر اپنی جیب میں ڈالے اور بغیر ہاتھ ملائے رخصت ہونے ہی والا تھا کہ میں نے

گے بڑھ کر اس سے کہا "تم جا رہے ہو .... لیکن مجھے بھلا
نہ دینا!"

میری آنکھوں میں آنسو آگئے، مگر اس کی آنکھیں
الکل خشک تھیں۔

"میں کوشش کروں گا" یہ کہہ کر وہ چلا گیا اور میں بہت
ل جہاں کھڑا تھا، بت بنا رہا۔

جب ادھر اس کے سسرال والوں کو پتہ چلا کہ ان کی لڑکی
ات رات میں کہیں غائب ہو گئی ہے تو ایک ہیجان برپا ہو گیا۔ ایک
فتے تک انہوں نے اسے اِدھر اُدھر تلاش کیا اور کسی کو اس واقعے
ی خبر تک نہ ہونے دی، مگر بعد میں لڑکی کے بھائی کو میرے پاس
ا پڑا اور مجھے اپنا ہم راز بنا کر اسے ساری رام کہانی سنانی پڑی۔

وہ بے چارے یہ خیال کر رہے تھے کہ لڑکی کسی اور آدمی کیساتھ
اگ گئی ہے اور لڑکی کا بھائی میرے پاس اس غرض سے آیا تھا کہ
ں ان کی طرف سے اپنے دوست کو اس تلخ واقعے سے آگاہ کروں
ہ بیچارا شرم کے مارے زمین میں گڑا جا رہا تھا۔

جب میں نے اس کو اصل واقعہ سے آگاہ کیا تو حیرت کے
باعث اس کی آنکھیں کھلی رہ گئیں۔ اس بات سے تو اسے بہت
ڈھارس ہوئی کہ اس کی بہن کسی غیر مرد کے پاس نہیں بلکہ اپنے
شوہر کے پاس ہے، لیکن اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میرے دوست
نے یہ فضول اور نازیبا حرکت کیوں کی۔

"بیوی اُسی کی تھی، وہ جب چاہتا اُسے لے جاتا۔ مگر
اُس کی اس حرکت سے یہ معلوم ہوتا ہے، جیسے .....
جیسے ....."

وہ کوئی مثال پیش نہ کر سکا۔ اور میں بھی اس کو کوئی
اطمینان دہ جواب نہ دے سکا۔

کل صبح کی ڈاک سے مجھے اس کا خط ملا، جس کو میں
نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے کھولا۔ لفافے میں ایک کاغذ تھا
جس پر ایک ٹیڑھی لکیر کھینچی ہوئی تھی ——— خالی لفافہ
ایک طرف رکھ کر میں اس عمود کی طرف دیکھنے لگ گیا جو
میں نے بورڈ پر جھکے ہوئے کاغذ پر گرایا تھا۔

× × × × × × × ×

جناب گوپال متل

بیتابی

کیا کہوں اے جانِ محبوبی کہ کیوں بیتاب ہوں | کس لئے حالانکہ تیرے پاس ہوں بیتاب ہوں
میں سمجھتا ہوں مجھے ہے راحت ترے آغوش میں | دل مرا دھڑکا ہے اک مدت ترے آغوش میں
دلربائی سے تری انکار ہو سکتا نہیں | تیرے احسانات کا اظہار ہو سکتا نہیں
تیرا لطفِ خاص جینے کا سہارا ہے مجھے | تیرے دم سے زیست کی تلخی گوارا ہے مجھے
ہے فقط دم سے ترے سوز و گدازِ زندگی | تیرا اعجازِ وفا ہے نغمہ پیرائی مری

تیرے الطاف و کرم پر جان و دل صدقے مگر
کیا کروں میری حقائق پر بھی رہتی ہے نظر

مے بھی ہے آنکھوں میں تیری اذنِ مدہوشی بھی ہے | اور مجھ کو آرزوئے خود فراموشی بھی ہے
چاہتا ہوں دیکھ کر اس روئے دلآرام کو | بھول جاؤں اس جہانِ تیرہ کے آلام کو
روح کر دوں تیرے بوسوں کی حلاوت میں حلول | تلخیٔ ایام سے ہونے نہ دوں دل کو ملول

آہ لیکن بر نہیں آتی مرے دل کی مراد
جذبۂ غیرت کو کہہ سکتا نہیں میں خیر باد

ننگِ محکومی کو خاموشی سے سہ سکتا ہے کون　　مرد ہو کر ٹھوکروں کی زد پہ رہ سکتا ہے کون
لٹ رہا ہو جب وطن کی آبروؤں کا سہاگ　　کون گا سکتا ہے پیاری عشرت و مستی کے راگ
بزدلی کا داغ ماتھے پر لگا سکتا ہے کون　　ظلم سہ کر عافیت کی تان اڑا سکتا ہے کون

دلبری تیری مسلّم عشق میرا لازوال
غم ہی کچھ ایسے ہیں جن کو بھول جانا ہے محال

گونجتی ہے ہم نفس! کانوں میں اکثر ناگہاں　　بھوک سے ماری ہوئی مخلوق کی آہ و فغاں
نالۂ مزدور کی مدہم سی آتی ہے صدا　　اور ہو جاتا ہے اک محشر مرے دل میں بپا
کیا کہوں ہوتا ہے کیا عالم مرے احساس کا　　دیکھ کر فاقہ زدہ انساں کا منہ اترا ہوا
اور پھر ذاتی مصائب کا ہجوم بے شمار　　دامنِ صبر و سکوں کیوں ہو نہ جائے تار تار
یہ مصائب کر ہی دیتے ہیں سکونِ دل تباہ　　چھوڑ جاتے ہیں لطیف احساس تنہا مجھ کو آہ
بادۂ عشرت کا گر پڑتا ہے ہاتھوں سے سبو　　کھنچ کے آ جاتا ہے آنکھوں میں مرے دل کا لہو
آنچ سی محسوس کرتے ہیں مرے قلب و جگر　　قبضہ پا لیتی ہے اک وحشت مرے اعصاب پر

ہاتھ بڑھتے ہیں جنوں میں تختِ شاہی کی طرف
تختِ شاہی کیا ہے اکثر عرش و کرسی کی طرف

جناب ابو سعید قریشی

سڑک

سڑک شہر سے دریا کی طرف جاتی تھی۔ ہر صبح لوگ اس طرف سیر اور اشنان کی خاطر جاتے اور اسی طرح آنے جانے والوں کا ایک تانتا بندھ جاتا۔ زندگی کی اس بہتی ہوئی ندی میں امیر غریب سب دوش بدوش جا رہے ہوتے۔ امیر ندی کے پوتر پانی سے اپنے پاپ دھونے اور غریب۔۔ غریب نہ جانے کیوں۔۔۔ شاید ندی کے پانی سے یہ کہنے کہ ان کا انتظار کرے۔

عجیب عجیب شکل اور عجیب عجیب ہیئت کے لوگ نظر آتے۔۔۔ موٹے موٹے توندیل ساہوکار۔۔۔ بانہہ پر ٹاٹ کا تھیلا اور منہ میں مسواک اور زنار کان پر لپٹا ہوا۔ ان کی آنکھیں شاید بہت رات گئے تک روپیہ گنتے رہنے کی وجہ سے سوجی ہوتیں۔

کہیں کوئی پنڈت جی چندن کا ٹیکا لگائے رام رام جپتے چلے آتے اور کہیں کوئی مولوی صاحب یا رحیم یا کریم کی رٹ لگاتے اپنی خضاب آلود داڑھی پر ہاتھ پھیرتے آ دھمکتے۔۔۔ یہ عمر اور خضاب میں سوچتا چوتھی شرط پوری ہوئی ہے۔

استے میں کوئی امیرزادہ شب خوابی کا لباس پہنے، سگرٹ کے کش لگاتا، نازک سی چھڑی گھماتا راگیروں پر چھچلتی ہوئی نگاہیں ڈالتا نکل جاتا۔ یہی ہمارے ملک کی امیدیں ہیں؟ میں سوچتا: کیا یہ لوگ کبھی تلوار بھی اٹھا سکیں گے؟

اور پھر کبھی کوئی مغرب زدہ گھوڑے کی گری ہوئی نعل گڈلک سمجھ کر جیب میں ڈال لیتا اور کسی کے آوازہ کسنے پر کھسیانا ہو منہ میں بڑبڑاتا اپنی راہ لیتا۔

کہیں کوئی عورتوں کی ٹولی آ رہی ہوتی۔۔۔ کسی کے جہیز کا ذکر کسی کے رشتے نہ ملنے کا جھگڑا۔ کوئی اپنی ساتھ والی کو۔۔۔ کہنی مار کر کسی کی ساڑھی دکھاتی، کوئی کسی کا زیور۔۔ یا کسی کے مرنے کا افسوس اور کسی کے جنم کی خوشی۔۔۔ ماشاء اللہ کتنے کام ہیں ہندی مستورات کو، بھلا ان کے فرزند کیوں نہ اپنی جنم بھومی کے لئے کٹ مریں گے۔!!! ـــــ اور پھر کہیں مغرب کی تقلید میں کٹے ہوئے بال گاؤن اور سائیکل نظر آتے اور بے اختیار میرے دل میں کہ کاش میں کارٹونسٹ ہوتا۔۔۔۔ اناج سے لدے ہوئے چھکڑوں کے آگے فرزند جتے ہوئے نظر آتے وہ اناج جس کا شاید ایک دانہ بھی ان کے نصیب میں نہ ہوتا۔

امرا کی موٹریں دھوئیں اور گرد کے بادل چھوڑتی ہوئی نکل جاتیں۔۔۔ تانگے والوں کی بچو بچو! اور سائیکلوں کی ٹن ٹن!۔۔۔ اور پھر وہ ان مسلح لاریوں کے لشکر جو کہیں تہذیب پھیلانے جا رہی ہوتیں اور جنہیں دیکھتے ہی بے اختیار میرے منہ سے نکل جاتا۔ ع

ابلیس کو یورپ کی مشینوں کا سہارا

طفلان مکتب بستے بغل میں دبائے غلامی کا سبق لینے جا رہے ہوتے۔ کارخانوں کے سامنے گرسنہ شکم مزدور اترے ہوئے چہرے لئے پھٹے پرانے کپڑے پہنے اس بات کا انتظار کر رہے ہوتے کہ کب ٹکٹ ملے اور کب وہ اندر جائیں ان کے چہروں سے خوف و ہراس ٹپک رہا ہوتا۔ ان کی آنکھوں میں خلا ہوتا۔ وہ دیکھ رہے ہوتے، نہ جانے کہاں؟ ـــــ سر۔۔ رام اپاہج آشرم کے باہر کوڑھی اپنے زخم جن پر مکھیاں بھنبھنا رہی ہوتیں راگیروں کو دکھا دکھا کر بھیک مانگ رہے ہوتے اور اسلامیہ یتیم خانہ کے سامنے ننگے دھڑنگے بچے مٹی میں لت پت ایک دوسرے کو گالی گلوچ دے رہے ہوتے۔

ہدررو کے پل پر اندھے بھکاری ہاتھ بڑھا بڑھا کر روٹی کیلئے پیسہ طلب کر رہے ہوتے اور کوئی دھن وان انسانوں کی طرف سے بے پروا ہو کر کتوں کے سامنے روٹیاں پھینکتا چلا جاتا۔ تھوڑا اور آگے جا کر بھکارن سوکھی ہوئی چھاتیاں باہر نکالتے اپنے ولہا کی خیرات اس بھکاری کو بھی کچھ دیتے جا کی صدا لگاتیں اور رحمدل مائیں چیونٹیوں کے بلوں میں چاول ڈالتی نکل جاتیں۔

اور پل اتر کر لیڈی۔۔۔ ٹیرنٹی ہاسپٹل کے اندر نئی زندگیاں پردۂ ظہور میں آ رہی ہوتیں۔

جناب نذیر میرزا برلاس، بی اے (آنرز)

شاعر کی دُنیا

میری دُنیا حسین دنیا ہے

جس میں سورج ہے چاند تارے ہیں — روز و شب حسن کے نظارے ہیں
شب کی محفل سجی ہے تاروں سے — جی بہلتا ہے ماہ پاروں سے!
رات کو تارے جگمگاتے ہیں — خود بخود گیت یاد آتے ہیں
کرنیں بھرتی ہیں روپ پریوں کا — نورِ انجم ہے حسن کا دریا
ہیں شعاؤں میں بجلیاں رقصاں — امڈ آتے ہیں نور کے طوفاں
لالہ زاروں میں پھول نکھرے ہیں — آبشاروں میں گیت بکھرے ہیں
موجیں انگڑائی لے کے چلتی ہیں — لہریں بہتے ہوئے مچلتی ہیں
مسکراہٹ میں بجلیاں پنہاں — دل کی بربادیوں کے ہیں ساماں
ہر طرف حسن ہے جوانی ہے — کامرانی ہے شادمانی ہے

میری دنیا حسین دنیا ہے

میری دنیا ہے کیف کی دنیا

اودی اودی گھٹاؤں کی دنیا — ٹھنڈی ٹھنڈی ہواؤں کی دنیا
بہکی بہکی فضائیں ہیں جس کی — مہکی مہکی ہوائیں ہیں جس کی
بھیگی بھیگی ہیں چاندنی راتیں — شعر، نغمہ، شراب کی راتیں
بدلیوں کے لرزتے سائے ہیں — جیسے فردوسی خواب چھائے ہیں
ہر طرف ہو رہی ہے مینوشی — ہر طرف چھا رہی ہے مدہوشی
ہر سو جامِ شراب چلتے ہیں — خم و ساغر میں خواب ڈھلتے ہیں
سر میں شوریدگی مچلتی ہے — دل میں آتشِ نوائی پلتی ہے!
جام میں خواب ڈھالے جاتے ہیں — مے سے جذبات پالے جاتے ہیں
جام پیتے ہیں سانس لیتے ہیں — زندگی کو فریب دیتے ہیں
مغبچے ہیں شراب خانے ہیں — رقص ہیں گیت ہیں ترانے ہیں

میری دنیا ہے کیف کی دنیا

جناب صادق الخیری صاحب ایم اے

دیدۂ تر

سلیمہ اپنے ایام عروس میں قابلِ رشک لڑکی تھی۔ خوبصورت، چنچل، ہنس مکھ، تعلیم یافتہ۔ بھلا اس سے زیادہ کوئی شوہر اور کیا چاہ سکتا ہے؟ لیکن اس کی خوشی کی گھڑیاں مختصر تھیں۔ ساس کے بعد سسرال والے اس کی قدر نہیں کر سکے۔ کچھ اس لئے کہ نند بھاوجوں نے اس سے غلط توقعات قائم کیں اور کچھ اس لئے کہ عمر خاں افزائش نسل کے شوقین اور لڑکے کے متمنی تھے۔ دس سال تک وہ اس سعادت سے محروم رہے۔ اس عرصے میں جوں جوں وقت گذرتا رہا انکے حسنِ سلوک میں کمی اور برہمئ مزاج میں اضافہ ہوتا رہا۔ پہلے ان میں خلقِ انسانیت تھی لیکن انقطاعِ نسل کا خوف ان کو بلندی سے پستی کی طرف لے جا رہا تھا۔ وہ چاندنی راتیں جب پائیں باغ میں مرمریں حوض کے کنارے سلیمہ اور عمر پہلو بہ پہلو رنگ برنگی مچھلیوں کو محوِ اختلاط دیکھتے، وہ کیف بار گھڑیاں جب دونوں دنیوی جھنجھٹوں کو بھول کر ایک دوسری کی پرستش کرتے، اب عہدِ گذشتہ میں دفن ہو کر رہ گئی تھیں۔ آدم و حوا جنت سے نکالے جا چکے تھے۔ شباب کا کنول مرجھا چکا تھا۔ اور تطویلِ زمانہ نے ان کی مسرتوں پر اوس ڈال دی تھی۔

آخر دریائے کرم جوش میں آیا اور وہ جو سب کا نگہبان ہے اس نے سلیمہ کی مسلسل گریہ و زاری سن لی اور جب اس کو منظور ہو گیا تو اسکے پاؤں بھاری ہونے میں کیا دیر تھی۔ اسکے عنقریب ماں بننے کے آثار ظاہر ہونے لگے۔ ایک آزاد روح قفسِ عنصری میں قید کر دی گئی اور سلیمہ کی ناامیدی پر امید نے ملمع کر دیا۔ عمر خاں کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ رہا۔

حقیقتاً اس کی سرشت میں شرافت تھی، اسلئے باوجود اسکے کہ گھر والے نکاح ثانی کے لئے شد و مد کے ساتھ اصرار کر رہے تھے، وہ دوسری شادی پر آمادہ نہ ہوئے۔ اگرچہ وہ خود اولاد کی طرف سے مایوس تھے اور سلیمہ ان کی نظروں سے گر چکی تھی۔ پھر بھی زندگی کی کٹھن راہ میں ان کے پیر نہ ڈگمگائے اور نجابت و بلند خیالی کا دامن انکے ہاتھ سے نہ چھوٹا۔ اور اب تو دعاؤں کو قبول کرنے والا ان پر مہربان ہو گیا تھا۔ اس لئے وہی خونخوار عمر خاں جن کی سرخ سرخ خشمناک آنکھیں سلیمہ کا دل دہلائے دیتی تھیں، پھر اپنی رفیقِ حیات کو محبت بھری نظروں سے دیکھنے لگے۔ اب اسے دونوں وقت ملتے آٹھ آٹھ آنسو بہانے، آدھی آدھی رات کو خدائے عزوجل کی بارگاہ میں گڑگڑانے اور شوہر کے غصے سے کانپ اٹھنے کی ضرورت نہ تھی۔ مسرت و انبساط نے پھر اس کو ایک بار اپنی آغوش میں لے لیا اور وہ لب و رخسار جن پر ہر دم موت کی سی زردی کھنڈی رہتی تھی اب ان میں پھر تازگی و شادابی کی لہریں بل کھانے لگیں۔

رات کی تنہائی میں نیند سے کچھ دیر پہلے وہ دونوں چپکے چپکے سرگوشیاں کر رہے تھے۔ فضائے بسیط پر خاموشی مسلط تھی۔ گاہے گاہے شاخِ بلوط پر بیٹھا ہوا بلبل ہزار داستان اپنی نغمہ سنجی سے دلمیں چٹکی سی لے لیتا تھا۔ سلیمہ نیم وا آنکھوں سے سامنے دیکھنے لگی۔ اس کے خیالات بھٹکے ہوئے تھے۔ کبھی وہ کچھ سوچنے لگتی۔ کبھی خالی الذہن ہو جاتی، اور کچھ دیر ٹھیر کر پھر سوچنے لگتی۔ عمر اور آگے بڑھ آیا اور اسکی گردن میں ہاتھ حمائل کر کے کہنے لگا۔ . . . . "سنو! ایک دفعہ میں نے خدا سے دعا مانگی "پروردگار! مجھے صاحبِ اولاد بنا۔ اس نے میری دعا قبول کر لی۔ خدا کتنا رحیم ہے! . . . . . اور سلیمہ! جب تمہارے ہاں لڑکا پیدا ہو گا تو اسوقت میری خوشی کا اندازہ کون کر سکتا ہے؟" سلیمہ کسی مخفی خوف سے لرز گئی اور اس پر ایسا ہراس طاری ہوا کہ وہ پیدائش کا نام سنکر شرما بھی نہ سکی۔ اس نے ایسا محسوس کیا کہ کوئی دھیمی، بہت دھیمی آواز میں اس سے ڈر ڈر کر کہہ رہا ہے ___ کہہ رہا ہے کہ "شاید ایسا نہ ہو"

(۲)

عمر خاں کو انتظار کی گھڑیاں بڑی کٹھن معلوم ہو رہی تھیں کبھی وہ اٹھ کر برآمدے میں ٹہلنے لگتے تگران کا کوئی پھیرا مکمل نہ ہوتا کبھی وہ ایکا ایکی پتھر کی سرد چوکی پر بیٹھ جاتے مگر اضطراب انہیں سکون نہ لینے دیتا کبھی کنکر کی روس پر پھاٹک تک چلے جاتے اور پھر سرخ سنگریزوں کو ٹھوکریں مارتے چلے آتے۔ انکا دماغ خیالات کے بے پناہ ہجوم کی آماجگاہ بنا ہوا تھا وہ سوچ رہے تھے۔ کوئی دم میں شور مچنے والا ہے کہ خدا نے مجھے بیٹا دیا۔ وہ میری زندگی کا سہارا ہوگا اور میں اس کی پرورش میں اپنا تن من دھن سب کچھ لٹا دونگا جب اس کی ماں کی گود ہری بھری ہو جائے گی تو پھر کوئی اس کی طرف آنکھ اٹھا کر نہ دیکھ سکے گا۔ آہ! میں نے بچاری پر کیسی کیسی زیادتیاں کی ہیں۔ اب اس کے آنسوؤں کا پونچھنے والا آ تا ہی ہوگا پھر کوئی اس پر ظلم نہ توڑ سکے گا۔ جب میں بوڑھا ہو جاؤنگا۔ تو وہ جوان ہوگا۔ پھر ہم اس کی شادی کر دیں گے۔ اور میرا نام کئی پشتیں گذرنے پر بھی زندہ رہیگا

عمر خاں سے ضبط نہ ہو سکا۔ وہ تیزی سے قدم اٹھا کر دروازے کے پاس آئے۔ اندر سے نوزائیدہ بچے کے رونے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ وہ چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا: "اے میرے رب! تو نے مجھے اس دارالمحن میں کیوں بھیجا ہے؟ دنیا مجھے راس نہ آئے گی۔ تو مجھے تو اپنے ہی پاس بلا لے جہاں دکھ ہے نہ فکر۔" لیکن کوئی اس کی بات نہ سمجھ سکا۔ عمر خاں کی آنکھوں میں چمک پیدا ہو گئی۔ وہ دل ہی دل میں خوش ہونے لگے۔ مدتوں بعد زندگی کے افق سے امید وارماں کا چاند طلوع ہو رہا تھا۔ مگر ان کو اس بات پر بڑا غصہ آیا کہ اندر سے میرے پاس کوئی نہیں آیا۔ کسی نے آکر مبارکباد نہیں دی۔ کوئی مسرت سے پاگل تو نہیں ہوا۔ اتنے میں دروازہ آہستہ سے کھلا اور بڑی بھاوج منہ بنائے ناک سکیڑے باہر نکلیں۔ عمر خاں کو اسطرح بیتاب دیکھ کر انہیں بہت ناگوار گذرا گویا آنکھوں ہی آنکھوں میں کہہ رہی ہیں "تم یہاں کیوں آئے؟" اور پھر دوسری طرف رخ پھیر کر یہ کہتی ہوئی چلی گئیں "لڑکی ہوئی ہے۔"

عمر خاں کے دل پر جیسے کسی نے گھونسہ مارا ہو۔ انکے سب کس بل نکل گئے۔ ان کا تنا ہوا سینہ اور کھنچی ہوئی کمر ڈھیلی پڑ گئی۔ چہرے کی سطح پر خوشی کے نقوش فکر و تردد کی سلوٹوں میں بھولے ہوئے خواب کی طرح معدوم ہو گئے۔ کھلی ہوئی باچھیں سکڑ آئیں اور وہ آہستہ آہستہ چپ چاپ الٹے قدم باہر لوٹے۔ انکی رفتار میں اب بے چینی اور تیزی نہیں تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی ان کے کانوں میں سیسہ پگھلا کر ڈال رہا ہے۔ دور سے سن سن کی آوازیں آ رہی تھیں اور وہ ان گنت قسم کے خیالات میں کھوئے ہوئے چلے جا رہے تھے۔ کبھی وہ اپنے دل کو حلق میں دھڑکتا ہوا محسوس کرتے، کبھی ان کو یہ معلوم ہوتا کہ دل بیٹھا جا رہا ہے۔ پھاٹک کے آگے لانبے لانبے درخت اجاڑ پڑے تھے، اور خاموش سڑک پر ہیبتناک فضا منڈلا رہی تھی۔ وہ کیکر کے نیچے سرنگوں ہو کر بیٹھ گئے اور استغراق نے انہیں دنیا و مافیہا سے غافل کر دیا۔

انہیں سلیمہ اور بچی کی کوئی پروا نہیں تھی۔ غم واندوہ میں گھرے ہوئے وہ اپنی ہستی کو بھول گئے تھے۔ سرکش و بے ادب انسان اپنے پیدا کرنے والے سے جھگڑ رہا تھا۔ اس پاگل کی طرح جو اپنے آپ سے بے ربط ولایعنی گفتگو کئے چلا جاتا ہے وہ دانت پیس پیس کر کہہ رہے تھے . . .

. . . "تو مجھ سے مذاق کر رہا ہے؟ کیا تیرے تمسخر کیلئے میں ہی رہ گیا تھا؟ دس سال تک میں نے تیری عبادت کی مدتوں کو اٹھا اٹھا کر تجھ سے دعا مانگی۔ ایک چیز کی۔ صرف ایک چیز کی کہ تو مجھے ایک بیٹا دیدے۔ تو نے مجھ سے میرے ماں باپ چھین لئے اور میں نے یہ کہکر صبر کیا کہ تو مالک ہے۔ پھر بھی تو نے مجھ پر رحم نہیں کیا۔ وہ قرآن کے الفاظ جو تجھکو سب سے زیادہ رحمدل بتاتے ہیں بے معنی نہیں تو اور کیا ہیں؟ بجائے بیٹا دینے کے تو نے مجھ پر یہ مصیبت نازل کی! پھر بھی تو کہتا ہے کہ ہم انسان کو نعمتیں دیتے ہیں! اگر یہی نعمت ہے تو لے لے، اپنی نعمت واپس لے لے۔ مجھے اب تیری بھی ضرورت نہیں۔" عمر خاں کا دل غصے سے لبریز ہو گیا اور وہ غلط سلط تاویلیں کرتے ہوئے سلیمہ پر برس پڑے "وہ تو بانجھ ہے۔

میں نے اتنی دوائیں کھائیں تب جا کر وہ ماں بنی لیکن اب معلوم ہوا کہ وہ لڑکا پیدا ہی کرنیکے ناقابل ہے۔"

عمر خاں سلیمہ کی طرف سے یکسر متنفر ہو گئے۔ انکی گذشتہ

بے رُخی اور سنگدلی پھر کے سے عود کر آئی۔ بات بات پر بگڑنا اور قدم قدم پر برہم ہونا ان کا ہر روز کا وطیرہ ہو گیا۔ تحکمانہ لہجے میں ڈھلے ہوئے سخت الفاظ نے میٹھے بولوں کی جگہ لے لی اور گھر والے عمر خاں کی اس بیزاری سے اطمینان محسوس کرنے لگے۔ سلیمہ لبوں پر مہر خاموشی لگائے ڈیڑھ دو سال تک سب کچھ برداشت کرتی رہی۔ اس کے دل میں بار ہا باغیانہ خیالات پیدا ہوئے، جنہوں نے اسے اپنی تذلیل کا انتقام لینے پر ابھارا لیکن وہ ہمیشہ یہ سوچ کر "ہم اپنے بزرگوں پر آنچ نہ آنے دینگے" ہتھیار ڈال دیتی تھی۔ دن ڈھلے اس نے باپ کی تشویشناک علالت کا حال سُنا۔ عمر خاں سیر کو گئے ہوئے تھے۔ وہ کوٹھے پر سے نیچے اُئی کہ نند بھاوجوں سے اجازت لیکر چلی جائے مگر کمرہ بند تھا۔ اور اندر سے آہستہ آہستہ باتوں کی آوازیں آرہی تھیں۔ اس نے دروازہ پر دستک دی لیکن کسی نے جواب نہ دیا بلکہ بدستور باتیں ہوتی رہیں مغرب کے وقت جب اسکے پاس یہ پیغام پہنچا کہ باپ کوئی دم کا مہمان ہے تو اس سے نہ رہا گیا اور وہ بچی کو لے کر ڈرتی ڈرتی ڈولی میں بیٹھ گئی۔

عمر خاں نے واپسی پر سنا کہ بیوی میکے چلی گئی ہیں تو غصے میں لال پیلے ہو گئے۔ نند بھاوجوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ ان کی سازش کامیاب ہو رہی تھی۔ جب پہلی بار آدمی یہ کہنے آیا تھا کہ سلیمہ کے باپ کی حالت اچھی نہیں ہے۔ تو اس وقت سے وہ کمرے میں سر جوڑ کر باتیں کرنے بیٹھ گئی تھیں۔ ایک بہانہ ان کے ہاتھ آرہا تھا۔ اسی کے سہارے وہ عمر خاں کو سلیمہ کے خلاف بڑی سے بڑی کارروائی کرنے پر آمادہ کرنا چاہتی تھیں۔ بہن نے تیوری پر بل ڈال کر کہا "ابھی تو گھر میں ان سے بڑے موجود ہیں! ان کو اجازت لیکر یہاں سے جانا چاہیئے تھا۔ عمر کے چہرے پر رنگ تبدیل ہو رہے تھے۔ بڑی بھاوج کو اچھا موقع مل گیا! وہ ان کو تسکین دیتی ہوئی بولیں "تم کیوں خواہ مخواہ خون جلاتے ہو وہ جیسا کریں گی ویسا بھگتیں گی"

دوسری بہن نے اور تتمہ دی "نہ جانے انہوں نے کیا دل میں ٹھانی ہے۔ کئی دن سے انکے طور اچھے نہیں تھے"

عمر خاں کھڑے ہو گئے۔ کچھ دیر ٹہلتے رہے۔ پھر اوپر کمرے میں جا کر گرجدار آواز میں ملازم بُلایا اور ایک خط لکھ کر سلیمہ کے بھائی کے پاس بھیج دیا۔

(۳)

پچھلا پہر، ہُو کا عالم، سنسان فضا، گھڑیال نے چار بجائے پے در پے آوازوں سے عمر خاں اٹھ بیٹھے، اور آنکھیں ملتے ہوئے باہر آئے۔

"کون ہے؟" انہوں نے نیند کی آواز میں کہا۔

"بھائی صاحب! میں ہوں، خالد" نو وارد نے رنج میں ڈوبے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ عمر نے روشنی کر دی۔ خالد اندر آگیا اس کی آنکھوں میں اُداسی چھائی ہوئی تھی۔ اور چہرے سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ کسی ساحر کا معمول ہے جو اس کی جان سلب کئے جا رہا ہے۔ عمر خاں نے پہلو بدلتے ہوئے طنزاً کہا "کیسی گذار ی ہے؟" خالد نے کوئی جواب نہ دیا۔

"ایسے بے وقت کیسے آنا ہوا؟" عمر نے ذرا سختی سے پوچھا۔

"بھائی صاحب، گفتگو ذرا طویل ہے۔ لیکن اب آپ کو سب کچھ سن لینا پڑیگا" خالد کی آواز کانپ گئی۔ بہنوئی خاموش بیٹھے رہے۔ اس نے پھر کہنا شروع کیا "آپ کا خط پڑھکر جی میں تو یہ آئی کہ اپنا یا آپ کا خاتمہ کر دوں مگر مجبور تھا کہ ابا جان کی موت نے اس کی مہلت نہیں دی"

"ہیں! ابا جان کا انتقال ہو گیا!" عمر خاں حیرت میں بول اٹھے۔

"جی ہاں! اسی شب انکا انتقال ہو گیا۔ آپ دورے پر گئے ہوئے تھے آپ نے اس چھ ماہ میں پلٹ کر خبر تک نہ لی اور شاید اسکی ضرورت بھی نہ تھی۔ آپ تو اپنی طرف سے تمام تعلقات ختم کر چکے ہیں لیکن ——— ایک تعلق ابھی باقی رہتا ہے"

خالد کے پہلی بار جواب نہ دینے سے عمر خاں کو پٹھانی غصہ آچلا تھا۔ مگر خسر کے انتقال کا سنکر وہ دھیمے پڑ گئے۔ خالد بولے گیا "میں آپکے اس فقرے کا مطلب نہ سمجھ سکا کہ "سلیمہ کو اب یہاں آنیکی ضرورت نہیں۔ وہ اب اپنے ہی گھر رہیں۔ بھائی صاحب! ہم لوگ غریب ہیں لیکن بے غیرت نہیں۔ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ آپ کا وہ خط پڑھنے کے بعد ہم لوگ آپ کی

طرف رخ کر سکتے تھے ؟ ہاں، وہ جو آپ نے لکھا تھا کہ "کوئی شریف آدمی یہ برداشت نہیں کر سکتا کہ اسکی بیوی بغیر کچھ کہے سنے اپنے گھر چلی جائے۔ تو یہ سراسر آپ کی غلط فہمی ہے۔ موقع موقع میں فرق ہوتا ہے۔ کیا وہ عورت جس کا باپ بستر مرگ پر پڑا ہو، جو بارہ سال کی بیاہت ہو اور ایک بچی کی ماں ہو اتنا حق بھی نہیں رکھتی کہ اگر گھر میں کوئی کہنے سننے کیلئے نہ ہو تو وہ اپنے مرتے ہوئے باپ کو جاکر آخری دفعہ دیکھ لے۔ اور وہ تو بھائی جان سے پوچھنے نیچے آئی تھیں مگر سب اندر کے کمرے میں تھے۔ خوب بھائی صاحب! آپ نے فیصلہ تو بڑا اچھا کیا! ادھر ابا جان نے دم توڑا، اُدھر آپ کا خط پہنچا، آپ سمجھ سکتے ہیں اس وقت ہم پر کیا کچھ بیت گئی ہوگی ؟"

عمر خاں کی پیشانی پر عرقِ انفعال چمکنے لگا اور وہ گردن جھکائے خاموش بیٹھے رہے۔ خالد نے شکستہ آواز میں پھر کہا" اس بیچاری کا میکہ ہی کیا۔ ایک باپ تھا وہ رخصت ہو گیا۔ رہ گئے بھائی بھاوج سو وہ مفلس ہیں۔ آپا کا میکہ تو یہی ہے جہاں آپ نے ان کے آنے کی ممانعت کر دی۔ یہ آپ جانتے ہیں کہ انفراغ تعلیم کے بعد میں آج تک بے روزگار ہوں اور ابا جان کے جانے کے بعد تو ہم دو دو دانوں کے محتاج ہو گئے ہیں۔ سلمیٰ آپ کے لئے تڑپ تڑپ کر بیمار پڑ گئی اور آج مر کر ہی اس نے اپنی ماں کا سینہ چھوڑا۔"

عمر خاں کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ بیٹی کی موت کی خبر ان کے خرمنِ ہوش و خرد پر بجلی بنکر گری۔ ان کا طنطنہ خاک میں مل گیا۔ وہ بچی جو اپنی معصوم گلکاریوں سے ان کو اپنی طرف متوجہ کیا کرتی تھی، انکی آنکھوں کے سامنے آگئی۔ وہ ان کے پاس آنے کیلئے پھڑک رہی ہے۔ اور وہ جھڑک رہے ہیں! وہ کسی چیز کیلئے مچل رہی ہے اور انکی شکل دیکھ کر اس طرح خاموش ہو گئی گویا مطلوبہ شے سے کوئی افضل چیز اسے مل گئی ہے! ماں نے اسے کوئی چیز کھانے کے لئے دی اور وہ اسے لے کر جھٹ باپ کو کھلانے دوڑی آئی! آج وہی بچی عمر خاں کے دل کو اپنی یاد سے برما رہی تھی جو باپ کے ہوتے ہوئے بھی شفقتِ پدری سے محروم رہی

"بھائی صاحب!" خالد نے غمناک ہو کر کہا، "میں آپ کے پاس اس لئے نہیں آیا کہ اپنی غریبی کا اظہار کر دوں بلکہ یہ کہنے آیا ہوں کہ للہ میری بہن پر رحم کیجیئے۔ مجھ جیسا خود دار آدمی آپ کے آگے ہاتھ جوڑتا ہے۔ آپا بیمار ہیں۔ وہ سلمیٰ کی لاش سے لپٹے گھنٹوں روتی رہیں اور مجھ سے کہا "خالد! میری خاطر ان کے پاس چلے جاؤ۔ انہوں نے جو کچھ لکھا وہ ٹھیک ہے۔ بے شک مجھ سے قصور ہوا اور میں اپنے کئے پر پشیمان ہوں۔ خدارا، ان کے آگے ہاتھ جوڑ کر میرا قصور ان سے معاف کرا دو۔"

سلیمہ کی دردناک التجا سُنکر عمر خاں کا دل بھر آیا۔ سوچنے لگے ہائے میں نے یہ کیا کیا! میں کتنا سفاک اور بے درد ہوں! یہ سب کچھ میرا ہی کیا دھرا ہے۔ میں نے خط میں کیسی سخت باتیں لکھیں ہیں! آہ! میری جلد بازی نے یہ دن دکھایا! ان کا ضمیر بھی ان کو ملامت کرنے لگا" عمر! کیا تم ہادیٔ برحق کے احکام بھول گئے! کیا خاکِ عرب سے اٹھنے والا رسول میاں بیوی کے بارے میں یہ نہیں فرماتا۔

"مسلمانو! تم اپنی بیویوں سے شریفانہ سلوک کرو۔ اور جب کبھی کسی قسم کی ناخوشگواری پیدا ہو تو ٹھنڈے دل سے اسکے اسباب پر غور کر کے جلد سے جلد صلح کر لو۔ لیکن اگر تم دیکھو کہ نباہ کسی طرح ممکن ہی نہیں تو نیکی اور شرافت کے ساتھ ان کو علیحدہ کر دو۔ ——————— اپنے نکاح میں رکھ کر ان کو ان کے حقوق سے محروم کر دیں تو بہت ہی برا اور غیر شریفانہ فعل ہے"

خالد نے آہستہ آہستہ نگاہ اونچی کی تو دیکھا کہ عمر خاں کا چہرہ آنسوؤں سے بھیگ گیا ہے۔ اور ان کی آنکھوں میں سیلاب اشک اُمڈا چلا آیا ہے۔ دونوں کی نظریں ملیں۔ عمر خاں نے اٹھ خالد کو سینے سے لگا لیا اور شکستہ آواز میں کہا "چلو"

پروفیسر محمد حسین محوی صدیقی لکھنوی

نوائے محوی

عجب نیرنگِ قدرت ہے جہاں عہدِ شباب آیا
تمنا ہم عناں آئی تعشق ہم رکاب آیا

اُدھر لب پر ہنسی آئی، نگاہوں میں حجاب آیا
اِدھر رگ رگ میں دوڑی زندگی یعنی شباب آیا

جہاں وہ مسکرائے کھِل گئیں کلیاں اُمیدوں کی
پڑی ہر زندگی پر اوس جب انکو عتاب آیا

کہاں آنکھوں کو تابِ جلوہ کس کے ہوش رہتے ہیں
بُرا کیا ہے اگر وہ جانِ محفل بے نقاب آیا

دلوں کے ہوش رخصت تابِ رخصت جوشِ غم رخصت
وہ جانِ حسن جانِ آرزو جانِ شباب آیا

اسی کو زندگی کہتے ہیں کیا اے چارہ سازِ غم؟
نہ سکھ پایا کبھی دل نے نہ ان آنکھوں میں خواب آیا

فلک تک اپنے نالے بھی گئے دل کی دعائیں بھی
نہ کوئی مستجاب آئی نہ کوئی کامیاب آیا

ہمیں بھی تو بتا کچھ اے ادائے حسن جانانہ!
تمکن ما ہم پہ کیوں ہیچ تو نہیں کیوں عتاب آیا

سکوں کو کر دیا برہم، دلوں کو کر دیا بیدم
کوئی طوفانِ حسن و ناز آیا یا شباب آیا

یہ کس نے دل جلوں پر مسکرا کر پھول برسائے
کہ ہر داغِ تمنا پر بہار آئی شباب آیا

مبارک ہو اسی کا نام تکمیلِ محبت ہے
اجل بھی آ گئی بالیں پہ جب خط کا جواب آیا

ملی کچھ ایسی راحت حشر تک آغوشِ تربت میں
نہ تڑپا پھر جگر محوی نہ دل کو اضطراب آیا

ناب بہزاد لکھنوی

ایک ایکٹ کا ڈراما

تقاضائے عمر

منظر (مرزا اشرف جو ایک معتمر سرکاری عہدہ دار ہیں اپنے
ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ چائے کی کشتی اُن کے سامنے ہے۔
یکن وہ کسی بات پر ناراض سے نظر آرہے ہیں۔)

مرزا۔ کریمن اری او کریمن۔

کریمن۔ آئی حضور۔

(کریمن داخل ہوتی ہے)

مرزا۔ کمبخت تجھے کیا ہو جاتا ہے ہر روز۔ کل ملکہ کشتی میں نہیں تھا
ج شکر غائب ہے۔

کریمن۔ حضور بھول جاتی ہوں کیا کہوں سرکار مجھ کم بخت
ی یاد کو نہ جانے کیا ہو گیا ہے۔

مرزا۔ چل چل جلدی کر۔ اچھا سن۔

کریمن۔ جی سرکار۔

مرزا۔ ذرا اسلم کو بھیجتی جا۔

کریمن۔ حضور۔ چھوٹے میاں تو خود ہی آرہے ہیں؟

(اسلم آتا ہے)

مرزا۔ اسلم! آج کا سبق ازبر کر لیا ہے تم نے؟

اسلم۔ ابا۔ حساب میں ذرا گڑبڑ ہے۔

مرزا۔ گڑبڑ ہے؟ کیوں گڑبڑ ہے؟ میاں اسلم تمہیں سینما اور
دوستوں سے فرصت ہی کہاں ملتی ہے۔ جو سکول کے کام کی طرف توجہ
رو۔ مجھے دیکھو میں اپنی آپ مثال ہوں۔ میرے والدین غریب تھے میں
نے نوکریاں کر کے تعلیم حاصل کی جب تعلیم حاصل کر چکا تو سفارش کیلئے
وئی صورت نہ تھی۔ آج دیکھو میں بلا سفارش کے اس عہدہ تک پہنچ گیا ہو
یک تم ہو کہ تم کو ذرا سا خیال نہیں آتا کہ تمہارے لئے تمام وہ آسانیاں مہیا
ہیں جو مجھے نصیب نہ تھیں۔ لاحول ولا قوۃ۔

(بیگم آتی ہے)

بیگم۔ اے ہے میرے بچے کا دل دکھلائے دے رہے ہیں آپ۔
یہ نہیں سوچتے کہ یہ بھول چوک محض تقاضائے عمر ہے۔

مرزا۔ اچھا جناب معاف کیجئے۔ مجھ سے خطا ہوئی۔ اور یہ بھی کریمن کی
روز روز کی بھول۔

بیگم۔ (آہستہ) یہ بھی تقاضائے عمر ہے۔

مرزا۔ بہتر ہے۔ ذرا بڑے صاحبزادے کو بلائیے۔

بیگم۔ اکمل میاں اے اکمل میاں۔

اکمل۔ حاضر امی جان فرمائیے۔

بیگم۔ سنو بیٹا تمہارے ابا میاں کیا حکم دیتے ہیں

اکمل۔ فرمائیے ابا میاں۔

مرزا۔ بیٹا ذرا ٹیلیفون نمبر ۲۲۳۴ سے ملاؤ اور پوچھو کہ آپ کس
وقت ملیں گے۔

اکمل۔ بہت خوب۔

(اکمل جاتا ہے۔۔ چند لمحوں کے بعد واپس آتا ہے)

اکمل۔ ابا میاں اُن صاحب کا نام کیا ہے۔

مرزا۔ اوہ۔ میں بھولا جمال خان صاحب۔ بیگم! موٹر کے لئے تم نے کہلوا
دیا ہے نا۔

بیگم۔ جی ہاں۔ صبح ہی میں نے کہلوا دیا تھا۔

(اکمل واپس آتا ہے)

اکمل۔ ابا میاں انہوں نے کہا کہ تین بجے ملونگا۔

مرزا۔ کہاں؟

اکمل۔ یہ تو میں نے پوچھا نہیں۔ جہاں آپ اُن سے ملا کرتے ہوں۔

مرزا۔ لاحول ولا قوۃ۔ میں آج تک اُن سے کبھی نہیں ملا۔ کیا

جانوں کہاں ملیں گے۔ ان سے پوچھو۔

بیگم۔ اب دیکھئے یہ اکمل کا تقاضائے عمر ہے۔ کہ پوری بات دریافت نہیں کرتا۔

مرزا۔ تقاضائے عمر۔ تقاضائے عمر سنتے سنتے بیگم میں بیزار ہو گیا ہوں۔ آخر میں بھی تو انسان ہی ہوں۔ ہر کام صحیح وقت پر کرتا ہوں۔ آخر مجھ سے کوئی بھول چوک کیوں نہیں ہوتی؟

بیگم۔ اس کو تو میں بھی مانتی ہوں۔

مرزا۔ (خوش ہو کر) بیگم ایک تم ہی سمجھ دار انسان اس گھر میں ہو باقی تو سب کندہ ناتراش ہیں کندہ ناتراش۔

(دس کا گھنٹہ بجتا ہے۔ مرزا برابر گن رہے ہیں)

مرزا۔ ایک دو۔ تین۔ چار۔ پانچ۔ چھ۔ سات۔ آٹھ۔ نو۔ دس تو بہ دس بج گئے اور مجھے کچہری پہنچنا ہے۔ کریمن! کریمن!!

کریمن۔ جی سرکار۔

مرزا۔ جلدی دیکھ موٹر دروازہ پر آگئی یا نہیں۔

کریمن۔ سرکار موٹر تو کل رات ہی بننے دیا گیا ہے۔

مرزا۔ ٹھیک ہے لیکن بیگم کہتی تھیں کہ میں نے کہلوا دیا ہے۔

بیگم۔ ——— کیا عرض کروں بس غلطی سے آپ سے کہہ گئی تھی۔

مرزا۔ (عاجز ہو کر) اچھا بھائی خدا کے لئے ٹیکسی بلواؤ۔ ورنہ کچہری کا کام رکا رہے گا۔

کریمن۔ سرکار ٹیکسی والے کو میاں نے پہلے سے ہی بلا رکھا ہے۔

مرزا۔ ول ڈن۔ یہ کام کیا ہے۔ ہاں ٹوپی لاؤ میں چلوں۔

بیگم۔ لیکن آپ تو شب خوابی کا پاجامہ ہی پہنے ہوئے ہیں۔

مرزا۔ لاحول ولا قوۃ۔

بیگم۔ یہ تقاضائے عمر ہے۔

(مرزا قہقہہ لگاتا ہے)

جناب ڈاکٹر تصدق حسین خالد ایم اے ایل ایل ایم، ڈی

اے وطن

تو وہی کچھ ہے کہ تھا۔
گودیوں میں تیری جب میں خانماں برباد تھا۔
کامیاب زندگی
تیرے جنگل۔
تیرے دریا۔ بحر و بر لیل و نہار
سب وہی کچھ ہیں کہ تھے۔
نام میں تیرے مگر اک دلکشی
اک انوکھی۔ اک نرالی دلکشی۔
ناقابل شرح و بیاں
پاتا ہوں میں

آج تجھ سے دور ہوں خاکِ وطن
تیری عیدوں ہولیوں۔ دیوالیوں سے دور۔
مغرب کے تمدن زار میں۔
خیرہ کن رعنائیوں کے درمیان کھویا ہوا۔
دل میں اٹھا اضطراب
چھا رہا ہے کائناتِ روح پر سیلاب نور
شعبدہ ہے۔ خواب ہے۔ اعجاز ہے۔
اے وطن۔
تو کہ اتنا دور تھا اس وقت میرے پاس ہے۔
سچ بتا کیا بات ہے؟

جناب صغر حسین صاحب نظیر لدھیانوی

حِسّیات

لب جو وہ چشمِ حسیں مسکرا دی — چمن کی فضائے حزیں مسکرا دی
گھٹاؤں کی آغوش میں برق چمکی — کہ محمل میں محمل نشیں مسکرا دی
وہی شمعِ تربت، وہی شمعِ خلوت — کہیں رو پڑی اور کہیں مسکرا دی
ہٹا پردہ یوں میرے زخمِ جگر سے — کہ جیسے کوئی نازنیں مسکرا دی
قضا بھی تو کھاتی نہیں رحم اے دل — جہاں مجھ کو دیکھا وہیں مسکرا دی
اسی چہرہ سے بستگی ہے ہنسی کو — جو لب تھک گئے تو جبیں مسکرا دی
ابھی لب پہ آیا نہ تھا نام میرا — وہ شکلِ جمیل و حسیں مسکرا دی
مجھے دیکھ کر رات وہ مسکرائے — کہ صبحِ جمال آفریں مسکرا دی
جہاں میری تصویر کو اس نے دیکھا — وہ چشمِ حیات آفریں مسکرا دی
ہوئے بادہ خانہ میں داخل جو ہم تم — سبو ہنس پڑا ساتگیں مسکرا دی

غزل تو نے لکھی نظیر اس زمیں میں
کہ پنجاب کی سرزمیں مسکرا دی

محبوبۂ ابلیس

جناب ایم اسلم

کسی پہاڑ کے دامن میں ایک بہت بڑی بستی تھی۔ جہاں کہیں کہیں عالیشان عمارات کے کھنڈر بھی پائے جاتے تھے۔ کہا جاتا تھا۔ کہ کسی زمانے میں یہ کسی سلطنت کی راج دھانی تھی۔ لیکن یہ وہ زمانہ تھا۔ جب راجا اور پرجا سادہ اور سپاہیانہ زندگی بسر کرتے تھے۔ اس زمانے میں تن کی عریانی کو ڈھانپنے کے لئے صرف ایک مختصر سی دھوتی یا لنگوٹی کے سوا اور کسی لباس کی ضرورت نہ تھی۔ عورت جو روزِ ازل سے شرم و حجاب کی پتلی ہے۔ جب شباب کی منزل میں قدم رکھتی۔ تو سینے کی رعنائیوں کو نظرِ بد سے بچانے کے لئے ایک انگیا یا چولی سی پہن لیتی۔ یہ وہ زمانہ تھا۔ جب عشق اور محبت کا اظہار کھلے بندوں کیا جاتا تھا یہ وہ دور تھا۔ جب سماج کے قوانین انسان کی فطرت کے مطابق تھے۔ اور اس کے ساتھ توہم پرستی بھی زوروں پر تھی۔

لوگوں کا عقیدہ تھا۔ کہ جس طرح دیوتا وقتاً فوقتاً کسی نہ کسی روپ میں درشن دیتے ہیں۔ اسی طرح راکھشس یعنی شیطان بھی تاک میں لگا رہتا ہے۔ اور جب موقع پاتا ہے۔ انسان کو غلط راہ پر لگا دیتا ہے۔ اور لوگ جس طرح دیوتاؤں کے درشنوں کے آرزومند رہتے تھے۔ اسی طرح شیطان کے نام سے بیزار!

بستی سے کوئی ڈیڑھ پونے دو میل کے فاصلے پر ایک بڑے گھنے جنگل میں پتھر کا ایک چھوٹا سا مکان تھا۔ جس کی دیواروں سے جنگل کی بیلیں سانپوں کی طرح لپٹی ہوئی تھیں۔ اور درختوں کی شاخیں اس پر اس طرح جھکی ہوئی تھیں۔ جیسے کوئی بڑھیا بال کھولے کسی کے غم میں سر جھکائے بیٹھی ہو۔ ایک ندی کہیں جنگل سے نکلتی ہوئی اور شور و شیون کرتی ہوئی مکان کے پاس سے گذر کر پھر جنگل میں روپوش ہو جاتی تھی۔ ہوا چلتی تو بسا اوقات ایسا معلوم ہوتا۔ کہ بد اطوار ارواح چیخ رہی ہیں۔ اور اپنی بداعمالیوں کی پاداش میں سزا ملنے پر نالہ و شیون برپا کر رہی ہیں۔ شعاعِ آفتاب کسی رہزن کی طرح چھپ چھپا کر جب جنگل کا جائزہ لینے لگتی۔ تو اداسی کی گھٹائیں پھٹ جاتیں۔ اور گوالے کی بانسری کی آواز جب آس پاس کے پہاڑوں میں سے گونجتی ہوئی سنائی دیتی تو گرد و پیش کے مناظر کی المناک خاموشی میں زندگی کی ایک لہر سی دوڑ جاتی۔ لیکن غروب آفتاب کے ساتھ ہی پھر وہی خاموشی اور اداسی جنگل پر مسلط ہو جاتی۔ اور وہ کالے کالے پہاڑ جن کے دامن میں جنگل کے پیڑ اور بوٹے بڑھ رہے تھے۔ اور جن کے سروں پر اکثر بجلیاں کوندا کرتی تھیں۔ اور بادل گرجتے تھے۔ مردم خور دیووں کی طرح گھورتے نظر آتے۔

ایک مکان میں ایک لڑکی تھی۔ یہ کون تھی؟ یہ کسی کو معلوم نہ تھا۔ لڑکی کا نام اوشا تھا۔ اوشا نے کچھ ایسا حسن و جمال پایا تھا۔ کہ لوگ اسے چاند کی بیٹی سمجھتے تھے۔ اور جس طرح سورج دیوتا پربت کی چوٹیوں پر سے صبح صبح اس کے درشن کیا کرتے تھے۔ اسی طرح چاند بدلیوں کی اوٹ میں سے چھپ چھپ کر اسے دیکھا کرتا تھا۔ اور گاؤں والے دیوتاؤں

کا اوتار سمجھ کر اس کی عزت کرتے تھے۔ وہ جب کبھی گاؤں میں آتی تو کوئی دودھ پیش کرتا۔ کوئی بھوجن کرنے کو کہتا۔ لیکن اوشا ان چیزوں کو دیکھتے ہی منہ دوسری طرف پھیر لیتی۔ لوگوں کو اتنا بھی معلوم نہ تھا۔ کہ اوشا کھاتی کیا ہے۔ اور کہاں سے کھاتی ہے۔ کیونکہ جنگل میں پھلوں کے سوا جنہیں کالے کالے چہروں والے بندر پکنے سے پہلے ہی ختم کر دیتے تھے۔ یا چمگادڑیں کاٹ کاٹ کر خراب کر دیتی تھیں۔ اور کچھ ہوتا ہی نہ تھا۔

اُوشا یوں تو بڑی ہنس مکھ لڑکی تھی۔ لیکن جب شباب کی آندھی چڑھی اور جوانی کی کونپل پھوٹنے لگی۔ تو اس کی طبیعت میں کچھ سنجیدگی سی کچھ متانت سی پیدا ہو گئی۔ پہلے وہ ہنس ہنس کر باتیں کیا کرتی تھی۔ لیکن اب اکثر خاموش سی رہتی۔ کسی فکر میں ڈوبی ہوئی۔ کسی خیال میں کھوئی ہوئی کسی الجھن میں گرفتار۔

گاؤں کے پٹیل کا لڑکا لچھمن جو جوانی کے نشے میں سرشار تھا۔ اور جسے دیوتاؤں نے توانائی اور رعنائی عطا کر رکھی تھی۔ بنسری خوب بجاتا تھا۔ اس کی بنسری کی آواز سنکر گاؤں کی جوان جوان چھوکریاں گھروں میں بیٹھی اس کے تصور سے ہی خوش رہتی تھیں۔ جب پنگھٹ پر پانی بھرنے والیوں کی بھیڑ ہوتی۔ تو لچھمن بنسری بجاتا ہوا آ نکلتا..... پانی بھرنے والیوں کے مٹکے ندی میں ہی ڈوبے رہ جاتے اور نکالنے کی کسی کو سدھ بدھ نہ رہتی۔ لیکن لچھمن کسی کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھتا۔ کیونکہ اس کے من کے مندر میں اب اوشا دیوی بنکر بیٹھی تھی۔ وہ ہر روز بنسری بجاتا ہوا اس راستے پر جدھر سے اوشا آیا کرتی تھی جا بیٹھتا تھا۔ اوشا جب آتی۔ تو اس سے مسکرا مسکرا کر باتیں کرتی۔ پھر لچھمن بنسری بجاتا اور اوشا ناچتی۔ اور دیکھنے والے پاس بیٹھے مزے مزے سے تالیاں بجاتے۔ لیکن اب کچھ دنوں سے اوشا لچھمن سے بھی اجتناب کرنے لگی تھی۔

ایک روز اوشا پنگھٹ پر جو گئی۔ تو ندی کا پانی گدلا تھا پانی بھرنے والیاں پانی بھر رہی تھیں۔ اوشا ان کے پاس بیٹھی باتیں کر رہی تھی۔ کہ اتنے میں لچھمن بھی بنسری بجاتا ہوا ادھر آ نکلا۔ اور پاس پہنچکر بولا۔

"اوشا! دو گھونٹ پانی پلا دو"

"ندی بہہ رہی ہے پی لو"۔ اوشا بولی "میرے پاس برتن تو ہے نہیں۔ جو میں پلاؤں"۔

"برتن نہ سہی" لچھمن نے جواب دیا "تم چلو میں بھر کر پلا دو"

"تو آؤ!" اوشا بولی۔ "پی لو"۔

لچھمن اس کے پاس ندی پر بیٹھ گیا۔ اُوشا نے ندی سے چلو میں پانی لیا۔ اور لچھمن کی طرف ہاتھ بڑھا کر کہا۔

"لو!"

ارے "یہ تو امرت ہے!" لچھمن نے تعجب سے کہا

پاس سے ایک چنچل چھوکری بولی۔

"کیچڑ کو تم امرت نہ کہو۔ تو اور کون کہے؟"

اب لچھمن نے اس کی طرف دیکھ کر کہا

"اندھی تو تم بھی نہیں۔ آؤ دیکھ لو "کیچڑ ہے یا نتھرا ہوا جل!"

اس نے اٹھ کر جو دیکھا۔ تو پانی واقعی بالکل صاف تھا

"ارے!" وہ تعجب سے بولی۔ "یہ سب اوشا دیوی کی دیا ہے"

"کیا؟" ایک اور نے پوچھا

"ساری! تو دیکھ تو سہی" پہلی بولی" "دیوی نے کیچڑ کو امرت بنا دیا"

سبھی اپنے اپنے مٹکے اٹھا کر اوشا کے پاس آ کھڑی ہو گئیں

اوشا جب ندی سے چلو میں پانی لیتی تو وہ بالکل نتھرا ہوا تھا۔
اب سب اپنے اپنے مٹکے آگے بڑھا بڑھا کر کہنے لگیں۔

"اوشا دیوی میرے جل کو پوتر کر دے!"

اوشا اپنی ہتھیلی مٹکے کے منہ پر رکھ کر جب ہاتھ اٹھاتی تو پانی بالکل صاف اور نتھرا ہوا ہوتا۔ ایک ہنس کر بولی۔

"اوشا! میں تو تب جانوں۔ جو میرے مٹکے کا جل دودھ ہو جائے"

اوشا نے اسی طرح مٹکے کے منہ پر ہتھیلی رکھدی۔ اور پھر ہاتھ اٹھا کر بولی۔

"لے اٹھا دودھ اپنا!"

اب جو مٹکے والی دیکھنے لگی۔ تو واقعی پانی کی بجائے مٹکے میں دودھ تھا۔ عورتوں نے گاؤں میں آتے ہی ایک شور مچا دیا۔ گھر گھر یہی تذکرے ہونے لگے۔ لیکن اوشا آج گاؤں جانے کی بجائے جنگل کو چل دی تو لچھمن بھی ساتھ ہولیا۔

"اوشا! وہ چلتے چلتے بولا۔ "آج یہ تم نے کیا کیا؟"

"کیا کیا میں نے؟" اوشا نے ہنسکر پوچھا۔ "کچھ چاہیئے تمہیں بھی؟"

"ہاں!" لچھمن نے جواب دیا۔ "مجھے اوشا چاہیئے!"

اوشا نے کچھ جواب نہ دیا۔ لچھمن کہنے لگا۔

"اوشا! یہ اب تم چپ چپ سی کیوں رہتی ہو۔ نہ تم کبھی پیار سے بات کرتی ہو۔ نہ کبھی ملتی ہو۔ کیا بات ہے آخر؟"

"کوئی بات نہیں!" اوشا نے کچھ روکھے پن سے جواب دیا

"تو کیوں نہیں!" لچھمن بولا۔ "میری بھی تو آنکھیں ہیں آخر!"

"لیکن کچھ نظر بھی آتا ہے تمہیں؟" اوشا نے پوچھا۔

"ہاں اوشا!" لچھمن نے ایک آہ بھر کر کہا۔ "میں جدھر دیکھتا ہوں مجھے اوشا ہی نظر آتی ہے"

"تو پھر اور کیا چاہیئے تمہیں؟"

"کہہ تو چکا!" لچھمن نے کہا۔ "کہ مجھے میری اوشا چاہیئے!"

"اب تم جا کہاں رہے ہو؟" اوشا نے پوچھا۔

"ذرا تمہارا گھر دیکھوں گا آج!" لچھمن نے جواب دیا۔

"تم وہاں نہیں جا سکتے!" اوشا نے جواب دیا

"کون روکنے والا ہے مجھے!" لچھمن نے ذرا اکڑ کر پوچھا

"میرا تو ہے کوئی نہیں"۔ اوشا نے آہ بھر کر کہا۔

اسی طرح باتیں کرتے کرتے دونوں جنگل کے قریب پہنچ گئے۔

"لو اب جاؤ تم!" اوشا بولی

اور لچھمن مسکرا کر بولا

"آج تو تمہارا گھر دیکھ کر ہی لوٹوں گا"

اس وقت جنگل کی طرف سے اُتو سے ملتے جلتے دو بہت بڑے جانور خوفناک آوازیں نکالتے ہوئے آئے۔ اور آتے ہی لچھمن پر جھپٹے۔ لچھمن اپنی بنسری سے مدافعت کرنے لگا۔ لیکن ایک نے جھپٹ کر بنسری بھی اس کے ہاتھ سے چھین لی۔ اس نے جو ادھر ادھر دیکھا تو اوشا بھی جا چکی تھی۔ لچھمن خوفزدہ ہو کر گاؤں کو بھاگا راستے میں اسے اس کی بنسری بھی پڑی ہوئی مل گئی۔

رات کا وقت تھا۔ ہوا چل رہی تھی۔ اور جنگل سائیں سائیں کر رہا تھا۔ آسمان پر ستارے اس طرح چمک رہے تھے۔ جیسے کوئی نیند کی ماتی آنکھیں جھپک رہی ہو۔ رات اتنی تاریک تھی۔ کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دیتا۔ چمگادڑیں اور اُلو جو لوگوں کے عقیدے کے مطابق برے لوگوں کی روحیں ہوتی ہیں۔ بھیانک آوازیں نکالتے ہوئے ہوا میں خراٹے بھر رہے تھے۔ اوشا کے مکان سے ذرا فاصلے پر ایک کھلی جگہ تھی۔ یہاں اوشا اور ایک آدمی دوش بدوش بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ اس آدمی کی آنکھیں انگاروں کی طرح چمک رہی تھیں۔

"اوشا! وہ کہہ رہا تھا۔ "تم نے حسن مانگا! تمہیں ملا یا نہیں؟ تم نے خواہش ظاہر کی کہ ایک دنیا میری متوالی ہو۔ تمہاری یہ خواہش بھی پوری ہوئی یا نہیں؟ پھر تم نے کہا کہ جو تم چاہو۔ وہی ہو جائے

کل پنگھٹ پر تم نے یہ بھی دیکھ لیا۔ کہ جو کچھ تم نے چاہا۔ وہی ہو گیا۔ لیکن ......"

"لیکن" اوشا بات کاٹ کر بولی۔ "جو کچھ میں چاہتی ہوں۔ کبھی وہ بھی ہوگا یا نہیں۔؟"

اوشا!" سیاہ پوش کہنے لگا۔ "تم چاہتی ہو۔ کہ تمہیں جننے والی کی روح کو پل بھر کا بھی آرام نصیب نہ ہو۔ اور وقت سے پہلے ہی نرگ میں پہنچ جائے۔"

"تو گویا!" اوشا نے ذرا تنک کر کہا۔ "تم چاہتے ہو۔ کہ ماں کے جرم کی سزا میں بھگتوں؟"

"جرم اوشا!" سیاہ پوش بولا۔ "جرم نہیں"

"جرم نہیں تو پھر کیا؟" اوشا نے پوچھا۔

"اوشا!" سیاہ پوش کہنے لگا۔ "تمہاری ماں ایک پاکباز عورت تھی۔ لیکن ایک شخص نے جسے وہ اپنا بھائی سمجھتی تھی۔ اس سے ایسی دغابازی کی۔ کہ تمہاری ماں انتقام لینے پر آمادہ ہوگئی۔ اس نے اس پاپی سے بدلا لینے کو دنیا بھر کے جتن کئے۔ لیکن اسے کامیابی نہ ہوئی۔ آخر ہر طرف سے مایوس ہو کر اس نے مجھ سے وعدہ کیا۔ کہ اگر میں کچھ مدد کر دوں۔ تو وہ اپنا جگر کا ٹکڑا مجھے دیدے گی۔ اوشا! اس وقت تم آٹھ سال کی تھیں۔ اور تمہاری ماں بستر مرگ پر تھی۔ اور انتقام لینے کے لئے ملاتی تھی۔ میں نے اسے چیتے کی سبک رفتاری اور خونخواری دی۔ اور کسی ترکیب سے اس پاپی کے گھر پہنچا دیا۔ وہ اپنے گھر میں سوتا تھا۔ تمہاری ماں اپنے دشمن کے سینے پر چڑھ گئی۔ اور دانتوں سے اس کا گلا کاٹ کر اس کے خون سے اپنی آتش انتقام کو ٹھنڈا کیا۔"

"تو گویا!" اوشا بولی۔ "میں پاپ کی بیٹی ہوں!"

اور سیاہ پوش مرد نے اسے اپنی آغوش میں لیتے ہوئے کہا۔

"نہیں! بلکہ ابلیس کی بہو ہو!"

یہ خوفناک الفاظ سنکر اوشا کے بدن میں ایک کپکپی سی پیدا ہوگئی۔ لیکن وہ سنبھل کر کہنے لگی۔

"نہیں! ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔ کہ ایک ماں اپنی بچی کو نرگ کا نوالہ بننے کے لئے آگ میں پھینک دے۔"

"تو گویا!" سیاہ پوش مرد بولا۔ "تمہیں میری بات کا اعتبار نہیں؟"

"اعتبار کیسے ہو؟" اوشا نے جواب دیا۔ "تم بات بھی تو وہ کہتے ہو۔ جو دنیا نہ مانے!"

"تم ثبوت چاہتی ہو کیا؟" سیاہ پوش مرد نے پوچھا۔

"کیا ثبوت ہے تمہارے پاس؟" اوشا نے پوچھا۔

"ابھی لو!"

یہ کہکر اس سیاہ پوش مرد نے ہوا میں انگلی سے کچھ نقش سے بنائے۔ ساتھ ہی جھاڑیوں میں سانپ کے پھنکارنے کی آواز سنائی دینے لگی۔

"ناگ ہے کہیں!" اوشا ادھر ادھر دیکھ کر بولی۔

لیکن اس کے ساتھی نے کچھ جواب نہ دیا۔ اور سانپ کے پھنکارنے کی آواز لحظہ بہ لحظہ قریب ہوتی گئی۔ پھر جنگل سے ایک بہت خوفناک ناگ پھن پھیلائے نکلا۔ اس کے پھن کے اوپر ایک عورت آلتی پالتی مارے بیٹھی ہوئی تھی۔ عورت کے گلے میں ایک ہار تھا۔ جو انگاروں کی طرح چمک رہا تھا۔

"ماں" اچانک اوشا کے منہ سے نکلا۔ اور اس نے خوفزدہ ہو کر اپنے ساتھی کا ہاتھ پکڑ لیا۔ لیکن وہ اسی طرح خاموش بیٹھا رہا۔ سانپ پھنکارتا ہوا ان کے قریب آکر رک گیا۔ اور وہ عورت اس کے پھن پر سے اتری۔ اور اوشا کے پاس آکر اپنے گلے سے وہی انگاروں کا ہار اتار کر اس کی گردن میں ڈال دیا۔ اور اس کا ہاتھ سیاہ پوش مرد کے ہاتھ میں دے کر پھر سانپ پر سوار ہوگئی۔ اور وہ اسی طرح پھنکارے مارتا ہوا جنگل کی طرف چلا گیا۔

اگلے روز جب اوشا بستی میں آئی۔ تو لوگ اوشا دیوی کی جے کے نعرے لگانے لگے۔ جدھر سے وہ گزرتی عقیدتمند جھک جھک

کہ پرنام کرتے۔ عورتیں بچوں کو لاکر اس کے قدموں پہ ڈالتیں۔ ایک لڑکی گڑوی ہاتھ میں لئے آئی۔ اور گڑوی آگے بڑھا کر بولی۔

"اوشا دیوی! میری گڑوی دودھ سے بھر دے!"

اوشا نے مسکراتے ہوئے گڑوی کے اوپر اپنی ہتھیلی رکھدی پھر ہاتھ اٹھا کر بولی۔

"لے لے دودھ اپنا!"

ایک اور نے گڑوی بڑھا کر کہا۔

"اوشا دیوی! میری گڑوی پیڑوں سے بھر دے"!

اوشا نے پھر گڑوی پہ ہاتھ رکھ کر ہاتھ ہٹایا۔ اور کہا۔

"لے اٹھا پیڑے اپنے"!

ایک اور گڑوی بڑھا کر کہنے لگی۔

"اوشا دیوی! میری گڑوی سونے سے بھر دے"!

اوشا نے پھر اسی طرح گڑوی پہ ہاتھ رکھدیا۔ پھر ہاتھ اٹھا کر بولی۔

"لے جا سونا اپنا!"

لوگوں نے جو دیکھا۔ تو واقعی گڑوی سونے کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں سے بھری ہوئی تھی۔ اوشا اسی طرح گھومتے گھومتے مندر کے پاس جا نکلی۔ پجاری ہاتھ جوڑ کر بولا۔

"اوشا رانی! بھگوان کی مورتی سونے کی بنا دے"

لیکن بھگوان کا نام سنتے ہی اوشا جنگل کی طرف بھاگ گئی۔

کوئی تہوار تھا۔ ندی پہ لوگوں کی خاصی بھیڑ بھاڑ تھی۔ کہیں جوان چھوکریاں جھومر ڈال رہی تھیں۔ کہیں مرد کھیل تماشوں میں مصروف تھے۔ لچھمن اپنے دوستوں کے ساتھ میدان میں تیر اندازی کا کمال دکھا رہا تھا۔ ایک طرف پجاری لکڑی کے ایک تخت پہ مورتی رکھے بیٹھا تھا۔ سامنے نذرانوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ دو چار آدمی جھانجھ اور ڈھولک بجا رہے تھے۔ اور ایک نوجوان چھوکری ماتھے پر قشقہ لگائے مٹک مٹک کر ناچ رہی تھی۔ عقیدتمند آتے اوندھے منہ لیٹ کر مورتی کو سجدہ کرتے۔ پجاری انگلی سے ان کے ماتھے پر سیندور کا ٹیکا لگا دیتا۔

اتنے میں اوشا ایک نوجوان کے ساتھ جس نے سیاہ لباس پہنا ہوا تھا۔ ایک طرف سے آئی۔ دونوں مورتی سے ذرا ہٹ کر اس جگہ جہاں عورتیں جھومر ڈال رہی تھیں کھڑے ہو گئے۔ وہ سیاہ پوش بنسری بجانے لگا۔ اور اوشا رقص کرنے لگی۔ بنسری کی آواز اتنی دلکش تھی۔ اور اوشا کا رقص اتنا دلفریب تھا۔ کہ لوگ سب طرف سے ہٹ کر انہی کی طرف پلٹ آئے۔

لچھمن بھی کہیں اوٹ میں کھڑا یہ تماشا دیکھ رہا تھا۔ اپنی محبوبہ کو ایک غیر کے ساتھ رقص کرتے دیکھ رقابت کی آگ اسکے سینے میں بھڑک اٹھی۔ اس نے چلا چڑھا کر اوشا کے ساتھی کو تیر مارا۔ تیر لوگوں کے سر پر سے سنسناتا ہوا گذر کر جب اس سیاہ پوش نوجوان کے قریب آیا۔ تو اس نے اچک کر تیر ہاتھ میں پکڑ لیا۔ اور ہوا میں اچھال دیا۔ ساتھ ہی آسمان سے پھول برسنے لگے۔ لچھمن نے یہ دیکھ کر کہ اس کا وار خالی گیا ہے۔ پھر تیر مارا۔ اور اس سیاہ پوش نوجوان نے اسی طرح پھر تیر پکڑ کر ہوا میں اچھال دیا۔ اور پھر اسی طرح پھولوں کی بارش ہونے لگی۔ لچھمن پے در پے تیر مارتا تھا۔ لیکن اوشا اسی طرح رقص کر رہی تھی۔ اور اس کا ساتھی مزے سے بنسری بجا رہا تھا۔ آخر لچھمن غضبناک ہو کر لوگوں کی بھیڑ کو چیرتا ہوا نکلا۔ اس کے ہاتھ میں ایک دو دھارا بھالا تھا۔ اس نے بھالا کو اپنے رقیب کی طرف پھینکا۔ لیکن اس نے اسی بے اعتنائی سے اچک کر بھالا بھی پکڑ کر ہوا میں اچھال دیا۔ آناً فاناً ایک مہیب جانور کہیں سے تیر کی طرح پرواز کرتا ہوا آیا۔ اور خوفناک آواز نکالتا ہوا لچھمن پر جھپٹا۔ لوگ جو مبہوت کھڑے تھے۔ خوفزدہ ہو کر ایک دوسرے پر گرتے پڑتے ادھر ادھر بھاگ گئے۔ اور اوشا اور اس کا ساتھی بنسری بجاتے اور ناچتے کودتے جنگل کی طرف چلے گئے۔

آج گاؤں میں ہر طرف یہی چرچے تھے پجاری کے پاس بہت سے آدمی بیٹھے تھے۔ پجاری کہہ رہا تھا۔

"ان کالے کالے پہاڑوں میں کہیں ایک راکشس رہتا ہے

گرو جی کہا کرتے تھے۔ کہ سو سال گذرنے کے بعد وہ پہاڑوں سے نکل کر بستیوں کی طرف آتا ہے۔ اس وقت لوگوں پر کوئی نہ کوئی آفت نازل ہوتی ہے۔ میں نے حساب لگا کر جو دیکھا۔ تو معلوم ہوا۔ کہ پورے ایک سو سال گذر چکے ہیں۔ یہ وہی راکھشس ہے۔ جو آجکل ہمیں پریشان کر رہا ہے۔"

لوگوں میں سے ایک بولا۔

"مہاراج! اگر وہ بنسری والا راکھشس ہے۔ تو پھر اوشا دیوی کیوں اس کے ساتھ تھی؟"

پجاری غصہ سے بولا۔

"تم جسے دیوی کہتے ہو۔ وہ بھی پاپن ہے"

لوگوں میں سے ایک پکار اٹھا۔

"مہاراج! ایسا مت کہئے۔ اوشا دیوی ہے۔ رانی ہے"

"دیوی ہے" پجاری نے طنزاً کہا۔ "تو پھر مندر سے کیوں بھاگ گئی اس روز۔ بھگوان کا نام سنتے ہی کیوں خوفزدہ ہو گئی"

"تو پھر یہ بلا دُور کیسے ہو؟" ایک نے پوچھا۔

"اس راکھشس کو پکڑ لو" پجاری نے گرج کر کہا۔ "اور سوا سو من ایندھن کی چتا تیار کر کے اسے اس میں ڈال دو"

"لیکن پکڑے کون؟" مجمع میں سے ایک بوڑھا بولا۔

"میں پکڑوں گا" لچھمن نے آگے بڑھ کر کہا۔ "اور سوا سو من ایندھن بھی میں جنگل سے کاٹ کر لاؤں گا"

لوگ لچھمن کی جے کار پکارنے لگے۔

رات کا وقت تھا۔ اور چاند تاروں کے جھرمٹ میں اس طرح چمک رہا تھا۔ جیسے کسی سندر صورت نازنین کے ماتھے پر بندیا۔ کائنات پر نور کی بارش ہو رہی تھی۔ لچھمن دو چار منچلے نوجوانوں کو ساتھ لے کر بستی سے نکلا۔ سب تیر کمان اور بھالوں سے مسلح تھے۔ جب یہ لوگ جنگل کے قریب پہنچے۔ تو بنسری کی آواز سنائی دینے لگی۔ پھر کچھ اور نزدیک پہنچ کر گانے کی آواز بھی آنے لگی۔ کبھی تو یہ آواز نغمۂ محبت بن کر فضا میں گونجتی تھی۔ اور کبھی پیغام پیکار بن کر جنگل میں ہنگامہ رستخیز پیدا کرتی معلوم ہوتی۔ یہ لوگ دبے پاؤں جنگل میں داخل ہوئے۔ تو انہیں ایک کھلی جگہ میں اوشا اور اس کا ساتھی محوِ اختلاط نظر آئے اوشا ناچ رہی تھی۔ اور وہی سیاہ پوش بنسری بجا رہا تھا۔ لیکن دونوں مل کر رقص کرتے کبھی وہ سیاہ پوش اوشا کی کمر میں ہاتھ ڈال کر جو جست لگاتا۔ تو دونوں ہوا میں پرواز کرتے معلوم ہوتے لچھمن اور اس کا ساتھی صورتِ تصویرِ حیران کھڑے یہ تماشہ دیکھ رہے تھے۔ ان لوگوں کے دیکھتے دیکھتے جنگل میں سے دو بہت خوفناک ناگ پھنکارے مارتے ہوئے نکلے۔ ان کے منہ سے آگ نکل رہی تھی۔ اور گول گول آنکھیں شعلوں کی طرح چمک رہی تھیں۔ یہ دونوں ناگ اوشا اور اس سیاہ پوش نوجوان کے سامنے جا کر پھن پھیلا کر کھڑے ہو گئے۔ سیاہ پوش مرد نے اوشا کو گود میں اٹھا کر ایک ناگ کے پھن پر بٹھا دیا۔ اور دوسرے پر خود اچک کر بیٹھ گیا پھر اس نے اپنی بنسری زمین پر ماری۔ آناً فاناً زمین میں سے آگ کا ایک فوارہ پھوٹ نکلا۔ اور اس میں سے آتشیں پھولوں کی بارش ہونے لگی۔ ساتھ ہی فضا میں رنگا رنگ کی پھلجھڑیاں چھوٹنے لگیں۔ اب دونوں ناگ اس آتشین فوارے کے گرداگرد رقص کرنے لگے۔ کبھی کبھی وہ اوشا اور اس سیاہ پوش مرد کو ہوا میں اچھال کر پھر اپنے پھنوں پہ لے لیتے۔ اوشا ہنستی اور اس کا ساتھی قہقہے لگاتا۔ اوشا گاتی اور وہ بنسری بجاتا۔ ساتھ ہی جنگل سے بھی خوفناک قہقہوں کی آواز سنائی دینے لگتی یہ منظر جس قدر دلفریب تھا۔ اتنا ہی دہشتناک بھی تھا۔ لچھمن کے سب ساتھی خوفزدہ ہو کر دیوانوں کی طرح چیختے چلاتے بستی کی طرف بھاگ گئے۔ لیکن لچھمن جس کے دل میں۔ رقابت کی آگ بھڑک رہی تھی کھڑا رہا۔ آخر یہ کھیل ختم ہوا۔ اوشا اور وہ سیاہ پوش نوجوان سانپوں پر سے اترے۔ اور سانپ جھومتے جھامتے جنگل کی طرف چلے گئے۔ آگ کا فوارہ بھی غائب ہو گیا۔ اور آسمان پہ پھلجھڑیاں چھوٹنی بھی بند ہو گئیں۔ اوشا اور اس کا ساتھی ایک دوسرے کی کمر میں ہاتھ ڈالے جب مکان کی طرف چلے تو لچھمن بھی کمین گاہ سے نکلا۔ اور پیچھے پیچھے ہو لیا۔ لیکن ابھی دس بیس قدم ہی چلا تھا۔ کہ جنگل سے ایک چیتا نکلا۔ اور اس کا راستہ روک کر کھڑا ہو گیا۔ لچھمن نے چلا چلا کر

تیر مارا۔ تیر نشانے پر بیٹھا۔ اور چیتے کے سینے میں پیوست ہوگیا۔ لیکن نہ تو چیتا ہی گرا۔ اور نہ وہاں زخم سے خون ہی نکلا۔ لچھمن نے پےدرپے اتنے تیر مارے کہ ترکش خالی ہوگیا۔ لیکن چیتا اسی طرح دم ہلا ہلا کر غراتا رہا۔ لچھمن نے کمان چھوڑ کر بھالا سونتا۔ لیکن بھالے کی بجائے ہاتھ میں ایک خوفناک سانپ نظر آیا۔ لچھمن نے اسے زمین پہ پٹک دیا۔ اور وہ رینگتا ہوا جھاڑیوں میں چھپ گیا۔ ساتھ ہی جنگل سے چمگادڑوں نے نکل کر اس پہ چاروں طرف سے ایسا حملہ کیا۔ کہ لچھمن مجبوراً گاؤں کی طرف لوٹا۔ جب گھر پہنچا۔ تو دروازے پہ اس کے سب تیر اور بھالا بھی رکھا تھا۔

اس راکھشس سے چھٹکارا پانے کیلئے گاؤں والوں نے مندر میں سنجگا بھی کیا۔ اور پجاری نے برت بھی رکھے۔ لیکن کچھ کامیابی نہ ہوئی۔ اگرچہ بہت دنوں سے نہ تو اوشا ہی کہیں نظر آئی۔ اور نہ کسی نے راکھشس کو ہی کہیں دیکھا۔ ہاں! جنگل کی جانب سے اب بھی کبھی کبھی رات کے وقت بنسری کی آواز اور خوفناک قہقہے سنائی دیتے۔ گاہے گاہے چنگاریاں برستی بھی نظر آتیں۔ لوگوں کا خیال تھا۔ کہ راکھشس پہاڑوں پہ چلا گیا ہے۔ اور وقتاً فوقتاً اوشا سے جنگل میں آجاتا ہے۔ لیکن لچھمن بار بار زک اٹھانے کے بعد بھی ہمت نہیں ہارا تھا۔ اس نے لکڑی کاٹ کاٹ کر ایک بہت بڑا ڈھیر لگا دیا تھا۔

ایک روز سر شام گھومتا گھامتا وہ ندی پر جا نکلا۔ یہاں اسے اوشا بھی بیٹھی نظر آئی۔ وہ کسی خیال میں کچھ اسقدر کھوئی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ کہ گو لچھمن پاس بھی جا پہنچا۔ لیکن اسے خبر تک نہ ہوئی۔

"اوشا!" لچھمن پاس بیٹھ کر بولا۔ "اب تو تم کہیں نظر ہی نہیں آتیں!"

لیکن اوشا نے کچھ جواب نہ دیا۔

"اوشا!" لچھمن نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا۔ "ایک بات پوچھوں!"

"کیا؟" اوشا نے بے اعتنائی سے کہا۔

"یہ تمہارے ساتھ کون ہوتا ہے!" لچھمن نے پوچھا۔ "لوگ تو اسے راکھشش کہتے ہیں۔"

"میں کیا جانوں!" اوشا نے کچھ روکھے پن سے جواب دیا۔

"تم نہ جانو تو اور کون جانے!" لچھمن کہنے لگا۔ "اوشا! جانے تمہارا دل کیوں پلٹ گیا۔ افسوس! میں تمہارے لئے ذلیل بھی ہوا لیکن تمہیں ترس نہ آیا!"

"ذلیل کیسے؟" اوشا نے پوچھا۔

"میں نے پجاری سے وعدہ کیا تھا!" لچھمن بولا۔ "کہ میں راکھشس کو پکڑوں گا۔ اور سوا سو من ایندھن جمع کر کے اس کی چتا بنا کر اس میں اسے ڈالوں گا۔ ایندھن تو میں نے اکٹھا کر لیا۔ لیکن سچ پوچھو تو میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہا۔ ہاں! تم ایک دیا کرو تو شاید میری بات رہ جائے گی!"

"کیا؟" اوشا نے پوچھا۔

"تم میرے ساتھ گاؤں چلو۔ اگر وہ راکھشس تمہیں تلاش کرتا ہوا آگیا تو پھر میں اس سے نپٹ لونگا"

"چلو!" اوشا نے مسکرا کر کہا۔ "یہ حسرت بھی نہ رہ جائے تمہاری۔"

جب دونوں گاؤں میں آئے۔ تو لچھمن اوشا کو گھر میں بٹھا کر پجاری کے پاس گیا۔ اور جو ترکیب اس نے سوچی تھی۔ اس سے بھی کہدی۔ لیکن پجاری نے لوگوں کو بلا کر حکم دیا۔ کہ وہ سب ایندھن جو لچھمن نے کاٹ کاٹ کر اکٹھا کر رکھا تھا۔ لچھمن کے مکان کے چاروں طرف لگا دیں۔ اگر اوشا مندر میں آکر مورتی کی پوجا کرے گی تو اسے چھوڑ دینگے۔ ورنہ اسی جگہ جلا دینگے۔ لچھمن کو یہ بات ناگوار تو بہت گزری۔ لیکن وہ پجاری کے سامنے دم نہ مار سکا۔ لوگوں نے ایندھن اٹھا اٹھا کر اس کے مکان کے چاروں طرف لگا دیا۔ پھر پجاری لچھمن اور چند ایک آدمیوں کو ساتھ لیکر اوشا کے پاس آیا۔ گاؤں کے سب لوگ تماشہ دیکھنے کیلئے لچھمن کے مکان کے آس پاس ٹھٹھ کے ٹھٹھ باندھ کر کھڑے ہو گئے۔

اوشا ایک کوٹھڑی میں بیٹھی دیوار پہ ہاتھ سے کچھ لکیریں ڈال رہی تھی۔

"اوشا!" پجاری بولا۔ "اگر تم مورتی کی پوجا کرو۔ تو ہم تمہیں چھوڑ دینگے۔ ورنہ یاد رکھو۔ اسی جگہ جلادی جاؤ گی"

اوشا ان لکیروں کی طرف جو وہ دیوار پر بنا رہی تھی۔ اشارہ کر کے بولی۔

"پہلے تم بتلاؤ۔ یہ کیا ہے؟"

"یہ تو گھوڑا بنایا ہے تم نے؟" پجاری نے ہنسکر کہا۔ کیا اس گھوڑے پر سوار ہو کر چلوگی؟

"اور جو میں نہ جاؤں تو؟" اوشا نے پوچھا۔

"تو پھر تم یہاں سے زندہ بچکر نہیں جاسکتیں!" پجاری نے جواب دیا۔

"کیا بگاڑ لوگے تم میرا؟" اوشا نے ہنسکر پوچھا۔

"تمہیں زندہ جلادینگے" پجاری نے کہا۔ "چلوگی؟"

"نہیں!" اوشا نے جواب دیا۔

"اوشا!" لچھمن نے منت سے کہا۔ "خدمت کرو۔ کیوں مفت میں جان دیتی ہو!"

"جاؤ!" اوشا بولی۔ "تمہیں اگر جان کا خوف ہے تو چلے جاؤ"

"تمہیں چھوڑ کر کہاں جاؤں اوشا!" لچھمن نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا۔

"تو نہیں چلوگی تم؟" پجاری نے تحکمانہ لہجہ میں پوچھا

"نہیں!" اوشا نے جواب دیا۔

پجاری یہ جواب پاکر باہر نکل گیا۔ لیکن لچھمن اوشا کے پاس ہی رہ گیا۔

پجاری کے حکم سے لوگوں نے چاروں طرف سے ایندھن کو آگ لگادی۔ جب شعلے بلند ہوئے تو اچانک مکان کی ایک دیوار پھٹی۔ اور اوشا ایک سیاہ گھوڑے پر بیٹھی اسی راستے سے باہر نکلی۔ وہ تو آگ پھاند کر نظروں سے غائب ہو گئی۔ لیکن لچھمن غریب جل کر راکھ ہو گیا۔

اس واقعہ کے بعد۔ وہ رامگھنش اور اوشا پھر کسی کو نظر نہ آئے ہ

جناب ثاقب سلمانی

غزل

آہ کی شعلہ باریاں نہ گئیں — چشم کی چشمہ باریاں نہ گئیں

داستانِ عشق کی ہے طولانی — شب کی اختر شماریاں نہ گئیں

خوں ہوئیں دل میں لاکھ امیدیں — ہائے یہ لالہ کاریاں نہ گئیں

یاد آتی ہیں چاندنی راتیں — شوق کی بے قراریاں نہ گئیں

لٹ گیا جب متاعِ دل ثاقب
نیند کی سوگواریاں نہ گئیں!

محترمہ امتہ اللطیف

موت

موت یہاں ہے، موت وہاں ہے،
موت ہر جگہ کام میں مشغول ہے،
اردگرد، نیچے اوپر، اندر اور باہر ہر جگہ موت ہے،
موت نے ہر چیز پر اپنا سکہ جما لیا ہے!
جو کچھ ہم ہیں اس پر بھی اور جو کچھ ہم محسوس کرتے ہیں اس پر بھی، جو کچھ ہم جانتے ہیں، اس پر بھی اور جس سے ہم ڈرتے ہیں اس پر بھی۔
سب سے پہلے ہماری خوشیاں مرجاتی ہیں،
پھر ہماری امیدیں
اور پھر رنج و فکر
موت دنیا کے ہر کونے پر مسلط ہے۔ (ترجمہ)

جناب سید الطاف مشہدی

اقبال کا پیغام

برساتی تھی کل رات مری آنکھ ستارے	ہونٹوں میں مچلتے تھے غضبناک شرارے
جاں حدّتِ افکار سے گھبرائی ہوئی تھی	اک آگ کی آندھی تھی کہ لہرائی ہوئی تھی
نشتر سے چبھوتا تھا کوئی قلب و جگر میں	اقبال کی بیوقت جدائی تھی نظر میں
ایسے میں سیہ فام گھٹا جھوم کے آئی	اقبال کے جنت میں قدم چوم کے آئی
چلنے لگیں خوابوں کے جزیروں کی ہوائیں	ہونٹوں میں لئے قلقلِ مینا کی صدائیں
آنکھوں نے خنک جھونکوں کو شرما کے صدا دی	کچھ نیند کی مے باقی ہے یا ساری لنڈھا دی؟
جھونکوں نے تھپک کر مجھے زانو پہ سلایا	اور بہکی ہوئی لَے میں کوئی راگ سنایا
اس راگ کی بدمست جوانی میں سما کر	آنکھوں کے جھپکتے ہی میں جا پہنچا فلک پر
کیا دیکھتا ہوں نور کے دریا کے کنارے	بیٹھے ہیں جواں حور سے تکیوں کے سہارے
ہر سمت نظر آتا ہے بہکا سا ترنّم	ہر لب پہ جھلکتا ہے نشیلا سا تبسّم
ہر ساز میں نغمات کی مے جھوم رہی ہے	ہر آنکھ میں بدمست ادا گھوم رہی ہے
پھولوں کے جو بستر ہیں تو کلیوں کی ردائیں	اک نیند سی برساتی ہیں مخمور ہوائیں
ہونٹوں میں لئے وصل کی راتوں کی کہانی	پیمانہ بکف پھرتی ہے حوروں کی جوانی
اک حور سے ڈر ڈر کے کہا میں نے "جواں سال!	اس وقت کہاں ہونگے بتا حضرتِ اقبال"
اس زہرہ جبیں نے مجھے رستے پہ لگایا	اور دور سے ایوانِ غلامی بھی دکھایا
میں پیکرِ انوار کے دیدار کو پہنچا	اس صاحبِ ایثار کے دیدار کو پہنچا

کیا دیکھتا ہوں حضرتِ اقبال کھڑے ہیں — اور پاؤں میں بیچارے مسلمان پڑے ہیں
آداب بجا لایا میں گردن کو جھکا کر — اور عرض یہ کی درد کو سینے میں دبا کر
"اے ہند کی اُجڑی ہوئی بستی کے کنہیّا — اے سوئی ہوئی قوم کی کشتی کے کھویّا
میں آپ کی آنکھوں میں یہ کیا دیکھ رہا ہوں — اشکوں کی جگر سوز ضیا دیکھ رہا ہوں"

شاعرِ مشرق کا جواب

اے شاعرِ بیدار! تجھے کیسے بتاؤں — اس عالمِ پُر درد کا کیا حال سُناؤں
تجھ کو نظر آتے ہیں جو روتے ہوئے چہرے — ان چہروں پہ تھے خدمتِ اسلام کے سہرے
جن ہونٹوں کو تو وقفِ فغاں دیکھ رہا ہے — ان ہونٹوں نے اسلام کا پرچار کیا ہے
اُن آنکھوں کو ہر آن جو بیدار رہی ہیں — تسبیح کے دانوں پہ نظر بار رہی ہیں
دوزخ کے بھڑکتے ہوئے شعلوں کی دہانے — آغوش میں لے کے لگایا ہے ٹھکانے
اس جرم میں ملتی ہیں انہیں سخت سزائیں — خونخوار شراروں کی نفس سوز غذائیں
احساس کے ہوتے ہوئے مظلوم رہے ہیں — توحید کی مے پی کے بھی محکوم رہے ہیں
اے نورِ نظر جب تو مرے ہند میں جائے — اور میری ملاقات کے حالات سنائے
اُس سوئی ہوئی قوم کو ٹھوکر سے جگانا — اور درد بھری لے میں یہ پیغام سنانا
جب تک نہ خس و خارِ غلامی کو جلاؤ — جب تک نہ درِ شرق پہ مغرب کو جھکاؤ
جب تک نہ قفس توڑ کے صیّاد پہ لپکو — برچھوں کو لئے ہر ستمِ ایجاد پہ لپکو
اُس وقت تلک صاحبِ ایمان نہیں تم — ایمان تو اک سمت مسلمان نہیں تم"

یہ کہہ کے مجھے آپ سوئے خُلد سدھارے
میں تھام کے دل بیٹھ گیا درد کے مارے

اشتراکی ادیب باری

پشکن

رُوس کا اِنقلاب پسند مفکّر

روسی ادبیات میں پشکن کی حیثیت حقیقت نگاری کے مُوجد کی ہے۔ اس نے اٹھارہویں صدی کے مدرسی ادیبوں کے خلاف بغاوت کی، اسے زدکوریسکی اور کارم زین کی جذبات نگاری بھی پسند نہ تھی۔ پشکن کی تحریروں میں زندگی کو مختلف صورتوں میں پیش کیا گیا ہے۔ وُہ ایک حیرت انگیز ذہانت کا مالک تھا۔ وہ بیک وقت شاعر، نثار، تمثیل نگار، نقاد اور مورخ تھا۔ اس نے اپنی تحریروں کیلئے جو کردار منتخب کئے وہ اس کے ہمعصر تھے۔

پشکن نے دیہاتی افسانوں کے بہادروں اور روسی تاریخ کی بعض اہم شخصیتوں کو اپنے ناولوں میں جگہ دی۔ نثر ہو یا نظم، تمثیل ہو یا تنقید، پشکن قدم قدم پر واقعیت کا علمبردار دکھائی دیتا ہے۔ مساوات کا مُغنی، دسمبریوں کا دوست، آزادیٔ افکار کا حامی اور فرانسیسی انسائیکلوپیدائی علما کا مقلد پشکن زاریت اور روسی اشرافیہ کی نگاہوں میں کانٹے کی طرح کھٹکتا تھا۔

پشکن کے تخلیقی ارتقا میں شیکسپیئر کا بہت زیادہ حصہ ہے۔ انگلستان کے اس مایۂ ناز تمثیل نگار کے مطالعہ نے پشکن کو روس کا ایک کامیاب فن کار اور واقعیت نگار بنا دیا۔ پشکن اپنی المیہ بورس گودونوف کے متعلق لکھتا ہے:-

"مجھے اس امر کا کامل احساس ہو چکا ہے۔ کہ رُوس میں تمثیل نگاری کے فرسودہ اور کہن فن کو ہمیشہ کیلئے ختم کر دینا چاہئیے۔ ہمیں تمثیل نگاری کو فن کاری واقعیت کے خطوط پر چلانا چاہئیے۔ میں نے اپنی المیہ بورس گودونوف" کو اپنے باپ شکسپیئر کے انداز میں لکھنے کی کوشش کی ہے"

پشکن نے نہ صرف اپنے ڈراموں کے لئے شیکسپیئر کے تخلیقی اصول کی پیروی کی۔ بلکہ اس نے روس کے ادیبوں کو شیکسپیئر کی تحریروں کا بغور مطالعہ کرنے کی دعوت بھی دی۔ وہ اس ضمن میں لکھتا ہے:-

"مولیئر کی طرح شیکسپیئر کے کردار کسی خاص خوبی یا بدی کے مالک نہیں۔ اس کے کردار سانس لیتے ہوئے انسان ہیں۔ جن میں بیک وقت خوبیاں اور خرابیاں پائی جاتی ہیں۔ تماشائیوں کے سامنے مختلف احوال و حوادث کے پیش نظر ان کی سیرت میں نمایاں تبدیلی واقع ہوتی ہے۔ مولیئر کا "اویرے" صرف ایک بخیل ہے۔ لیکن شیکسپیئر کا شائی لاک بخیل کے ساتھ ساتھ ذہانت اور باپ کے جذبات کا مالک بھی دکھائی دیتا ہے"

پشکن نے فن کار واقعیت کا مطالعہ شکسپیئر کی تحریروں میں کیا۔ اس غیر فانی اور لاثانی تمثیل نگار کی اسی خصوصیت کے پیش نظر کارل مارکس اس کی ستائش میں قلم اٹھاتا ہے۔ لاکی کو وہ ایک خط میں تنبیہ کرتا ہے۔ کہ اس نے اپنے ڈرامہ فرنیگ فان کو شیکسپیئری انداز میں پیش کرنے کی جگہ شلری رنگ میں کیوں پیش کیا ہے؟ پشکن کی گہرائیوں کو سمجھنے کے لئے مارکس اور اینیلز نے روسی زبان کو سیکھا پشکن کی کتابوں سے انہوں نے روسی اقتصادیات اور روسی کسانوں کی حالت کا اندازہ لگایا۔ پشکن نے روسی زبان کو ادبی زبان بنانے میں انتہائی کوشش کی۔ وہ اس کوشش میں پوری طرح کامیاب ہوا۔ مشہور رُوسی نقاد بیلنسکی لکھتا ہے:- "پشکن کی آمد سے رُوسی زبان میں جوش، توانائی، حسن، لچک اور وسعت پیدا ہو گئی۔ روسی

زبان ایک فطری زبان بن گئی۔ .... اور اس نے صحیح معنوں میں روس کی زبان حیثیت اختیار کر لی!"

پشکن نے بے شمار غیر ملکی محاوروں اور لفظوں کو جو روسی اشرافیہ کی زبان پر عام ہو چکے تھے۔ روسی زبان سے خارج کر دیا۔ اس نے دیہاتی گیتوں اور افسانوں کو اپنی تحریروں میں جگہ دی۔ پشکن روسی ادبیات کی تاریخ میں سلاست، روانی اور اسلوب کا موجد ہے۔ اس کے نزدیک نثر کی بہترین خوبی اختصار اور جامعیت ہے۔ اس نے عوام کی زبان کو روس کی ادبی زبان بنا دیا۔ روسی ادبیات میں یہ معیار آج تک قائم ہے روسی ادبیات میں پشکن کا اثر ہر جگہ نمایاں ہے۔ پشکن کی تحریروں کے مختلف پہلوؤں کو انیسویں صدی کے روسی ادیبوں نے بہت زیادہ وسعت دی۔ اس کی جامعیت، اختصار اور اسلوب نے ترجنیف اور طالستائی کو ناول نویسی میں بہت زیادہ مدد دی۔ "وہ میری مشعل راہ ہے......... وہ میرا استاذ ہے۔ ترجنیف نے پشکن کے متعلق کہا۔ طالستائی کہتا ہے۔ کہ پشکن اس کا استاذ ہے۔ ترجنیف اور طالستائی کو روسی ادبیات میں نمایاں درجہ حاصل ہے۔ اور دونوں ادیبوں اور مفکروں کی رائے سے پشکن کی ذہانت اور قابلیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ ترجنیف اور طالستائی کے علاوہ روس کے دو مزید ادیب پشکن کے معبد فکر میں سربسجود دکھائی دیتے ہیں۔

پشکن کو غریبوں اور بے نواؤں سے جو ہمدردی تھی اسے اس نے "سٹیشن ماسٹر" میں جی کھول کر بیان کیا ہے۔ یہی حکایت گوگل اور داستوفسکی کے لئے رشد و ہدایت کا ذریعہ ثابت ہوئی۔ "میں نے لکھتے وقت پشکن کو ہمیشہ اپنے پیش نظر رکھا ہے" گوگل نے کہا۔ پشکن کی کتاب "گوریوخین" سالتی کوف کو نگاری کا باعث ہوئی۔ اس کتاب میں پشکن نے غلام کسانوں کو زبوں حالی اور واژگوں بختی پر آنسو بہائے ہیں۔ پشکن ہی نے نکراسوف کو سیاسی منظومات کی راہ دکھائی۔

روس کے اشتراکی ادیب میکسم گورکی نے "روسی ادبیات کے باپ" پشکن سے بہت کچھ سیکھا۔ روسی ادب اور روسی تمدن کی تاریخ میں پہلی مرتبہ پشکن نے "انسان" کے لفظ سے عوام کو آشنا کرایا۔ روسی ادبیات میں پشکن پہلا ادیب ہے جس نے انسانیت، آزادی، مساوات اور انفرادی حق مسرت کا اعلان کیا۔ پشکن کی تحریروں میں انسانی محبت کا جذبہ صاف طور پر دکھائی دیتا ہے پشکن کے مطالعہ سے قارئین کے دلوں میں بدی اور ظلم کے خلاف جہاد کرنے کی سپرٹ پیدا ہوتی ہے۔ پشکن کے ڈراموں کو انگلستان، جرمنی اور ہسپانیہ میں کھیلا گیا۔ اس کی تحریروں میں بین الاقوامی ادب کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔

پشکن نے یورپی فکر کے تمام رجحانات کا بڑے غور سے مطالعہ کیا۔ اس نے مغربی یورپ کی تحاریک حریت میں بہت زیادہ دلچسپی لی۔ اس کے کتب خانہ میں سین سائمن، والتیر، دائیدرو، بال باخ روسو اور دوسرے انقلاب پسند مفکروں کی کتابیں دکھائی دیتی تھیں۔ وہ انگلستان کے بائیرن کی طرح یونان کی جنگ آزادی کا بہت بڑا حامی تھا۔ ہسپانوی انقلاب پسندوں کے رہنما ریگو کی موت پر اس نے ایک پر جوش نظم لکھی وہ پہلا روسی مصنف ہے۔ جس نے روس کی اقلیتوں کو غیر ملکی قرار نہیں دیا۔ وہ اپنی بین الاقوامیت کی وجہ سے روس اور یورپ میں یکساں طور پر محبوب ہے۔ شوریٰ روس کے لوگ پشکن سے بہت محبت کرتے ہیں۔ وہ پشکن کو لینن کی طرح روس کا نجات دہندہ تصور کرتے ہیں۔ لینن کو پشکن سے جس قدر محبت تھی۔ اس کا اندازہ کروپسکایا کے ان الفاظ سے لگایا جا سکتا ہے۔

"میں اپنے ہمراہ پشکن، لرمون توف، اور نکراسوف کی کتابیں سائبیریا لے گئی۔ لینن ان کتابوں کو بار بار پڑھتا...... سب سے زیادہ مطالعہ اس نے پشکن کا کیا۔"

روسی ادبیات میں پشکن کی اہمیت کا اندازہ لگانے کے لئے اس زمانہ کی روسی سیاسی تاریخ کا مطالعہ ضروری ہے۔ پشکن کی ذہانت نے یورپ میں انقلابی رد عمل کے زمانہ میں تربیت پائی۔ جب روس میں

زاریت اور جاگیرداری نے عوام سے زندہ رہنے کا حق چھین رکھا تھا۔ اسی زمانہ میں پوپ، زار، میٹرنخ اور گوزونے اشتراکیت کے خلاف ایک محاذ قائم کیا ہوا تھا۔ روس کے تمدنی ارتقا کو اشرافیہ اور دفتری حکومت نے روک رکھا تھا۔ اس زمانہ میں روس کے بہترین دماغ روسی اشرافیہ کو روس کے لئے غیر ضروری خیال کرتے تھے۔ وہ ذمہ دار حکومت کا مطالبہ کرتے تھے۔ روسی تاریخ جاگیرداری کا یہ دوسرا دور ہے۔ جاگیرداروں کے خلاف نفرت و حقارت پیدا ہو چکی تھی۔ روسی زاروں نے چاہا کہ فرانس کے لوئی چہاردہم کی طرح روس کے شاعروں سے شاہیت کی حمایت، تاج و تخت کی طرف داری، اور اشرافیہ کی اطاعت پر قصائد لکھوائیں۔ اور جلد ان قصائد کو عوام میں عام کر دیں۔ تاکہ ذہنی طور پر ان میں زاریت کے خلاف بغاوت کرنے کا وہم و گمان بھی پیدا نہ ہو سکے۔ کہ زاریت نے چاہا۔ کہ پشکن کو خرید لے۔ لیکن تاج و تخت، غرور و فکر خریدنے میں ناکام رہے۔ پشکن نے زاریت اور روسی اشرافیہ کے خلاف قلم اٹھایا۔ اسے اپنے مقصد میں کامیابی ہوئی۔ زاریت نے پشکن کو اپنے راستہ سے ہٹانا چاہا۔ اس کی المناک موت کو کسی صورت میں بھی اتفاقی حادثہ نہیں کیا جا سکتا۔ نکولس اول جب پشکن کی روح خریدنے میں ناکام رہا۔ تو اس نے اس کے جسم سے انتقام لیا۔ وہ ایک سازشی کی گولی کا نشانہ بنا۔ زاریت نے اسے ۳۷ برس سے زیادہ اس دنیا میں نہ رہنے دیا۔

پشکن کی نظم "سائبیریا کے نام" روسی ادبیات میں بہت ممتاز درجہ رکھتی ہے۔ زاریت کے بے پناہ مظالم کے خلاف آواز بلند کرنے والوں کو شاہیت سائبیریا کے برفستانوں میں دھکیل دیتی۔ روس کے بہترین مصلح، شاعر اور ادیب اس برفستان میں زندگی کاٹ چکے ہیں۔ سائبیریا کی برفانی ہوائیں بھی اس آتشِ انقلاب کو سرد نہ کر سکیں جو ان کے سینوں میں بھڑک رہی تھی۔ پشکن سائبیریا کے برفستانوں میں زندگی کاٹنے والے روسی بہادروں کو پیام دیتا ہے:۔

سائبیریا کے برفستانوں میں
اس آگ کو سرد نہ پڑنے دو،
جو سلگ رہی ہے۔
تمہارے سینوں میں۔
یہ مصائب و نوائب،
ختم ہونے پر۔
راحت ہوگی اور سرور
بغاوت کے خیال کو
نہ جھکنے دو۔۔۔۔۔
بڑی بڑی زنجیریں
جنہیں،
پہن رکھا ہے تم نے
ٹوٹ جائیں گی،
بہت جلد
آزادی،
بلا رہی ہے تمہیں،
اپنی طرف"

جون ۱۹۳۸ء میں روس کے اس مایۂ ناز شاعر و ادیب کی صد سالہ برسی منائی گئی۔ تاجیکوں، ازبکوں اور کرغیزوں نے اپنی اپنی زبان میں پشکن کے اشعار پڑھے۔

ہندوستان ہنوز کسی پشکن کی تلاش میں ہے!

جناب ادیب مالیگانوی

سرگذشت

داستاں حسن کی، یا عشق کا افسانہ کہوں
شمع کا ذکر کروں، قصۂ پروانہ کہوں

مست و رنگین فضاؤں کا تقاضا یہ ہے
کہ سرِ بزم حدیثِ مئے و پیمانہ کہوں

گرمیٔ شوق ہوئی موجِ ہوا سے افزوں
اب کہاں تاب کہ حالِ دلِ دیوانہ کہوں

ذرّے ذرّے میں ہو تجلی کا تلاطم پیدا
یوں حکایاتِ جمالِ رخِ جانانہ کہوں

شعر میں کوثر و تسنیم کا نقشہ کھینچوں
یا کسی گیسوئے خمدار کا افسانہ کہوں

ذکر اس جلوہ گہ ناز کا ہو زیبِ بیاں
قصۂ طور بانداز کلیمانہ کہوں

عقل کہتی ہے کہ ہر دشت کو گلزار سمجھ
عشق کہتا ہے، کہ ہر باغ کو ویرانہ کہوں

انقلاباتِ زمانہ کا دکھاؤں منظر
یا باسلوبِ دگر گردشِ پیمانہ کہوں

یا سناؤں دلِ ناکام طلب کا احوال
یا غمِ کشمکشِ کعبہ و بت خانہ کہوں

کوششِ ہوش کہاں اور کہاں ذوقِ جنوں
کیا کہوں اس کو، جو نیرنگیٔ دنیا نہ کہوں

ماجرا "عہدِ تمنا" کا سناؤں ہمدم!
جس کو مشکل سے بھلایا ہے وہ افسانہ کہوں

ہے مجھے شکوۂ بیقدریٔ احساس بہت
کس کو ہمدرد بناؤں، کسے بیگانہ کہوں

زندگی میری ہے بربادیٔ غم کا مظہر
اس کشاکش میں ہوں، اے دوست کہوں یا نہ کہوں

کیا غلط ہے ترے ہوتے ہوئے اے جذبۂ دل
محفلِ دہر کو اجڑا ہوا کاشانہ کہوں

کوئی تقریب ہو میرے لئے ناممکن ہے
کہ کسی رنگ سے کیفیتِ "سلمیٰ" نہ کہوں

لب کشائی کا کوئی اذن تو دیتا ہے ادیب
دل یہ کہتا ہے، کہ کیا کیا کہوں کیا کیا نہ کہوں

حاجی لق لق

ماڈرن غزل

(حاجی لق لق کے قلمی دیوان سے)

بیٹھا ہوں ترے در پہ ترقی نہیں ہوتی　درباں کے لئے کیا کوئی سیڑھی نہیں ہوتی
کاشانۂ ہستی کے لئے برق ہے لازم　بیکار ہے وہ گھر جہاں بجلی نہیں ہوتی
کیا جائیے اس بزم میں افلاس نے مارا　موجود جو اچکن ہو تو ٹوپی نہیں ہوتی
بیتاب تو ہوں دشتِ جنوں کے لئے لیکن　سڑکیں نہیں ہوتیں وہاں بجری نہیں ہوتی
پروردۂ دہقاں ہمیں لادے کوئی للہ　ہوٹل کی شرابوں سے تسلی نہیں ہوتی
کیوں کوچۂ جاناں میں سدا اٹھتے ہیں فتنے　کیا قرب میں پولیس کی چوکی نہیں ہوتی

دل بخش دو لق لق انہیں یا کورٹ میں جاؤ
یہ روز کی تکرار تو اچھی نہیں ہوتی

والٹر سکاٹ

مترجمہ محترمہ انوری خانم نائب مدیرۂ "تنویر"

شیرخوار سرہنگ زادے کی آیا کی لوری!

دم بخود سکوت میں خواب راحت کے مزے لے میرے ننھے!
تیرا پدرِ محترم اک "نائٹ" تھا۔ اور تیری والدہ ماجدہ اک ذی وقار خاتون!
پہلا، جلالِ مردانہ کا مجسمہ تھا، اور دوسری جمالِ نسوانی کی پیکر! ایک بیدار مغز تھا، دوسری گرم دل!
اس قصر کے برجوں اور جھروکوں سے جو باغ و کشت نظر آتے ہیں۔ وہ سب تیرے باپ کی قلمرو تھے' اور اب تیری میراثِ امیرانہ!
ہاں بگل کی آواز پر جھجک مت! ـــ یہ صرف ان سپاہیوں کیلئے تنبیہ بیداری و ہشیاری ہے جو تیری آرامگاہ کے پاسبان ہیں!
قبل اس کے کہ کوئی غنیم تیرے بستر کی طرف گستاخانہ قدم بڑھائے ان پاسبانوں کی کمانیں دہری ہو جائیں گی اور ان کے نیزے رنگین!
ہاں ابھی چند روز اور خوابِ نوشیں سے لطف اٹھا' وہ وقت قریب آ رہا ہے کہ اس خوابِ نوشیں کو طبلِ جنگ کی چوب برہم کر دے گی!
ہاں میرے بچے! خوابِ شیریں کے دو ایک جرعے اور! اب چند ہی روز جاتے ہیں کہ تیرے بلوغ کی صبح ہے' اور تیری مردانگی کی بیداری!"
طفلی کا لہو و لعب جوانی کی معرکہ آرائیوں سے بدل جانے والا ہے!

[redacted]

جناب ناکارہ حیدرآبادی

میں کون ہوں؟

دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو . میری سنو جو گوش نصیحت نیوش ہے

ایک پولیس کے عہدیدار بہت نخوت گیر واقع ہوئے تھے ان کی گالیاں ان کے ڈنڈے کی طرح موٹی ہوتی تھیں، جس تعلقہ پر ان کو مسلط کیا جاتا اس کے تمام باشندے آٹھوں پہر الامان والحفیظ کا ورد کرتے رہتے۔ کسی خطاکار کو آپ کے حضور میں پیش کیا جاتا، تو اس کے اوسان اور مثانہ کمزور ہوتا تو ایک سیال شے بھی خطا ہو جاتی، اس کو نئی نئی گالیاں دیکر فرماتے" میں کون ہوں، معلوم ہے .؟ میں کون ہوں؟ میں بڑا خبیث ہوں، معلوم، میں بڑا اسؤر ہوں!"

تو عرض یہ ہے کہ میں اس قماش کا آدمی نہیں ہوں اور نہ اتنا صاف گو بن سکتا ہوں، اب آپ پوچھیں گے، کہ آپ نہ یہ ہیں اور نہ وہ تو پھر آپ ہیں کون ؟ تو اس کا جواب یہ ہے. میرا حلیہ یہ ہے. گال پچکے ہوئے، آنکھوں کے گرد حلقے پڑے ہوئے، سر کے بال بےحد بڑھے ہوئے، کیونکہ مہینوں ان کو حجام کی قینچی کی صورت دیکھنی نصیب نہیں ہوتی، ہندوستانی ایکٹروں کے بال میرے بالوں کے مقابل میں بھلا کیا چیز ہیں! جی میں آیا اور پیسے پاس ہوں تو داڑھی اور مونچھیں فنا فی الفیشن، ورنہ دونوں بے توجہی کے مارے یوں اگتے چلے جائیں گے جیسے غالب کے در و دیوار سے سبزہ، غرضکہ میری تعریف یہ ہے بال زیادہ آدمی کم۔

تعجب ہے آپ مجھے نہیں پہچانتے. میری شہرت شہر کے چار خانوں میں بہت ہے. جہاں بے فکرے اور شاعر گپیں اڑاتے دکھیا ہانکتے نظر آتے ہیں، شہر کے ان باخبر حلقوں میں، میں مشہور اپنے بال یا چال ڈھال کی وجہ سے نہیں ہوں، بلکہ کچھ اس لئے کہ ایک نشست میں ۲۰، ۲۵ چاء کی پیالیاں پینے میں مجھے ید طولیٰ اور لچکدار معدہ حاصل ہے اور کچھ اس لئے کہ سگرٹ پے درپے نوش کرنے میں بھی بہت کم حریف رکھتا ہوں، لیکن میری چار خانہ کی شہرت کو جس چیز نے چار چاند لگا دیئے وہ در اصل میری شاعری ہے۔

جی ہاں! میں ایک شاعر ہوں، بہت بڑا شاعر. وہ شاعر ہرگز میرے ہم پلہ نہیں ہو سکتے. جو آجکل زمین کی پیٹھ کا بوجھ بنے ہوئے ہیں، میرے خیال میں صاحب کمال وہی ہے. جو چاء پئے اور عمدہ شعر اگلے، آپ ذرا خیال تو کیجئے، کتنے ہوٹل نشین افراد چاء پیتے پیتے شاعر بن گئے۔ درحقیقت چار خانہ کا ماحول ہوتا ہے کچھ ایسا شاعرانہ کہ عجب نہیں وہاں کے چوہوں میں بھی شاعرانہ صلاحیتیں پائی جاتی ہوں، مجھ سے پہلے بھی چار خانے بلند پایہ شاعر پیدا کرتے آئے ہیں. لیکن میری شاعری سے وہاں انقلاب آگیا، چاء میں ڈوبی ہوئی دنیائے شعر کا رنگ بدل گیا۔

میرا گاکر کلام سنانے کا انداز دور دور مشہور ہے. میرے دشمن تو کہتے ہیں کہ میں شاعر کی بہ نسبت قوال سے قریب تر ہوں، لیکن دشمنوں سے اس کے سوا اور کیا توقع کیجئے. ایمان نگلنا اور انگارے تھوکنا اور چیز ہیں. اور داد سخن دینا اور چیز. سب اس نکتہ کو تھوڑا ہی سمجھ سکتے ہیں کہ شعر اسی وقت مکمل معلوم ہوتا ہے. جب موسیقی سے اس کو تقویت دیجائے. میں اردو شاعری کے محسنوں میں ہوں. جنہوں نے تغزل اور ترنم کو توام بنادیا۔

چار خانہ میں جنم لینے والے شاعر کا آخری ٹھکانا مشاعرہ ہوتا ہے چار خانہ کا شاعر جلد یا بدیر مشاعرہ کا شاعر ہو کر رہتا ہے. میرے جوہر بھی چار خانہ کی چار دیواری کے اندر گھٹے رہنے سے انکار کرنے لگے تو مشاعرے کا میدان مجھے بہت وسیع نظر آیا، میں نے کتنے ہی مشاعروں میں قیامت برپا کی ہے. اب عوام میرے ہاتھ اور شہرت میرے قدم چومتی ہے. میرا کلام غلطیوں سے پاک اور دوسرے شاعر میری نظر میں خاک. ہمعصروں تو بہت سے ہیں لیکن ہمسر کوئی نہیں

مجھے ایک اور خصوصیت سے پہچانئے۔ کئی کئی دن میں اپنے گھر سے غائب رہتا ہوں۔ میرے گھر والے بالکل پریشان نہیں ہوتے، انہیں میرے غیاب پر یہ خیال کبھی نہیں آتا کہ کہیں مجھے کوئی حادثہ تو پیش نہیں آیا یا گرفتار تو نہیں ہو گیا، اس لئے کہ انہیں معلوم ہے کہ دوست احباب کے گھر کئی کئی دن مجھے رہنے کی عادت ہے، مجھے تو یاد نہیں پڑتا کہ مسلسل ایک ہفتہ میں نے اپنے گھر گذارا ہو۔ زندگی اپنے دوستوں کے لئے وقف کر دی ہے۔ اس لئے ان کی صحبت میں دن رات بیٹھنا میرا فرض ہو جاتا ہے آپ پوچھیں گے کہ ان کے پاس وقت کیسے کٹتا ہے۔ برج کھیلنا، چائے پینا، کلام سنانا، لطیفے کہنا، کھانا پینا، لڑکیوں کے تذکرے کرنا، اپنے کارنامے بیان کرنا، دوسروں کی پگڑیاں اور اپنا نام اچھالنا، سگریٹ پینا، سگریٹ پینا اور سگریٹ پینا! ہماری بیٹھک یا زیادہ صحیح ہماری لئیک کے پاس جلے ہوئے سگریٹ کے ٹکڑے یوں نظر آتے ہیں جیسے میدان جنگ میں نعشیں۔ میری ان مصروفیات پر نہ میرے گھر والے زبان ہلا سکتے ہیں، اور نہ میرے دوستوں کے سرپرست۔ اس لئے کہ میں ایک بڑا آدمی مانا گیا ہوں اور بڑے آدمی اپنی جوانی میں یونہی اپنی زندگی گذارا کئے ہیں۔ یقین ہے کہ یہ لمحات جو میں نے اپنے دوستوں کے گھر میں گزارے ہیں، عبادت میں شمار ہوں گے۔

مجھے طوائفوں سے بہت دلچسپی ہے۔ جو شخص ہماری معاشرت کی اصلاح کا علمبردار ہو۔ وہ مجھے الزام نہیں دے سکتا۔ طوائف ہماری سماج کی ریڑھ کی ہڈی ہے۔ اس لئے میں اسے بہت اہمیت دیتا ہوں میں نے ان کے حلقوں کا دورہ کر کے حالات کا گہرا مطالعہ کیا ہے۔ اور تحقیق و تدقیق سے کام لیا ہے۔ آئے دن ہماری زبان میں تذکرے شائع ہوتے رہتے ہیں۔ تذکرۂ شعراء، تذکرۂ ادباء، میرا ارادہ ہے کہ ایک مبسوط تذکرۂ طوائفین مرتب کروں۔ یہ اپنی قسم کا پہلا تذکرہ ہوگا۔ اور اپنی نوعیت کے لحاظ سے ہاتھوں ہاتھ لیا جائے گا۔ جو حضرات اس موضوع سے دلچسپی رکھتے ہیں، وہ اس کارِ عظیم میں میرا ہاتھ بٹائیں۔ تو میں ایک گرانقدر قومی خدمت انجام دینے کے قابل ہو جاؤں گا۔ میں مر جاؤں گا، مگر میرا نام تو اس زبردست سماجی کارنامے کی بدولت بھی زندہ رہ جائے گا، اور آنے والی نسلیں میرا نام عزت و احترام سے لیں گی۔

دیکھئے یہاں آپ کو دلچسپی اور بوالہوسی میں امتیاز کرنا پڑے گا مجھے تکلیف پہنچتی ہے۔ جب میں ملک کے نوجوانوں کو طوائفوں کے کوٹھوں کے چکر کاٹتے، یا ریڈیو سٹیشن کے پاس اچھے اچھے کپڑے پہن کر گانے والیوں کی ایک آدھ جھلک دیکھنے کے لئے انتظار کرتے دیکھتا ہوں، ایسی حرکتوں سے ہمارے قومی ناموس پر حرف آتا ہے، بہتر تو یہ ہے کہ ایسے نوجوان جو دل کے ہاتھوں مجبور ہو گئے ہیں، میری خدمات اور معلومات سے استفادہ کریں میں ان کو بتلا سکتا ہوں، کہ کون طوائف اچھا گاتی ہے، کون باتیں دلچسپ کرتی ہے کون ایک شریف آدمی کی دوستی کے لائق ہے کون نغمہ سرائی اور نیش زنی میں مچھر کی ہم پیشہ ہے۔

میری شہرت چار خانوں سے نکلی اور کوٹھوں تک جا پہنچی ہے۔ وہ طوائف جو مجھے نہیں جانتی یا نہیں پہچانتی۔ کئی طوائفیں میری غزلیں گاتی ہیں۔ پان کھلاتی ہیں اور میری پُرلطف گفتگو سنتی ہیں۔ اور جب میں اپنا یہ تلخ تجربہ بیان کرتا ہوں، تو ہنسی کے مارے لوٹ پوٹ ہو جاتی ہیں کہ کس طرح ایک روز مجھے خبر ملی تھی کہ ایک نئی طوائف شہر میں آئی ہوئی ہے اور فلاں طوائف کے کوٹھے کے پاس ایک مکان میں مقیم ہے اور کس طرح میں یہ سنکر دوسرے ہی روز رات کو اس سے ملنے پہنچا تھا۔ اور مکان میں دستک دیئے بغیر گھسنے ہی والا تھا، کہ ایک شخص باہر نکلا۔ اور کس طرح اس نے یہ معلوم کر کے کہ اس کے مکان کو ایک طوائف کا مکان سمجھا جا رہا ہے مجھے بدمعاش اور دیگر خطابات دینے کے بعد قانون اور جوتہ اپنے ہاتھ میں لینے کا ارادہ کیا تھا۔ اور کس طرح میں موقع کی نزاکت کا احساس کر کے ساری قوتوں کو ٹانگوں میں مجتمع کر کے چوکڑیاں بھرتا نظر آیا تھا۔

اکثر اوقات میں ہندوستانی فلموں کے نقاد کے روپ میں بھی جلوہ گر ہو جاتا ہوں۔ تعلیم حاصل کرنے کا ایک مقصد یہ ہے کہ دوسروں کو اس سے فائدہ پہنچایا جائے۔ سینما کے منتظمین میرے علم سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ اور دکھائے جانے والے فلموں پر مجھ سے تنقیدیں لکھواتے ہیں، اور مجھے فری پاس دیتے ہیں۔ مدیرانِ اخبارات و رسائل اس خیال سے کہ اشتہار مل جائیں گے۔ میری تنقیدیں شائع کر دیتے ہیں۔ مصلحت میری اور مدیر اخبار دونوں کی متقاضی ہوتی ہے کہ تنقیدیں محض تعمیری ہوں، جن میں ان کی فلموں کی تعریف ہی تعریف ہو۔ اس طرح میرا اور مدیر دونوں کا کام سہولت سے چلا آتا

ہے۔ اب آپ ہی بتایئے، کہ اگر میں کسی خراب فلم کو اپنے تبصرہ میں خراب بتاؤں، تو آئین تنقید کی رو سے تو یہ درست کہا جا سکتا ہے۔ اور میرے فکر و نظر کے بارے میں بھی اچھی رائے قائم کی جا سکتی ہے لیکن حکمت عملی کے تقاضے بھی تو کوئی چیز ہیں، فری پاس کی کشش کی مزاحمت کا کس کو دماغ ہے؟

آپ نے ابھی تک مجھکو نہیں پہچانا؟ تو ذرا اس شاندار اور آباد سڑک تک شام کے وقت زحمت کیجئے۔ جس کو ٹھنڈی سڑک کہہ سکتے ہیں۔ آپ شام کو مجھے کسی ہوٹل یا شاپ کے سامنے کھڑا ہوا پائیں گے۔ دو ایک یار دوست ساتھ ہوں گے۔ پان چباتے اور ایک سگرٹ سے دوسرا سگرٹ جلاتے ہوئے ـــــ خدا بھلا کرے ملکی صنعت سگرٹ سازی کا، کہ اس نے سگرٹ بے حد سستے کر دیئے ہیں اور فن سگرٹ نوشی کو خوب فروغ دیدیا ہے ـــــ ریڈیو سن رہے ہونگے سر کے بال محنت سے جمے ہوئے ہوں گے۔ ٹوپی ہاتھ میں ورنہ جیب میں ورنہ گھر ہی میں ہوگی۔ آنے جانے والے پر تنقید یا نکتہ چینی ہو رہی ہوگی میری بذلہ سنجیاں سڑک اور فٹ پاتھ کو دیوار قہقہہ بنا رہی ہونگی، موٹروں کے بلتے یا لہراتے ہوئے پردوں پر ہماری نظریں جمی ہوئی ہوں گی، بعض خاص موٹروں کے نمبر ذہن کی ڈائری میں نوٹ ہو رہے ہونگے۔ کہ وقت ضرورت کام آئیں۔ گذرنے والی بے پردہ لڑکیوں خصوصاً اینگلو انڈین اور پارسی لڑکیوں کی نجی زندگی پر ہوس انگیز تبصرے میری صدارت و نگرانی میں ہو رہے ہونگے۔ زندگی نام ہے۔ حرکت کا، اور جب ایک ہی جگہ کھڑے کھڑے پیر سن اور دماغ کند ہو رہا ہوگا۔ تو چہل قدمی اس سڑک پر شروع ہو جائے گی۔ میری پارٹی کے اور زندہ دل افراد جابجا ملتے جائینگے کالج کے رفیق نظر آئیں گے۔ موقع ملا تو میں سر راہ ہی اپنا تازہ کلام ملکے سروں میں گاتا جاؤں گا۔ اور اس "سڑک چھاپ" چلتے پھرتے مشاعرہ میں میرے ایک ایک مصرعہ پر تحسین و ستائش کا جو شور ہو رہا ہوگا اس کو سن کر لوگ گردنیں موڑیں گے۔ غرض کہ یہ فرحت افزا مصروفیات جاری رہیں گی، یہاں تک کہ رات ہو جائے گی اور میری تحریک پر غیر رسمی طور پر اعلان کیا جائے گا۔ کہ بھائی مسلمانو! آج کا جلسہ برخاست کل ہمارا جلسہ لب سڑک، حسب معمول شام کو پھر منعقد ہوگا ـــ آپ حضرات سے شرکت اور دلکشا تفریح کی مخلصانہ استدعا کی جاتی ہے ـــ!

کیا برا کرتا ہوں، اگر ان خوشگوار لمحات کو حاصل زندگی سمجھتا ہوں؟

تعلیم آپ نے حاصل کی لیکن کیا فائدہ اگر آپ نے اپنے تعلیمیافتہ ہونے کا ثبوت علانیہ نہ دیں۔ مجھے دیکھئے۔ جب باہر نکلتا ہوں تو انگریزی کی ایک آدھ موٹی کتاب میری بغل میں ہوتی ہے۔ ایسی کہ کتاب کا نام پوچھنے والوں پر رعب پڑے، اردو کتابیں بھی کبھی کبھی ساتھ رکھتا ہوں تاکہ لوگ سمجھیں کہ مادری زبان ہی سے غفلت برتتا ہوں لیکن سچی بات تو یہ ہے۔ کہ ترجیح ہمیشہ انگریزی کتابوں کو حاصل ہے۔ کہ اس کا مقصد یہ باور کرانا ہوتا ہے۔ کہ انگریزی کی قابلیت بھی اس خاکسار کی ماشاء اللہ لاجواب ہے۔ برٹرینڈ رسل یا جی کے چسٹرٹن یا ایچ جی ویلز جیسے انگریزی مفکرین کی کتابیں، جب آپ بغل میں دابے یا ہاتھ میں ہلاتے سڑکوں پر نظر آئیں گے۔ تو کوئی بے وقوف ہی ہوگا۔ جو یہ خیال دل میں لائے گا کہ آپ کی انگریزی کمزور ہے یا آپ محض نام و نمود کی خاطر ایسی کتابیں لئے لئے پھرتے ہیں، المختصر یہ کہ یہ ایک نازک نفسیاتی مسئلہ ہے۔ اب آپ دریافت فرمائیں گے، کہ نیلی پیلی خوشنما جلدوں کی جو انگریزی کتابیں میں رکھتا ہوں، ان کو میں نے پڑھا بھی ہے یا نہیں۔ اور اگر پڑھا بھی ہے۔ تو کچھ سمجھا بھی ہوں یا نہیں تو جناب فرصت کا سوال در اصل اب سوال ہے جس نے میرے شوق مطالعہ کو ہمیشہ کچلنے کی کوشش کی اور ان کتابوں کے ایک دو صفحات سے زیادہ پڑھنے نہ دیا۔ یہاں تک کہ کتابوں کے واپس کرنے کا وقت آ گیا۔ اس کے علاوہ ایسے مصنفوں کی دقت پسندی سے میرا دم الجھنے لگتا ہے۔ بہرحال میں تو یہ عقیدہ نہیں رکھتا، کہ جو بھی کتاب مانگ لائی یا چرائی جائے، اس کو شروع سے آخر تک پڑھنا کسی شریف آدمی کا فرض ہے۔ تاہم نیک نیت قارئین کرام کو خوش کرنے کی غرض سے وعدہ کرتا ہوں کہ دوست: دل کے معاملے اور شاعری مہلت دے، تو بغل کی گرمی پانے والی اور ہاتھ کے پسینے سے تر ہونے والی ان بلند پایہ انگریزی کتابوں کو واپس کرنے یا کھو دینے سے قبل پڑھ کر سمجھنے کی کوشش کروں گا انشاء اللہ المستعان۔

تمام باکمال انسان لاابالی بے پروا۔ بے حس۔ اور اہل زمانہ کو خاطر میں نہ لانے والے گزرے ہیں۔ میں خود ستائی نہیں کرتا لیکن کیا کروں!

یہ سب خوبیاں میرے اندر موجود ہیں۔ ایک روز رات کے ایک بجے سینما سے واپس ہوا، غلطی یہ کی کہ دوست کے ساتھ اس کے گھر جانے کے بجائے اپنے گھر آ گیا۔ دروازہ بند تھا۔ آوازیں دیں۔ دل میں گالیاں دیں، اور زیرِ لب کوسنے دیئے۔ لیکن میرا چیخنا چلانا، صدا بہ قبرستان ثابت ہوا دیکھئے تو سہی اکلوتے باپ کے بیٹے سے ـــــ میرا مطلب ہے، باپ کے اکلوتے بیٹے یعنی اس ناچیز سے گھر والے کتنے بے پروا ہیں! شنوائی نہ ہوئی تو واپس چلا آیا۔ گھر کے پاس ایک دکان تھی۔ شیروانی اتار ڈالی، دکان کے چبوترے پر لیٹ گیا، اور شیروانی اوڑھ لی اور شیروانی کے موجد کو دعائیں دیتا ہوا سو گیا۔ کہ خدا اسے جنت نصیب کرے، اور وہاں بھی شیروانی کا فیشن رائج کرنے کی توفیق عطا کرے، کیا ہی مفید چیز ایجاد کی ہے۔ کہ بہ یک وقت لباس بھی ہے اور لحاف بھی ـــــ تو کہنے کا مطلب یہ ہے کہ "سنک" اور "ترنگ" بھی سے مجھ میں پیدا ہے جو لاریب بڑے آدمی کی نشانی ہے۔ پہلے لباس بہت اچھا اور پاک صاف پہننے میں وقت ضائع کرتا تھا۔ پائجامہ کی استری ذرا بھی خراب ہوتی، تو چہرے پر بھی شکن پڑ جاتی، یہ دلیل تھی میری سطح بنی اور اوچھے پن کی، لیکن جوں جوں شعور آتا گیا۔ لباس کی طرف سے اور امور کی طرح بے پروائی منتہا کو پہنچنے لگی، اب میلے سے میلے کپڑے پہنتا ہوں کہ صاحب کمال (ـــــ) کی مثال ہمیشہ پیش نظر رہتی ہے۔ اس لئے اب جہاں ظاہر بین نظریں میرے اندر مجذوب کو پرورش پاتا دیکھتی ہیں، وہاں چشم بینا رکھنے والے سر اور کلے کی انگلی ہلا کر کہتے ہیں، کہ یہ نوجوان ضرور کچھ ہو کر رہے گا۔ خدا اس کی عمر دراز کرے!

قصہ مختصر میں وہ ہوں جو اب تک چار پی کر شعر کہتا آیا ہے لیکن جس کی کہنہ مشقی اب شراب کا عادی بننے کا مطالبہ کرتی ہے۔ میں وہ ہوں جس نے استادوں سے سرکشی کی اور طوائف یا تفریح پسند لڑکی کے سامنے سر جھکایا۔ جس کی ذہنی و اخلاقی کیفیت کے ہر طرف چرچے ہیں جو ریل میں بغیر ٹکٹ کے سفر کرنے کو اپنا پیدائشی حق سمجھتا ہے۔ جو قابلیت کے باب میں کسی سے نہیں دبتا بلکہ ساری دنیا کو اپنے تگے گرد سمجھتا ہے۔ جو غلامی یعنی ملازمت کو بہت بری نظر سے دیکھتا ہے لیکن دوست احباب اور خصوصاً ازلی رفیق پیٹ کے اصرار سے ہر محکمہ کو ایک عدد درخواست برائے ملازمت کے وصول کرنے کا شرف بخش چکا اور بخشتا ہے۔ جس کا نام بدمعاش پولیس کی ڈائری میں، ورنہ پھر اخبارات کے صفحات پر نظر آتا ہے، اس لئے نہیں کہ شہرت چاہیئے بلکہ اسلئے کہ اس کے نام کی برکت سے اخبار کا وقار اور اشاعت بڑھتی ہے۔ جو خدا آپ کو نیکی دے قومی سرگرمیوں میں بھی پیش پیش رہنا چاہتا ہے۔ لیکن ایک انجمن سے دوسری انجمن میں اپنا تبادلہ کراتا رہتا ہے۔ اس لئے کہ اسکے معیار کے عقلمند روشن ضمیر اور مخلص رفیق کار کی جستجو اسے ہمیشہ رہتی ہے جو پروپگنڈے اور ڈنڈے دونوں کا قائل ہے، اس لئے کہ یہ حربے اسکے خلاف اکثر اوقات استعمال کئے گئے اگر نہیں تو کئے جانے والے تھے یا ہیں۔ جو اپنے لئے . . . . .

اب بھی آپ نے مجھے نہیں پہچانا! توبہ ہے! کیا کند ذہن واقع ہوئے ہیں آپ! یہ معمہ ایسا کیا مشکل تھا! اس کا جواب آپ کو اب تک نہ سوجھا، کہ میں کون ہوں! اچھا تو سنئے ـ

میں عہدِ جدید کا ایک بے روزگار گریجوئیٹ ہوں، جسے رزق ہے نہ موت!

جناب منشی پیارے لال صاحب شاکر

غزل

ایک دن چین سے بسر نہ ہوئی — عمر سی عمر عمر بھر نہ ہوئی
ہاتھ مل مل کے رہ گئی تقدیر — کوئی تدبیر کارگر نہ ہوئی
اب کے صدمے جو عشق میں جھیلے — ایسی تکلیف عمر بھر نہ ہوئی
دل میں دل کی طرح ہے درد ترا — یہ امانت اِدھر اُدھر نہ ہوئی
خون بہتا رہا ہے آنکھوں سے — آستیں کب لہو سے تر نہ ہوئی
ساتھ پیری میں سب نے چھوڑ دیا — عمرِ رفتہ بھی ہمسفر نہ ہوئی
تجھ کو دیکھا تو دیکھتے نہ بنا — چشم بینا ہوئی مگر نہ ہوئی
لے گئے دل وہ باتوں باتوں میں — لٹ گیا گھر مجھے خبر نہ ہوئی
لاکھ آنسو بہائے آنکھوں نے — کم مری سوزشِ جگر نہ ہوئی
یہ بھی میرے نصیب کی ہے کجی — کبھی سیدھی تری نظر نہ ہوئی
مل گئیں خاک میں تمنائیں — نگہِ لطفِ یار ادھر نہ ہوئی
یہ حمیّت ہے اور یہ غیرت ہے — آہ منت کشِ اثر نہ ہوئی
کون ہوں کیا ہوں اور کیوں ہو نیر — اس کی مجھ کو بھی خود خبر نہ ہوئی
سب پہ وہ مہرباں رہے لیکن — چشمِ رحمت کبھی ادھر نہ ہوئی
خونِ دل سے بھی آبپاشی کی — شاخِ امید بارور نہ ہوئی
آسماں بن گئی زمینِ مزار — موت بھی اپنی چارہ گر نہ ہوئی
دل میں بیٹھی تھی جو نگاہ تری — وہ نگہ پھر اِدھر اُدھر نہ ہوئی
وعدے کے بعد کارگر تدبیر — ہونے والی تو تھی مگر نہ ہوئی

آئے ہیں میکدے میں پھر شاکر
کہیں حضرت کی جب بسر نہ ہوئی

لیونیڈ اینڈریو (روسی افسانہ نگار)

اخذ و ترجمہ از محترمہ مس کے۔ احمد شجاع

ماں

ننھا ولکا ایک بڑی سی کتاب پڑھنے میں ہمہ تن مصروف تھا۔ کتاب قریب قریب اس کے قد کے برابر تھی۔ ننھا ولکا بہت مشکل سے اس کتاب کے چھوٹے چھوٹے الفاظ کو پڑھ رہا تھا۔ اس کتاب میں کہیں کہیں تصویریں بھی تھیں۔ تصویروں کو دیکھنے کے لئے وہ کرسی پر گھٹنوں کے بل بیٹھ کر اپنی لمبی گردن کتاب پر جھکا دیتا۔ اس نے اپنی لمبی سفید انگلی اس سطر پر رکھی ہوئی تھی جس کو وہ پڑھ رہا تھا۔ کیونکہ وہ ڈرتا تھا۔ کہ کہیں یہ سطر کھو نہ جائے۔

ولکا کو پڑھنے سے اس قدر اُنس تھا۔ کہ ہر وقت ہی وہ کسی ایسی بڑی سی کتاب کو ڈھونڈنے کی فکر میں لگا رہتا۔ جس کے موٹے موٹے الفاظ ولکا کی بالشت کے برابر ہوتے تھے۔ وہ کتابوں کو اکٹھا کرتا اور اپنے ننھے سے کمرے کو ان کتابوں سے آراستہ کرتا۔ دن رات وہ یہ جاننے کی کوشش میں سرگرداں رہتا۔ کہ ان کتابوں کو کون چھاپتا ہے؟ اور جہاں یہ چھپتی ہونگی۔ وہاں ان کا کتنا ڈھیر ہوگا؟ مگر وہ اپنے اس خیال کو کسی سے نہ کہتا۔ چنانچہ اس کے یہ تمام خیالات اس کے دل ہی میں پوشیدہ رہتے تھے۔

اس وقت وہ ایک کہانی پڑھ رہا تھا۔ جس کا نام شہزادہ بڑاہ تھا۔ یہ ایک ایسے شہزادے کی کہانی تھی۔ جو دوسرے لڑکوں کے ہاتھ پاؤں باندھ کر بھاگ جاتا تھا۔ ملک بھر میں اس کی بہادری کا سکہ بیٹھا ہوا تھا......!

عین اس وقت ولکا کے مطالعہ میں کسی نے خلل ڈال دیا وہ بہت پریشان ہو گیا۔ اُس کی ماں کسی اجنبی عورت کو ساتھ لیئے اندر داخل ہوئی۔ "ولکا یہ ہے"! ولکا کی ماں نے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ولکا نے دیکھا۔ کہ اس کی ماں کی آنکھیں روتے روتے سرخ ہو گئی ہیں۔ اس کے آنسو ابھی تک نہ تھمتے تھے۔ وہ اب بھی رو رہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں سفید لیس والا رومال تھا۔ جس سے وہ بار بار اپنے آنسو پونچھ رہی تھی۔

"ولکا پیارے"! اس اجنبی عورت نے محبت سے ولکا کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ اس نے ننھے کو کئی بار چوما۔ . . . . اپنی باہیں اس کے گلے میں حمائل کر دیں۔ اور پھر اس کے منہ اور آنکھوں کو کئی بار چوما۔

ننھا ولکا حیرت سے اس کی حرکات کو دیکھ رہا تھا۔ اس کو اس اجنبی عورت کا پیار کرنا کچھ نازیبا سا محسوس ہوا۔ اس کی ماں کے پیار میں اور اس عورت کے پیار میں کتنا فرق تھا؟ ماں کا پیار کتنا خوش کن اور راحت بخش تھا۔ اس کے خلاف اس عورت کا پیار کس قدر تکلیف دہ ثابت ہو رہا تھا۔ ننھا ولکا چاہتا تھا۔ کہ فوراً کمرے سے باہر نکل جائے مگر وہ خاموشی اختیار کر کے اس وقت کا بے چینی سے انتظار کرنے لگا۔ جب وہ عورت اُسے تنہا چھوڑ دے۔

ولکا کو یہ خلل اندازی بہت ناگوار گزری۔ اس کی سفید پیشانی پر شکنیں پڑی ہوئی تھیں۔ وہ اس عورت کو بغور دیکھ رہا تھا۔ کس قدر بدصورت۔ لمبی۔ ہڈیوں کا ڈھانچہ۔ زرد رنگ۔ لمبی لمبی بھدی انگلیوں میں ایک چھلا یا انگوٹھی تک نہیں۔ پھر اس کا بدبودار لباس جس کی بو سے بچنے کیلئے اس نے ناک پر رومال رکھ لیا تھا۔ مگر اس کی ماں کا جسم کس قدر خوبصورت تھا۔ خوشبو سے معطر۔ ولکا انہی خیالات سے خوش اور پریشان ہو رہا تھا۔

آخر وہ اجنبی عورت ایک طرف کو ہٹ گئی۔ وہ رو رہی تھی روتے وقت اس کے بدصورت ہونٹ کانپ رہے تھے۔ اس کی چھوٹی سی ناک اونٹ کے کوہان کی طرح مڑی ہوئی تھی۔ اُس

کی سیاہ حلقہ دار آنکھیں کتنی ڈراؤنی تھیں؟ دلکا پھر سوچنے لگا۔ اس کی ماں اور اس عورت میں کتنا فرق تھا۔ رونے وقت بھی اس کی ماں کتنی حسین نظر آتی تھی۔ اس کے خلاف وہ عورت کتنی بدصورت تھی۔ اس وقت جبکہ آنسو اس کی آنکھوں میں امڈے چلے آتے تھے۔ اس کا چہرہ کسی حس و حرکت کے بغیر کتنا بھیانک نظر آتا تھا! آخر اس نے اپنی کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔

"دلکا۔ پیارے دلکا۔ تم مجھے جانتے ہو؟"

"نہیں۔"

"میں تمہیں ملنے کیلئے آئی ہوں۔ دو مرتبہ پہلے بھی آ چکی ہوں۔" شاید وہ اس کو دیکھنے آئی ہو۔ ممکن ہے کہ وہ دو مرتبہ وہاں آئی ہو۔ مگر دلکا کو کیا خبر تھی؛

اس کے لگاتار سوال دلکا کے مطالعہ کا وقت ضائع کر رہے تھے۔ "میں تمہاری ماں ہوں دلکا۔ حقیقی ماں" اس اجنبی عورت نے جوش اور محبت بھرے لہجہ میں کہا۔

دلکا نے حیرت سے اپنی ماں کو دیکھنے کیلئے منہ پھیرا۔ مگر اب وہ کمرے میں موجود نہ تھی۔

"کس طرح! کبھی کسی کی دو مائیں بھی ہو سکتی ہیں؟ آپ یہ سب کچھ غلط کہہ رہی ہیں۔ معزز خاتون!" دلکا نے حیرت اور نفرت سے کہا۔

وہ عورت ہنسی۔ لیکن اس کی ہنسی دلکا کو خوش نہ کر سکی۔ وہ ڈر رہا تھا۔ وہ بہت جلد کچھ سنجیدہ سا ہو گیا۔ کچھ دیر تک کمرے میں کامل خاموشی طاری رہی۔ بالکل خاموشی۔ آخر اس عورت ہی نے مہرِ سکوت توڑتے ہوئے کہا۔

"تم کونسی کتاب پڑھ رہے ہو ننھے؟"

"شہزادہ بوزاہ کی کہانی ہے یہ" اس نے دھیمی آواز میں کتاب کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"یہ کہانی بہت دلچسپ ہوگی۔ مجھے بھی سناؤ۔"

اس کی گفتگو سے دلکا سہما جاتا تھا۔ وہ عورت اپنی آواز کو نرم کر رہی تھی۔ پھر بھی اس کے لہجے میں کانٹوں کی سی چبھن اور تلوار کی سی تیزی تھی۔

اس عورت نے اپنی کرسی دلکا کے قریب لا کر اپنی گردن کتاب پہ جھکا دی۔ دلکا نے کہانی پڑھنی شروع کی۔ پڑھ رہا تھا۔ اور وہ عورت غور سے اس کے چہرے کا ... کر رہی تھی۔ وہ بہت جلد کہانی سے بیزار ہو گئی۔ دلکا بہت دانا ... اس نے فوراً کہانی کا آخری حصہ پڑھا اور یہ کہکر کہ "کہانی ختم" کتاب بند کر دی۔

"اچھا! میرے پیارے بچے الوداع۔ میرے پیارے۔ خدا حافظ" اس عورت نے اپنا سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے "میں بہت جلدی پھر تمہیں دیکھنے آؤنگی۔ کیا تم ... ہو گے نا" اس نے پھر بچے کو پیار کرتے ہوئے کہا۔

"ہاں آپ ضرور آئیے!" دلکا نے مہذبانہ طریقے سے پیچھا چھڑانے کی غرض سے کہا۔ "ضرور آئیے گا۔ میں بہت ... ہونگا۔"

اجنبی عورت کمرے سے باہر نکل گئی۔ دلکا نے بڑی ... سے کتاب کا وہ لفظ تلاش کیا۔ جس کو وہ پڑھ رہا تھا۔ لیکن ... اس کی ماں کمرے میں داخل ہوئی۔ جس کی آنکھوں میں آنسو ... رہے تھے۔

دلکا اس اجنبی عورت کو روتے ہوئے دیکھ کر یہ سمجھا کوئی دکھیا ہے۔ جو زمانے کی بے مہری اور اپنی مفلسی کی وجہ آنسو بہانے پر مجبور ہے۔ مگر یہ بات وہ نہ سمجھ سکا۔ کہ اس ماں کیوں رو رہی ہے؟

"امی ننھے" اس نے مسکراتے ہوئے ماں سے کہا "وہ کون تھی۔ وہ کہتی تھی۔ کہ وہ میری ماں ہے۔ یہ کس طرح ہو سکتا کہ کسی کی دو مائیں ہوں؟"

"نہیں بچے یہ تو نہیں ہو سکتا! مگر وہ سچ کہہ رہی تھی تمہاری حقیقی ماں ہے۔"

"اور پھر آپ کون ہیں؟" لڑکے نے مضطرب ہوکر ...

"میں تمہاری چچی ہوں۔"

اس نئی حقیقت کا دلتا کو وہم و گمان بھی نہ تھا۔ اس نے اس بات کو مذاق سمجھتے ہوئے کہا۔

"اچھی امی! اس کو میری چچی بنا دیجئے۔ اور آپ میری امی بنے رہیئے۔ کیا یہ نہیں ہو سکتا؟" اس کی ماں اس کے سامنے دلتا کی زندگی کے صفحے الٹنے لگی۔

.... ایک عرصہ گزرا۔ جب دلتا بہت چھوٹا بہت ہی چھوٹا تھا۔

"میں کتنا چھوٹا تھا امی؟" دلتا نے اپنا ننھا منا سا ہاتھ میز پر سے اوپر اٹھاتے ہوئے پوچھا۔

"کیا کاسکا کے برابر؟" دلتا نے خوشی سے اچھلتے ہوئے پوچھا۔ اس کا منہ حیرت اور خوشی سے کھلا ہوا تھا۔ کیونکہ اُسنے اپنے آپ کو ننھی بلی کاسکا کے برابر بتایا تھا۔

"ہاں"

دلتا نے اس جواب پر قہقہہ لگایا۔ مگر پھر جلد ہی غیر معلوم خیال سے خاموش ہو گیا۔

"میں کتنا بیوقوف ہونگا۔ شاید مجھے بھی کاسکا کی طرح اجنبی عورت سے ہمیشہ کیلئے لایا گیا ہو۔ اور اب میں بڑا لائق ہو گیا ہوں۔ تو میری ماں وہ اجنبی عورت مجھے واپس لینا چاہتی ہے!"

دلتا نے دل ہی دل میں سوچا۔ اب اس کے چہرے پر افسردگی کے آثار نمایاں ہو گئے تھے۔

"کیا تم اس کے پاس جانا چاہتے ہو؟" اس کی ماں نے پوچھا

"نہیں! امی میں ان کے پاس خوش نہ رہ سکونگا!"

اس جواب سے اس کی ماں کی آنکھیں مسرت سے چمک اٹھیں۔ وہ اپنے کمرے میں چلی گئی۔ اور ننھا دلتا کتاب پڑھنے میں مصروف ہو گیا۔

دلتا اس بات کو مذاق سمجھے ہوئے تھا کہ وہ اجنبی عورت سچ مچ اُس کی ماں تھی۔ جس کا بدصورت چہرہ اسے ڈراؤنا نظر آتا تھا جس کے تمام جسم میں خون کا ایک قطرہ بھی نہ تھا۔ وہ عورت اس کو اپنے گھر لے جائے گی۔ کسی ایسی جگہ جس کا اس کو کچھ علم نہیں۔ وہ گھبرانے لگا۔

اس کی ماں بار بار اس سے پوچھتی۔ کیا تو مجھکو چھوڑ کر اس عورت کے پاس جانا چاہتا ہے؟ کیا تو اپنی ماں اور اپنے چچا کو چھوڑ کر چلا جائے گا؟ ....!!

ایک رات کا ذکر ہے۔ دلتا اپنے چھوٹے سے پلنگ پر ایک سفید بستر پر لیٹا ہوا تھا۔ اگرچہ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ مگر وہ جاگ رہا تھا۔ اس نے اپنے چچا اور اپنی ماں کو ساتھ کے کمرے میں بلند آواز سے باتیں کرتے سنا۔ وہ دونوں بار بار دلتا اور اُس اجنبی عورت کا ذکر کر رہے تھے۔ اُس کے چچا گریشیا کی خفگی بڑھتی جا رہی تھی۔

"تم بیہودہ بک رہی ہو۔ ظلیا! ہمیں یہ حق حاصل نہیں کہ ہم اب اس بچے کو اس عورت کے سپرد کر دیں۔"

"وہ اس سے محبت کرتی ہے۔ گریشیا!"

"اور ہم۔ کیا ہم اس سے محبت نہیں کرتے؟ تم کو شاید ننھے دلتا سے نفرت ہو گئی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ بچے کو پھینک کر جان چھڑانا چاہتی ہو تم۔ کیا تمہیں ایسی باتیں کرتے شرم نہیں آتی؟" گریشیا نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"اچھا جانے دو۔ تم کتنی جلدی ناراض ہو جاتی ہو؟ تم ذرا اس بات کو تو سوچو۔ کہ گناہ کا انجام کس قدر بھیانک ہوتا ہے۔ تمہیں وہ وقت یاد ہے۔ جب وہ اس بچے کو ہمارے دروازے کے باہر پھینک گئی تھی۔

"آہ کتنا بڑا ظلم تھا یہ۔ ہم نے اس کو پالا پوسا اپنے بچے کی طرح اسے بالکل اپنا سمجھا۔ اور اب۔ اب وہ کہتی ہے۔ کہ ہم اس کو اپنا بچہ دے دیں۔ کیونکہ وہ اکیلی ہے۔ اور وہ یہ بھی کہتی تھی۔ کہ اب اس کے پاس روپیہ نہیں ہے۔ جس سے وہ کسی سینما یا محفل رقص میں جا کر دل بہلا سکے۔ یہ بچہ اس کو دے دیا جائے۔ تاکہ اس سے ایک کھلونے کی طرح کھیل کھیل کر اپنی زندگی کے دن گزار دے۔

"نہیں۔ نہیں یہ ہرگز نہ ہوگا — خیر اس بات کا فیصلہ عدالت

کریگی۔

"تم بے انصافی کر رہے ہو گریشیا۔ تم ایک ماں کی محبت سے واقف نہیں۔ تم نہیں جانتے۔ کہ اس کے دل کی کیا حالت ہے ماں اپنا تن من دھن سب کچھ اپنے جگر کے گوشے پر نچھاور کر دیتی ہے۔ ـــ تم جانتے ہو۔ کہ وہ آجکل کتنی بیمار ہے۔ اس میں خون کا ایک قطرہ بھی نہیں۔ وہ اکیلی ہے۔ بالکل اکیلی ـــ" فلپا نے گرجتے ہوئے جواب دیا۔

"فلپا۔ واللہ تم تو ایک فرشتے کو بھی اپنی اشتعال انگیز گفتگو سے بھڑکا دوگی۔ شاید تم اس بچے کی محبت کو بھول گئی ہو۔ ظاہر ہے۔ کہ ہماری تربیت نے اس کو ایسا نیک اور سعادتمند بنا دیا ہے میں قسمیہ کہتا ہوں۔ کہ اگر اس کا ظالم بدمعاش باپ اس کو پالتا تو یہ بھی ویسا ہی بدمعاش بدفطرت اور بدکردار ہوتا۔ گریشیا! خدا کے لئے مجھے غصہ نہ دلاؤ۔ اب چپ بھی ہو جاؤ۔ تمہیں میری ہر بات میں دخل دینے کی عادت ہو گئی ہے۔ وہ بہت اکیلی ہے۔ اور ہم اکیلے نہیں" اس نے پھر کہنا شروع کیا۔

"ظالم عورت! تیرے پہلو میں دل نہیں ہے۔ فلپا میں کس قدر بدنصیب تھا۔ کہ میں نے تم سے شادی کی۔ تم جیسی عورت سے جس کے سینے میں دل ہی نہیں"

فلپا کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ اس کے شوہر نے اس کو روتا دیکھکر معافی مانگی۔ اور اعتراف کیا۔ کہ وہ ایک بے وقوف گدھا ہے۔ اور اس نے جو کچھ کہا ہے کسی بات کو سوچنے سمجھنے کے بغیر کہا ہے

فلپا نے کچھ دیر کے بعد اپنے آنسو پونچھتے ہوئے کہا ـــ

"ولسٹن نے کیا کہا ہے؟"

"کیا تم سمجھتی ہو کہ وہ بہت عقلمند ہے" اس نے کہا۔ جو کچھ فیصلہ بھی ہوگا۔ عدالت کریگی۔ وہ اس معاملہ میں کچھ نہیں کر سکتا۔

"میں کسی کی منت سماجت نہیں کر سکتا۔ یہ سب باتیں لغو اور بیہودہ ہیں"

اسی دوران میں فلپا نے وتکا کے کمرے کا دروازہ بند کر دیا تھا۔ اس لئے وتکا ان کی گفتگو کے آخری حصے کو نہ سن سکا۔ وہ اپنے بستر پر بہت رات گئے تک آنکھیں کھولے بیٹھا رہا۔

وہ ان کی باتوں کا اصلی مدعا اپنانا چاہتا تھا۔ مگر وہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ اجنبی عورت کون ہے۔ جو اس کو اپنے گھر لے جانا چاہتی ہے؟ . . . . . . مگر بے سود۔ وہ کچھ بھی معلوم نہ کر سکا۔

(۲)

دوسرے روز حسب معمول وتکا اس بات کا منتظر تھا۔ کب اس کی ماں اور چچا اس سے دریافت کرتے ہیں۔ کہ وہ کس ماں کے پاس رہنا چاہتا ہے۔ لیکن اس کی امی، چچا آئے ـ! مگر کسی نے اس سے اس بات کا ذکر نہ کیا۔ بلکہ وہ دونوں وتکا کے چہرے کو غور سے دیکھتے رہے۔ بالکل اسی طرح جس طرح لوگ کسی مریض کے چہرے کو دیکھتے ہیں۔

اس دن اس کے چچا نے اسے نہایت عمدہ تصویروں والی کتابیں دیں۔ وہ اجنبی عورت نہ آئی۔ وتکا اس سے بہت ڈر گیا تھا۔ اس کو خیال تھا۔ کہ وہ دروازے کے باہر چھپی کھڑی ہو گی۔ اور جب باہر جائیگا۔ تو اس کو بھوتوں اور چڑیلوں کے مسکن میں لے جایا جائیگا۔ اور پھر اسے آگ کے مہیب شعلوں میں پھینک دیا جائیگا۔ وتکا کچھ اسی قسم کے دہشت انگیز خیالات سے سہما ہوا تھا۔

شام کا وقت تھا۔ اس کا چچا گریشیا اخبار بینی میں مصروف تھا۔ اس کی ماں فلپا، اپنا سویٹر بن رہی تھی۔ ننھا وتکا دریچہ کے سامنے بیٹھا اپنی نئی کتاب جس کے لفظ نہایت باریک تھے مطالعہ کر رہا تھا۔

کمرے میں مکمل خاموشی طاری تھی۔ بالکل خاموشی کبھی کبھی ورق الٹنے کی یا سلائیوں کے آپس میں رگڑنے کی آواز کمرے میں ایک گونج سی پیدا کر دیتی تھی۔ کمرے میں لیمپ کی مدھم روشنی سے وتکا کا چہرہ چمک رہا تھا۔ لیمپ کے نیلے رنگ کے فانوس سے سفید میز پوش نیلا ہو رہا تھا۔

دریچہ سے باہر سامنے تاڑ کے پودوں کے بڑے بڑے

پتوں پہ چاند کی ہلکی ہلکی روشنی پڑ رہی تھی۔ اس کے اگرد شجریں اس طرح پھیلی ہوئی تھیں۔ گویا زہریلے سانپ آپس میں لڑ رہے ہیں۔ ولکا خوف سے سہما جاتا تھا۔ اس نے دریچہ کی طرف سے منہ پھیر لیا۔ اور "سمندر کی پری" کی کہانی پڑھنے میں محو ہوگیا۔

اس کو کہانی کی ہیروئن ——— سمندر کی پری سے ہمدردی ہوگئی۔ آہ! وہ ایک ظالم شہزادے کو چاہتی تھی۔ اس سے دل و جان سے محبت کرتی تھی۔ اس نے اپنی بہنوں کو شہزادے کی خدمت کے لئے اس کے سپرد کر دیا۔ اور تمام سمندروں پر شہزادے کو حکمران کر دیا۔ مگر بیوفا شہزادے نے ایک حسین شہزادی سے شادی کر کے اس پری کے نازک دل کو ہمیشہ کے لئے توڑ دیا۔

شہزادہ اپنی نئی دلہن کے ساتھ عیش و نشاط کی محفل میں خوشیاں منا رہا تھا۔ اور ناشاد و بدنصیب پری اپنی عزیز جان کو سمندر کی اٹھتی ہوئی لہروں کے سپرد کر رہی تھی۔ اس کہانی سے ولکا کے ننھے سے دل پہ بہت برا اثر ہوا۔ اس کو شہزادے کی بیوفائی کے خیال نے پریشان کر دیا۔

اس کو ایسا محسوس ہوا۔ جیسے مہیب دیو اس کے چاروں طرف زہر اگل رہے ہوں۔ اور ظالم ڈراؤنے جن اپنے وحشت ناک قہقہوں سے فضا میں طوفان برپا کر رہے ہوں۔ اس کو خوفناک بھوتوں کے سائے دریچہ کے باہر تاڑ کے درختوں میں چھپے ہوئے دکھائی دیتے جو آہستہ آہستہ سرگوشیاں کر رہے تھے۔ اور انگلیاں اٹھا اٹھا کر ولکا کی طرف اشارے کر رہے تھے...... وہ سہما جاتا تھا۔

اس کو ایسا معلوم ہوا۔ کہ خوفناک جنوں کے ہجوم میں سے اس عورت کی شکل نمودار ہوئی۔ جو ولکا کو لینا چاہتی تھی۔ ولکا نے ہزاروں آدمیوں کو اپنے گھر آتے دیکھا تھا۔ وہ سب کو بھول گیا تھا۔ مگر وہ اس اجنبی عورت کی شکل کو فراموش نہ کر سکا تھا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے ہر وقت اس کی ڈراؤنی صورت نظر آتی تھی۔ وہ سہما جاتا تھا۔ ولکا کو خیال ہوا۔ کہ اگر وہ عورت اس کو اپنے گھر لے گئی۔ تو وہ ہرگز زندہ نہ رہ سکے گا........

"امی سنئے! سنئے۔ میں آپ کو ماں کہونگا۔ کیونکہ میں سمجھتا ہوں آپ فضول کہہ رہی ہیں۔ کہ وہ میری ماں ہے۔ میں جانتا ہوں آپ میری ماں ہیں۔ میں اس کو ہرگز ماں نہ کہونگا۔"

"کیوں" فلپا نے دریافت کیا۔ اس کا چہرہ بالکل اس لڑکی کی مانند تھا۔ جس کا چہرہ اپنی تعریف سن کر سرخ ہو جاتا ہے ——— ولکا خوش تھا۔ مگر کبھی کبھی اسے خوف محسوس ہوتا تھا۔ تو کانپ جاتا۔ وہ ان دنوں بہت ڈرپوک ہوگیا تھا۔ وہ اکیلا سونے سے بھی ڈرتا تھا۔ اب وہ اکثر نیند میں چیخ اٹھتا تھا۔

"لیکن ولکا کیا وہ تمہاری ماں نہیں ہے؟"

"مجھے تعجب ہے۔ کہ آپ کو یہ بات کہنے کی عادت کیوں ہوگئی ہے"؟ ولکا نے چچا کی نقل اتارتے ہوئے کچھ اس انداز سے یہ فقرہ کہا۔ کہ فلپا بے اختیار ہنس پڑی........

رات ہوگئی تھی۔ ننھا ولکا بستر استراحت پر آرام کر رہا تھا۔ فلپا اور گریشا آہستہ سے اس کے کمرے میں داخل ہوئے۔ اور بچے کا چہرہ غور سے دیکھنے لگے۔ گریشا کے ہاتھوں کے کانپنے کی وجہ سے لیمپ کی بتی ہل رہی تھی۔ اور اس کی شعاعیں بچے کے زرد چہرے پر کانپ رہی تھیں۔ بچہ مسکرا رہا تھا..........

ولکا نے ایک سرد آہ بھری ——— کروٹ لی۔ اور پھر سوگیا۔ فلپا نے بچے کو کانپتی ہوئی آواز سے پکارا "ولکا۔ ولکا"۔ ولکا نے اپنی آنکھیں کھول دیں۔ لیمپ کی روشنی سے اس کی آنکھیں چندھیا گئیں۔ وہ خوفزدہ ہو کر اٹھ بیٹھا۔ اور اپنی باہیں فلپا کی گردن میں ڈال دیں۔ اپنا سر اس کے سینے سے لگا دیا۔ اور دھیمی آواز میں کہا "امی مجھے ڈر لگ رہا ہے آپ میرے پاس سے نہ جائیے"۔

یہ تمام رات سب کے لئے پریشان کن تھی۔ کچھ دیر کے بعد ولکا سوگیا۔ گریشا کھانسی کی زیادتی کی وجہ سے تمام رات جاگتا رہا۔ فلپا کے دل میں طرح طرح کے وسوسے اور وہم آتے تھے۔ اُسے یقین تھا۔ کہ اگر بچے کو اس کی ماں لے گئی۔ تو وہ ہرگز زندہ نہ رہ سکے گا۔ وہ تمام رات دوزانو بیٹھکر اس کے لئے دعائیں مانگتی رہی۔ اس واقعہ پہ قریب قریب ایک برس کا عرصہ گزر گیا۔ ولکا کا دماغ ہر وقت اسی پریشانی میں مبتلا رہتا تھا۔ لوگوں نے فلپا کو یہ صلاح دی۔ کہ ولکا کی پڑھائی کم کر دی جائے اور

کو اپنے ہم عمر بچوں سے کھیلنے کی اجازت دی جائے۔ تاکہ اس کا دل بہلا رہے۔ اس طرح وہ ان وحشت ناک وسوسوں کو بھول جائیگا۔

دوسرے دن ولکا سے ننھے بچے کھیلنے کے لئے آئے۔ مگر اُس نے ان کی کچھ پروا نہ کی۔ وہ بچوں کو بیوقوف سمجھتا تھا۔ جو اس کے خیال میں شور مچانے والے بندروں سے کچھ زیادہ اہمیت نہ رکھتے تھے۔ بچوں نے اس کے بوئے ہوئے شگفتہ پھولوں کو جڑ سے اکھاڑ دیا۔ اس کی پسندیدہ کتابوں کے ورق پھاڑ ڈالے۔ وہ کرسیوں پر اچھلتے کودتے پھرتے تھے۔ اس کے خلاف ولکا نہایت متانت اور خاموشی سے اپنے کمرے میں کتاب پڑھ رہا تھا۔ آخر شام کے وقت جبکہ بچے اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے۔ تو اس نے اپنی ماں فلپا سے التجا کی "امی مجھے یہ بچے دکھ دیتے ہیں۔ آپ انہیں نہ بلایئے۔ میں آپ ہی کے پاس بیٹھونگا"۔

اس نے پھر اپنی کتاب نکالی۔ اور پڑھنے میں مشغول ہو گیا۔ وہ اتنا محو تھا کہ اس کو اپنے چچا گریشیا کے اندر آنے کی بھی مطلق خبر نہ ہوئی۔ گریشیا نے اس کے ہاتھ سے کتاب چھین لی۔ اور بیوی پہ بُری طرح ٹوٹ پڑا "فلپا۔ کیا یہی تمہاری تربیت کا اثر ہے۔ تم اس کو پڑھائی سے بھی نہیں روک سکتیں۔ جانتی نہیں۔ کہ یہ کسقدر لاغر ہو گیا ہے۔ تم صرف بلیوں کو پال سکتی ہو"۔

ایک دن فلپا اور ولکا صحن میں بیٹھے ہوئے تھے۔ اس کا چچا گریشیا گھبرایا ہوا آیا۔ اس کی ٹوپی پیشانی سے نیچے جھک گئی تھی۔ اس کا چہرہ پسینہ میں شرابور تھا۔ اس نے نہایت دھیمی آواز میں کہا۔

"عدالت نے بچے پر ہمارا حق تسلیم کرنے سے انکار کر دیا ہے انکار۔ صاف انکار" اس کی آنکھوں سے دو موٹے موٹے آنسو نکلکر اس کے مرجھائے ہوئے رخساروں پہ جم گئے۔ فلپا کے ہیرے کے بندے جلدی جلدی ہلنے لگے۔ اس کے ہاتھ سے چھری پلیٹ پر گر پڑی۔ اور پلیٹ کے کئی ٹکڑے ہو گئے۔ گریشیا کے دل کے ٹکڑوں کی مانند......

کیا آپ سچ کہہ رہے ہیں؟" فلپا نے آہستہ سے کہا۔ گریشیا نے اپنا سر غم سے جھکا لیا۔ اور پھر کہا۔

آہ! ہمارا وکیل ٹالسٹن بہت نالائق تھا...... میں عدالت عالیہ میں فریاد کرونگا۔ ضرور۔ میں اپنے بچے کو ہرگز اس عورت کے پاس نہ جانے دونگا۔" اس نے اپنا سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا...... "کاش میرے پاس ایک معقول رقم ہوتی۔ ولکا جانتے ہو۔ وہ تمہاری قیمت لینا چاہتی ہے"۔

کیا قیمت ادا کر دینے پر وہ عورت مجھے نہ لیجائے گی؟" ولکا نے پژمردہ ہو کر کہا۔

"میرے پیارے بچے! میرا خیال ہے۔ کہ وہ پھر تمہیں نہ لیجا سکے گی...... ہاں میں یہ تو بھول ہی گیا۔ کہ میں تمہارے لئے نہایت اچھی عمدہ کتابیں لایا ہوں"۔

وہ کتابیں لینے الماری کی طرف بڑھا...... فلپا نے ایک دردبھری چیخ ماری۔ اور ولکا بے ہوش ہو کر کرسی پر گر پڑا۔

دن مہینوں میں۔ مہینے سالوں میں تبدیل ہو گئے۔ کئی کئی بار کلیاں کھلیں۔ اور مرجھا گئیں۔ اب ولکا بھی ان وحشتناک باتوں کو بھول گیا تھا۔ اب وہ اپنے ہم عمر لڑکوں کے ساتھ کھیلتا۔ نئے نئے لباس پہنتا۔ اور اکثر ریچھ اور گیدڑ کی کھالوں میں چھپ کر بچوں کو ڈرایا کرتا۔

ولکا کو اکثر اُس اجنبی عورت کا خیال آتا۔ اب اس کو اس عورت کے ساتھ کچھ ہمدردی سی ہو گئی تھی۔ وہ خیال کرتا تھا۔ کہ وہ غریب عورت شہر سے دور کسی پوشیدہ جھونپڑی میں آنسو بہا رہی ہوگی۔ اس کو اس بات کا بہت رنج تھا۔ کہ اس نے اس غریب عورت کو شہزادہ بوآہ کی پوری کہانی بھی نہ سنائی۔ مگر اب وہ کیا کر سکتا تھا۔ ولکا کا تمام خوف وخطر جاتا رہا تھا .... کیونکہ اُسے امید تھی۔ کہ اب کوئی اس کو نہیں لے جا سکتا .... عدالت کے قابل اور لائق ججوں نے بہت سوچ بچار کے بعد مقدمے کا فیصلہ بچے کی حقیقی ماں کے حق میں دیا۔ اور گریشیا کو حکم کیا۔ کہ وہ بچے کو اس کی ماں کے سپرد کر دے۔ اگر وہ چاہے تو اس کے پالنے کا خرچ اس کی ماں سے وصول کر لے۔ مگر گریشیا نے اپنی محبت کی قیمت لینے سے انکار کر دیا۔

وہ اجنبی عورت گریشیا کے گھر میں آئی۔ آج اُس کے اداس چہرے پر رونق تھی۔ فلپیا اپنے کمرے میں بیٹھی آنسو بہا رہی تھی۔ اور گریشیا اپنے وکیل ٹالسٹن کے گھر گیا ہوا تھا......

ولکا کا زرد چہرہ سمور کی ٹوپی سے باہر نکلا ہوا تھا۔ اس کی بغل میں ایک بڑی سی کتاب تھی۔ عورت نے بچے کو چھاتی سے چمٹا لیا...... اس کی آنکھوں سے خوشی کے آنسو بہے جا رہے تھے۔

"تم بہت بڑے ہو گئے ہو۔ ولکا پیارے۔ کیا تم مجھ سے ناراض ہو؟"

"چلو اب گھر چلیں"۔ ولکا نے آہستہ سے کہا۔

فلپیا چیخ مار کر کمرے سے باہر نکلنے لگی۔ اور ولکا کو اُس سے چھین کر اپنے گلے سے لگا لیا۔ وہ دونوں رو رہے تھے......

"چلو ولکا! دیر ہو رہی ہے۔ تمہیں ان لوگوں کے پاس نہیں رہنا چاہیئے۔ انہوں نے تمہیں تمہاری حقیقی ماں سے جدا کر دیا تھا۔ چلو"

"آہ تم ظالم ہو!" "چھوڑ دو میرے بچے کو۔ چلو بیٹا اپنے باپ کی طرح ظالم اور بیوفا نہ بنو۔"

"اجنبی عورت نے غصہ سے کہا۔ اور ولکا کو ساتھ لے کر دروازہ کی طرف بڑھی۔ "اس کا دھیان رکھنا میرے لال ولکا کا"

فلپیا نے سسکیاں بھرتے ہوئے کہا۔

دونوں گاڑی میں بیٹھے ہوئے جا رہے تھے۔ گاڑی بہت جلد فلپیا کی نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ تمام راستہ ولکا نے روتے ہوئے طے کیا۔ اس کے آنسوؤں کو دیکھ کر ماں۔ اس کی اپنی ماں اداس ہو رہی تھی...... گاڑی ایک چھوٹے سے مکان کے آگے رکی۔ وہ عورت ولکا کو ایک کمرے میں لے گئی جس میں ایک چھوٹا سا پلنگ بچھا ہوا تھا۔ ایک کرسی اور میز ایک طرف بڑی بے ترتیبی سے پڑی ہوئی تھیں۔ عورت نے کہا۔ "ولکا تمہارے لئے کھلونے لائی ہوں۔ دیکھو! پردے کے پیچھے پڑے ہیں۔ کیوں پسند ہیں؟" ولکا نے کھلونوں کو دیکھا۔ اور انہیں کھڑکی سے باہر پھینک دیا۔ عورت کو بچے کی یہ حرکت ناگوار گزری۔ وہ روتے ہوئے بولی۔ "آہ! ننھے تم کیا پسند کرتے ہو؟ مجھے بتاؤ میں اکیلی ہوں۔ بالکل تنہا ہوں۔ جانتے ہو۔ میں کس سے پوچھوں۔ کہ تمہیں کیا پسند ہے؟"

"آپ رو رہیئے۔ امی! آپ کو معلوم نہیں۔ میں کھلونوں سے نہیں کھیلتا۔ مجھے کتابوں سے اُنس ہے۔ میں آپ سے محبت کرونگا۔ بہت محبت۔ آپ میری ماں ہیں۔"

یہ کہتے ہوئے ولکا نے دونوں باہیں ماں۔ اپنی حقیقی بچھڑی ہوئی ماں کے گلے میں ڈال دیں۔ اور وہ .... بے طرح اس کو پیار کر رہی تھی۔ اس کی آنکھوں سے خوشی کے آنسو بہے جا رہے تھے۔

"مجھے ماں کہو۔ ماں"۔ عورت نے جوش سے کہا۔

"ماں ..... ماں .... ماں" ولکا نے محبت بھری نظریں ماں کے چہرے پر گاڑے ہوئے کہا:۔

"چلیے کتابیں لینے چلیں...... پھر رات ہو جائے گی......"

جناب علی احمد صاحب

پردیسی پیا

(سانٹ)

تم گئے پردیس اب دل میرا بہلائیگا کون
اب نیاز و ناز کی محفل سجاؤں کس لئے
پھول اب چمپا کے بالوں میں لگاؤں کس لئے
میری زینت کی بہاریں دیکھنے آئیگا کون
کون ہستی میں مری اب جذب ہونے آئیگا
اب تمہاری یاد کو دل میں بسا کر کیا کروں
بجھ چکی جو شمع اب اس کو جلا کر کیا کروں
مضطرب باہوں میں میری کون سونے آئیگا
ہو کے بیخود کون کھیلے گا مرے جذبات سے
آئی ہے فصلِ بہاری مست ہے ساری فضا
چھیڑتی ہے پھر ربابِ دل کے تاروں کو ہوا
کون ہوگا لطف اندوز اب مرے نغمات سے
گھر کے آئی ہیں گھٹائیں کوندتی ہیں بجلیاں
کاش "پردیسی پیا" اس وقت تم ہوتے یہاں

(جناب اختر انصاری)
(بی اے آنرز)

گرمیوں کی ایک دوپہر

میں اس دن ذرا اچھے اور صاف کپڑے پہنے ہوئے تھا۔ اور ایک پڑھا لکھا شریف آدمی معلوم ہوتا تھا۔ جب کبھی میں موقع کی اہمیت کا لحاظ کرتے ہوئے اپنی سرمئی رنگ کی دھاریدار اچکن سفید کینوس کا شو، اور سفید موزوں کی جوڑی نکال کر پہن لیتا ہوں۔ تو مجھ میں یہی تبدیلی پیدا ہو جایا کرتی ہے۔ لیکن اُس روز اسی تبدیلی کے باعث مجھے بڑی ذلت اور پریشانی اٹھانی پڑی میرا خیال ہے۔ کہ اگر میں حسبِ معمول اپنا پھٹا ہوا ترکش کوٹ، پیوند لگا ہوا پاجامہ اور گھسا ہوا جوتا (جو اپنی اصلی شکل سے بہت مختلف ہو چکا ہے۔ اور جس کا سیاہ رنگ سفید ہو جانے کے قریب ہے) پہنے ہوتا تو وہ یکّے اور تانگے والے ہرگز میری طرف توجہ نہ کرتے۔

صاحب کا بنگلہ سڑک کے کنارے واقع تھا۔ میں بنگلے سے نکلا اور مستعدی کے ساتھ اپنے راستے پر ہولیا۔ میری بائیں جانب ایک اور سڑک تھی۔ جو نصف دائرہ بناتی ہوئی ذرا آگے چل کے اس سڑک سے مل جاتی تھی جس پر میں جا رہا تھا۔ اور دوسری سڑک پر ایک خالی تانگا آہستہ آہستہ جا رہا تھا۔ جونہی تانگے والے کی نظر مجھ پر پڑی۔ اُس نے تانگے کی رفتار تیز کر دی۔ ہم دونوں ——— میں اور وہ تانگے والا... دو مختلف سڑکوں پر چل رہے تھے۔ لیکن منزل ایک تھی۔ یعنی بہت جلد ہم دونوں اس چوراہے پر پہنچنے والے تھے۔ جو دونوں سڑکوں کا مقامِ اتصال تھا۔ فرق تھا تو اتنا۔ کہ مجھے بہت تھوڑا سا راستہ طے کرنا تھا اور تانگے والے کو سڑک کی گولائی کی وجہ سے بہت زیادہ چنانچہ تانگے والے کے لئے نہایت ضروری تھا۔ کہ وہ اپنی رفتار تیز کرے تاکہ چوراہے تک پہنچتے پہنچتے مجھے پکڑ لے۔ جب وہ سڑک کی گولائی کا ابتدائی حصہ عبور کر رہا تھا۔ تو (تھوڑی دیر کیلئے) مجھ سے دور ہوتا جا رہا تھا۔ اور قدرے مختلف سمت میں جا رہا تھا لیکن اس کا چہرہ میری طرف مڑا ہوا تھا۔ اور جس نسبت سے تانگا آگے بڑھ رہا تھا اسی نسبت سے اس کا چہرہ میری طرف گھوم رہا تھا۔ اس نے اپنی نگاہیں نہایت ہٹ دھرمی کے ساتھ میرے اوپر گاڑ رکھی تھیں۔ اور برابر نظر سے نظر ملانے کی کوشش کر رہا تھا۔ ظاہر ہے۔ کہ وہ میری طرف سے سر کی ایک خفیف جنبش یا ہاتھ کے ایک مختصر اشارے کی توقع کر رہا تھا۔ اور نہیں چاہتا تھا۔ کہ جب میں اس طرح تانگے پر چلنے کی آمادگی ظاہر کروں تو وہ مجھے نہ دیکھ رہا ہو۔ اور یوں موقع کو ہاتھ سے کھو بیٹھے۔ اس وقت اس کی حیثیت ایسے شکاری کی سی تھی۔ جس نے ایک جنگلی جانور کو تاک لیا ہو۔ اور نشانہ لگانے کیلئے مناسب موقع کا انتظار اور صحیح زاویے کی جستجو کر رہا ہو۔ لیکن مجھے تو تانگا چاہیئے تھا نہیں اس لئے میں خاموشی سے اپنے راستے پر چلتا رہا۔

وہ مجھ سے چند لمحے پیشتر چوراہے پر پہنچ گیا۔ جب میں اس کے پاس سے گزرا۔ تو وہ انتہائی شدت کے ساتھ مجھے گھور رہا تھا۔ اس کا سارا وجود ایک سوال بن کر اس کی آنکھوں میں سمٹ آیا تھا........

"آپ کو میرا تانگا درکار ہے؟" لیکن میں اس سوال کا جواب دیئے بغیر اس کے برابر سے نکل گیا۔ وہ بھی اس آسانی سے ہار ماننے کیلئے تیار نہ تھا۔ اپنا تانگا لئے میرے پیچھے آیا۔ اور پھر الفاظ اس کی زبان پر آہی گئے۔ "تانگا لاؤں صاحب؟"

"نہیں" میں نے کہا۔

"تھوڑے سے پیسے لے لوں گا صاحب!" گویا وہ جانتا تھا کہ یہ شخص غریب ہے۔ اور تانگے میں بیٹھنے سے اسلئے ہچکچاتا ہے۔ کہ پیسے زیادہ خرچ ہو جائیں گے۔ لیکن میرے لئے کم اور زیادہ کا کوئی سوال نہ تھا۔ میری جیب سرے سے خالی تھی۔

میں نے پھر انکار کر دیا۔

اب مجھے معلوم ہوا کہ یہ شخص کتنا ضدی ہے!" بہت جلدی پہنچ جائیے گا۔" اس نے کہا۔ گویا یہ بات میرے ذہن سے اتر گئی تھی۔ کہ گھوڑا انسان سے زیادہ تیز چلتا ہے۔ اور دوڑتا ہے۔ یا شاید وہ مجھے لالچ دے رہا تھا۔ اور ایک پیدل چلنے والے کو اس کی مصیبت کا احساس دلا کر اپنا کام نکالنا چاہتا تھا۔ میں نے اس نامعقول بات کے جواب میں کچھ نہیں کہا۔

لیکن وہ میرے پیچھے پیچھے چلتا رہا۔ اور تھوڑی دیر میں پھر بولا۔ "لے چلوں صاحب!"

اب میں جھلا گیا۔" ارے بھئی کیوں پیچھے پڑے ہو؟ کہاں لے چلوگے؟ ــــ آخر کہاں لے جاؤگے؟

"شہر جائیے گا نا آپ؟" اس نے ذرا دبی ہوئی آواز سے کہا۔

"میں تو شہر نہیں جا رہا ہوں۔ مجھے تو یہاں سامنے کوٹھی تک جانا ہے" میں نے ہاتھ کے اشارے سے بتاتے ہوئے کہا۔

اب وہ بے بس ہوگیا۔ اور مایوسانہ خاموشی اختیار کر کے پیچھے رہ گیا۔ میں آگے بڑھ گیا۔

جب میں اس جلتی دوپہر میں سر سے پاؤں تک پسینے میں ڈوبا ہوا، ہانپتا کانپتا چلا جا رہا تھا۔ تو میں نے سوچا۔ کہ تانگے والے پر ناراض ہونا میری سخت غلطی تھی۔ اگر اس نے سمجھا۔ کہ یہ شخص تانگے پر چلے گا۔ تو اس کی یہ توقع ہرگز مہمل اور دور از کار نہ تھی۔ کون ایسا شخص ہے۔ جو اس قیامت کی گرمی میں ٹھیک دوپہر کے وقت ان لمبی لمبی سڑکوں پر چلنا پسند کریگا؟ لوؤں کا زمانہ ہے۔ آسمان سے آگ برس رہی تھی۔ ہوا کے جھونکے شعلوں کی طرح محسوس ہوتے ہیں۔ زمین جلتے ہوئے لوہے کی طرح گرم ہے۔ خاک کا ایک ایک ذرہ آفتاب بنا ہوا ہے۔ ایسے میں تو جی چاہتا ہے۔ کہ "خس خانہ و برفاب" کی دنیا نہ سہی کسی پھونس کے جھونپڑے میں پڑ رہیئے۔ اور یہ بھی میسر نہ ہو۔ تو کسی درخت کی گھنی چھاؤں میں آرام کیجئے۔ چنانچہ اس عظیم الشان شہر کے ہزاروں لاکھوں باشندوں میں سے دس بیس بھی تو ایسے نہیں ہیں۔ جو ان شاہراہوں پر نظر آتے ہوں۔ پھر اگر ایک میں ایسا بدبخت انسان ہوں۔ جو ایسے میں بھی گھر سے باہر رہنے پہ مجبور ہے۔ تو مجھے چاہیئے۔ کہ تانگے یا یکے میں بیٹھوں۔ اور اگر اس کا مقدور نہ ہو۔ تو کم سے کم غریب تانگے والوں پر تو غصہ نہ اتاروں۔

تقریباً ایک فرلانگ چلنے کے بعد میں نے دیکھا۔ کہ سامنے درخت کے سائے میں تین یکے کھڑے ہیں۔ یکے والے اونگھ رہے تھے۔ اور نیم درازی کی حالت میں آرام کر رہے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی چوکنے ہوگئے۔ اور سنبھل سنبھل کر بیٹھ گئے۔ میں نے دل میں کہا لیجئے یہ اور مصیبت آئی۔ میرے نزدیک ان کے تقاضوں سے بچنے کی بہترین سبیل یہ تھی۔ کہ ان کی طرف ایک مرتبہ دیکھوں۔ اور پھر اس انداز سے نکلتا چلا جاؤں۔ گویا میرے دل میں یکے پر بیٹھنے کا ذرا بھی ارادہ نہیں ہے۔ تاکہ ان کو مجھ سے مخاطب ہونے کا موقع ہی نہ ملے۔ میں نے ایسا ہی کیا۔ اور اپنے مقصد میں کامیاب ہوا۔ وہ امیدوارانہ نگاہوں سے مجھے دیکھتے رہے۔ لیکن کچھ کہنے کی جرأت نہ کر سکے۔ شاید خود ان کا بھی نہیں چاہتا تھا۔ کہ درخت کی ٹھنڈی چھاؤں کو چھوڑ کر دھوپ میں بیٹھیں۔ اور لو کے طمانچے کھائیں!

میں نے ان یکوں کو چند قدم پیچھے چھوڑا ہوگا۔ کہ ایک بڑی کوٹھی کے احاطے میں سے دو شخص باہر آئے۔ یہ اپنی وضع قطع سے خانساماں معلوم ہوتے تھے۔ ٹوکریاں ان کے ہاتھوں میں لٹک رہی تھیں۔ جس سے میں نے نتیجہ نکالا۔ کہ بازار سے سودا سلف لینے جا رہے ہیں۔ انہوں نے پیچھے مڑ کر یکوں کو دیکھا۔ اور ایک نے آواز لگائی "شہر چلتے ہو؟"

تینوں یک بیک وقت حرکت میں آئے۔

ادھر سے خانساماں پھر پکارا۔ "ایک آنہ ملے گا۔ ایک آنہ ــــ دو سواریوں کا ایک آنہ!"

"آٹھ پیسے ہوں گے" ایک یکے والے نے اس طرف سے کہا۔

دونوں خانساماں ہنس ہنس کر آپس میں باتیں کرنے لگے۔ ان کی بیشتر گفتگو فحش تھی۔ کوئی فقرہ گالیوں سے خالی نہ تھا۔ انہوں نے طے کیا۔ کہ چار پیسے سے ایک کوڑی زیادہ نہیں دیںگے۔ اور بالآخر دونوں ایک یکے میں بیٹھ گئے۔

جب یکہ میرے برابر سے گزرا۔ تو یکے والا بولا "شہر کو ایک سواری"

میں چُپ رہا۔ تو اس نے پھر کہا " دو پیسے فی سواری "

لیکن اس کی چیخ پکار فضول تھی۔ جو چیز خانساماؤں کی قسمت میں تھی۔ میں اس سے بھی محروم تھا۔

اب میرے سامنے ڈھائی میل لمبی سڑک تھی۔ جو سیدھی شہر کو جاتی تھی۔ اتنی طویل مسافت اور انسان کے چھوٹے چھوٹے قدم! — میں اپنے دل میں سوچنے لگا۔ تانگوں اور موٹروں کے مقابلے میں انسان کی رفتار کس قدر سست ہے! جب میں تپتی پیاپانی پر بیٹھا ہوا زمین پر رینگتی ہوئی چیونٹی کو دیکھتا ہوں۔ تو مجھے اُس کی بے بسی پر کتنا رحم آتا ہے۔ لیکن کیا میری حیثیت ان لوگوں کے مقابلے میں جو بگھیوں اور موٹروں پر بیٹھے ہوئے ہوا کے جھونکے کی طرح سَن سے گزر جاتے ہیں۔ اسی چیونٹی کی سی نہیں ہے؟ کیا میں ان لاکھوں کروڑوں انسانوں میں سے نہیں ہوں۔ جن کو اس دنیا نے اور اس دنیا والوں نے حشرات الارض کا درجہ دیا ہے؟ میں نے جب سے ہوش سنبھالا ہے۔ اور چلنے پھرنے کے قابل ہوا ہوں برابر پیدل چلتا رہا ہوں۔ گرمی ہو یا سردی۔ دھوپ ہو یا بارش بیماری ہو یا صحت ہر حال میں اور ہر موسم میں زمین پر اپنی ٹانگوں کی مدد سے گھسٹتا رہا ہوں۔ مجھے کبھی تانگوں اور موٹروں پر بیٹھنا نصیب نہ ہوا۔ پھر کیا میں انسان نہیں ہوں؟ کیا مجھے ایک انسانی ماں نے نہیں جنا؟ اور کیا یہ صورتِ حال نوعِ انسان کیلئے توہین آمیز نہیں ہے؟ کیا اس سے انسانیت کی تذلیل نہیں ہوتی؟

میں ان خیالات میں غرق پسینے میں شرابور۔ گردن جھکائے ہوئے چلا جا رہا تھا۔ کہ ایک تانگا نہایت تیزی کے ساتھ آیا۔ اور مجھے گرد کی طرح پیچھے چھوڑتا ہوا نکل گیا۔ تانگے میں ایک صاحب بیٹھے تھے جن کی صورت نہایت کالی تھی۔ اور کپڑے نہایت سفید یہ وہی تانگا تھا۔ جو ذرا دیر پہلے مجھے مل چکا تھا۔ تانگے والا جس سے میں نے کہا تھا۔ کہ مجھے شہر نہیں جانا ہے۔ میری طرف ہنستی ہوئی۔ اور مذاق اڑاتی ہوئی نظروں سے دیکھتا تھا۔ گزر گیا۔ اب اُس کی آنکھوں میں وہ پہلے جیسی امیدوارانہ کیفیت نہ تھی۔

معلوم نہیں۔ اس نے میرے متعلق کیا رائے قائم کی۔ مجھے نادار خیال کیا۔ یا خسیس! یا محض جھوٹا سمجھ کر نظر انداز کر دیا۔

میرا خیال ہے۔ اگر اس دن میں اپنا پھٹا ہوا ٹرکش کوٹ پیوند لگا ہوا پاجامہ اور گھسا ہوا جوتا پہنے ہوتا۔ تو شاید اس ذلت اور پریشانی سے بچ جاتا۔

[redacted]

جناب رضا نقوی

کسان کا گیت!

ہم جاگ اُٹھے۔ ہم جاگ اُٹھے دنیا کے لٹیروں سے کہدو

دولت کے خداؤں سے کہدو اور ان کی جفاؤں سے کہدو   ان تند ہواؤں سے کہدو مسموم فضاؤں سے کہدو
عشرت کی بہاروں سے کہدو ثروت کے نظاروں سے کہدو   ان بجھتے شراروں سے کہدو ان ڈوبتے تاروں سے کہدو
دہقان کی غیرت جاگ اٹھی انسان کی فطرت جاگ اٹھی   مغرب سے چلی اک تند ہوا وہ شعلہ اٹھا وہ آگ اٹھی
پھرنے کو ہے قسمت کی جھاڑو تہذیب کے عشرت زاروں میں   سونی ہیں فضائیں محلوں کی سناٹا ہے بازاروں میں
تقدیر نے کروٹ بدلی ہے بیمار نے صحت پائی ہے   یہ ہنگامہ بیداری کا دل کی پہلی انگڑائی ہے

ہم جاگ اُٹھے۔ ہم جاگ اُٹھے۔ دنیا کے لٹیروں سے کہدو

دنیا ہے نگاہوں میں اپنی اک بازی گاہ شیطانی   بازار تمدن میں جس کے ہے خون غریبوں کا پانی
وہ بھوکا ہے وہ ننگا ہے جو پیٹ سبھوں کا بھرتا ہے   انسانوں کی اس بستی میں ابلیس خدائی کرتا ہے
جلتے ہیں چراغ اس بستی میں دہقان کے خون حسرت سے   لیکن خود ان کی دنیائیں معمور ہیں ہر سو ظلمت سے
کہدو غداروں سے جاکر طاقت سے ڈریں دہقانوں کی   ہم چولیں ڈھیلی کردینگے ان سربفلک ایوانوں کی
ہم اپنی قسمت چھینینگے دنیا کے قسمت والوں سے   ہم لیں گے خراج محکومی ان دولت کے متوالوں سے

ہم جاگ اُٹھے۔ ہم جاگ اُٹھے، دنیا کے لٹیروں سے کہدو

تہذیب و تمدن کے پردے میں دنیا کے عیاروں نے   غداروں نے مکاروں نے ان دودھاری تلواروں نے
لوٹا مارا برباد کیا مجبوروں کو ناداروں کو   حیوانوں سے بدتر سمجھا انسانوں نے انسانوں کو
جذبات ہمارے صدیوں سے کچھ ایسے کچلے جاتے ہیں   ہم اپنے کو پہچاننے میں اب خود ہی دھوکا کھاتے ہیں
لیکن وہ زمانہ دور نہیں دہقان کی جب ہو سلطانی   چھائے ہیں فضاؤں میں بادل اب گرنے ہی کو ہے پانی
اب خواب ہوئیں پچھلی باتیں وہ سارے اگلے طور گئے   رفتہ رفتہ سورج نکلا وہ تاریکی کے دور گئے

ہم جاگ اُٹھے۔ ہم جاگ اُٹھے دنیا کے لٹیروں سے کہدو

احساس خودی بیدار ہوا ہم اپنی حقیقت جان گئے   پہچان گئے پہچان گئے ہم دنیا کو پہچان گئے
طوفانوں سے گھبرائیں کیا طوفانوں کے جو پالے ہیں   دریا کے مخالف دھارے میں ہم کشتی کھینے والے ہیں
تہذیب کی یہ رنگین قبا بوسیدہ ہے فرسودہ ہے   انسانیت کا آئینہ صدیوں سے غبار آلودہ ہے
اب دنیا کے مستقبل کو دہقان بدلنے والا ہے   فطرت کے اشارے کہتے ہیں انسان بدلنے والا ہے
اخلاق بھی بدلے جائیں گے سیرت بھی بدلی جائیگی   دنیا کے معاشی پیکر کی صورت بھی بدلی جائے گی

ہم جاگ اُٹھے۔ ہم جاگ اُٹھے، دنیا کے لٹیروں سے کہدو

جناب سید بادشاہ حسین حیدر آبادی

ہندوستان کی حرفتی ناقابلیت کے اسباب

ہندوستان ایک حرفتی ملک کیوں نہیں بن سکا؟ — اس کے مختلف اسباب ہیں۔ جن میں سے بعض اہم قومی خصوصیات جغرافیائی ماحول، افلاس اور بیماریاں، جہالت اور ناتجربہ کاری مذہبی اثرات، سماجی انتشار، سیاسی غلامی اور تجارتی پستی ہیں ؛

قومی خصوصیات

یہ ایک مسلّمہ امر ہے کہ کسی قوم کی حرفتی قابلیت یا ناقابلیت اس کی خصوصیات پر منحصر ہوتی ہے۔ کیونکہ ہر قوم میں کچھ نہ کچھ ایسی خصوصیات ضرور ہوتی ہیں جن کے رجحانات پر بقا اور ارتقا کا دارومدار ہوتا ہے۔ اور یہ خصوصیات بسا اوقات ایسی ہوتی ہیں کہ ان کو آسانی یا بعض دفعہ مشکل سے بھی تبدیل نہیں کیا جاسکتا اور یہی وہ دقّت ہے جس کی وجہ سے صلاحیتیں بنتی اور بگڑتی ہیں

اس ضمن میں اگرچہ یہ سوال معرضِ بحث میں آتے ہیں کہ :-

(۱) کیا قوموں کی اندرونی دماغی خصوصیات ایکدوسرے سے مختلف ہیں؟

(۲) کیا اس اختلاف کی وجہ سے ایک کو دوسرے پر فوقیت حاصل ہوسکتی ہے؟

(۳) کیا جسمانی اختلافات رکھنے والی اقوام کے میل سے سماج متاثر ہوسکتی ہے؟

لیکن ان کے جوابات قطعیت کے ساتھ معیّن نہیں کئے جا سکتے۔ محققین نے اس بارے میں بہت کچھ دریافت کیا ہے۔ پھر بھی ابھی بہت کچھ دریافت کرنا ہے۔ نظریات پختہ ہوتے جاتے ہیں۔ لیکن ایک آدھ تجربہ اختلاف میں شہادت دیکر بنا بنایا کھیل بگاڑ دیتا ہے۔ قوموں کے رجحان اور اُن کے ذہنی اور جسمانی لگاؤ کو دو اور دو چار کی طرح بیان نہیں کیا جاسکتا۔ اس کے باوجود بھی علما و ماہرین نے جو سعی اس بارے میں کی ہے وہ ناشکور بھی نہیں کہی جاسکتی۔ کیونکہ بیشمار صحیح نتائج انہوں نے اخذ کئے جو آج بھی ہماری آنکھوں کے سامنے ہیں ؛

اچھا اب ہندوستان کا حال سنیئے — آپ جانتے ہیں کہ یہاں زیادہ تر منگولی، ایرانی، دراوڑی اور آریائی نسل کی قومیں آباد ہیں۔ اور ان سے بھی آخر الذکر دو نسلوں کی اولاد کثرت سے پائی جاتی ہے۔ باوجود چھوت چھات اور ذات پات کے یہ قومیں ایک دوسرے سے بالکل ہی الگ تھلگ نہ رہ سکیں۔ اور ان میں بعض دفعہ مرضی سے اور بعض دفعہ مرضی کے خلاف ربط ضبط

اس مضمون کی ترتیب میں مندرجہ ذیل حوالہ جاتی کتب اور رپورٹوں کو پیش نظر رکھا ہے :-

(1) Factory labour in India.
(2) Hindustani works on the Pacific coast.
(3) Report on the Indian Industrial commission 1916-1918.
(4) The wealth of India.
(5) Royal Commission on Agriculture in India 1928.
(6) Pundit M.M. Malvia's note on the Indian Industrial Commission.
(7) Geography of the World's Agriculture.
(8) India in 1923, 1924, 1927, 1928.
(9) Census of India.　　س۔ ب

بڑھتا گیا۔ اور اس طرح وہ ایک دوسرے پر کئی مرتبہ علانیہ اور کئی بار غیر محسوس طور پر اثر انداز ہوتی گئیں۔ اور نتیجہ کے طور پر آج کوئی نہیں کہہ سکتا کہ ان کی پہلی سی انفرادیت باقی ہے:

ان اقوام کی تاریخ کا گہرا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ان میں بعض قابل لحاظ اور بعض ناقابل لحاظ اختلافات تھے جسمانی اعتبار سے بھی اور دماغی اعتبار سے بھی اور اگرچہ اُن کے صحیح طور پر جانچنے کا کوئی طریقہ نہیں ہے۔ مگر اُن کے کارناموں سے مفید مطلب نتائج اخذ کئے جا سکتے ہیں صورت شکل، وضع قطع، رنگ و روغن، اور جسم و جسمانیت میں بھی نمایاں فرق تھا۔ اور دماغی صلاحیتوں میں تمدن و تہذیب کے مدارج سے فرق ظاہر ہوگیا۔ اس کے علاوہ جب ایک قوم دوسری قوم سے ٹکرائی تو ظاہر ہے کہ فطرت کا ذرّیں اصول "بقائے اصلح" (Survival of the fittest) رُو بہ عمل ہوا۔ اور اس کے نتیجہ سے مورخین نے نظریہ قائم کیا کہ آریائی قوم کو دراوڑی قوم پر تفوق حاصل تھا۔ لیکن یہ تفوق جماعتوار ہی رہا۔ یعنی یہ کہ آریاؤں نے اپنی بڑھی ہوئی صلاحیتوں سے دراوڑیوں کو فائدہ نہیں پہنچایا — شاید پہنچا نہ سکتے تھے۔ اور اسی وجہ سے ایک عجیب قسم کی دورنگی رائج ہوگئی۔ اور احساس برتری اور احساس پستی دونوں جذبے غیر موزونیت کے ساتھ پیدا ہوگئے اور نہ صرف اپنی اصلی حالت پر باقی رہے بلکہ بڑھتے گئے۔ حتیٰ کہ آج بھی صدیوں بعد ان کے آثار پائے جاتے ہیں۔

جغرافیائی ماحول

اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ جغرافیائی ماحول کا اثر انسانی دماغ اور تہذیب و تمدن پر گہرا اثر پڑتا ہے۔ آب و ہوا زمین کی سرسبزی و شادابی، پہاڑوں اور ندیوں کی افراط و تفریط جنگلوں اور معدنیات کا وجود اور ذرائع حمل و نقل کی سہولتیں غرض اس قسم کی ساری چیزوں پر قوم کی جسمانی اور ذہنی ارتقا کا دارومدار ہوتا ہے اور یہی سہولتیں اور دقتیں آگے چل کر قومی ذہنیت اور رجحان کو بناتی اور بگاڑتی ہیں:

زمانۂ قدیم میں جبکہ حمل و نقل کے ذرائع نہ آج کی طرح وافر تھے اور نہ صاف تھا اس لئے قوموں کا رجحان عام طور پر یہ ہو گیا تھا کہ مسطح زمینوں پر آباد ہوں اور سرسبز و شاداب وادیوں کو بسائیں۔ معتدل آب و ہوا بھی سکونت و رہائش میں سہولتیں بہم پہنچاتی تھی یہی وجہ ہے کہ دریائے نیل فرات اور سندھ کے کناروں پر تہذیب و تمدن کے چرچے دوسرے مقامات کی بہ نسبت زیادہ تھے ماحول سے صرف جسمانی وضع قطع ہی متاثر نہیں ہوتی بلکہ ذہنی اور دماغی صلاحیتیں بھی اثر پذیر ہوتی ہیں۔ اس کی عمدہ مثال ان دریاؤں کے کنارے جو قومیں آباد تھیں ان کے ادبیات مذہبیات اور اخلاقیات سے واضح ہوتی ہے۔ اگرچہ زمانہ قدیم کا بیشتر ادب تاریخ پارینہ کے نذر ہو کر طاقِ نسیاں پر دھرا ہے لیکن جو کچھ بھی ہم تک پہنچا ہے اور موجودہ تحقیقات سے پہنچ رہا ہے۔ اس کے دیکھنے سے واضح ہوتا ہے کہ ان کے علوم و فنون سب کے سب جغرافیائی ماحول سے متاثر تھے۔ ان کی شاعری میں ایسا ہی تخیل تھا جیسا کہ ان کا ذہن اس ماحول میں پیش کر سکتا تھا۔ مذہبی خیالات میں بھی جو دیومالا کا تخیل تھا وہ بھی مقامی پیداوار کہی جا سکتی ہے۔ فنون بھی وہی تھے جو اس فضا میں سہولت کے ساتھ حاصل کئے جا سکتے تھے۔ تجارت، صنعت و حرفت، اور عنداً بالکل ہی مقامی رنگوں میں رنگی ہوئی تھی اور یہی کا نتیجہ تھا کہ تمدن و تہذیب کا معیار ایک خاص ہوگیا تھا۔ جدید تحقیقات سے یہ بھی ثابت ہوا کہ مقام اور ماحول کی یکسانیت اور مطابقت ملتے جلتے اثرات پیدا کرنے کا نتیجہ تھے۔ چنانچہ جغرافیائی ماحول کی یکسانیت کی وجہ سے ہمعصر تہذیبوں اور تمدنوں میں بہت کم فرق تھا خواہ وہ فرات کے کنارے ہوں خواہ سندھ کے خواہ نیل کے۔ ان متعلقات میں اکثر جگہ ایسا ہوا ہے کہ ایک مقام کا تمدن کمزور پڑ جانے کے بعد یا بعض صورتوں میں بالکل ہی مٹ جانے کے بعد دوسری جگہ جو تمدن چمکا تو انہی اصولوں اور طریقوں پر۔ اس کی وجہ سوائے اس کے کچھ نہیں ہو سکتی کہ ماحول کی مطابقت یکساں تمدن و تہذیب پیدا کرنے کی ذمہ دار تھی۔ خصوصاً قدیم زمانے میں یہ اصول بہت زیادہ واضح اس وجہ سے بھی تھا کہ حمل و نقل کے ذرائع محدود تھے اور تمدن کے اثرات زیادہ دور دراز تک پھیل نہ سکتے تھے:

جغرافیائی ماحول صحت انسانی پر بالخصوص زیادہ اثر ڈالتا ہے۔ اور صحت انسانی ہی صنعت و حرفت کی روح رواں ہے۔ کیونکہ بہت سی صنعتیں ایسی ہیں کہ کمزور جسم والا یا غیر محنتی شخص نہیں کر سکتا۔ آج یہ قول مشینوں اور بجلی کے کل پرزوں کی وجہ سے اتنا صحیح نہیں معلوم ہوتا جتنا کہ زمانہ قدیم میں گھریلو صنعتوں کی موجودگی میں موزوں اور درست معلوم ہوتا تھا۔ گرم آب و ہوا ایک قسم کی خشکی پیدا کرتی ہے جو آیندہ چل کر قبل از وقت ضعف کا باعث ہوتی ہے ظاہر ہے کہ اس وجہ سے گرم ممالک کے باشندے نہ زیادہ دیر تک محنت کر سکتے ہیں نہ بڑی عمر تک۔ دوسرے یہ کہ گرم ممالک میں بعض ایسی بیماریاں پھیلتی ہیں جو جان لیوا ثابت ہوتی ہیں۔ خصوصاً زمانہ قدیم میں ہیضہ، چیچک اور بخارات بہت ہی مہلک ثابت ہوتے تھے۔ تیسرے یہ کہ گرمی انسان کی قوت برداشت کو کم کر دیتی تھی پھر اس سبب سے گرم ممالک کے افراد ایسی صنعت و حرفت کو فروغ نہیں دے سکے جس میں کہ ہمت، حوصلہ اور سعیٔ پیہم کی ضرورت تھی۔ چوتھے آب و ہوا کی خشکی نے ان کی طبیعتوں کو بدمزہ کر کے جدت پسندی، جولانی، اور اختراعی صلاحیتوں کو ناپید کر دیا تھا۔

ہندوستان کا جغرافیائی احول ظاہر ہے کہ قدرتی طور پر حرفتی ترقی کے لئے کچھ زیادہ موزوں نہیں ہے۔ اور اس میں گرم ممالک کی وہ سب ناقابلیتیں موجود ہیں جو اوپر بیان کی گئی ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ عام طور پر یہاں کی حرفتوں کو عروج حاصل نہ ہو سکا۔ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ زمانہ قدیم میں دریائے سندھ کے کنارے جو تمدن تھا وہ حرفتی ترقی کے لحاظ سے بھی کافی بڑھا ہوا تھا۔ اور اب بھی سندھ اور گنگا کے کنارے جو حرفتیں رائج ہیں وہ ایک حد تک وقیع ہیں لیکن ہندوستان جیسے عظیم الشان ملک جس کو وسعت کے لحاظ سے براعظم کہا جاتا ہے کے لئے معمولی سی حرفتوں کا وجود قابل لحاظ نہیں ہو سکتا۔

افلاس اور بیماریاں

ہندوستان کی حرفتی ناقابلیت کا ایک اہم سبب ہندوستانیوں کی خراب صحت ہے۔ اندازہ کیا جاتا ہے کہ اس خرابی کی وجہ سے قوم کی ایک چوتھائی صلاحیتیں گھٹ گئیں۔ جو یقیناً قابل نظر انداز ہی نہیں۔ خرابیٔ صحت کے دو وجوہ صاف ہیں۔ ایک تو افلاس اور دوسرے اصول حفظان صحت کی عدم پابندی۔

ہندوستان کا افلاس ضرب المثل کی حد تک پہنچ گیا ہے اور عام طور پر دیہات میں اس کا مظاہرہ ہو سکتا ہے۔ باوجود اس کے کہ ہندوستان زرعی ملک ہے۔ اور اس کے باشندوں کی ایک بہت بڑی تعداد زمین کی پیداوار ہی پر تکیہ کرتی ہے۔ لیکن زراعت اس ملک میں ایک اچھا خاصہ جوا ہے جس کا پانسہ کبھی کسان کی موافقت میں پڑتا ہے اور کبھی مخالفت میں۔ محنت کر چکنے کے بعد زراعت پیشہ طبقہ آسمانی رحم و کرم کا ملتجی رہتا ہے۔ اس کے سوا رونا اس بات کا ہے کہ حسب دلخواہ فصل ہونے کے باوجود بھی کسان نہال اور بخت نہیں ہوتا۔ اس کی ثروت اور دولت ساری یہی ہوتی ہے کہ دو وقت پیٹ بھر کر روٹی مل جانا اور بس ظاہر ہے کہ جب وہ فصل کی کامیابی پر کچھ پس انداز نہیں کر سکتا تو فصل کی خرابی پر اندازہ کیجئے کہ اس پر کیا گذرتی ہو گی۔

فصلوں کی تباہی قحط کا سبب ہوتی ہے۔ اور قحط بیماریوں سے زیادہ مہلک ثابت ہوتا ہے سنہ ۱۸۷۶ء میں ہوا اس کے آثار ایک عرصہ تک باقی رہے۔ اور سنہ ۱۸۹۹ء میں اس کی شدت گئی اس زمانہ میں ۴۵۰،۰۰۰ سے لے کر ۴۷۵،۰۰۰ مربع میل تک کا رقبہ قحط سے متاثر تھا۔ اور دو کروڑ سے لے کر چھ کروڑ تک افراد پر فاقوں کی نوبت آ گئی تھی۔

یوں بھی معمولی دنوں میں جسے خوشحالی کا زمانہ سمجھا جاتا ہے غلہ کی پیداوار آبادی کی مناسبت سے کم اور بہت کم ہے ایک فرد کو پیٹ بھرنے کے لئے جتنی غذا اوسطاً چاہیئے اتنی میسر نہیں ہوتی۔ اور تحقیقات سے ثابت ہے کہ صرف ایک تہائی حصہ دستیاب ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ غذا کی یہ عام قلت خوشحالی کے دنوں میں بھی قحط سالی سے کم نہیں اور اس طرح بیچارے

[redacted]

ہندوستانی عام طور پر سال کے بارہ مہینے قحط زدہ رہتے ہیں:

مدراس کے قیدخانے میں ایک قیدی کو سال بھر میں جو غذا دی جاتی ہے اس کی مقدار مجموعی طور پر ۱۷۴۰ پونڈ ہوتی ہے اس کے برخلاف امریکہ کے قیدی کو سال کے دوران میں اوسط طور پر ۴۷۶۶ پونڈ غذا ملتی ہے۔ ان اعداد سے ظاہر ہے کہ امریکہ کا قیدی ہندوستانی قیدی کے مقابل میں تین گنا سے زیادہ مقدار حاصل کرتا ہے۔ قیدیوں کو جو غذا ملتی ہے وہ ایک متوسط انسان کی غذا کا پیمانہ سمجھا جاتا ہے۔ اس لئے اس مقدار کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ اس سلسلہ میں یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ ہندوستانی قیدیوں کو جو غذا ملتی ہے وہ بھی عام افلاس کی وجہ سے اوسط سے کم ہوتی ہے اس خیال کے پیش نظر اس کا اندازہ بخوبی ہو سکتا ہے کہ عام طور پر ایک ہندوستانی کو کتنی کم غذا میسر آتی ہے۔ ظاہر ہے کہ کم خوری انسان کی جسمانی صلاحیتوں پر اثر انداز ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی اور جسم کی کمزوری کے ساتھ ساتھ دماغی کمزوری بھی رونما ہوتی رہتی ہے۔ اس لئے ایسی حرفت جن میں محنت زیادہ کرنی ہوتی ہے اور دل و دماغ کو سکون ضروری ہوتا ہے یا پھر قوتِ برداشت لازمی ہوتی ہے ہندوستانیوں کے بس کی بات نہیں:

ایک خاص حلقہ میں یہ خیال عام ہوتا جا رہا ہے کہ دور جدید میں کاشتکاروں کے لئے جو سہولتیں مہیا کی گئیں۔ مثلاً انجمن اتحادی، کاشتکاروں کے بنک، قرضہ کے حصوں میں سہولت اور مہاجنوں کے چنگل سے رہائی وغیرہ۔ ان کی وجہ سے زراعت پیشہ طبقہ کی حالت سدھر رہی ہے۔ لیکن یہ قیاس ہی قیاس ہے حقیقت اس کی تائید میں نہیں ہے۔ بیشک یہ صحیح ہے کہ متذکرہ بالا سہولتیں جو کسانوں کو پہنچائی گئیں ان کا ضرور، کوئی نہ کوئی مفید نتیجہ نکلنا چاہیئے۔ لیکن ہمیں اُن ذرائع اور واقعات کو بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے۔ جو ان سہولتوں کے باوجود بھی حالات کو بہتر بنانے میں روڑے اٹکاتے ہیں۔ کسانوں کو سہولت تو بہم پہنچائی گئی۔ لیکن جہالت اور ناتجربہ کاری سے انہیں نجات کہاں دلائی گئی؟ افلاس اور بیماریوں سے انہیں چھٹکارا کب نصیب ہوا؟ سماجی انتشار، مذہبی اختلافات اور سیاسی غلامی سے انہیں کب آزاد کیا گیا؟ غرض یہ کہ یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ ان مخالف ذرائع کی موجودگی میں کسان کی حالت بہتر نہیں ہو سکتی:

افلاس کا حال تو یہ ہوا۔ اب ذرا بیماریوں کا ذکر سنیئے۔ تپ دق ملیریا ہیضہ چیچک۔ انفلوانزا۔ غرض یہ کہ کونسی وبا ہے۔ جو مہلک نہیں۔ ایک تو یوں بھی بیماریاں جان لیوا ہیں۔ اس پر طرفہ ہندوستانیوں کی عام جہالت جس کی وجہ سے بیماری مہلک سے مہلک تر ہو جاتی ہے:

ملیریا ہندوستان کے مختلف صوبوں میں کثرت سے ہے اور محققین کا بیان ہے کہ اس بخار میں مریض کی حالت بہت ہی ناگفتہ بہ ہوتی ہے۔ جس شدت کی تکان اور کمزوری مریض اس بخار میں محسوس کرتا ہے۔ اتنی کسی اور بخار میں محسوس نہیں کرتا۔ مزدوری پیشہ طبقہ اکثر و بیشتر اس بخار میں مبتلا نظر آتا ہے۔ اپنی جہالت اور حفظان صحت کے اصول کے فقدان کی وجہ سے یہ مرض بہت ہی مہلک ہو گیا ہے۔ بنگال کے صوبہ کی حالت "راس انٹی ٹیوٹ کی سالانہ رپورٹ ۱۹۲۸ء" میں دیکھیئے۔ لکھا ہے "ہزاروں ایکڑ زمین افتادہ پڑی ہے۔ اور اس پر بسنے والے سب کے سب ملیریا کا شکار ہو کر چلتے بنے ہیں۔ متعدد شہر جو بہت آباد تھے ملیریا کے حملے کے بعد معمولی سے چھوٹے موٹے دیہات میں منتقل ہو گئے۔ جہاں نحیف و لاغر مریض کے سوا تندرست اشخاص مشکل ہی سے نظر آتے ہیں۔ بڑے بڑے محلات جن میں چہل پہل رہا کرتی تھی اب جنگلی جانوروں اور درندوں کا مسکن ہو گئے ہیں۔ مختصر یہ کہ بنگال کا ملیریا ایک المیہ سے کم نہیں ہے۔" جو حالت بنگال کی ہے وہی کم و بیش دوسرے صوبوں کی بھی ہے۔ اندازہ کیجیئے کہ جب ہندوستان میں ملیریا ہی سے ۰۰۰،۳۰۰،۱۰ افراد سالانہ مرتے ہیں تو مبتلا کتنے ہوتے ہونگے۔ مرنے والوں کو تو جانے دیجیئے زندوں کو جو اس موذی مرض کا شکار ہوتے ہیں اعرصہ دراز تک کام کرنے کے قابل

نہیں رہتے۔ بیسے میں حرفت کی ترقی معلوم؟

ان بیماریوں نے ماں باپ دونوں کو اتنا ضعیف کر دیا ہے کہ ان سے جو اولاد ہوتی ہے وہ بیماریوں کو ورثہ میں الگ پاتی ہے۔ اور ضعف کو الگ۔ اس لئے اندرون سال کی عمر میں جو بچے مرتے ہیں ان کی تعداد کثیر ہے۔ ہر نئو بچے جو ہندوستان میں پیدا ہوتے ہیں اُن میں ۴ء۱۹۔ ایک سال کے اندر ہی اندر مر جاتے ہیں۔ انگلستان اور ویلز میں شرح اموات ۷ء۷ فرانس میں ۸ء۹ جرمنی میں ۱ء۱۰ ہے۔ ہر سال ہندوستان میں اوسطاً بیس لاکھ بچے مرتے ہیں اور اس کے سوا ہوش سنبھالنے سے قبل جو انتقال کرتے ہیں ان کی تعداد جدا ہے۔ دس اور پندرہ کی عمر میں جو بچے مرتے ہیں ان کی تعداد ایک کروڑ تک پہنچ جاتی ہے" آل انڈیا کانفرنس آف میڈیکل ریسرچ ورک" کی تحقیقات کے بموجب ہندوستان میں جتنے بچے پیدا ہوتے ہیں۔ اُن میں پچاس فیصدی کمانے کی عمر تک پہنچتے ہیں اور باقی نذر اجل ہو جاتے ہیں"

حفظان صحت کے اصول جن کو اب عام کی جانے کی بہت کوشش ہو رہی ہے کی وجہ سے عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ صحت عامہ بہتر ہوتی جا رہی ہے۔ لیکن اعداد و شمار سے یہ ترقی ظاہر نہیں ہے۔ بلکہ عمر کا اوسط گھٹتا ہی جاتا ہے۔ جو ذیل کے نقشہ سے کسی قدر واضح ہو جاتا ہے:۔

سال	مرد	عورت
۱۸۸۱	۲۴٫۵	۲۵٫۲
۱۸۹۱	۲۴٫۴	۲۴٫۹
۱۹۰۱	۲۳٫۷	۲۵٫۱
۱۹۱۱	۲۲٫۷	۲۳٫۷
۱۹۲۱	۲۴٫۳	۲۴٫۷

یہ اوسط اس وقت زیادہ واضح ہوتا ہے۔ جب ہم دوسرے ممالک کے اعداد سے اس کا مقابلہ کرتے ہیں۔ اور دیکھتے ہیں کہ ہر جگہ عمر کا اوسط بڑھ رہا ہے۔

یہی حال شرح اموات کا بھی ہے۔ دوسرے ممالک میں یہ شرح کم ہو رہی ہے۔ اور ہندوستان میں برابر زیادتی ہو رہی ہے۔ ذیل کے اعداد سے اس کی وضاحت ہو سکتی ہے۔

سال	انگلستان و ویلز	فرانس	جرمنی	بلجیم	ہندوستان
۱۸۸۱-۹۰	۱٫۹۰	۲٫۲۱	۲٫۵۱	۲٫۱۳	۲٫۷۴
۱۸۹۱-۱۹۱۰	۱٫۵۴	۱٫۹۴	۱٫۸۷	۱٫۶۵	—
۱۹۱۰-۱۹۲۱	۱٫۲۱	۱٫۷۷	۱٫۴۰	۱٫۳۵	۳٫۰۶

جہالت اور ناتجربہ کاری

جہالت کو لوگ اُمّ الخبائث کہتے ہیں اور یہ کچھ زیادہ غلط بھی نہیں۔ کیونکہ ہر برائی کسی نہ کسی طرح جہالت کی وجہ سے ہوتی اور بڑھتی ہے۔ چنانچہ ترقی ناقابلیت بھی زیادہ تر اسی وجہ سے ہے۔ جہالت ہندوستان میں اتنی عام ہے کہ شاید اس سے عام اور کوئی خصوصیت نہیں محض لکھے پڑھوں کی تعداد اتنی محدود ہے کہ دوسرے ممالک والے اس پر انگشت بدنداں ہوتے ہیں۔ کہ ہندوستانی اس قدر جاہل ہو کر زندہ کس طرح رہتے ہیں کیونکہ آج کل ترقی کے لئے ہی تعلیم ضروری نہیں بلکہ زندہ رہنے کے لئے بھی تعلیم لازمی ہے۔ ذیل کے اعداد سے ہندوستان کی جہالت کا دوسرے ممالک سے مقابلہ ہو سکے گا:۔

سال	جرمنی	ہالینڈ	فرانس	بلجیم	ہندوستان
۱۹۱۰	۰٫۰۳	۱٫۰	۴٫۷	۸٫۹	—
۱۹۲۱	..	..	..	..	۹۲

یورپ کو تو خیر چھوڑیئے کہ وہاں آج کل تو تقریباً ہر فرد معمولی طور پر لکھنا پڑھنا جانتا ہے۔ لیکن تعجب تو بعض مشرقی ممالک پر ہوتا ہے۔ خصوصاً جاپان پر کہ وہ دن دونی اور رات چوگنی ترقی کر رہا ہے۔ اور لازمی اور جبری تعلیم کی بدولت اب جاہل بہت ہی کم ملتے ہیں۔ لیکن ہندوستان میں اب بھی ۱۹۱۰ اور ۲۰ و کے درمیان جہلا فی صد موجود ہیں:۔

کہیں یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ حرفت کو تعلیم سے کیا واسطہ؟ تعلیم سے مراد اعلیٰ اور جامعاتی تعلیم نہیں ہے بلکہ ابتدائی تعلیم ہے۔ جس کے بغیر مزدوری پیشہ اور کاریگر بھی اپنا کام پوری طرح

سمجھ بوجھ کر نہیں کر سکتا۔ اور نہ فروغ و ترقی پا سکتا ہے۔ یہ بات معلوم ہونی چاہیئے کہ ابتدائی تعلیم سے دماغی صلاحیتیں چمکتی ہیں۔ اور ان کی نشوونما میں سہولتیں بہم پہنچتی ہیں

بچوں کی تعلیم کو قوم کی تعلیم کا سنگِ بنیاد سمجھا جاتا ہے اور پانچ سے دس یا پانچ سے چودہ کی عمر کے درمیان ابتدائی تعلیم کو لازمی اور جبری مختلف ممالک نے اپنی سہولتوں کے لحاظ سے قرار دیا ہے۔ پانچ اور دس کے درمیانی عمر والے بچے ہندوستان میں تقریباً ۴۷۰ لاکھ ہیں اور ان میں سے صرف ۱۶۰ لاکھ کی تعلیم کا انتظام ہے۔ باقی بچے اپنی عمر جہالت میں گنوتے ہیں۔ دس اور پندرہ کے درمیانی عمر والے بچوں کی تعداد ۳۷۰ لاکھ کے قریب ہے۔ اور ان میں سے صرف ۲٫۱۰ لاکھ بچے ثانوی تعلیم پاتے ہیں۔ تعلیم بالغاں جو کہ فی زمانہ نہایت اہم قرار دی گئی ہے۔ ہندوستان میں بہت پیچھے ہے۔ اور اس کی طرف سے برابر بے پروائی برتی جا رہی ہے۔ ۱۹۲۸ء تک کل ۱۱۱۲۲۷ ادارے تھے۔ اور طلبا کی تعداد ۳۹۴۰۲۰۲ تھی۔

اخبارات بالغوں کی تعلیم کا ایک مؤثر ذریعہ سمجھے جاتے ہیں لیکن ہندوستان میں ان کی تعداد بہت ہی کم ہے۔ اخباروں اور رسالوں کی کل تعداد ۱۹۲۶-۲۷ء میں ۱۱۰۵ تھی۔ ممالک متحدہ امریکہ میں اس زمانہ میں ۲۰۰۹۴ اخبارات و رسالہ جات جاری تھے۔ اس کے علاوہ یورپ اور امریکہ میں اخبارات کی اشاعت کثیر ہے۔ برخلاف اس کے ہندوستان کے اخبارات سوائے معدودے چند کے محدود دائرہ اشاعت رکھتے ہیں۔ عوام میں اخبار کے ذریعہ سے تعلیم حاصل کرنے کا شوق بھی بالکل نہیں ہے۔ اوّل تو افلاس کی وجہ سے اخبار خریدنے کی استطاعت کم ہی ہے۔ دوسرے زبانوں کے معاملہ میں تعصب سنگِ راہ ہے۔ اس کے سوا بھی خبریں دوسروں سے سن لینا اور اخبار مانگ کر پڑھ لینا ہندوستان کی قدیم روایت ہے جس کو عوام چھوڑنے پر آمادہ نہیں ہے

ہمارے موضوع کے نقطۂ نظر سے تعلیم کا وہ حصّہ زیادہ اہم ہے جو فنی روزگارانہ اور پیشہ ورانہ شعبوں سے تعلق رکھتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جو ملک عام تعلیمی حالت میں پسماندہ ہے۔ وہ ان شعبوں میں کیونکر آگے ہو سکتا۔ خصوصاً ایسی حالت میں جبکہ ان شعبوں کے لئے مواقع، سہولتیں اور روپیہ کی کافی ضرورت ہے۔ کل ہندوستان میں فنی تعلیم کے ادارے چار سو کے قریب ہیں۔ جن میں تقریباً ۲۹۰۰۰ طلبا زیر تعلیم ہیں۔ ہندوستان کی وسعت کا اندازہ کیجئے۔ اور اس کی گنجان آبادی کا تصور کیجئے۔ اور پھر اس سے ۲۹۰۰۰ طلبا کا مقابلہ کیجئے۔ تو آپ کو اچھی طرح معلوم ہو جائے گا۔ کہ ہندوستان ایک حرفتی ملک کیوں نہیں بن سکا؟

یہ تو سبھی جانتے ہیں کہ زمانہ قدیم میں جبکہ تمدنی اثرات کم یاب تھے۔ ہندوستان کے بعض علاقے اس سے مالا مال تھے۔ اور اس تمدن میں حرفتی فروغ بھی بلاشبہ شامل تھا۔ اس سے بھی سب آگاہ ہیں کہ قرونِ وسطیٰ میں جبکہ مغلوں کی حکومت کا آفتاب نصف النہار پر تھا۔ صنعت و حرفت کو دوبارہ عروج حاصل ہوا۔ اگر راجہ اشوک کے ایوانات میں لکڑی کا کام... بہترین نظر آتا ہے تو اکبر اعظم اور شاہجہان کے زمانہ میں پتھر، سنگ سرخ و سفید، موم نظر آتا ہے۔ اس کے سوا گھریلو اور چھوٹے پیمانہ پر جو حرفتیں ان ادوار میں رائج تھیں وہ ترقی کے زینوں پر دور تک پہنچی ہوئی تھیں۔ پھر کیا سبب ہے کہ آج ہندوستان حرفتی میدان میں طفلِ مکتب ہے؟ اس کو ہندوستانیوں کی جہالت اور ناتجربہ کاری کے سوا کچھ ہی کیا سکتے ہیں کہ انہوں نے موقع سے فائدہ نہیں اٹھایا۔ اور گذشتہ عہد کی کامرانیوں سے آیندہ ترقی کے مواقع نہیں پیدا کئے۔ اپنی ناتجربہ کاری اور غلط راہ روی سے پرانی ڈگر سے ہٹ کر نیا راستہ تلاش کرنے لگے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ نہ خدا ہی ملا اور نہ وصالِ صنم۔

مذہبی اثرات

ہندوستان ایک مذہبی ملک ہے۔ جہاں سب سے زیادہ مذہب کا اثر ہے۔ زندگی کے ہر شعبہ میں اس کے اثرات

موجود ہیں اور تقریباً سب کے سب ہندوستانی اس سحر سے مسحور ہیں۔ اور پھر لطف یہ کہ اتنے وسیع ملک میں جتنے بھی زیادہ مذاہب ہیں وہ سب کے سب انتہا پر پہنچے ہوئے ہیں اور کوئی فرقہ ایسا نظر نہیں آتا جو معقولات کو روایات پر ترجیح دے۔ بظاہر مذہبیات کا حرفت پر کوئی اثر معلوم نہیں ہوتا لیکن اگر غائر نظر ڈالی جائے اور واقعات کا تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ چونکہ مذہبیات کا اثر انسانی دل و دماغ پر ہوتا ہے اور حرفتوں کا تعلق بھی دل و دماغ سے ہے اس لئے یہ امر مسلمہ ہے کہ مذہبیات کا اثر حرفتوں پر پڑے بغیر نہیں رہ سکتا۔

انتہائی مذہب پرستی نے عوام کو مادی ترقی کے خیال سے ہٹا کر صرف روحانیات کی طرف ہمہ تن مشغول کر دیا۔ اس لئے ظاہر ہے کہ حرفتی ترقی کا خیال جو خالص مادی ہیں ہندوستانیوں کو کبھی نہیں ہو سکتا۔ اس کا اور سبب معیار زندگی کی پستی بھی انہی مذہبی تاثرات کا نتیجہ ہے اور اس پستی نے رفتہ رفتہ ضروریات کی کمی کی وجہ سے حرفتی ترقی کی راہ میں روڑے اٹکائے۔

سماجی انتشار:۔ ہندوستانی سماج جتنی منتشر ہے اتنی کسی ملک کی سماج نہیں ہے کیونکہ یہاں مختلف قومیں مختلف مذاہب اور مختلف روایات کے ساتھ پہلو بہ پہلو بستی ہیں اور ان میں سے ہر ایک فرقہ اس بات پر مصر ہے کہ وہ اپنی خصوصیات کو کبھی نہ چھوڑے گا۔ اس لئے ملی جلی سماج اور عمومی تمدن ہندوستان میں عنقا ہو گیا۔ اگرچہ ایک عرصہ سے متواتر اس کی کوششیں ہو رہی ہیں لیکن نہ کبھی اس کی کامیابی کی توقع ہوئی تھی اور نہ آج ہے۔

ہندوؤں میں چھوت چھات اور اونچی نیچی ذات کے سوال نے ابتدا ہی سے انہیں متحد نہیں ہونے دیا۔ ان میں ایک فرقہ دوسرے فرقہ کے ساتھ کسی طرح کا بھی اتحاد کرنے پر راضی نہیں۔ کھانا پینا تو بڑی چیز ہے ہندوستان کے بعض علاقوں میں آج بھی ایسے مقامات موجود ہیں جہاں مختلف فرقوں کے چلنے کے لئے مختلف راستے محفوظ ہیں۔ پوجا پاٹ کے مقامات الگ تھلگ ہیں مندر سے اور پاٹ شالے جدا جدا ہیں۔ اب ان حالات کے تحت یہ کس طرح ممکن تھا کہ مختلف فرقے مل جل کر ایک جگہ حرفتوں کی ترقی کے لئے کام کرتے۔ ایک ہی کارخانے میں ان کا بیٹھنا اٹھنا بھی تو مذہبی اختلافات کی وجہ سے ناممکن تھا۔

اگرچہ مسلمانوں میں اتنی تفریق نہیں ہے اور اونچی نیچی ذات کا تو سوال ہی نہیں ہے لیکن بعض معاشرتی خرابیاں ان کے ہاں ایسی ہیں کہ انہیں بھی حرفتی ترقی میں آگے بڑھنے کے مواقع نہیں مل سکے۔ مثلاً پردہ کا رواج عورتوں کو گھروں کی چار دیواری میں بند رکھ کر ان کی صحت کو الگ خراب کرنے کا باعث ہوا اور ان کی معاشی پستی کا سبب جدا بنا۔

اول تو ہندوستانی ضرب المثل افلاس اور اس پر خاندانوں کی مشترکہ زندگی، جن میں کمانے والا عام طور پر صرف ایک ہوتا ہے۔ اور کھانے والے لاتعداد، ایسے زبردست وجوہ ہیں جن کی بنا پر ان کی سماجی حیثیت بہت پست ہو گئی اور یہی پستی آگے چل کر جہاں اور برائیوں کا گھر بنی وہاں حرفتی ناقابلیت بھی پیدا کرنے کا باعث ہوئی۔

سیاسی غلامی ہندوستان کی تاریخ کا اگر ابتدا سے مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ صدیوں سے یہ وسیع ملک کسی نہ کسی بیرونی اثر کے ماتحت رہا ہے۔ جب سے تاریخ شروع ہوتی ہے اس وقت سے حملہ آوروں کا ذکر بھی شروع ہوتا ہے حالانکہ ہمالیہ جیسا سر بفلک پہاڑ اس کی امید دلاتا تھا کہ قدرتی طور پر یہ ملک محفوظ ہے۔ لیکن شمال مغرب کے راستوں سے فاتحین داخل ہوئے اور اس پر انہوں نے ایسا تسلط جما لیا۔ آریاؤں نے ملک کے قدیم باشندوں، دراوڑیوں کو غلام بنا لیا اور اپنے اشاروں پر ان کو نچوایا۔ ان کا تمدن اور ان کی تہذیب کو ملیا میٹ کر دیا۔ اس کے بعد یونانیوں کا حملہ تھا لیکن اس کے اثرات دیرپا نہ ہوئے۔ پھر مسلمانوں کا سیلاب آیا اور انہوں نے اپنے قدم رفتہ رفتہ مضبوطی کے ساتھ جما دیئے۔ صدیوں تک حکومت کی آخر میں انگریزوں کا دور دورہ ہوا۔ اور یہ آخری اثر حرفتی نقطۂ نظر سے گذشتہ

تمام ملکوں سے زیادہ دیر پا اور راست ہوا کیونکہ انگریز تجارتی میدان ڈھونڈھنے کے لئے ہندوستان آئے اور ابتدا میں تجارت ہی کو اپنا پیشہ بنا کر انہوں نے مراعات حاصل کئے۔ رفتہ رفتہ اپنی تجارت کو فروغ دینے کے لئے جب کہ ان کی حکومت قائم ہو گئی تو انہوں نے ہندوستانی حرفتوں کی راہیں مسدود کر دیں۔ اس کو سوا انگریزی حکومت کا یہ طرز عمل رہا کہ اپنے نو آبادیات کو خام پیداوار مہیا کرنے کا ذریعہ بنائیں اس کے ساتھ ہی ساتھ یہ خام پیداوار حاصل کر کے انگلستان جو سامان تیار کرتا ہے اس کی مارکیٹ بھی ان ہی نو آبادیات کو بنایا گیا۔ ان حالات کے ماتحت ہندوستان میں بھی صرف خام پیداوار مہیا کرنے کے ذرائع پیدا کئے گئے اور تیار انگریزی سامان کی مارکیٹ قائم کی گئی۔ اسی وجہ سے ہندوستانی حرفتوں کو کبھی فروغ نہ ہو سکا۔

تجارتی پستی:۔ جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے۔ خام پیداوار سب کی سب ملک سے باہر چلی جاتی ہے اور وہ تیار اشیاء کی شکل میں دوبارہ مارکیٹ میں آتی ہے۔ ایسا طریقۂ کار کی وجہ سے عام طور پر ہندوستانی کارخانے جن میں سامان تیار ہوتا تھا۔ بند ہو گئے کیونکہ انکے لئے کوئی مارکیٹ نہ تھی اور جب تیار سامان کی فراہمی نہیں ہو سکتی تو تجارت کی کس طرح ترقی ہو سکتی۔

اب خدا خدا کر کے ملک میں ملکی اشیاء کی مانگ ہو رہی ہے اور سدیشی اور بدیشی میں فرق کیا جانے لگا ہے۔ اگر یہی جوش و خروش باقی رہا تو ملکی تجارت نئے سرے سے ابھر سکتی ہے۔

جناب حکیم احمد شجاع
(بی اے علیگ)

ایک ایکٹ کا ڈرامہ

نئی روشنی

(تعارف)

تسنیم ہاشم کی بیوی موجودہ زمانے کی تعلیم اور تہذیب کی تمام زیبائشوں سے آراستہ ہے۔ مگر ایک شریف اور پرانے خاندان کی بیٹی ہونے کے باعث اپنے گھر ہی کو اپنی جنت اور اپنے شوہر ہی کو اپنی دنیا سمجھتی ہے۔

ہاشم کو گھر میں تمام آسائشیں میسر ہیں۔ لیکن وہ کلب کو اپنا مقصدِ حیات تصور کرتا ہے۔ اس کی زندگی میں صرف دو چیزیں ہیں۔ آفس اور کلب۔ گھر میں وہ اس طرح آتا ہے۔ جیسے کوئی منزلِ مقصود تک پہنچنے کی غرض سے کسی ریلوے اسٹیشن پر آتا ہو۔ اس کے کچھ دوست ہیں۔ جو اسی کی طرح مغربی تہذیب کے متوالے اور نئی روشنی کے سحر سے مسحور ہیں۔ ان میں مرد بھی ہیں۔ اور عورتیں بھی ——

اس وقت تسنیم اپنے خوبصورت اور آراستہ ڈرائنگ روم میں بیٹھی مشین پر اپنے شوہر کی ٹینس شرٹ سی رہی ہے۔

ماما تپائی پر چائے کے برتن سجا رہی ہے۔

ساڑھے چار بج چکے ہیں۔ اور اب شوہر کی انتظار میں وقت کا چھوٹے سے چھوٹا دقفہ تسنیم کے دماغ میں رینگتا ہوا معلوم ہوتا ہے

کلاک کا گھنٹہ پانچ بجاتا ہے

تسنیم۔ پانچ بج گئے۔ اور اب تک وہ دفتر سے نہیں آئے یہی چار سے پانچ بجے تک کا وقت تو گھر کے حصہ میں آتا ہے اب آئیں گے۔ تو اودھم مچا دیں گے۔

(شوہر کی طرزِ تکلم کی نقل کرتے ہوئے)

کلب میں جانے کا وقت ہے۔ اوہ کتنی دیر ہو گئی۔ میں ایک منٹ کیلئے بھی نہیں رُک سکتا۔ ملتا ہے کوئی چائے کا گھونٹ۔

ماما:۔ (مغالطہ سے بیوی کی آواز کو اپنے آقا کی آواز سمجھتے ہوئے)

چائے تو میں نے میز پہ لگا دی ہے۔ سرکار!

ارررے میں نے سمجھا سرکار ڈانٹ رہے ہیں ——

مگر بیوی خدا جانے اس موئی کلب میں کیا جادو بھرا ہے موت کا وقت مل سکتا ہے۔ لیکن کلب کی حاضری نہیں مل سکتی

(بچے کے رونے کی آواز)

(آیا بچے کو گود میں لئے داخل ہوتی ہے)

تسنیم۔ کیا ہے آیا!

آیا۔ ننھے میاں مچل رہے ہیں۔ کہتے ہیں۔ امّی ٹے پاس جائیں ڈے۔ ڈیڈی ٹے ساتھ چائے پئیں ڈے

بچّہ۔ (روتے ہوئے)

اوں۔ اوں۔ امّی ٹے پاس جائیں ڈے۔ ڈیڈی ٹے ساتھ چائے پئیں ڈے۔

تسنیم:۔ اب معصوم بچے کو کیا خبر کہ ڈیڈی اس وقت تک آفس کے کام سے فارغ نہیں ہوئے۔ ذرا اس کا جی بہلاؤ۔ آیا سرکار آجائیں تو لے آنا۔

مگر اب ان کو گھر پہ ٹھیرنے کی فرصت کہاں ہوگی۔

ماما:۔ بیوی آپ شوہر کو قابو میں رکھنے کا فن بھی تو نہیں جانتیں۔ آج کل کے زمانے کی عورتوں نے عورتوں کے تمام طور طریقے بھلا دیئے ہیں۔

آیا۔ اگلے زمانے میں تو بڑے بڑے امیر اور نواب اپنی بیویوں کے سامنے بھیگی بلی بنے رہتے تھے۔

ماما۔ اور اب بھی کیا ہے بوا۔ ہم نے بڑے بڑے صاحب لوگوں کی نوکری کی ہے۔ کیا مجال ہے۔ کہ صاحب لوگ میم صاحب کے سامنے یوں نوکر جائیں۔

آیا۔ اصلی صاحب لوگوں کی کیا بات ہے۔ بوا۔ میم صاحب کے پیچھے پیچھے ان کا کمبل اور اوورکوٹ اٹھائے پھرتے ہیں۔ یہ بیویوں کو ڈانٹ ڈپٹ بتلانے کی عادت تو کچھ دیسی صاحب لوگوں ہی کو ہوتی ہے۔

ماما۔ بھلا یہ بھی کوئی بات ہے بوا۔ بیوی تو دن بھر گھر میں اکیلی بیٹھی رہیں۔ اور سرکار جب شام کو گھر واپس آئیں۔ تو پھر ان کو چاق چوبند کر کے کلب بھیج دیں

تسنیم۔ (کوئی بہانہ ڈھونڈتے ہوئے) بے چارے دن بھر کے تھکے ماندے شام کو ذرا جی بہلانے کیلئے کلب چلے جاتے ہیں۔ آخر اس میں حرج ہی کیا ہے!

ماما۔ نا بیوی ان مردودوں پہ اتنا اعتبار نہیں کرنا چاہیے

(باہر سے دروازہ کی کھٹ پٹ اور ہاشم کی آواز سنائی دیتی ہے)

ہاشم۔ (باہر سے) بیرا۔ بیرا!

بیرا۔ (باہر سے) حضور۔ حاضر۔ سرکار

ہاشم۔ منہ ہاتھ کے غسل کا پانی لگاؤ

بیرا۔ تیار ہے سرکار۔

ہاشم۔ چائے میز پہ لگاؤ۔

بیرا۔ تیار ہے سرکار

ہاشم۔ ٹینس کا کپڑا لگاؤ۔

بیرا۔ تیار ہے سرکار

بچہ۔ (کمرے کے اندر) آؤں۔ آؤں ہم چائے پئیں ڈے۔

تسنیم۔ آیا تم انہیں لے جاؤ۔ وہ کچھ خفا سے معلوم ہوتے ہیں۔ ہاں ننھے میاں کو ذرا دیر سے لانا۔

(ہاشم ایک فوری انداز سے کمرے میں داخل ہوتا ہے)

ہاشم۔ افوہ۔ اب تک ایک قمیص بھی نہیں سِل سکی۔ خدا جانے یہ ہندوستانی عورتیں گھر میں بیٹھی کیا کرتی رہتی ہیں۔ بس باتیں باتیں۔ دن بھر باتیں۔ رات بھر باتیں۔ کل شام سے آج اس وقت تک اتنی فرصت بھی نہ ملی۔ کہ ایک قمیص ہی سی لیتیں۔

ہاشم۔ ارے ساڑھے پانچ بج گئے۔ یہ کلب والے خدا جانے کیا کہتے ہونگے۔ انہیں میں منہ کیسے دکھاؤنگا۔ پانچ بجے تو مجھے ٹینس کھیلنے کے لئے کلب میں پہنچ جانا چاہیے تھا۔

تسنیم۔ (قمیص کو روکتے ہوئے) پھر ہوا کیا۔ دفتر ہی سے تو آئے ہیں۔ آپ کوئی میرے پاس تو بیٹھے نہیں رہے اور ٹینس شرٹ کا عذر کیا ہے۔

(قمیص کو آگے بڑھا کر)

لیجئے آپ کی قمیص تیار ہے۔ پہن لیجئے۔ اور تشریف لے جائیے۔ کہہ دیجئے گا۔ دفتر میں دیر ہو گئی ہے۔ آخر سرکار کی ملازم ہیں آپ۔ کلب کے تو نوکر نہیں۔

ہاشم۔ بس میں نہیں کہتا۔ کہ ہندوستانی لوگوں کو وقت کی پابندی کا احساس ہی نہیں۔ ارے صاحب مجھے کیا حق حاصل ہے۔ کہ میں تین شریف لوگوں کا وقت ضائع کر دوں۔ اور یہ لوگ کوئی معمولی آدمی نہیں ہیں یعنی عام قسم کے ہندوستانی آدمی نہیں ہیں۔ کہ جن کو اپنے وقت کی اہمیت کا احساس نہ ہو۔ ان لوگوں میں ایک تو ہیں ڈاکٹر قادری۔ میڈیکل سائنس کے ماہر۔ جن کا ایک ایک لمحہ اس قدر قیمتی ہے۔ کہ اگر ان کا ایک منٹ ضائع ہو جائے تو یوں سمجھ لو کہ سائنس کی دنیا ایک منٹ کیلئے مر گئی۔ اور دوسرے ہیں مسٹر اومکار پرشاد بیرسٹر ایٹ لا جن کے وقت کی اتنی بڑی قیمت ہے۔ کہ آجکل چونکہ ان کی قدر و قیمت کے مطابق کوئی موکل فیس ادا نہیں کر سکتا۔ وہ سستی فیس پر مقدمہ ہی نہیں لیتے۔ دن بھر کلب میں بیٹھے اچھے وقتوں کا انتظار کرتے رہتے ہیں۔ اور غضب تو یہ ہوا کہ

ہماری تیسری پارٹنر ہندوستان کے نامی گرامی اخبار نیو لائیٹ کے ایڈیٹر کی بیوی ہیں۔ اگر انہوں نے کہیں اپنے شوہر سے شکایت کر دی۔ تو وہ ظالم میرا یا تمہارا لحاظ کریگا؟ ابھی ایک کالم کا کالم ہندوستانیوں کی فرض ناشناسی اور بے اصول زندگی کے متعلق لکھ ڈالیگا۔ اور عجب کیا ہے۔ کہ مثال کے طور پر میرا نام اور آج کے واقعہ کی تفصیل لکھ دے۔ بس پھر تو دو جہان میں کہیں ٹھکانا نہیں۔

تسنیم۔ (غصہ اور تعجب سے) اچھا؟ تو ایک دن کلب میں وقت پر نہ پہنچنے کے اتنے بڑے نتائج ہوتے ہیں۔ اگر ایسا ہی تھا۔ تو صاحب دفتر ہی میں دیر نہ کی ہوتی۔ ڈانٹتے نوکری کو چولہے میں، چار بج گئے تھے، کلب میں آپ کا انتظار ایک نامی گرامی ایڈیٹر صاحب کی اہلیہ محترمہ فرما رہی تھیں۔ مگر میں ایک بات پوچھتی ہوں آپ سے۔ کہ ان ایڈیٹر صاحب کی بیوی کو آپکے وقت پر اس قدر حق حاصل ہے۔ اور آپکی اپنی بیوی کو اتنا حق بھی حاصل نہیں کہ وہ برس کے بارہ مہینوں میں سے ایک دن بھی آپ کو اپنے پاس بیٹھنے پر مجبور کر سکے۔

ہاشم۔ اسی لیئے تو میں بار بار تم سے کہتا ہوں۔ کہ تم کلب کی ممبر بن جاؤ۔ تمہارا حسن۔ تمہارا علم۔ تمہارا سلیقہ اُس وقت تک بالکل بیکار ہے۔ جب تک تم کلب کی ممبر نہیں بن جاتیں۔ گھر میں رہ کر بیوی اپنے شوہر کی طبیعت پر بوجھ رہتی ہے۔ اور کلب میں جا کر سوسائٹی کا سنگھار ہر شخص اس کے حسن اور لباس کو دیکھتا ہے۔ اس کے علم اور ہنر کی قدر کرتا ہے۔ جب لوگ اُس کے پیچھے پیچھے پھرتے ہیں۔ تو اس کا شوہر اپنے جامے میں پھولا نہیں سماتا۔

تسنیم عجب قسم کا انسان ہوتا ہے۔ یہ کلب کا ممبر

ہاشم۔ تسنیم تم اس وقت تک کلب کے ممبر کی ذہنیت سے واقف نہیں ہو سکتیں۔ جب تک کہ تم خود کلب کی ممبر نہ بن جاؤ۔

تسنیم۔ مگر اس آپ کی کلب میں کیا چیز ہے۔ جو آپ کو گھر میں میسر نہیں؟ ایک نامی گرامی اخبار کے ایڈیٹر صاحب کی بیوی نہ سہی تو کیا ہوا۔ اپنی بیوی حاضر ہے۔ صاف ستھرا مکان ہے۔ ہر قسم کے آرام و آسائش کا سامان ہے تاش کھیلو۔ اخبار پڑھو۔ ٹینس کھیلنا چاہو تو کوٹھی میں لان بھی موجود ہے۔

ہاشم (زور سے) دوست نہیں! برج نہیں!! کلب نہیں!!!

تسنیم۔ آپ اپنے دوستوں کو گھر پر بلایئے۔ ان کی خاطر تواضع کیجئے۔ برج کھیلئے۔

ہاشم۔ (بات کاٹتے ہوئے۔ غصے میں) کیا ساری کلب کو گھر پر اٹھا لاؤں۔

تسنیم تو کلب کے سارے ممبروں سے آپ ایک ہی وقت میں برج اور ٹینس تو کھیلتے نہیں۔

ہاشم۔ (کف افسوس ملتے ہوئے) ہے۔ ہے کلب۔ کلب کو تم کیا جانتی ہو تسنیم۔ کلب کی عمارت میں ایک جادو ہے۔ کلب کے لانوں میں ایک سحر ہے۔ کلب کے صوفوں، کرسیوں میزوں میں ایک طلسم ہے۔ میرا جسم اس وقت تسنیم یہاں ہے۔ مگر میری روح کلب میں ہے۔

تسنیم (تھک کر) تو آپ اپنے آپ کو اتنا دکھ کیوں دیتے ہیں۔ جلدی سے چائے پی لیجئے اور چلے جایئے۔

ہاشم (تعجب اور غصے سے) چائے پی لوں؟ چائے اس وقت؟ جب کلب میں میرے دوست میرے منتظر ہیں۔ اور ان میں ایک لیڈی بھی ہے لیڈی۔ جو اس قسم کی ذلت کبھی برداشت نہیں کر سکتی۔

(اس تمام گفتگو کے دوران میں ہاشم نے ادھر ادھر پھر کر منہ ہاتھ دھو لیا ہے۔ کپڑے تبدیل کر لئے ہیں۔ بال بنائے ہیں۔ اب ساب بلیزر پہنتا ہوا دروازے کی طرف لپکتا ہے۔ کہ اتنے میں باہر سے آدمیوں کا غور سنائی

دیتا ہے۔ موٹروں کے ہارن کی لگاتار آواز سنائی
دیتی ہے)

(ہاشم کھڑکی سے جھانکتا ہے اور گھبرا جاتا ہے)

ہاشم۔ ارے غضب ہوا۔ ساری کی ساری پارٹی یہیں آنکلی۔ اب انہیں کیسے منہ دکھاؤنگا۔ میں دفتر ہی میں رُک جاتا تو اچھا ہوتا۔ اب یہ سب کے سب مجھ پر پل پڑیں گے گھر میں بیوی کے پاس بیٹھے وقت ضائع کر رہے ہو۔ اپنا بھی اور دوسروں کا بھی۔ کلب کا خیال ہی نہیں۔ ٹینس اور برج کے وقت کا دھیان ہی نہیں۔ ہمارے وقت کی اہمیت کا احساس ہی نہیں۔ ڈاکٹر قادری مسز لیلاوتی چوہدری۔ مسٹر او۔ پی۔ ورما۔ بیرسٹر ایٹ لاء

(ہاشم سر پکڑ کر کرسی پر بیٹھ جاتا ہے)

ارے تم ہی بتاؤ بیوی میں اب اُن سے کیا کہوں۔ کوئی بات ہی نہیں بنتی۔ کوئی جواب ہی نہیں سوجھتا۔

تسنیم:۔ (حیران ہو کر) ارے صاحب اس قدر گھبراہٹ کس بات کی ہے۔ آخر یہ لوگ آپ کے دوست ہی ہیں نا۔ کچھ کر دیجئے۔ کوئی سچ جھوٹ چلئے کہہ دیجئے۔ میری بیوی سخت بیمار ہے۔ بیمار کیسی قریب المرگ ہے۔ کوئی دم کی مہمان ہے۔ ڈاکٹر کا انتظار کر رہا تھا۔ دیر ہو گئی اچھا میں جاتی ہوں آپ انہیں بلا لیجئے۔

ہاشم۔ (بہت پریشان ہو کر) ارے تم نہ جانا بیوی۔ بس غضب ہی ہو جائیگا۔ یہ لوگ میرے مکان پر پہلی مرتبہ آئے ہیں۔ اگر تم اُن سے نہ ملیں۔ تو یہ اپنی انسلٹ سمجھیں گے انسلٹ۔

تسنیم:۔ (حیران ہو کر) میں اور غیر مردوں سے ملوں! یہ آپ کو کیا ہو گیا ہے؟ کیا آپ کے دوست نہیں جانتے کہ آپ کی بیوی ایک پردہ دار عورت ہے؟

ہاشم۔ ابھی یہ کلب کے ممبر ہیں۔ یہ پردہ وردہ کچھ نہیں جانتے ان میں سے کسی کی بیوی مجھ سے پردہ نہیں کرتی۔

تسنیم۔ تو دوستوں کی بیویوں کو دیکھنے کی قیمت آپ مجھے بے پردہ کر کے ادا کریں گے؟ افسوس ہے آپکی عقل پہ

(خود دروازے کی طرف جاتی ہے)

(ملازم سے) جاؤ مہمان کو اندر بلا لو۔

ہاشم۔ (بڑھکر اس کا راستہ روکتے ہوئے) خدا کے واسطے نہیں بیوی میری عزت رکھ لو۔ میری پیاری بیوی آخر ایک دن تو تمہیں کلب کا ممبر بننا ہی پڑے گا۔ چلو آج ہی بسم اللہ کرو اس پردے کو جہنم میں ڈالو۔ اور دیکھو یہ لوگ بہت شریف آدمی ہیں۔ بہت بڑے آدمی ہیں۔

تسنیم۔ ہوا کریں۔ میرا ان سے کیا واسطہ۔ میں تمہارے اصول کی پابند نہیں ہو سکتی۔

(دامن چھڑا کر جانا چاہتی ہے۔ ہاشم اس کے گلے سے لپٹ جاتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ وہ دونوں بغلگیر ہو رہے ہیں۔ کہ مہمان داخل ہوتے ہیں)

مسز لیلاوتی چوہدری:۔ (ہاشم اور تسنیم کو اس حالت میں دیکھتے ہوئے) کیوں میں نہ کہتی تھی۔ مسز ہاشم نے روک لیا ہوگا (آگے بڑھ کر) ایسی حسین بیوی کو چھوڑ کر آخر مسٹر ہاشم کلب کیوں جانے لگے (مسز ہاشم سے زبردستی ہاتھ ملاتی ہے) ہوڈو یو ڈو۔

تسنیم۔ (شرماتے ہوئے اور مردوں سے بچتے ہوئے) ہوڈو یو ڈو تشریف رکھئے۔

ہاشم۔ (کچھ گھبرا کر اور ہمت سے تعارف کراتے ہوئے) "مائی وائف" ڈاکٹر قادری" "مسٹر امرکار پرشاد"

(دونوں مہمان آگے بڑھ کر ہاتھ ملاتے ہیں۔ مسز ہاشم شرم کے احساس سے ایک بے جان سا ہاتھ آگے بڑھا دیتی ہے)

امرکار۔ (مسز ہاشم کو دیکھتے ہوئے) آپ سچ کہتی ہیں مسز چوہدری واقعی مسز ہاشم کی سی حسین عورت کو چھوڑ کر کلب کا خیال کرنا ناممکن ہے۔

تسنیم۔ کیا؟

ڈاکٹر قادری۔ (جلدی سے ایک بڑی سی گول شیشوں کی عینک لگا کر مسز ہاشم کو غور سے دیکھتے ہوئے) ابھی میری بیوی اگر ایسی خوبصورت ہوتی۔ تو میں کسی طلب دلب کا نام تک نہ لیتا مسٹر ہاشم۔ میڈیکل سائنس کے اعتبار سے اس قسم کا حسن نہایت مہذب اور متمدن حیوانات ہی میں پایا جاتا ہے۔ اور مسز ہاشم کا گورا گورا رنگ صاف دلالت کرتا ہے۔ ان کے مغل اور افغان اور کاکیشین فرض اسی قسم کے کسی مکسڈ بلڈ پر آپ نے علم نباتات میں انٹرگرفٹنگ کی تھیوری نہیں پڑھی۔ شاید۔ بات یہ ہے۔ کہ جب ایک نسل کے کسی فرد کی ہتھانی مائنڈ ٹلینڈ

مسز لیلاوتی چوہدری۔ (بات کاٹ کر) آپ انہیں کلب میں کیوں نہیں لاتے۔ مسٹر ہاشم ایسی بیوی کو گھر میں چھپا رکھنا تو سوسائٹی پر ظلم ہے۔

ادمکار۔ (شد و مد سے) تہذیب اور تمدن پر ظلم ہے۔ آرٹ پر ظلم ہے

قادری۔ (زیادہ شد و مد سے) بلکہ میڈیکل سائنس کی رو سے رشنل ای وولیوشن آف ہیومن سپیشیز۔ یا یوں کہیے۔ کہ ڈیولپمنٹ آف ہیومن کلچر کے تمام مسلمہ اصولوں پر ظلم ہے۔ آپ ساری میڈیکل ورلڈ کے سامنے مجرم قرار دیئے جا سکتے ہیں مسٹر ہاشم! یہ ای وولیوشن کی تھیوری۔ آپ نے نہیں دیکھی شاید؟ بات یہ ہے۔ کہ جب حیوانات کی کسی سپیشیز کے میکسولائن اور

مسز لیلاوتی چوہدری۔ (بات کاٹ کر) مسز ہاشم ہم چائے پی سکتے ہیں کیا؟ یہ گرم گرم چائے اور پیسٹری دیکھ کر ہم چپ چاپ نہیں بیٹھ سکتے۔ (اٹھ کر خود میز کی طرف چلی جاتی ہے)

ہاشم۔ (تسنیم سے) دیکھا تم نے کیسے شریف آدمی ہیں۔ یہ لوگ اور مسز چوہدری تو جس قدر دیکھنے میں خوبصورت ہیں اس سے کہیں زیادہ ان کا دل خوبصورت ہے

مسز ہاشم۔ (اٹھ کر جلدی سے میز کے قریب آ کر) آپ کیوں تکلیف فرماتی ہیں!

مسز چوہدری۔ نہیں۔ نہیں آپ باتیں کیجیے۔ ہم لوگ خود اپنی خاطر کرنا جانتے ہیں۔ (ادمکار سے) ادمکار یہ لو پیسٹری کا ڈبہ اٹھاؤ یہاں سے اور وہاں سنٹرل ٹیبل پر رکھ دو۔ اور ڈاکٹر قادری تم چائے بناؤ۔ یہ تمہاری میڈیکل سائنس آخر کسی کام بھی آنی چاہیے۔ (دونوں بالتو بلیوں کی طرح اٹھ کر میز کی طرف حرکت کرتے ہیں) ادھر آؤ مسز ہاشم یہ کام عورتوں کے کرنے کے نہیں۔

قادری۔ یہی تو میں ثابت کر چکا ہوں۔ کہ جہاں تک میڈیکل سائنس کا تعلق ہے۔ فیمی نن سیکس کا جینیس اس کے بریز سیلز۔ اس کے بلڈ کارسلز۔ کسی یوزفل کام کرنے کی اہلیت نہیں رکھتے۔ یعنی اُن میں ایکٹو فورس بالکل نہیں ہوتا ہے۔ اب جیکٹو پوٹاٹی اور کیپیسٹی فار کنزمشن اس قدر زیادہ ہوتی ہے کہ۔

مسز چوہدری۔ (پھر بات کاٹ کر) اور یہ تم ٹکر ٹکر کیا دیکھ رہے ہاشم۔ یورپ میں سات برس رہ کر کیا یہی تہذیب سیکھی تم نے۔ مسز ہاشم سے تم اس قسم کی توقع بھی رکھتے ہو کیا

(ہاشم کچھ شرمندہ اور مرعوب ہو کر اٹھتا ہے تسنیم ابھی اس کا اپنی مسز چوہدری کا منہ تکتی ہے۔ انا داخل ہوتی ہے۔ اور تسنیم کو غیر مردوں کی صحبت میں دیکھ کر حیران ہو جاتی ہے)

تسنیم۔ کیا ہے انا؟

انا۔ بیوی ننھے میاں کو لے آؤں کیا؟

مسز چوہدری۔ یہ ننھے میاں کس جانور کا نام ہے۔ مسز ہاشم۔

تسنیم۔ ہم اپنے بچے کو اسی نام سے پکارتے ہیں۔

مسز چوہدری۔ (حیرت اور تعجب سے) بچہ! آپ کا بچہ۔ یعنی آپ بچے بھی رکھتی ہیں اور .... پھر ڈرائنگ روم میں اس بچوں کا کیا کام۔ اس کوٹھی میں کوئی نرسری نہیں ... نے مہذب سوسائٹی میں زیادہ سے زیادہ کنٹرول

دیکھے ہیں۔ مگر انسانوں کے بچوں کو کبھی نہیں دیکھا۔ یہ ماما آپ کی کوئی بدتمیز عورت معلوم ہوتی ہے۔

آنا - اوئی بیوی۔

قادری - (بات کاٹ کر) حقیقت یہ ہے۔ کہ میڈیکل سائنس کی رُو سے جب ہیومن سینٹمنٹل ایوولیوشن کی جگہ ڈی ٹیریوریشن کی جانب بائی کیمیکل ایکشن کے پروسس سے مجبور ہو کر رجعت کرتی ہے۔ تو بڑی سے بڑی حسین عورت بھی آخر کار اسی قسم کی کوئی بدتمیز ماما یا ڈس فگرڈ اور ڈسمس شڈ ڈڈ ایمل ان کا نگر داٹی۔ اور نگوٹانگ۔ کیلی بن یا مدسے مدا بیپ کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔

آنا - اوئی بیوی یہ کیا اول۔ جلول بک رہے ہیں۔

(تسنیم کھسیانی سی ہو جاتی ہے۔ انادل ہی دل میں کوستی ہوئی جانا چاہتی ہے)

قادری - (غصے سے) ہم یعنی ڈاکٹر قادری اول جلول بک رہے ہیں؟

تسنیم - یہ دفتر سے آتے ہیں۔ تو بچہ اُن کے ساتھ ہی چائے پیتا ہے۔ اس کی کچھ ایسی عادت سی ہو گئی ہے۔

مسز چوہدری - یہ عادت تو بالکل بیہودہ ہے۔ مسز ہاشم میرے تین بچے ہیں۔ مگر یہ اس زمانے کی بات ہے۔ جب برتھ کنٹرول پر عورت ذات کو کوئی اختیار نہ تھا۔ ہاں! میرے بچے مہینوں تک ماں باپ کی شکل نہیں دیکھتے یہ مامائیں آخر ہیں کس مرض کی دوا (آنا سے) جاؤ جی ہم یہاں بچوں کی چوں چاں سننے کے لئے نہیں آئے۔ ایسا ہی ہے تو ایک پیالی چائے کی لے جاؤ۔ اور اس ننھی بچے کو کسی دوسرے کمرے میں بٹھا کر پلا دو۔

قادری - مگر دیکھئے نا۔ شاید سنا نہیں آپ نے مسز چوہدری مسز ہاشم نے ابھی ابھی کہا تھا۔ کہ بچے کو ڈرائنگ روم میں اپنے ڈیڈی کے ساتھ چائے پینے کی کچھ عادت سی ہو گئی ہے۔ اب میڈیکل سائنس کی رُو سے عادت یعنی روزمرہ کسی کام کو کرنے کے لئے ہیومن آرگنزم کے کلیکٹو فورس کی ٹرائرکشن ٹو ورڈز دی پرفامنس آف سرٹن سپیفک فنکشنز

مسز چوہدری - (غصے میں) بھاڑ میں ڈالو تم اپنی میڈیکل سائنس کو۔ یہاں تہذیب و تمدن کے تمام اصول غارت ہو رہے ہیں۔ اور تم لئے بکھرتے ہو۔ اپنی میڈیکل سائنس کو

(قادری مجبوراً چپ ہو جاتا ہے)

تسنیم - آپ اس گھر میں مہمان آئے ہیں۔ میں کیا جواب دوں مگر یہ بچہ ہی تو اس گھر کی رونق ہے۔

مسز چوہدری - (غصہ میں) بچہ اس گھر کی رونق ہے؟ یہ کیا کہا آپ نے مسز ہاشم معلوم ہوتا ہے۔ آپ کسی کلب کی ممبر نہیں بنیں اب تک۔ اجی زندگی کی رونق کلب ہے۔ کلب۔ (ہاشم سے) ہاشم تمہارے جیسے مہذب انسان سے کبھی یہ توقع نہ تھی۔ کہ تم اپنی بیوی کو اس طرح جانوروں کی سی زندگی بسر کرتے ہوئے دیکھ کر مطمئن ہو گئے۔ اپنے بچوں کو بلیاں پالتی ہیں۔ یا مرغیاں۔ یہ انائیں اور مامائیں آخر خدا نے کیوں بنائی ہیں۔ (خود بخود ہی فیصلہ کر کے) انسانوں کے بچوں کو پالنے کے لئے اور نہیں تو کیا۔؟

قادری - (پُرجوش انداز میں) نہیں نا پڑھی آپ نے تھیوری آف دی پروکری ایشن اینڈ پریزرویشن آف دی آف سپرنگ آف ہیومن بینگز۔

(ادہ نکار اور ہاشم چائے تیار کر کے لاتے ہیں)

ادہ نکار - لیجئے ڈاکٹر قادری آپ چائے پیجئے فی الحال۔

تسنیم - آپ چائے پیجئے۔ میں بچے کو جا کر خود ہی چائے پلاتی ہوں

ہاشم - (بڑھ کر روکتے ہوئے) نہیں نہیں ایسا ستم نہ ڈھانا تسنیم اگر تم مہمانوں کو چھوڑ کر چلی گئیں۔ تو ساری کلب بھر ہنسے گی۔ اخباروں کے کالم کالم میری ذلت اور رسوائی سے سیاہ نظر آئیں گے۔ بس تمہارا اب ایک ہی علاج ہے۔ کہ تم ہماری کلب کی ممبر بن جاؤ۔

تسنیم ۔ (بے قابو ہو کر) بھاڑ میں جائے تمہاری کلب اور تمہاری تہذیب میں جاہل اور بدتمیز ہی اچھی ہوں۔

(نسائیت کے غرور اور مادری شفقت کے احساس سے مجبور ہو کر چلی جاتی ہے)

مسز چوہدری ۔ ہا۔ ہا۔ ہا۔ اومکار دیکھا تم نے ہندوستانی گھروں کی حالت۔ عورت ذات کی ذلت۔ ان مردوں نے ہم عورتوں کو ایک کھلونا بنا رکھا ہے۔ کھلونا۔ اور کھلونوں سے بھی کھیلنے کا ایک وقت ہوتا ہے۔ یہ مرد عورتوں کی کمزوری سے ہر وقت کھیلتے رہتے ہیں۔ گھر کا انتظام بچوں کی نگہداشت۔ مہمانوں کی خاطر سب کچھ عورت کرے۔ آخر یہ مرد بھی کوئی کام کرنا جانتے ہیں۔ یا نہیں۔

اومکار ۔ آپ سچ کہتی ہیں۔ مسز چوہدری (ہاشم سے) مگر کوئی وسکی بھی ہے۔ آپ کے گھر میں مسٹر ہاشم۔ یہ ہمکو آپ نے کہاں کا ٹی ٹوٹلر سمجھ رکھا ہے۔ کہ بس چائے پی کر چلدیں۔

قادری ۔ خوب یاد دلایا اومکار۔ بچوں کے متعلق گفتگو سنتے سنتے میری نروس ایکسہاسچن۔ کچھ اس درجہ تک پہنچ چکی ہے کہ کیپلیری موشن آف آرگینک وائیلٹی کو ایک نارمل روٹین میں لانے کے لئے کسی پک می اپ کی ضرورت حد سے زیادہ محسوس کر رہا ہوں۔ مسٹر ہاشم۔ میڈیکل سائنس کے رُو سے۔

مسز چوہدری ۔ عورتوں کو اس کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے ڈاکٹر قادری۔ آخر تم نے ایک عقل کی بات بھی کہی۔

ہاشم ۔ (ہونٹوں پر انگلی رکھتے ہوئے) چپ چپ وسکی کا اس گھر میں نام بھی نہ لینا۔ تسنیم آگے ہی آگ بگولا ہو رہی ہے۔ وہ سب کچھ برداشت کر سکتی ہے۔ مگر شراب کا استعمال اپنے گھر میں کبھی برداشت نہیں کر سکتی۔

مسز چوہدری ۔ تو اس کا ایک ہی علاج ہے۔ کہ ان کو فوراً کلب کا ممبر بنا لیا جائے۔

اومکار ۔ اللہ تمہاری بیوی کی اس ضد پر ابھی اس وقت اسی کمرے میں وسکی کا دَور چلے۔ کیوں کیا کہتے ہو قادری؟

قادری ۔ درست فرماتے ہیں آپ

مسز چوہدری ۔ مگر وسکی آئے کہاں سے؟

اومکار ۔ ایسا ہی سمجھ رکھا ہے۔ آپ نے ہمکو۔

(پتلون کی جیب سے وسکی کا فلاسک نکال کر زور سے میز پر رکھ دیتا ہے)

یہ لیجئے جانی واکر بارہ سو ۱۵۲۰ء اسٹل گوئنگ سٹرانگ

مسز چوہدری ۔ کیا کہنے ہیں تمہارے اومکار

(سب فرط انبساط سے تالیاں بجانے لگ جاتے ہیں)

ہاشم ۔ (بہت بے تابی سے) خدا کے لئے اومکار اسے چھپاؤ۔ کلب چلو۔ وہاں چلکر جتنی وسکی چاہو گے پلا دوں گا

اومکار ۔ (گاتا) کہاں چھپائے۔ لا دے بھائی۔ وسکی،
جسمیں رنگت ہو مَیس کی
اور لذت ہو کِیس کی!

ڈاکٹر قادری ۔ کس کی رہی اور کس کی رہ جائے گی
بندے مر جائیں گے وسکی رہ جائے گی کہاں!

ہاشم ۔ (رونی صورت بنا کر) اسے بس کرو بھائی۔ بس کرو

اومکار ۔ یہی تو بیسویں صدی کی سب سے زیادہ کمزوری ہمارے دل میں۔ ان کاموں کو عملی جامہ پہنانے کی جرأت نہیں۔ جن کو ہم اچھا سمجھتے ہیں۔ مگر جن کو لوگ بھی اگر تم شراب پیتے ہو تو پیتے کلب میں ہی۔ ویسے گھر میں

مسز چوہدری ۔ (چار گلاس سائڈ بورڈ سے اٹھا کر میز پر رکھتے ہوئے) بلکہ میں تو کہوں گی کہ آپ خود شراب پیتے ہیں تو ضرور اسے ایک اچھی چیز سمجھ کر پیتے ہیں۔ اور اگر ایسا ہے۔ تو آپ کو چاہیئے کہ مسز کو بھی اس نیکی میں شریک کریں۔ اسی کو تو میں مردوں کی انتہائی خود غرضی سمجھتی ہوں۔ مرد اپنی فطرت سے خود غرض واقع ہوئے ہیں۔ جو کام وہ خود کرتے ہیں اپنی بیویوں کو نہیں کرنے دیتے۔

ڈاکٹر قادری۔ (سوڈے کی بوتل کو کھول کر گلاسوں میں ڈالتے ہوئے) کس قدر افسوس کا مقام ہے۔ سوشل پالٹیکس میں اسی کا نام ہے۔ ایگریس (اینگر) ''دی چینج آف دی سیکولائن سیکس آن دی ڈومین آف دی ماسٹرز اینڈ پریویلیجز آف دی فیمنائن سیکس'' یہ ایکیوالٹی آف سیکسز کی تھیوری نہیں دیکھی ہو گی آپ نے مسٹر ہاشم۔

مسز چوہدری۔ (مسٹر ہاشم کو دیکھ کر) تو مسٹر ہاشم دی نیو ممبر آف آور کلب

اداکار اور قادری۔ (جام صحت تجویز کرتے ہوئے) مسٹر ہاشم

ہاشم۔ ...... تسنیم ...... دے ...... رے ......

دیکھو نا

تسنیم۔ (مشتعل ہو کر) کیوں صاحب یہ آپکا گھر ہے یا شراب خانہ

ہاشم۔ (ششدر سا ہو کر) م ..... م ... میں تو نہیں پی رہا۔ تسنیم

مسز چوہدری۔ (گلاس کو اٹھاتے ہوئے) ارے یہ تو بھی ہاشم ایسی جاہل بیوی سے بھی کوئی ڈرا کرتا ہے۔ ہاں ہم جیسی کلچرڈ اور ریفائنڈ بیویوں سے ڈرنا اور ان کے حکم کی تعمیل کرنا اور بات ہے۔

تسنیم (فرطِ غضب سے) میں پھر عرض کرتی ہوں۔ کہ آپ میرے گھر پہ تشریف لائی ہیں۔ اس لئے میں آپ سے کچھ کہنا نہیں چاہتی۔ مگر اتنا تو میں ضرور پوچھونگی۔ آپ یہ کسی شریف عورت کو اس کے اپنے گھر میں جاہل کہنا انسان کے بچوں کو کتوں کے پلوں سے حقیر سمجھنا کسی دوسری عورت کے شوہر کو اس کی آنکھوں کے سامنے اپنے ہاتھ سے شراب پلانا۔ یہ تہذیب ہے۔ تمدن ہے کلچر ہے۔ اور میں اگر اپنے گھر میں اپنے شوہر کو شراب پینے یا پلانے سے روکوں تو یہ جہالت ہے۔ بدتمیزی ہے۔ بدتہذیبی ہے۔ اگر ایک ماں اپنے بچے کو پیار کرے۔ تو یہ جانوروں کا سا فعل ہے۔ اگر کوئی عورت اپنے گھر میں آئے ہوئے مہمانوں کی خاطر تواضع کرے۔ تو یہ عورت ذات کی ذلت ہے۔

مسز چوہدری۔ (بہت شد و مد سے) بیشک عورتیں ایسے کام کرنے کے لئے پیدا نہیں ہوئیں۔

اداکار۔ (اور زیادہ شد و مد سے) بچوں کی نگہداشت مردوں کا کام ہے

قادری۔ (پہلے سے بھی زیادہ شد و مد سے) کیونکہ میڈیکل سائنس کی رو سے مرد بچوں کی پیدائش کے ذمہ دار ہیں۔

اداکار۔ گھر کا کام کاج کرنا مردوں کا کام ہے۔ عورتوں کو اس سے کوئی واسطہ نہیں۔

قادری۔ (اسی لئے میں) کیونکہ سوشل موریلیٹی اس بات کا تقاضا کرتی ہے۔ کہ جو مرد اپنا گھر آباد کرتا ہے۔ اس کا فرض ہے کہ اس گھر کا انتظام خود کرے۔ اس کے ساز و سامان کا خود کفیل ہو۔ عورت خود زبردستی کسی مرد کے گھر میں نہیں گھس جاتی۔

تسنیم۔ (غصے کے انتہائی احساس سے) تو میڈیکل سائنس اور سوشل مارلیٹی کے اوتار اس دنیا میں عورت کا بھی کوئی فرض ہے کہ نہیں،

قادری۔ (بہت زیادہ زور و شور سے) ہے کیوں نہیں۔ آپ ذرا ان کو اپنے چوبیس گھنٹوں کا پروگرام سنا دیں مسز چوہدری۔

مسز چوہدری۔ (کسی قدر انکسار سے) میری مصروفیتیں تو اس قدر ہیں۔ کہ مسز ہاشم کے وہم و گمان میں بھی نہیں آسکتیں۔

اداکار۔ (ایک پرمعنی انداز سے) تاہم

مسز چوہدری۔ اب دیکھئے نا میں ایسے سرد موسم میں بھی صبح نو بجے ہی اٹھ بیٹھتی ہوں۔ اور زیادہ سے زیادہ دس بجے تک بستر ہی میں لیٹے لیٹے چائے پی لیتی ہوں۔ دس بجے تک مسٹر چوہدری یعنی میرے شوہر دفتر چلے جاتے ہیں۔ تو میں جلدی جلدی حد سے حد بارہ بجے تک غسل، مانکٹ

وغیرہ وغیرہ سے فارغ ہو کر کپڑے پہن لیتی ہوں۔ بارہ بجے سے ڈیڑھ بجے تک میرے لنچ کا وقت ہے کیونکہ میں بریکفاسٹ تو بالکل کھاتی ہی نہیں۔

قادری۔ زیادہ کھانا میڈیکل سائنس کی رُو سے بھی بہت بُرا ہے۔

مسز چوہدری۔ (سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے) ڈیڑھ سے دو بجے تک کوٹھی کے تمام ملازموں میں ٹہل کر دو چار سگریٹ پیتی ہوں۔ اور پھر ٹھیک دو بجے کلب میں پہنچ جاتی ہوں۔ کلب میں اس وقت میری موجودگی بہت ضروری ہوتی ہے۔ کیونکہ اکثر وکیل اور بیرسٹر جو ہماری کلب کے ممبر ہیں۔ اور جو مقدمات کی کمی کے باعث عدالتوں کے کام سے جلد ہی فارغ ہو جاتے ہیں۔ بارہ بجے ہی سے کلب میں میرے منتظر رہتے ہیں۔ اب دو سے چار بجے تک برج۔ چار بجے سے پانچ بجے تک ٹینس۔ پانچ سے سات بجے تک کسی ایکسپیریر اور فیشن ایبل ریسٹورنٹ میں دوستوں اور سہیلیوں کے ساتھ چائے اور کاک ٹیل پارٹیز میں شرکت ۹ بجے سے دس گیارہ بجے تک پھر کلب میں برج یا تاش یا کوئی اور اِن ڈور گیم۔ اب کوئی گیارہ بجے کے قریب کہیں گھر پہنچتی ہوں۔ جلدی جلدی کپڑے بدل کر ٹھیک بارہ بجے ڈنر کے لئے کھانے کی میز پر جا بیٹھتی ہوں۔ اس وقت تک میرے شوہر یعنی مسٹر چوہدری۔ دفتر کے کام۔ گھر کے انتظام۔ بچوں کی تعلیم۔ باورچی خانے کے حساب وغیرہ سے فارغ ہو کر اخبار کا ایڈیٹوریل لکھنے کے لئے اپنے کمرے میں چلے جا چکتے ہیں۔ ڈنر کے بعد کوئی ایک دو بجے جا کر کہیں سونا نصیب ہوتا ہے۔ مگر میں نے نوکروں کو حکم دے رکھا ہے کہ اس وقت سے لے کر صبح تک یعنی جب تک میں اپنی مرضی کے مطابق خود بستر سے نہ اٹھوں کوئی شخص اور اس میں میرے بچے، اور مسٹر چوہدری بھی شامل ہیں۔ میرے بیڈروم کے پاس تک نہ پھٹکے۔

قادری۔ (ایک انداز مسرت سے) بیشک۔ ساؤنڈ سلیپ سے زیادہ صحت کیلئے کوئی چیز مفید بھی نہیں۔ اس پر تمام میڈیکل ورلڈ کا اتفاق ہے۔

تسنیم۔ (تمسخر سے) بہت کام کرتی ہیں۔ آپ مسز چوہدری۔

اوم کار۔ (اظہار فخر و مباہات کے ساتھ) دیکھا آپ نے مسٹر ہاشم۔ یوں ہوا کرتے ہیں متمدن اور مہذب اور شریف عورتوں کے پروگرام۔

مسز چوہدری۔ مسز ہاشم بس ایک دفعہ آپ ہماری کلب کی ممبر بن جائیں۔ پھر آپ کے لئے بھی اس قدر کام کرنا کچھ مشکل نہ ہوگا۔ آخر گھر کی چار دیواری میں بیٹھ کر آپ کر ہی کیا سکتی ہیں۔ یہی تو ہے۔ اس کم بخت پردے کی خرابی۔

قادری۔ (زیادہ شدت احساس سے) اور مشرقی تہذیب کی بداخلاقی۔

اوم کار۔ (غیظ و غضب میں) اور ہماری معاشرت کا درندہ پن۔

ہاشم۔ (خوش ہو کر) اے کاش آپ لوگ تسنیم کو کلب کی ممبر بننے پر رضامند کر لیں۔ تاکہ میرا گھر بھی تہذیب اور تمدن کے نور سے منور ہو جائے۔

تسنیم۔ (غصہ میں) میں آگ میں جھونکتی ہوں تمہاری تہذیب کو اور جہنم میں ڈالتی ہوں۔ تمہارے تمدن کو (مسز چوہدری کو مخاطب کر کے) میں حیران مسز چوہدری آپ کے شوہر اب تک آپ کو اپنی بیوی کیوں سمجھتے ہیں۔

مسز چوہدری۔ (احساس کرب سے) ہائیں۔ میری اتنی انسلٹ نیو لائٹ کے ایڈیٹر کی بیوی کی اتنی انسلٹ۔ کل کا اخبار تمہاری بیوی کی جہالت اور بدتہذیبی کی داستان سے سیاہ ہوگا۔ ہاشم۔

ہاشم۔ (ڈرتے ہوئے) نہیں لیلا وتی۔ خدا کے واسطے کہیں

ایسا نہ کر بیٹھنا۔ ارے اگر اخبار میں میرا نام چھپ گیا تو میں دین دنیا میں کہیں کا نہ رہونگا لیلا وتی۔ یہ میری بیوی کچھ ہے ہی ایسی اُجڈ اور جاہل۔

تنیم۔ (غصے میں) آپ کی بیوی اجڈ اور جاہل ہے۔ کیونکہ وہ صبح پانچ بجے اٹھ کر آپکی چائے۔ آپ کے غسل آپکے لباس۔ آپکے کھانے کا انتظام کرتی ہے۔ آپکی بیوی اُجڈ اور جاہل ہے۔ کیونکہ دس بجے سے چار بجے تک وہ آپکے گھر کی آرائش۔ آپ کے گھر کے کام کاج آپ کے بچے کی تربیت اور حفاظت میں صرف کرتی ہے آپ کی بیوی اُجڈ اور جاہل ہے۔ کیونکہ پھر چار بجے سے رات کے گیارہ بجے تک جب تک آپ اپنی کلب سے واپس نہیں آتے۔ وہ آپ کے آرام و آسائش کی فکر میں مبتلا آپ کے گھر کو شاد و آباد رکھنے کے غم میں سرگرداں رہتی ہے۔ آپ کی بیوی اُجڈ اور جاہل ہے۔ کیونکہ وہ صرف آپ کو اپنا دیوتا آپ کے گھر کو اپنی دنیا اور آپ کی خوشی کو اپنا مقصد حیات سمجھتی ہے۔ اور یہ عورت مہذب اور متمدن ہے۔ کیونکہ تمام دنیا اس کا گھر۔ جہاں بھر کے مرد اس کے رفیق زندگی اور شراب پینا اور برج کھیلنا اس کا سرمایہ ناز ہے۔

(مسز چوہدری کو مخاطب کر کے)

مسز چوہدری میں آپ سے معافی چاہتی ہوں۔ جو کچھ میں نے کہا وہ میری جہالت تھی۔ میری بد تہذیبی تھی۔ آج سے میں آپ کی شاگرد ہوں۔ چلئے میں کلب کی ممبر بننے کے لئے تیار ہوں۔ آئیے مجھے اپنی متمدن دنیا میں لے چلئے۔ اور ایک اجڈ اور جاہل عورت کو مہذب اور شائستہ بنائیے۔

قادری۔ (خوش ہو کر) بسم اللہ بسم اللہ۔

ادمکار۔ (خوش ہو کر) اس کو کہتے ہیں صحیح اخلاقی جرأت

مسز چوہدری۔ (خوش ہو کر) شاباش مجھ کو آپ جیسی عقلمند اور شریف خاتون سے یہی امید تھی۔ میں آپ کو معاف کرتی ہوں۔

(سب جاتے ہیں ہاشم اکیلا متفکر سا نظر آتا ہے)

ادمکار۔ حوصلہ کرو ہاشم۔

قادری۔ (ایک ماہر فن کے انداز تفکر سے) ایبی مینٹل اٹی ٹیوڈ۔ میڈیکل سائنس کی رو سے لاس آف ول ٹیلنسی اینڈ لیک آف اینی شی ایٹو فورس۔ ہوتا ہے

ہاشم .... ۔

جناب تاجور سامری

خراب آباد

کشاکش دہر کی ہے کسقدر کرب آفریں یارب　سکوں کا ایک لمحہ بھی یہاں حاصل نہیں یارب
مرا یہ حال ہے گویا کسی صحرا میں تنہا ہوں　تلاشِ زندگی میں ہر طرف بیتاب پھرتا ہوں
مکدر دیکھ کر سب کو بجھا رہتا ہے جی میرا　نہیں ہے آہ اس ویران دنیا میں کوئی میرا
لہو روتا ہوں میں دن رات انسانوں کی طینت پر　بہت ماتم زدہ رہتا ہوں قحطِ آدمیت پر
نرالے ڈھنگ کا دستورِ دنیا دیکھتا ہوں میں　یقیں جس پر نہ آئے وہ تماشا دیکھتا ہوں میں
گنہ گاری یہاں ابلیس کے سائے میں پلتی ہے　ریا کاری یہاں تہذیب کے سانچے میں ڈھلتی ہے
قتیلِ خنجرِ بیداد معصوموں کو دیکھا ہے　شہیدِ تیغِ استبداد مظلوموں کو دیکھا ہے
یہاں معتوب پایا ہے غریبوں بے گناہوں کو　خلافِ حق یہاں خنجر بکف دیکھا ہے شاہوں کو
مرے مولا یہ مجھ سے کون سا بدلا لیا تو نے　خراب آبادِ عالم میں جو پیدا کر دیا تو نے
دلِ حساس دیکر اور بھی ڈالا مصیبت میں　تڑپ سیماب کی کیا سوچ کر بھر دی طبیعت میں

جئے گا اس طرح کے رنج و غم میں تاجور کیونکر
بتا مجھ کو کہ میری زندگی ہو گی بسر کیونکر

نوشتہ: فرانسیسی افسانہ نگار خاتون

مترجمہ جناب عباس، ایڈیٹر آواز

مقبرہ

وہ بدنصیب تھا۔ جن چیزوں پر خوشیوں کا انحصار ہے۔ ان میں سے ایک بھی اسے میسر نہ تھی۔ نہ دولت تھی۔ نہ شکل وصورت۔ نہ کبھی کسی نے چاہا تھا۔ نہ کسی سے محبت ہوئی تھی۔

بچہ ہی تھا کہ یتیم ہو گیا۔ ماں باپ معاش کی فکر میں ایک دور دراز ملک میں گئے تھے۔ وہیں زندگی کے دن پورے ہو گئے۔ لاوارث بچے کو غیروں نے پالا پوسا تھا۔ لیکن ہوش سنبھالتے ہی ان کے ہاں سے صاف جواب مل گیا تھا۔ بڑی مشکل سے ایک معمولی دفتر میں ملازمت حاصل کی تھی۔ نہ کوئی دوست تھا۔ نہ آشنا۔ تنہا زندگی بسر کرتا تھا۔ کٹھن اور بے لطف۔ برس دھیرے دھیرے گزر رہے تھے۔ جن کا کاٹنا دوبھر تھا۔ اسی طرح زندگی کے تیس سال بیت گئے۔

ایک دن سوچا کہ میرا جینا بھی کوئی جینا ہے۔ ایسی زندگی سے موت بہتر ہے۔ چنانچہ تنگ آ کر خودکشی پر آمادہ ہو گیا۔

دفتر کے دوسرے ملازم آپس میں ہنسی دل لگی کی باتیں کر رہے تھے۔ بعض اپنے دوستوں کو محبت بھرے خط لکھ رہے تھے۔ جنہیں جاذب سیاہی کاغذوں کے درمیان چھپا چھپا کر رکھتے تھے۔ لیکن وہ ان سب سے الگ تھلگ ایک کونے میں بیٹھا سوچ رہا تھا۔ کہ اس زندگی کا خاتمہ کیونکر ہو۔ دنیا میں ایسا کون تھا۔ جس کو وہ اپنی موت سے مرعوب کرتا۔ یا جو اسکی موت سے متاثر ہو سکتا۔ اس لئے اس نے خودکشی کے شاعرانہ اور اضطراب انگیز طریقوں کو سوچنے میں ذرا وقت ضائع نہ کیا۔ یہی سوچتا رہا۔ کہ کیا ترکیب ہو۔ جس سے جان جلد نکل جائے۔ نہ زیادہ تکلیف پہنچے نہ زیادہ دہشت ہو۔

ایک دن صبح اس نے اخبار میں خودکشی کی ایک خبر پڑھی۔ کہ ایک شخص نے چھت سے رسی لٹکا کر پھانسی لے لی۔ یہ طریقہ اسے بہت پسند آیا۔ اس سے بس ایک جھٹکے میں جان نکل جاتی ہے۔

اس نے سوچا۔ ہفتہ بھر ٹھہر جاؤں۔ اس عرصہ میں اس خیال سے طبیعت مانوس ہو جائیگی۔ جانتا تھا۔ بعض زہر ایسے بھی ہیں۔ جو اس سے بھی جلد اپنا اثر دکھاتے ہیں۔ لیکن انہیں حاصل کرنا آسان بات نہ تھی۔

ساتویں روز دفتر کے دوسرے ملازموں نے دیکھا کہ وہ کچھ بدل سا گیا ہے۔ اس کے چہرے کا رنگ پیلا پڑ گیا ہے۔ معلوم ہوتا تھا کسی مہلک مرض کا شکار ہو رہا ہے۔ لیکن منہ سے کوئی نہ بولا۔ کسی نے اس کا حال نہ پوچھا۔ وہ اچھا تھا یا بیمار۔

ان کی بلا سے۔ دفتر کے ملازموں کی نگاہ میں اس کی وقعت انگیٹھی اور اسٹول جتنی بھی نہ تھی۔ بلکہ کم ہی تھی۔ کیونکہ انگیٹھی سردیوں میں انہیں گرمایا کرتی تھی اور اسٹول پر چڑھ کر وہ الماری کے اوپر کے خانوں میں سے کتابیں نکالا کرتے تھے۔

آٹھواں روز آن پہنچا۔ وہ صبح اٹھ کر دفتر کی طرف چل دیا۔ راستے میں ایک دکان پر ٹھہر گیا۔ ایک رسی مول لی۔ اسے جیب میں رکھا اور دفتر پہنچا۔ آج اس کے چہرے پر مردنی چھائی تھی۔ سارے بدن میں ایک کپکپی سی دوڑ رہی تھی۔ دانت زور زور سے بج رہے تھے۔ اس کا یہ حال دیکھ کر دفتر کے ملازم اس سے دُور دُور رہنے لگے۔ اور آپس میں سرگوشیاں کرنے لگے "دیکھنا اس سے بچ کر رہنا۔ کم بخت کو انفلوئنزا ہو رہا ہے۔ ہمیں بھی ساتھ لے مرے گا"

شام کو وہ بہت آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا گھر آیا۔ ماما نے بڑبڑا کر کہا "اتنی دیر کہاں تھے۔ کھانا کب کا پڑا ٹھنڈا ہو رہا ہے؟"

وہ بولا "ناراض نہ ہو۔ آج رات مجھے کھانے کو کچھ نہیں چاہئے . . . . ."

جب یہ خیال آیا کہ یہ میرے آخری الفاظ ہیں اور اس کے بعد میری آواز ہمیشہ کے لئے بند ہو جائے گی۔ تو اسکے جسم میں کپکپی سی دوڑ

گئی۔جس وقت وہ سیڑھیوں پر چڑھ رہا تھا تو یکایک اسے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔مڑکر دیکھا ماما بھاگتی ہوئی اس کے پیچھے پیچھے آرہی تھی۔آتے ہی بولی "اے ہے۔میں تو بھول ہی گئی تھی۔یہ تمہارا خط آیا ہے "

"میرا خط؟" اس نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے خط لے لیا۔کمرے میں پہنچ کر لیمپ جلایا۔اور خط کو کھولا۔پہلے پہل وہ اس کا کچھ مطلب نہ سمجھا۔دوسری بار پھر پڑھا۔تو قدرت کی ستم ظریفی پر ہنس دیا۔وکیل نے اطلاع دی تھی کہ "تمہارا ایک رشتے کا بھائی مر گیا ہے۔اور اب قانون کی رو سے اس کی جائداد کے مالک تم ہو" یہ جائداد تھی کیا۔ایک مقبرہ جس میں صرف ایک مردے کی جگہ خالی تھی۔

عین اس موقع پر جب کہ وہ خودکشی پر آمادہ تھا۔ایک مقبرے کا مل جانا عجب حسن اتفاق تھا۔پھر سوچ میں پڑ گیا۔اسکے دماغ میں نئے نئے خیالات آنے لگے۔

فراعنۂ مصر اپنی زندگی ہی میں اپنے لئے مقبرے تعمیر کروا رکھتے تھے۔جنہیں وہ اکثر دیکھنے جایا کرتے تھے۔اسے شوق چرایا کہ چلو ہم بھی ایک نظر اپنے آخری مسکن کو دیکھ آئیں۔

سوچا آج جمعہ ہے۔میں اتوار کی رات تک ادھر ہی جاؤں اتوار کے دن مقبرے کو جاکر دیکھ آؤں گا۔اس کے بعد دنیا کو خیرباد کہہ دوں گا۔

جب وہ اپنے مقبرے کے سامنے کھڑا ہوا۔تو اس پر ایک عجیب وغریب کیفیت طاری ہو گئی۔ایسا وسیع اور ایسا عالیشان مقبرہ بڑے بڑے امیروں کو بھی نصیب نہیں ہوتا۔اس کا دل ایک عجیب مسرت سے لبریز ہو گیا۔اور وہ اپنے کو بھی امیر سمجھنے لگا۔

اب اس کے دل میں شوق پیدا ہوا۔کہ دیکھوں جن رفیقوں کے ساتھ میں ابدی نیند سونے والا ہوں۔وہ کون کون ہیں۔اس نے سب کے نام ایک ایک کرکے پڑھنے شروع کئے۔

سب سے آخر میں اس شخص کا مدفن تھا۔جس کی موت پر اسے یہ مقبرہ وراثت میں ملا تھا۔اس کا نام پال تھا۔عمر پڑھی۔لکھا تھا۔پچاس سال۔دل میں کہنے لگا "ایسا بوڑھا تو نہ تھا۔یہ بھی بے چارہ میری طرح دنیا میں اکیلا ہی تھا۔۔

۔۔۔یہ میری چچیری بہن اسٹیلے پڑی آخری نیند سو رہی ہے۔آہ بیچاری اٹھارہ برس ہی میں دنیا سے رخصت ہو گئی۔۔۔۔

یہ میرا چچیرا بھائی چارلس ہے۔۔۔۔"

شام کو گھر پہنچا۔تو معلوم ہوتا تھا۔جیسے کسی نئی جگہ آگیا ہے ایک ایسی جگہ جو کچھ بھی تھی۔مگر شہر خموشاں سے بہت مختلف تھی۔جہاں دکھ اور تلخیاں تو تھیں۔لیکن غفلت کی اتھاہ تاریکی اور بے بسی کی ابدی نیند نہ تھی۔جس کی سنگدلی اور خودغرضی بھی موت کی نامعلوم بستی سے بہرحال بہتر کہی جا سکتی ہے۔ایک نہ ایک دن مرنا تو ہے ہی۔پھر زندگی کا خاتمہ اپنے ہاتھوں کیوں کرے۔اس خوبصورت مدفن نے اسے زندگی کی قدروقیمت سے آگاہ کر دیا تھا۔

"میں کھڑا ہو سکتا ہوں۔بات کر سکتا ہوں۔۔۔چل پھر سکتا ہوں۔میری آنکھیں دیکھ سکتی ہیں۔۔۔میں سانس لے سکتا ہوں۔۔۔۔"

ایک فاتحانہ جذبے کے زیر اثر اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔زندہ رہ کر وہ اپنے خاندان کے تمام لوگوں سے ممتاز اور بالاتر تھا۔ان کا مالک اور آقا تھا۔

اس نے کہا "اگلی اتوار میں پھر مقبرہ دیکھنے جاؤں گا اور اس دفعہ مردوں کے لئے پھول بھی لیتا جاؤں گا۔۔۔۔۔"

پہلے اس کی تعطیلیں یونہی گذر جایا کرتی تھیں۔اور کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا۔کہ کہاں جائے۔لیکن اب اسے ایک جگہ مل گئی تھی۔سیر کیلئے۔۔۔وقت گذارنے کیلئے۔۔۔۔اب وہ دنیا میں اکیلا نہ تھا۔بلکہ ایک بڑے کنبے کا فرد تھا۔

وہ میز کے پاس بیٹھ گیا۔اور وکیل کے خط کا جواب دینے کے لئے ایک سادہ کاغذ اٹھایا۔رتی سرک کر میز سے نیچے گر پڑی۔مگر وہ اپنے خیالات میں کچھ ایسا محو تھا۔کہ اس کی طرف توجہ ہی نہ کی۔

مصنفہ:- ایف ڈبلیو بین
مترجمہ جناب سراج الدین احمد نظامی

ناگ دیوی

پہلا باب

آسیب زدہ حسن

مدت ہوئی صحرا کے کنارے ایک سورج منبی راجہ کی راجدھانی تھی۔ جس طرح دوپہر کے وقت جھیل مانس کی شفاف گہرائیوں میں سورج کا عکس نظر آتا ہے۔ اسی طرح اس راجہ کا عکس ایک پتر کے روپ میں نظر آتا تھا جو عمر کے سوا باقی ہر لحاظ سے اپنے پتا جیسا تھا۔ اس نے اس کا نام اج رکھا اور کہا: یہ کوئی اور نہیں میں ہی ہوں جو موت پر فتح پا کر دوسرا جنم لئے بغیر ایک اور شریر میں آگیا ہوں۔ وہ بالکل اپنے باپ دادا اور اس دیوتا کی مانند ہوگا جس کے نام پر میں نے اس کا نام اج رکھا ہے۔ جیسے جیسے اس کا پتر جوان ہوتا گیا اس کی خوشی بھی بڑھتی گئی، وہ سرو کی مانند بلند قامت تھا۔ اور شیر کی طرح بلونت۔ اس کا چہرہ ایک استری کے چہرے سے زیادہ سندر تھا۔ اس کی آنکھیں مست ہرنیوں کی آنکھوں کو شرماتی تھیں۔ اس کے ہونٹ ہنسی کی مورتی تھے۔ اور وہ کامدیو معلوم ہوتا تھا اس کا پتا اس کی طرف دیکھتا تو کہتا: بیشک برہما نے غلطی سے اسمیں زنانہ اور مردانہ حسن بھر دیا ہے۔ اگر اس کی کوئی جڑواں بہن ہوتی، تو یہ بتانا مشکل ہو جاتا کہ ان میں سے کون لڑکا ہے اور کون لڑکی؟

جب اج اٹھارہ سال کا ہوا تو اس کا پتا سرگباش ہو گیا اس کے مرتے ہی اس کے رشتہ داروں نے جن کا سردار اج کا ماموں تھا۔ اج کے خلاف سازش کی اور ایک رات جب کہ وہ سو رہا تھا۔ اس پر دھوکے سے حملہ کر کے اسے زنجیروں میں جکڑ لیا۔ کیونکہ اس کی طاقت کے خوف سے وہ بیداری کی حالت میں اس پر حملہ کرنے کی جرأت نہیں کر سکتے تھے! وہ آپس میں صلاح مشورہ کرنے لگے کہ اس کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے بعض کی رائے تھی کہ اسے فوراً ہی ڈھیر کر دیا جائے لیکن منتری نے جو سازش میں شریک تھا۔ اس بات پر زور دیا کہ اسے زندہ چھوڑ دیا جائے۔ اس نے دل میں کہا: "اگر وہ لمبے کبھی سنگھاسن پر براجمان ہو جائے تو مجھے اپنی جان کے بچاؤ کے لئے ایک بہانہ مل سکتا ہے۔"

صبح سویرے انہوں نے اسے ایک اونٹ پر باندھ کر صحرا میں چھوڑ دیا اور خود اس کے پیچھے ہو لئے، وہ کئی گھنٹے تیز رفتاری سے چلتے رہے۔ یہاں تک کہ صحرا کے وسط میں پہنچ گئے۔ یہاں انہوں نے اسے اونٹ سے نیچے اتارا اور اس کے قریب تھوڑا سا اناج اور پانی رکھ دیا۔ اس کے ماموں نے کہا "اے بیٹا! اب ہم تمہیں اور تمہارے سائے کو اس صحرا میں چھوڑے جاتے ہیں اگر تم اپنی جان بچا سکتے ہو تو بچا لو لیکن یاد رکھو گھر واپس آنے کی کوشش نہ کرنا۔ میں ہر طرف اپنے پہرہ دار مقرر کر دوں گا جو تیرے آنے کا خیال رکھیں گے۔ اور اگر تم گرفتار ہو گئے تو میں تمہیں زندہ نہ چھوڑوں گا۔"

پھر اس کے ہاتھوں کی رسیاں کھول کر اور اس کے قریب ایک چھوٹا سا چاقو رکھ کر وہ اونٹوں پر سوار ہو گئے۔ اور ریت پر ایک ایسے بادل کے سائے کی طرح بھاگنے لگے جیسے کبھی ہوا میں اڑائے لئے جا رہی ہوں۔

(۲)

اس نے چاروں طرف نظر دوڑائی اور آسمان کی طرف دیکھ کر سورج سے کہنے لگا: "وہ ہے میرا دادا! وہ آسمان پر تنہا ہے۔ اور میں زمین پر!" اس نے دونوں ہاتھ سینہ پر رکھ کر اور پھر ہوا میں پھیلا کر کہا: "اے لوک پالو گواہ رہو کہ میں ماضی کو دفن کر چکا ہوں، اب ساری دنیا میری ہے میں سب منتری

کو ایک نہ ایک دن ضرور مناسب سزا دوں گا۔ آج زندگی میں پہلی مرتبہ مجھے زندہ رہنے کا مطلب معلوم ہوا ہے۔ آ ہا ہا! میں زندہ ہوں اور سانس لے رہا ہوں، اور میرے سامنے اناج اور پانی رکھا ہے۔ اب میں دیکھوں گا کون بلونت ہے؛ موت (جو اس صحرا کے روپ میں میری آنکھوں کے سامنے ہے) یا زندگی؟ مجھے اپنا راج کھو دینے کی کوئی چنتا نہیں، میرے پتا سرگباش ہو چکے ہیں، میں راج کو گھاس کے ایک تنکے سے زیادہ نہیں سمجھتا۔ رونے دھونے کی بجائے میں ایسا محسوس کرتا ہوں کہ میں نے آج نیا جنم لیا ہے۔ آ ہا ہا! زندگی بڑی چیز ہے۔ خواہ وہ صحرا میں ہی کیوں نہ ہو۔" یہ کہکر اس نے سورج کیطرف دیکھا اور بلند آواز سے پکار کر کہنے لگا۔ "آ میرے دادا! آؤ میں اور تم اکٹھے اس ریت میں سفر کریں۔ نہیں نہیں تم بہت تیز رفتار ہو۔ اور اچھے ساتھی نہیں بن سکتے۔ خواہ تمہارا ساتھی تمہاری اپنی نسل سے ہی کیوں نہ ہو۔ اس لئے تم میرے آگے آگے چلو جیسا کہ بزرگوں کا قاعدہ ہے۔ اور میں تمہارے پیچھے پیچھے آتا ہوں۔"

بعد ازیں وہ ریت پر لیٹ گیا اور کپڑے سے سر ڈھانپ کر سو گیا، وہ سارا دن یونہی لیٹا رہا یہاں تک کہ سورج ڈوبنے لگا، تب وہ اٹھا، تھوڑا سا کھایا پیا، اور سورج کے پیچھے پیچھے چلنے لگا، جو پچھمی پہاڑوں میں آرام کرنے جا رہا تھا۔ اج رات بھر چلتا رہا۔ اس سفر میں اس کا تنہا ساتھی چاند تھا۔ راستہ میں اس نے انسانوں اور اونٹوں کے پنجر دیکھے۔ جو ریت پر پڑے زبانِ حال سے ایک خاموش ہنسی کیساتھ اس سے کہہ رہے تھے۔ "اپنا انجام دیکھ لو۔ یاد رکھو۔ تم ذرا اور آگے بڑھے اور ہماری طرح ہوئے۔" لیکن وہ ننگے پاؤں چلتا رہا گویا وہ ایک سوئے ہوئے بھوکے شیر کی کچھار میں سے جلدی جلدی نکل رہا ہو۔ یہاں تک کہ صبح ہو گئی، اور سورج اس کی پشت پر سے طلوع ہونے لگا۔ وہ لیٹ گیا اور سارا دن انتظار کرتا رہا۔ اور رات کو پھر چل پڑا۔ اسی طرح وہ کئی دن اور راتیں چلتا رہا۔ یہاں تک کہ اس کا اناج اور پانی ختم ہو گئے اس نے دانت پیس کر کہا۔ "پروا نہیں میں اس صحرا کے کنارے پہنچ کر ہی دم لوں گا۔"

اسی طرح وہ کئی راتیں چلتا رہا، اور ہر رات پہلے سے زیادہ کمزور ہوتا گیا۔ آخر ایک رات ایسی بھی آگئی کہ وہ بھوک اور پیاس کی شدت سے بیہوش ہونے لگا۔ اور دل سے کہنے لگا۔ "میں مر رہا ہوں اور اب خاتمہ بالکل قریب ہے۔" یکایک اس کی پشت پر سے سورج طلوع ہوا۔ اس نے آنکھیں اٹھا کر دیکھا۔ اس کے سامنے سورج کی روشنی میں ایک شہر کی دیواریں چمک رہی تھیں یہ شہر امید کے سورج کی کرن تھی۔ اس نے آنکھیں مل کر پھر غور سے دیکھا اور کہنے لگا۔ "کیا یہ نظر کا فریب ہے، جو مرتے وقت مجھ سے چھیڑ چھاڑ کر رہا ہے۔ یا در حقیقت کوئی شہر ہے؟ آ ہا ہا! نہیں نہیں یہ واقعی شہر ہے۔" جوشِ مسرت سے اس میں پھر طاقت آگئی، اس نے جھک کر تھوڑی سی ریت اٹھائی اور اپنے پیچھے پھینک کر کہا۔ "اے مارولتر تم پر لعنت! میں تم سے بازی جیت چکا ہوں اور تمہارے چنگل سے بچ نکلا ہوں۔" اتنا کہکر وہ تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا شہر کی سمت چلنے لگا۔ وہ دل میں خوفزدہ تھا۔ اور شہر کیطرف دیکھتے ہوئے ڈرتا تھا۔ کہ کہیں وہ غائب نہ ہو جائے۔

قریب پہنچکر اس نے شہر کی فصیل پر ایک ہجوم دیکھا۔ وہ ابھی دور ہی تھا، کہ یکایک شہر کا عظیم الشان دروازہ کھلا، اور لوگوں کا ایک ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر اس کی طرف بڑھا، وہ دل میں کہنے لگا۔ "آ ہا! معلوم ہوتا ہے۔ کہ اس شہر کے باشندے میرے منتظر ہیں۔ جو میری طرح بیتابی سے میری طرف چلے آ رہے ہیں۔" ہجوم نزدیک پہنچ گیا، اس نے غور سے دیکھا تو سب کی سب عورتیں تھیں۔ اور ان میں کوئی بھی مرد نہ تھا، وہ حیران ہو رہا تھا، کہ عورتیں دوڑ کر اس کے قریب پہنچ گئیں، اور ہنستی اور چیختی چلاتی اس سے لپٹ گئیں۔ انہوں نے اسے پکڑ لیا اور کھینچتی ہوئی شہر کی طرف لے جانے لگیں۔ وہ سب کی سب بول رہی تھیں، اس کی باتوں کیطرف ذرا متوجہ نہ ہوتی تھیں، اج نے کوئی مقابلہ نہ کیا اس کی حالت اس پتے کی سی تھی، جسے دریا کی لہریں تیزی سے بہائے لئے جا رہی ہوں، اس نے حیرت سے اپنے دل سے کہا۔ "کیسی عجیب بات ہے۔ کہ یہ سب عورتیں میرے لئے لڑ جھگڑ رہی ہیں گویا انہوں نے اس سے پہلے کوئی مرد دیکھا ہی نہیں، وہ مرد کہاں ہیں، جن کی یہ استریاں ہیں؟ یا کیا میں ایک ایسے شہر میں آگیا ہوں جہاں عورتیں ہی عورتیں ہیں۔ اور مرد کوئی نہیں؟ کیا میں صحرا کی گہرائیوں سے اسی لئے نکلا ہوں، کہ استریوں کے سمندر میں غرق ہو جاؤں؟ ایک مرد کا اس

سمندر میں کیا کام! کیا اپنے پتیوں کو درگا ماتا کی بھینٹ چڑھانے کے بعد مجھے تو نہیں لے جا رہی ہیں؟ کیا میں صحرا میں مر چکا ہوں، اور یہ دوسری دنیا کا ایک خواب ہے؟ کیا یہ آکاش کی اپسرائیں تو نہیں جو مل کر مجھے لینے آئی ہیں۔ گویا میں لڑائی میں مارا گیا ہوں۔ یقیناً یہ وہی ہیں۔ کیونکہ ان میں سے بعض اندر کے اکھاڑے کی اپسراؤں سے بھی زیادہ حسین ہیں۔ کچھ ہو، صحرا میں تن تنہا کتے کی موت مرنے سے یہ کہیں بہتر ہے۔ کہ ان استریوں کے ہاتھوں ٹکڑے ٹکڑے ہو جاؤں۔

راستہ میں اس نے قریب کی عورتوں سے پوچھا "سندریو! تم کون ہو، اور مجھے کہاں لئے جا رہی ہو، اور مجھے دیکھ کر تم اتنی خوش کیوں ہو؟" آخر انہوں نے جواب دیا "اے حسین اجنبی! کچھ نہ پوچھو تمہیں بہت جلد معلوم ہو جائے گا۔ ہم تمہیں اپنے راجہ کے پاس لیجا رہی ہیں۔" اج نے دل سے کہا "آہا! یہاں بھی راجہ ہے۔ ہاں تو ان عورتوں کا بھی ایک راجہ ہے۔" وہ بھی ان کی طرح ہنسنے لگا اور وہ قہقہوں کے سمندر کی طرح شہر کے دروازوں میں داخل ہو گئے اور بازاروں میں چلتے گئے، آخر کار وہ راجہ کے محل کے سامنے پہنچ گئے۔ سارا راستہ اج ادھر ادھر دیکھتا رہا۔ لیکن اسے تمام بازاروں میں کسی مرد کا سایہ تک نظر نہ آیا۔ سارے بازار عورتوں سے کھچا کھچ بھرے پڑے تھے

محل کے دروازوں کے پہرہ داروں نے جو سب کی سب عورتیں تھیں، اسے پکڑ لیا۔ اور اندر لے گئیں، اور وہ تمام عورتیں جو اسے لائی تھیں، ان کے پیچھے پیچھے چلنے لگیں وہ سیڑھیاں چڑھنے لگیں اور تھوڑی دیر بعد وہ ایک عظیم الشان ہال میں داخل ہوئیں۔ جس کے سنگیں ستونوں کا عکس گہرے سبز بلوری فرش پر پڑتا تھا، اور ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ نازک اندام راج ہنسوں نے خاموش جھیل میں اپنی گردنیں پانی کے نیچے چھپا رکھی ہیں۔ معاً اج کو معلوم ہوا کہ وہ راجہ کے حضور میں کھڑا ہے۔

یکایک سب عورتیں پکار اٹھیں "مہاراج مبارک ہو دیکھئے ہم آپ کی سندرتیری کے لئے ایک اور پتی لائی ہیں" اج چونکا، یہ کیا! ایک اور پتی! اس سے پہلے اس عجیب و غریب راجہ کی تیری کے کتنے پتی ہیں؟ کیا وہ پتیوں کی پیاسی ہے؟ وہ کھڑا سوچتا رہا۔ راجہ سنگھاسن سے اچھل پڑا اور اس کی طرف بڑھا۔ اج نے اس کی طرف دیکھا، تو وہ پہلے سے زیادہ حیران رہ گیا۔ کیونکہ راجہ غم کی ایک مورتی معلوم ہوتا تھا۔ اس کے لمبے لمبے بال فرط غم سے سفید تھے۔ اس کی آنکھیں رونے سے سرخ تھیں، اور ان کے گرد سیاہ حلقے پڑے تھے وہ بلند قامت تھا۔ لیکن بوڑھا اور کبڑا ہو گیا تھا۔ گویا سوچ بچار کے بوجھ تلے دب گیا ہو۔ اس نے مسکرانے کی بے سود کوشش کی، اور کانپتی ہوئی آواز میں کہا "دوست! خواہ تم کوئی ہو، میں مدت سے تمہارا منتظر تھا۔ میں تمہیں دیکھ کر واقعی خوش ہوں اور جس طرح ایک مور بادل کو دیکھ کر ناچنے لگتا ہے۔ میں تمہیں دیکھ کر خوشی سے ناچنا چاہتا ہوں"

اج راجہ کی طرف دیکھ کر زور سے ہنسنے لگا "مور اور اس میں بہت سی باتیں یکساں ہیں۔ وہ ہنستا گیا، یہاں تک کہ آنسو اس کے رخساروں پر بہنے لگے۔ گویا وہ راجہ کے آنسوؤں کی نقل اتار رہے ہوں آخر جب وہ بولنے کے قابل ہوا، تو کہنے لگا "مہاراج! شما کیجئے۔ میں بہت گرسنہ ہوں، اور صحرا میں سے زندہ بچ کر آ رہا ہوں، مجھے کھانا دو اور پانی نہیں تو میں تمہارے قدموں میں جان دیدوں گا۔ اور بعد ازیں مجھے اپنی تیری دکھاؤ، جس سے میرا بیاہ ہونا ہے۔ خواہ میں اسے چاہوں یا نہ چاہوں"

راجہ بولا "اے برھما کی بدھی کے نمونے میں تیری گستاخی معاف کرتا ہوں، تمہیں کھانا پانی اور جو چیز تم چاہو ابھی ملے گی۔ اور تیری دیکھنا چاہتے ہو تو لو دیکھو وہ سامنے کھڑی ہے۔ وہ طنبورہ کو ناچ سکھا سکتی ہے"

(۳)

آج نے پھر ہنسنا چاہا اور کہا "اس مظلوم کھوسٹ راجہ پر لعنت جو صرف ناچ کی باتیں کرتا ہے" راجہ مڑا اور ایک طرف کھڑا ہو گیا اج نے نگاہ اٹھا کر دیکھا۔ اور اس کی ہنسی اندر کی اندر ہی مر گئی۔ اور اس نے آہستہ سے کہا "آہا! یہ سب سے بہتر ہے" راجہ، عورتیں صحرا اور ساری باتیں اس کے دماغ سے محو ہو گئیں۔ اور وہ حیرت سے بت بنا تکنے کا تکتا رہ گیا۔ اس کے روبرو راجہ کی سندرتیری کھڑی تھی۔ اور اپنے پتا کی مانند غم کی مورتی معلوم ہوتی تھی۔ اس کا جسم نازک تھا۔ رنگت زرد تھا۔ اور بال چمکتے سیاہ بادل کی طرح تھے

اس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں سے غم نمایاں تھا۔ اور آج اس کی خاموش اور اتھاہ گہرائیوں میں غرق تھا۔ اس کے سرخ ہونٹ کانپ رہے تھے گویا وہ مسکرانا چاہتے ہوں۔ وہ اس کی طرف بڑھنا چاہتی تھی، آج اس کے سامنے کھڑا تھا۔ اس سمندر کی طرح جس کی لہروں پر چاندنی کا ایک چمکنے لگے۔ وہ تھوڑی دیر تک یونہی کھڑے رہے۔ پھر سغا آج بغیر سوچے سمجھے آہستہ سے کہنے لگا "ہاں تو پھر اس سندر استری نے جو یاسمین کے ایک نازک غنچہ کی مانند پوتر معلوم ہوتی ہے، پہلے کتنے مردوں سے بیاہ کیا ہے؟" پھر گویا وہ کسی خواب سے بیدار ہوا ہو، اس نے دیکھا کہ راجہ کی پتری کے گال سُرخ ہو گئے ہیں، اس نے ایک آہ بھری اتنے میں راجہ کی آواز آئی: "افسوس! افسوس! ابھی تک کوئی پتی اسے حاصل نہیں کر سکا۔ اگرچہ اس کی عمر سولہ سال سے زیادہ ہے اور یہ طنبورہ کو بھی ناچ سکھا سکتی ہے"۔

راجہ کے الفاظ سے اس کی آتما پر سے کوئی بوجھ ہٹ گیا آج کھل کھلا کر ہنسنے لگا اور گرنے لگا، لیکن اس نے بوڑھے راجہ کا بازو تھام لیا، اور اتنے زور سے کھینچا کہ وہ چیخنے لگا۔ آج نے بلند آواز سے کہا "آہا! مہاراج میں بھی راجکمار ہوں۔ اور اب میں آپ کا داماد ہونگا اور آپ کی پتری کو ایک پتی مل جائے گا۔ اور وہ اسے ناچ سکھائے گی"۔ یہ کہکر وہ ہنسنے لگا۔ اور کمزوری کیوجہ سے زمین پر گر پڑا، اس کی ہنسی سسکیوں میں تبدیل ہو گئی۔ راجہ کی پتری اپنے پتا کی طرف متوجہ ہوئی، اور ماتھے پر تیوری ڈال کر کہنے لگی: "پتا جی! کیا آپ ان کے لئے کھانا اور پانی نہ منگوائیں گے؟ کیا آپ نہیں دیکھتے کہ راجکمار خواہ وہ کتنا ہی بہادر اور طاقتور کیوں نہ ہو، اسوقت کمزور ہو رہا ہے اور آپ کے سامنے بھوک اور پیاس کیوجہ سے مر رہا ہے"۔

راجہ نے تالی بجائی اور پاؤں زمین پر مارے، عورتیں دوڑیں آج کو اٹھا کر لے گئیں، انہوں نے اسے نہلایا، اسے پوشاک پہنائی اور اسے کھانا کھلایا یہاں تک کہ اس کی حالت اچھی ہو گئی، تھوڑی دیر بعد وہ اسے پھر دربار میں مہاراج کے حضور میں لے گئیں۔

(۴)

جب وہ پھر دربار میں آیا، تو وہ پہچانا نہ جاتا تھا، راجہ کو ایسا معلوم ہوا کہ وہ ایک سورج ہے۔ لیکن راجہ کی پتری نے محسوس کیا۔ کہ خود کامدیو دھرتی پر اتر آیا ہے۔ آج نے خوشی سے کہا: "مہاراج اب میں بالکل ہوش میں ہوں اور میری طاقت واپس آ گئی ہے۔ اور اگر میں نے بے خبری میں کوئی گستاخی کی ہے تو یہ میرا قصور نہیں، بلکہ اس صحرا کا ہے، جس نے تیرے شہر کو چاروں طرف سے گھیر رکھا ہے، میں بھوک پیاس اور حیرت سے اپنے آپ میں نہ تھا"۔ پھر اس نے راجہ کو اپنا اور اپنے خاندان کا نام بتایا، اور اپنی تمام آپ بیتی سنادی، اس عرصہ میں وہ اور راجہ کی پتری ایک دوسرے کو ایسی نگاہوں سے دیکھتے رہے۔ جو آہوئے مشابہ تھیں، آج نے اپنے دل سے کہا "اسے کیا ہو گیا ہے، کیونکہ اس کی خاموشی غم جاتا رہا ہے۔ اور وہ پرجوش معلوم ہوتی ہے اور اس کے رخسار سرخ ہو رہے ہیں، اور اس کی بڑی بڑی آنکھیں چمک رہی ہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کی آتما میں آگ لگ رہی ہے"۔ جب وہ اپنی آپ بیتی ختم کر چکا تو کہنے لگا: "مہاراج میں آپ کو اپنا سب حال بتا چکا ہوں، اب آپ کی باری ہے، مجھے اس حیرت سے نکالیں، اس شہر میں صرف عورتیں ہیں، مرد کیوں نہیں؟ اور آپ اتنے غمزدہ کیوں ہیں؟ اور سب سے عجیب بات یہ کہ آپ کو اپنی پتری کے لئے ایک پتی تلاش کرنے میں اتنی مصیبت کیوں کرنی پڑتی ہے؟ میں اپنے لئے یہ کہتا ہوں کہ خواہ آپ کسی قسم کی شرطیں پیش کریں، میں آپ کی پتری سے بیاہ کرنے کو تیار ہوں، اگر وہ مجھے اپنا پتی بنانے کو تیار ہے، تو میں سمجھوں گا کہ مجھے اپنے جنم کا پھل مل گیا"۔

اس کی حیرت کی کوئی حد نہ رہی، جب اس کی ان باتوں کو سنکر بوڑھا راجہ زار زار رونے لگا۔ اس کے رخساروں پر آنسوؤں کا تار بندھ گیا اور وہ کہنے لگا: "افسوس! افسوس! میرے ہونے والے داماد! تم بہت اچھے آدمی ہو، لیکن میں تمہیں دیکھ کر اور تمہاری تجویز سن کر بہت غمزدہ ہو گیا ہوں، کیونکہ تم سے پہلے بھی سینکڑوں نے یہی الفاظ کہے۔ لیکن ان سب کا انجام بہت برا ہوا، اور دیکھو میری پتری ابھی تک کنواری کی کنواری ہے! لیکن یہ اس کا دوش نہیں، ہاں یہ دوش ضرور ہے کہ وہ بے حد حسین ہے، اس کی عصمت بدستور محفوظ ہے۔ یہ سب میرا قصور ہے۔ اور ان کرموں کا پھل ہے، جو میں نے اپنے پہلے جنم میں کئے

سنو، مدت ہوئی جب میں جوان تھا۔ میں نے ساری دھرتی کو فتح کرلیا اور جب میں اپنی مصیبتوں کے بعد آرام کرنے لگا۔ تو ایکدن میرے پاس نارد جی اور رشی آئے، نارد جی پہلے داخل ہوئے۔ انہوں نے دھرتی فتح کرنے پر میری تعریف کی، تو میں نے مناسب جواب دیتے ہوئے کہا کہ میں ساری دھرتی آپ کی نذر کرتا ہوں، وہ بولے مہاراج مجھے دھرتی سے کیا فائدہ؟ میں تمہاری اس نذر کو قبول نہیں کرسکتا۔ ہاں تمہیں آشیرباد دیتا ہوں، کہ پرماتما تمہیں دھرتی کے پیٹ میں سے ایک بے مثال حسین بچہ دے۔ اس کے بعد دوسرا رشی داخل ہوا، اور مجھے مبارکباد دینے لگا۔ میں نے اس کی چرنوں میں بھی دھرتی نذر پیش کی، رشی نے یہ سنکر میری طرف غضبناک آنکھوں سے دیکھا۔ اور آہستہ سے کہا:-

"کیا کہا! کیا تم میرے گن نہیں جانتے؟ کیا تم مجھے دوسرے دن کا بچا کھچا دیتے ہو! تمہارے ہاں بچہ ضرور ہوگا، لیکن بیٹی! وہ بے حد حسین ہوگی لیکن اس سے تمہیں اور خود اس کو کوئی فائدہ نہیں پہنچے گا۔ یہ سراپ دیکر وہ رشی ہنسا اور فوراً چلا گیا۔ اس کے بعد مناسب وقت پر میرے ہاں ایک بیٹے کے بجائے یہ پتری پیدا ہوئی، اور میرے اوپر غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا، اور رشی کا سراپ حرف بحرف پورا ہوکر رہا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ چندرمان کی طرح سندر ہے۔ اور تریا چلتر سے واقف ہے لیکن یہ سارا امرت اس رشی کے سراپ سے بس بن گیا ہے، اور اس کا حسن ہی ہم دونوں کے لئے غم کا باعث ہے، دو سال ہوئے ہم دونوں آدھی رات کے وقت محل کے شاہ نشین پر سیر کررہے تھے۔ اور دن کی گرمی کے بعد چاند کی ٹھنڈی روشنی سے لطف اٹھا رہے تھے۔ کہ یکایک ہم نے صحرا میں سے پروں کے پھڑپھڑانے کی آواز سنی۔ اور ہوا میں سے ایک مرد اور ایک عورت کے بحث کرنے کی آوازیں آنے لگیں، اگرچہ ہم آوازیں پہچان سکتے تھے۔ لیکن کوئی مطلب نہ نکال سکتے تھے۔ کیونکہ وہ کسی اور زبان میں باتیں کررہے تھے۔ تب تھوڑی دیر بعد وہ دونوں پوشیدہ ہستیاں ہماری آنکھوں کے سامنے آگئیں۔ یہ گدھوں کا جوڑا تھا۔ یکایک نر نے انسانی آواز میں کہا:" اے مہاراج اپنی پتری کا بیاہ مجھ سے کردے۔ میں نے غصے سے جواب دیا۔ میں اپنی پتری کا بیاہ ایک منحوس پنچھی سے نہیں کرسکتا،

یہ سنکر وہ شیطان عاشق ایک چرخ کیطرح ہنسا اور معاً میری پتری بے ہوش ہوگئی، اور چاندنی میں وہ اتنی حسین دکھائی دی، کہ وہ پنچھی بھی متاثر ہوگیا۔ اس نے ساتھی سے کہا۔

"پتری میں سچا تھا، تم جھوٹی تھیں، دیکھو وہ تم سے بھی زیادہ سندر ہے یا نہیں، یہ سنکر مادہ ہنسی اور کہنے لگی:۔

"وقت بتادے گا۔ سنو مہاراج، یہ ناگ دیوتا واسوکی کا بھتیجا کرتی سینا ہے۔ ہم نے صرف تم سے باتیں کرنے کے لئے گدھوں کا روپ دھارا ہے۔ میں اس کی اکلوتی پتری ہوں، اس نے کہا تھا کہ تمہاری پتری مجھ سے زیادہ سندر ہے۔ اس پر میں نے بدلہ لینے کی قسم کھائی، لیکن میں نے وعدہ کیا کہ اگر تم اس کی شادی اس سے کردو۔ تو میں تمہاری پتری کو کچھ نہ کہوں گی، اسی لئے اس نے اسے میرے انتقام سے بچانے کے لئے تم سے شادی کی درخواست کی ہے۔ اب جب کہ تم نے یہ درخواست نامنظور کردی ہے۔ اور ہماری ظاہری شکل کیوجہ سے بہت نفرت کی ہے۔ اور میرے حسن کی بھی بے عزتی کی ہے میں تم دونوں کو سزا دونگی۔ اسے اس کے حسن کے لئے اور تمہیں تمہارے غرور کے لئے، تم نے ایک پریمی کو حقیر سمجھا ہے، اس لئے تمہاری پتری کے بیاہ کے لئے یہ شرط ضروری ہے۔ کہ اس کا جو چاہنے والا اس سے بیاہ کی آشا کرے، اسے رات کو تنہا اس شاہ نشین پر بھیجا جائے اور اگر وہ دعویٰ کرکے یہاں نہ آئے۔ تو ہم اس شہر کا ستیاناس کردینگے" یہ کہکر دونوں غائب ہوگئے۔ اس واقعہ کے تھوڑا عرصہ بعد یہ معلوم کر کے کہ میری پتری کا بیاہ ہونے والا ہے۔ کئی پریمی اس کے حسن کی شہرت سنکر دنیا کے ہر حصے سے آنے لگے۔ اس کا نام یشودتی ہے تب یہ پریمی سال کے دنوں کیطرح یکے بعد دیگرے آئے، اور شہر کی شاہ نشین پر گئے۔ اور ان دنوں کیطرح پھر واپس نہ آئے۔ بلکہ گم ہوتے گئے۔ اور یہ پتہ نہ چلا۔ کہ وہ کہاں گئے۔ جب دور دراز کے سب پریمی اور قریب کے راجے ختم ہوگئے۔ تو میں نے اسے محل کی کھڑکیوں میں بٹھا کر اپنے شہر کے مردوں کے سامنے پیش کیا، اور ہر شخص جس نے اسے دیکھا۔ اسے حاصل کرنے کے لئے دوڑا۔ اور شہر کے مرد بھی یکے بعد دیگرے پہلے پریمیوں کی طرح ختم ہونے

لگے یہاں تک کہ شہر میں چند مرد رہ گئے۔ اس پر عورتوں نے اپنے خاوندوں، بھائیوں اور بیٹوں کو چھپا دیا، اور جیسا کہ تم دیکھ رہے ہو یہاں سارے شہر میں کسی مرد کی صورت تک دکھائی نہیں دیتی لیکن جو مسافر اس شہر میں آتا ہے۔ یہ اسے پکڑ لیتی ہیں اور اسے سیدھا میرے پاس لے آتی ہیں، اور جب وہ میری پتری کو ایک نظر دیکھتا ہے تو وہ اس پر سو جان سے فدا ہو کر اس سے بیاہ کرنے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ لیکن جو بھی اس شاہ نشین پر جاتا ہے، پھر واپس نہیں آتا، اور یہ ہے میری پتری جو ابھی تک بن بیاہی کنیا ہے، اور میں دیکھ رہا ہوں کہ میرے باپ دادا غم سے ہاتھ مل رہے ہیں، اور میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ جونہی میری جان نکلی میری ساری نسل کا خاتمہ ہو جائے گا"

اج کھڑا بوڑھے راجہ کی کہانی سنتا رہا۔ راجہ کی پتری اٹھی اور چیخ مار کر کہنے لگی: "اے راجکمار! جلدی بھاگ جاؤ! چلے جاؤ! لوٹ جاؤ خواہ تمہیں پھر صحرا میں کیوں نہ جانا پڑے، اور مجھے میرے پتا، اور اس شہر کو ان کی قسمت پر چھوڑ دو" وہ لڑکھڑا کر گرنے لگی، مگر اج فوراً اٹھا اور اسے سنبھال لیا۔ اج کی تمنا تھی کہ وہ اسی طرح اس کے بازوؤں میں پڑی رہے، مگر راجہ نے کہا: "آہ! یہ نئی بات ہے اور پہلے نہیں ہوئی، اے راجکمار! وہ ضرور تمہارے پریم میں گرفتار ہو گئی ہے۔ اور تمہارے انجام کے خیال نے اس کی آتما کو غمزدہ کر دیا ہے۔ لیکن افسوس یہ اور بری بات ہے، کیونکہ اگر تم بھی شکار ہو گئے، جیسا کہ ضرور ہو گا، تو وہ تمہارے بغیر زندہ نہ رہے گی، اور پھر یہ بات کا خاتمہ ہو جائے گا کیونکہ جب تک وہ بیاہ کرنے کے لئے زندہ ہے امید کی کرن باقی ہے"

یہ کہکر وہ ہاتھ ملنے لگا۔ لیکن اج نے دل سے کہا: "آہ میں یہی چاہتا تھا، کاش یہ سچ ہو" اور وہ راجہ سے کہنے لگا: "مہاراج پہلے ہی میری اور اس کی موت پر یقین نہ کر لیں، اس عرصہ میں آپ مجھے اپنا داماد سمجھیں، اور اپنے باپ دادا کی قسمت کی اتنی فکر نہ کریں میں آج رات ہی آپ کو اس بلا سے نجات دلواؤں گا جس نے اسے گرفتار کر رکھا ہے، اور کل یہ ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیکر آگ کے گرد پھیرے لوں گا"

اس نے اسکا ہاتھ پکڑا، اور اسے اپنے ہونٹوں سے چھوا۔

(۵)

اس کے ہونٹوں کے لمس سے وہ ہوش میں آگئی، اور جب اس نے خود کو اج کے بازوؤں میں پایا تو وہ اچھل کر ایک طرف کھڑی ہو گئی۔ اس کا رنگ سرخ ہو گیا۔ اور اس کی آنکھیں زمین پر گڑ گئیں راجہ کہنے لگا: "پتری یہ کیا؟"

یشووتی نے گہری سانس لے کر خاموشی سے ادھر ادھر دیکھا، پہلے اپنے پتا کی طرف، اور پھر اج کیطرف، پھر یکایک وہ تن کر کھڑی ہو گئی اور تالی بجا کر خوشی سے کہنے لگی: "آہ! جنگل کی آگ کو کون چھپا سکتا ہے آہ میں غم کی آگ سے جل رہی ہوں اور دیکھ رہی ہوں کہ یہ راجکمار صحرا سے اس لئے بچ نکلا ہے کہ میرے ہاتھ سے موت کے منہ میں جائے۔ اب موت میرے سامنے بلند قامت جوان کے روپ میں کھڑی ہے۔ میں اپنے پہلے پریمیوں کے انجام کے خیال پر غمزدہ ہوئی، لیکن میں نے انہیں یکے بعد دیگرے ختم ہوتے دیکھا، اور میں زندہ رہی، میں عرصہ سے خود کو موت کے گھاٹ اتار دیتی، اور زندہ رہ کر اتنے پریمیوں کی موت کا کارن نہ بنتی اور اپنی جان دیکر انکی جانیں بچا لیتی۔ لیکن میں انکی قاتل ہوں، اور عورت کے روپ میں موت ہوں۔ اب دیوی نے ان کا انتقام لینے کی خاطر پریم کے دیوتا کو انسان کے روپ میں میرے پاس بھیجا ہے۔ جس کی موت میرے لئے پتہ نہیں کن مصیبتوں کا باعث بنے گی۔ اور میں اس کے بعد زندہ نہیں رہونگی، اس شخص سے محبت کرنے کا فائدہ جو ایک رات سے زیادہ زندہ نہیں رہ سکتا؛ جیسے ہی رات آئے گی وہ اپنی موت سے ہمکنار ہونے چلا جائے گا۔ اور اس مرتبہ میں اسکے بغیر سورج نکلتا نہیں دیکھ سکوں گی"

وہ بولتی رہی اور سب اسکی طرف حیرت زدہ دیکھتے رہے جب اس نے بولنا بند کیا تو راجہ نے ایک دلدوز چیخ ماری اور کہا: "بیٹی یشووتی! یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟ کیا یہ تمہارا قصور ہے کہ تم اتنی سندر ہو؟ تم کیوں مرنے کی باتیں کر رہی ہو؟ اگر تم مر گئیں تو میرے خاندان کا جس کی

تم امید ہو، کیا حال ہوگا؟" لیکن اج ہنسا اور کہنے لگا: "سندر ناری، میرا غم نہ کرو، اور اپنے سسر کی بھی کوئی چنتا نہ کرو۔ تمہارے خاندان کا چراغ ابھی تک جل رہا ہے اور ہوا کے ایک معمولی جھونکے سے نہیں بجھے گا۔ کل صبح ہم ان فضول باتوں پر ہنسیں گے۔"

یشودتی نے مڑکر اس کے چہرے پر آنکھیں گاڑ دیں اور کہا۔ "میرے پتی، تم پہلے اور آخری آدمی ہو جسے میں نے خود چنا ہے آج ہمارا پہلا اور آخری دن ہے، جو ہم اکٹھے بسر کریں گے۔" اج نے کہا: "سندری ایسا ہی سہی۔ اگر آج سارا دن میں تمہارے پاس ہوں تو مجھے کل کی کیا پروا ہے۔ ابھی ایک گھنٹہ ہوا جب میں نے تمہیں پہلی دیکھا، تو میرے دل میں تمہاری محبت جیتنے کا خیال پیدا ہوا محبت کرنے کے لئے ایک دن بھی کافی ہے۔ بشرطیکہ وہ تمہارے ساتھ گزرے۔"

اس نے اس کی طرف پیار سے دیکھ کر کہا: "تم بہادر ہو۔" پھر اس نے راجہ سے کہا: "پتاجی اب آپ جائیے، اور مجھے میرے پتی کے ساتھ چھوڑ جائیے۔ اور اپنی اور میری آبرو کا فکر نہ کیجئے۔ کیونکہ ہم دونوں کے درمیان تلوار ہوگی لیکن میں چاہتی ہوں کہ انجام تک یہ میرے پاس رہے اور جب وقت آجائے تو گجر بجا دیا جائے۔ میں اسے آپ کے پاس بھیج دوں گی تاکہ آپ اسے موت کا راستہ دکھا دیں۔" یہ سنکر بوڑھا راجہ چلا گیا — جب وہ چلا گیا، یہ دونوں پریمی سارا دن بیٹھے رہے اور ایک دوسرے کیطرف سورج اور سورج مکھی کیطرح دیکھتے رہے۔ اج کل کے خیال کو بالکل بھول گیا۔ لیکن یشودتی نے ایک لمحہ کے لئے بھی اسے دل سے نہ بھلایا۔ اس نے اس کے منہ سے اس کی زندگی کے حالات سنے اور اس کے الفاظ کے امرت سے لطف اندوز ہوتی رہی اس نے اپنی آنکھیں اس کے چہرے سے نہ ہٹائیں اور اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں دبائے رکھا۔ جب سورج غروب ہوا اس نے کھانا اور شراب اور قسم قسم کی چیزیں منگوائیں اور اسے بچوں کیطرح اپنے ہاتھ سے کھلائیں۔ اور خود کچھ نہ کھایا، پھر اس نے اسے آغوش میں لے لیا، پھر یکایک وہ کھڑی ہوگئی اور کان لگاکر سننے لگی، اج نے بھی کان لگاکر گجر کی آواز سنی۔

وہ اسے دیکھتا رہا، وہ زرد ہو رہی تھی اس نے دونوں ہاتھوں سے دل پکڑ لیا۔ پھر وہ تیزی سے اس کیطرف آئی، اور آہستہ سے کہنے لگی: "وقت آگیا۔" پھر اس کا ہاتھ پکڑ کر زور سے دبایا، اور پیاسی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا، پھر اچانک اس کا ہاتھ پرے پھینک کر کہنے لگی: "جاؤ" لیکن اج نے اسے آغوش میں لے لیا اور پھر اس کے بوسے لینے لگا۔ اور کہنے لگا "اے خوفزدہ سندری چنتا نہ کر، میں بہت جلد واپس آؤں گا؟" وہ تیزی سے چلا گیا۔ دروازہ پر رک کر اس نے اسے کھڑے دیکھا، اور اس گھڑی بوڑھے راجہ نے اسے بازو سے پکڑ کر کہا: "آؤ، میں تمہیں وہ راستہ بتاؤں جس پر اس سے پہلے تمہارے بھائی گئے ہیں۔"

اج بولا: "مہاراج میں نہتا ہوں، مجھے کوئی ہتھیار دو۔" راجہ اسے اسلحہ خانہ میں لے گیا، اور ایک لمبی سی تلوار اس کے لئے چنی۔ اج نے تلوار پکڑ کر کہا: "اب میں تیار ہوں۔" راجہ اسے راستہ بتا کر کہنے لگا: "اے داماد جاؤ تمہیں پرماتما کو سونپا، مجھے جتنا افسوس تم سے جدا ہونے کا ہو رہا ہے اور کسی کا نہیں ہوا، تم میری پتری کے لئے ایک بہترین پتی ثابت ہوتے۔ جاؤ اس دروازے سے باہر نکل جاؤ۔ اور اگر تم واپس آگئے، تو میں تمہیں از حد خوش قسمت سمجھونگا۔"

یہ کہکر وہ محل میں واپس چلا گیا۔ لیکن اج دروازے سے باہر نکلا، اور خود کو شہر کی فصیل پر پایا۔

دوسرا باب
گرہن

(۱)

وہ ننگی تلوار ہاتھ میں لئے شہر کی فصیل پر کھڑا ہوگیا، اور ادھر ادھر نگاہ دوڑانے لگا۔ اس کے پیچھے شہر کی آبادی ایک سیاہ لبادے میں لپٹی تھی، اور اس کے سامنے صحرا تھا۔ وہ بہادر تھا لیکن ہونے والی بات سے اس کا دل دھڑکنے لگا، اور اس نے دل سے کہا: "خطرہ کہاں ہے اور کہاں سے آرہا ہے کس شکل میں آرہا ہے۔ لیکن یہ یہاں چاند کے سایہ

سو اکون ہے، جس سے میں لڑوں؟ کیا میری آزمائش کے لئے راجہ نے کوئی چال تو نہیں چلی؟ نہیں نہیں، ایسا نہیں۔"

وہ کھڑا اپنے خیالات پر مسکراتا رہا۔ اتنے میں کرتی سینا کی تیری جس نے راجہ کی تیری سے جل کر راجہ کے شہر پر یہ مصیبت نازل کی تھی دستور کے مطابق اڑتی ہوئی شہر کی فصیل کیطرف آئی۔ وہ ہر رات یہ دیکھنے آتی تھی، کہ کوئی پریمی آیا ہے یا نہیں۔ اور جب وہ کسی پریمی کو دیکھتی تو وہ ایک راکشش کو بلاتی، جو فوراً حاضر ہو جاتا، اور پریمی کو ہڑپ کر جاتا۔ کچھ عرصہ سے کوئی پریمی نہ آیا۔ اس لئے جب وہ ایک چمگادڑ کی طرح اڑکر آئی، تو اس نے شہر کی فصیل کی طرف دیکھا۔ اور خیال کیا، کہ شاید آج بھی خالی ہو گی، لیکن اس نے آج کو تلوار کا آسرا لئے۔ اور مسکراتے دیوار پر کھڑے دیکھا، اور اسے دیکھتے ہی پہلی نگاہ میں وہ حیران رہ گئی، اور اس کی محبت میں ایسی گرفتار ہوئی، کہ اپنے پر نہ ہلا سکی۔

اس لئے وہ فصیل پر اتری اور تھوڑی دور کھڑی ہو کر اسے غور سے دیکھتی رہی، اس نے آہ بھر کر کہا: "آہ! یہ واقعی پریمی ہے۔ سب سے مختلف۔ یہ تو دیوی کا پتر معلوم ہوتا ہے۔ اور چاندنی رادھا بن کر اسے آغوش میں لے رہی ہے۔ آہ! یہ اپنے حسن کیوجہ سے کام دیو معلوم ہوتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ مقابلے سے پہلے ہی ہار چکی ہوں، پھر یکایک وہ غضبناک ہو گئی اور کہنے لگی: "لیکن آہ راجہ کی تیری، اسے مجھ سے چھین لے گی۔ افسوس! افسوس!! میں نے اسے پہلے کیوں نہ دیکھا۔ اس سے پہلے کہ راجہ کی تیری اس کے دل پر قبضہ کرتی، مجھے اس کو رام کر لینا چاہئے تھا۔ یہ نوجوان ہے اور باوفا۔ لیکن میں بھی سندر ہوں، میں اس کا خیال اس کے دل سے نکال دونگی۔ اور اپنی مورتی وہاں گاڑ دوں گی، اب میں اپنی ساری رعنائی کے ساتھ اس پر حملہ کروں گی، اور دیکھتی ہوں وہ کیونکر مقابلہ کرتا ہے۔ میں راجہ کی تیری کا خیال نکالنے کے لئے زمین اور آسمان ہلا دوں گی۔ اور اسے اپنا بنانے کے لئے پتال کو الٹ دوں گی، لیکن اگر میں ناکام رہی؟ نہیں نہیں میں ناکام نہیں رہوں گی، لیکن اگر رہی تو پھر کوئی دوسرا راستہ اختیار کروں گی۔"

(۲)

آج شہر کی دیوار پر کھڑا اپنے سامنے صحرا کو دیکھ رہا تھا، کہ اچانک اس کی آنکھوں کے سامنے سے ہر چیز غائب ہو گئی۔ اب اس کے سامنے نہ تو کوئی شہر تھا، اور نہ صحرا، بلکہ وہ ایک تاریک صحرا میں کھڑا تھا، جس میں ایک عجیب غریب مدہم سی روشنی تھی، اس کے چاروں طرف لالہ کے بڑے بڑے سرخ پھول بغیر ہوا کے لہلہا رہے تھے۔ جن میں ملے جلے کنول کے پھول بھی تھے۔ جن کی خوشبو کبھی آتی اور کبھی غائب ہو جاتی۔ سیاہ پتوں والے درختوں کے سایہ میں بڑے بڑے چمگادڑ ادھر ادھر خاموشی سے آہستہ آہستہ اڑ رہے تھے۔ اور شاخوں پر سرخ سرخ آنکھوں والے الو خاموش بیٹھے تھے۔ چاروں طرف موت کی سی خاموشی طاری تھی، آج صاف طور پر اپنے دل کی دھڑکن سن سکتا تھا۔ حیرت سے اس کے سر کے بال کھڑے ہو گئے۔ اور وہ اپنے دل سے کہنے لگا: "آہ! کتنی عجیب بات ہے۔ شہر کی دیوار کہاں گئی؟ میں اسوقت کہاں ہوں، اور یہاں کس طرح آگیا ہوں؟ یقیناً اب خطرہ بالکل قریب ہے۔"

وہ تلوار تھامے تیزی سے دائیں بائیں دیکھنے لگا۔ معاً اس نے ایک چیز دیکھی، جس پر اس کی نظریں گڑ گئیں۔ اس سے تھوڑے سے فاصلے پر لالہ کے پھولوں کے درمیان کسی برباد مندر کی ایک دیوار کھڑی تھی اس مندر کے گرے ہوئے ستون ادھر ادھر بکھرے پڑے تھے جنہیں پتوں نے ڈھانپ رکھا تھا۔ اس نے بڑے غور سے اس ٹوٹی پھوٹی دیوار کو دیکھا۔ وہاں ایک عورت کا مجسمہ نظر آیا۔ جو اتنا نمایاں دکھائی دیتا تھا۔ کہ وہ اپنی آنکھیں اس سے ہٹا نہ سکتا تھا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے اپنے دل سے کہا: "یقیناً یہ کوئی پتھر کی مورتی نہیں، بلکہ گوشت پوست کی بنی ہوئی اصلی عورت ہے۔ جو نہ جانے کیوں ایک شکستہ دیوار پر جھکی کھڑی ہے۔" اور وہ اسی طرح اسے دیکھتا رہا اور تھوڑی دیر بعد حیرت زدہ ہو کر وہ اور قریب گیا، جیسے ہی اس نے دیکھا حیرت اور تعریف سے اسکی آتما لبریز ہو گئی، اور وہ پتھر کی مورتی میں غرق ہو کر سب کچھ بھول گیا اس دیوار والی سندری کے حسن میں ایک ایسی کشش تھی، کہ اسے جنگل وغیرہ کی کوئی سدھ بدھ نہ رہی اور وہ دل سے کہنے لگا: "اس میں شک نہیں کہ جس سنگتراش نے پتھر سے یہ مورتی بنائی ہے، وہ ایک ماہر فن سنگتراش ہے۔ کیونکہ میں قریب پہنچکر بھی تمیز نہیں کر سکتا، کہ یہ پتھر کی ہے۔"

جیسے جیسے وہ اسے دیکھتا جاتا اس کی حیرت بڑھتی جاتی وہ اپنا دایاں ہاتھ اپنے کولہے پر رکھے کھڑی تھی، اور اس کی برہنہ دائیں چھاتی باہر نکلی تھی، اور ایک بڑے بحری موتی کیطرح چمک رہی تھی اور دوسری چھاتی اس کی سبز ساڑھی کے شکنوں میں چھپی تھی وہ بلند قامت تھی اور شری کے روپ میں تھی، اس نے اپنا سر ذرا سا جھکا رکھا تھا۔ اور اس کی بے نور آنکھیں سامنے خلا پر جمی تھیں، اور ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ وہ کسی متوقع آواز کو سن رہی ہے۔ دیکھتے دیکھتے ایک حیرت نے جو قریبا قریبا خوف سے مشابہ تھی، اس کے دماغ پر قبضہ کر لیا، کیونکہ اس کا چہرہ ایک بت کے چہرے کیطرح نہ تھا۔ بلکہ ایک نقاب سے ملتا تھا، یا یوں کہیئے کہ ایک از حد حسین عورت سے ملتا تھا جو اس گھڑی مردہ تھی، ایسا محسوس ہوتا، کہ اس کے رخساروں کا رنگ ابھی ابھی ماند پڑا ہے۔ اَج اس بت کے نظارہ سے خود بھی بت کیطرح کھڑے کا کھڑا رہ گیا۔

آخر وہ آگے بڑھا، اپنا بایاں ہاتھ بڑھا کر اپنی انگلی سے اس کے ننگے کندھے کو چھوا، اچانک اس کے لمس نے اس میں زندگی کی ایک لہر دوڑا دی ہو اس کے سنگین اعضا میں ایک کپکپی سی دوڑ گئی، اور جیسے ہی وہ پیچھے ہٹا، اس بت کے چہرے کا رنگ عود کر آیا، اور اس کے ہونٹوں میں سرخ خون دوڑنے لگا۔ اور اس کی آنکھیں نور سے چمک اٹھیں۔ اسکی زلفیں لہرانے لگیں، اور اس کا سینہ ابھرنے لگا۔ یکایک اس نے اپنا انداز بدل دیا۔ اور اس کی نگاہیں سیدھی اَج پر پڑیں۔ اس نے پہلے ایک ابرو اٹھائی، پھر دوسری۔ یہاں تک کہ وہ کمان بن گئی کیونکہ وہ دونوں وسط میں آپس میں مل گئیں۔ اس نے مسرت سے چہکتے ہوئے کہا: "آہ! کیا یہ تم ہو؟ یا میں ابھی تک خواب دیکھ رہی ہوں؟"

(۳)

اَج نے پھٹی ہوئی آنکھوں کے ساتھ اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا: "یقیناً یہ کچھ بھی نہیں، بلکہ میں خواب دیکھ رہا ہوں، کیونکہ اس جگہ آخری مرتبہ سورج نکلا تھا۔ میں صحرا سے بچ نکلا، اور اس شہر میں کسی مرد کو نہ دیکھا اور ایک بے حد حسین دلہن حاصل کی، اور اب یہاں ایک اور موجود ہے۔ جو مردہ سے زندہ ہوتی ہے۔ اور میری خواہشمند ہے" اسی طرح تلوار ہاتھ میں لیئے وہ کھڑا اسے تکتا رہا۔ تھوڑی دیر بعد وہ کہنے لگی: "کیوں! کیا میرا جسم اتنا بُرا ہے، کہ تمہاری زبان بولنے سے قاصر ہے؟ یا کیا تم اس تلوار کو میرے خلاف استعمال کرنے والے ہو؟ لیکن اس سے پہلے مجھے یہ معلوم کر لینے دو۔ کہ کہیں میں اتنی لمبی نیند کے بعد تمہاری زبان کی طرح اپنے اعضا کا استعمال تو نہیں بھول گئی" وہ اپنی جگہ سے ہلی۔ اور اپنے خوبصورت بازو ہلا کر ادھر ادھر حرکت کرنے لگی۔ پھر وہ اس کے سامنے زمین پر گرے ہوئے ایک شکستہ ستون پر بیٹھ گئی۔ اس عرصہ میں اَج اسے دیکھتا رہا، اور دل سے کہتا رہا: "اس کی حرکات بالکل ایک چیتے یا سانپ کی سی ہیں" اس نے ایک ابرو اٹھا کر ایک تبسم کے ساتھ کہا، "کیا میں تمہیں بتا دوں کہ میں "نٹ بھر دگتی" ہوں"۔ اَج بولا "سندری یہ ظاہر ہے، کیونکہ تمہاری خمیدہ ابرو کا تیر بھی تیر چھوڑ سکتی ہے" وہ بولی "اے پتی! کیا یہ تم مجھے اتنی لمبی جدائی کے بعد اشیرباد دے رہے ہو؟"

یہ سنکر اَج اچھل پڑا، گویا اسے کسی سانپ نے ڈس لیا ہو، وہ کہنے لگا "تیرا پتی! کیا! کیا میں تمہارا بھی پتی ہوں؟ لیکن اے خمدار ابروؤں والی سندری وہ شخص کس طرح تمہارا پتی ہو سکتا ہے، جس نے جیون میں تمہیں کبھی دیکھا ہی نہیں، آج صبح بھی میری کوئی پتنی نہ تھی اور ابھی دن پورا نہیں گزرا کہ میں ایک اور کا پتی بن گیا ہوں!" یہ کہکر وہ ذرا جھکا، ابھی یہ الفاظ مشکل سے اس کے منہ سے نکلے تھے۔ کہ نٹ بھر دگتی کھڑی ہو گئی، اور غصے سے اس کی آنکھیں دو شراروں کی طرح چمکنے لگیں، اس نے کہا "ہرگز نہیں! ہرگز نہیں! میرے سوا اور کوئی عورت تم پر قبضہ نہیں کر سکتی" پھر جس تیزی کے ساتھ اسے غصہ آیا تھا۔ اسی تیزی سے اتر گیا، اور وہ کہنے لگی: "اب مجھے اپنی لمبی چمکدار تلوار سے قتل کر دو، اور مجھے پھر پتھر کی مورتی بنا دو، لیکن میرے سامنے کسی اور عورت کا ذکر نہ کرو، افسوس کیا تم مجھے بالکل بھول گئے؟" اتنا کہکر اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب بہنے لگا۔

اَج نے اپنا ہاتھ اوپر اٹھایا، اور حیرت سے سر کھجاتے ہوئے کہنے لگا "اے اجنبی رنجیدہ سندری! میں از حد پریشان ہوں اور اس آدمی کیطرح ہوں، جو آدھی رات کے وقت کسی جنگل میں بھٹک جانے میں اسکو کس طرح بھول سکتا ہوں، جسے میں نے زندگی میں کبھی نہیں دیکھا!

وہ بولی: "نہیں، اس زندگی میں نہیں، اس سے پہلی زندگی میں، پہلے جنم میں میں تمہاری پتنی تھی!"

اج نے ہنسکر کہا: "سندری کون ہے جسے پہلے جنم کی باتیں یاد ہیں؟ میں بھی دوسرے لوگوں اور اپنے دادا سورج کیطرح تاریکی سے اجالے میں آیا ہوں، اور پھر تاریکی میں چلا جاؤں گا۔" یہ سنکر اس نے ایک گہری آہ بھری اور کہنے لگی: "افسوس یہ سزا ہے، اور اس حالت میں یہ سزا اور سخت ہو جاتی ہے جب کہ میں اتنا عرصہ دیوار پر پتھر بنے رہنے کے بعد پھر دوبارہ عورت بنی ہوں، اور اس کے دماغ سے محو ہو چکی ہوں، جس کے لئے میں نے اتنی مصیبت برداشت کی۔ ہاں تو سنو، میں تمہارے پہلے جنم کی کہانی سناتی ہوں۔"

(۴)

وہ گرے ہوئے ستون پر بیٹھی، آگے جھکی، اور اپنی مقناطیسی نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔ اج کو ایسا محسوس ہوا کہ وہ اس کے دل سے کھیل رہی ہیں۔ اس سندری کی آنکھوں کا رنگ ہر لحہ بدل جاتا تھا۔ اور ان میں عجیب غریب رنگ دکھائی دیتے تھے۔ آنکھوں کے اوپر ابرو کبھی تن جاتے تھے، اور کبھی اپنی اصلی حالت پر آجاتے تھے، وہ کہنے لگی "دور سمندر کے کنارے تمہارا ملک ہے۔ اور میں ابھی بتائے دیتی ہوں، بلکہ دکھائے دیتی ہوں کہ وہ کہاں ہے۔ ہمارے پہلے جنم کی بات ہے کہ میں اور تم لڑکی لڑکا تھے۔ لیکن تم ایک بلونت راجہ کے پتر تھے اور میں ایک برہمنی تھی، میرا پتا ایک غریب آدمی تھا اور رشی تھا۔ میں اپنے پتا کے ساتھ تنہا ایک عظیم الشان جنگل میں ایک کٹیا میں رہتی تھی، جس پر مالتی کی بیل اس طرح چھائی تھی کہ کٹیا کے دروازے کے سوا کچھ نظر نہ آتا تھا۔ ایک دن تم نے مجھے سر پر گاگر لئے دروازے میں کھڑا دیکھ لیا۔ تم اسوقت گھوڑے پر سوار شکار کو جا رہے تھے۔ ہماری نظریں ملیں، اور ہم سو جان سے ایک دوسرے پر فدا ہو گئے میں نے تمہیں اپنا دیوتا سمجھا اور سوائے تمہارے دنیا کی ہر چیز مجھے حقیر معلوم ہونے لگی۔ اور تم اس دن شکار کرنا بھول گئے۔ یا یہ کہ کامدیو نے تمہیں ایک اور شکار میں لگا دیا، اور تم ایک ہرنی سے پیار کرنے لگے جو، خود تمہارا شکار بننا چاہتی تھی، ہم نے اسی دن بیاہ کر لیا، افسوس تم اس زمانے کو بالکل بھول گئے ہو، کیا تمہیں یاد نہیں کہ میں کسطرح تمہیں ہر روز اپنی کٹیا میں ملا کرتی تھی جب میرا پتا جنگل میں گیان دھیان میں لگا ہوتا تھا، کیا تم یہ بھی بھول گئے ہو، کہ کتنی مسرت سے تم میرے لئے عمدہ عمدہ لباس، اور جواہرات لایا کرتے تھے جنہیں میں تمہارا دل خوش کرنے کو پہن لیا کرتی تھی، میں جو اس جنگل کی رانی تھی؟ کیا تم اس ننھی کٹیا کی پرانی محبت کو بالکل بھول چکے ہو؟ ہاں تو ایکدن کرنا پرماتما کا یہ ہوا کہ ہم دونوں ایک دوسرے کے پریم میں مست اور اندھے ہو کر امرت بھرے کنول میں مکھیوں کے جوڑے کی طرح اس چھوٹی سی کٹیا میں ملے۔ میں ایک چکرودتی راجہ کی رانی جیسا لباس اور ہاتھ پاؤں میں سونے چاندی کے زیور اور جواہرات پہنے کھڑی تھی، اور تم پریم کے نشہ میں سرشار مجھے آغوش میں لئے پیار کر رہے تھے۔ کہ میرا پتا آگیا اور اس نے آہستہ سے کہا: اے پتری تم اس راجکمار کے پریم میں اپنا فرض بھول گئی ہو، اس لئے میں تمہیں سراپ دیتا ہوں، کہ تم یہاں سے بہت دور ایک ویران مندر کی دیوار پر پتھر کی ایک مورتی بن جاؤ، اور اے راجکمار تم ایک اور جنم لو اور اپنی معشوقہ سے جدا ہو جاؤ۔ ہم دونوں نے اس کی منت سماجت کی تو اس نے کہا: جب تم دونوں دوبارہ ملو، تو تمہارا اپنی حیرت میں تمہیں اپنی انگلی سے چھوئے گا۔ اور تم پھر عورت بن جاؤ گی۔ میری جان! دیکھو میرے پتا کے سراپ کا ایک ایک لفظ سچا نکلا۔ اور میں نے تمہیں پھر پا لیا۔ مگر افسوس ہے تم اپنا دل کھو چکے ہو۔"

(۵)

یہ باتیں سنکر اج حیران رہ گیا، اس عورت کی آواز بانسری کیطرح رسیلی تھی وہ بت بنا اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اور کوشش کے باوجود اپنی نظریں اس کے چہرے سے نہ ہٹا سکتا تھا، یکایک وہ ہمت کر کے سنبھلا اور اپنی تلوار اٹھا کر کہنے لگا: "اے اجنبی سندری اس میں کوئی شک نہیں کہ تم نے مجھے بے تاب کر دیا ہے۔ تاہم میں نہیں جانتا کہ کیا جواب دوں، تمہارا حسن اور تمہاری آواز گوشت پوست کے انسان تو کیا ایک پتھر کی مورتی کو بھی بے چین کرنے کے لئے کافی ہیں۔"

اس عورت نے افسردگی سے سر ہلایا اور ایک شیریں تبسم کے ساتھ کہا، "آہ! یہی میرا خیال ہے: اج اس دوسری عورت کو دیکھکر تم اپنے پہلے جنم کی سب باتیں بھول گئے۔ کاش ہم ایکدن پہلے ملے ہوتے تو

میں اس عورت کا خیال تمہارے دل میں نہ آنے دیتی۔ لیکن کیا ہوا؟ کیا وہ آج مل کر پہلے جنم کی پتنی کے حقوق چھین سکتی ہے؟ کیا تم اس سے وفا کرنے کے لئے میرے ساتھ بیوفائی کرو گے۔ اور کیا تم کو کچھ حاصل ہو جائے گا؟ کیا میں اس سے زیادہ سندر نہیں"؟ یہ کہکر وہ کھڑی ہو گئی۔ اور بڑے غرور سے اج کیطرف دیکھ کر کہنے لگی:"کیا وہ سندری مجھ سے زیادہ حسین اور باوفا ہے۔؟ بولو اور بتاؤ کہ میں کس بات میں اس سے کم ہوں، اور تم مجھے اس کے مقابلے میں کیوں حقیر جانتے ہو؟

آج اس کی طرف دیکھ کر کچھ شرمندہ سا ہو گیا، اور آہستہ سے کہنے لگا:" وہ جھوٹ نہیں بولتی کیونکہ وہ واقعی حسین ہے اور اسے کسی عورت سے مقابلہ کرتے ہوئے نہ ڈرنا چاہیئے۔ اور یہ بھی کسی قدر سچ ہے، کہ اگر میں ایک دن پہلے اسے دیکھ پاتا۔ تو اسے میرا دل لینے میں کوئی تکلیف نہ ہوتی۔ پھر وہ اس کی طرف بغور دیکھنے لگا۔ وہ نہیں جانتا تھا، کہ کیا کرے اور کیا نہ کرے۔ اسے کچھ تو اس پر رحم آیا۔ اور کچھ خوف، وہ تھوڑی دیر یونہی کھڑی رہی۔ پھر یکایک زمین پر بیٹھ گئی۔ گویا وہ تھک گئی ہو، اور اسی طرح لالہ کے پھولوں کے درمیان بیٹھی رہی اور اپنے گھٹنے پر ٹھوڑی رکھے صبر کے ساتھ فیصلہ کا انتظار کرنے لگی۔ اس عرصہ میں کبھی کبھی آنکھیں بند کرتی اور کھولتی۔ گویا وہ یہ دیکھنا چاہتی ہے کہ وہ کہیں چلا تو نہیں گیا۔

آج نے خاموشی سے لالہ اور کنول کے پھولوں اور آلوؤں کیطرف دیکھا اور پھر اس کیطرف دیکھنے لگا۔ اس کا سر چکرانے لگا، اور اس نے دل سے کہا، کیا یہ خواب ہے۔ اس کا کیا مطلب ہے؟ کیا وہ میری سرد مہری سے مایوس ہو کر پھر مورتی بننے لگی ہے، اب کیا کرنا چاہئے؟ اس نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں، اور اس کی خوبصورتی پوشیدہ تھی، وہ پھر دل سے کہنے لگا:" اس کی بھنویں حرکت کر رہی ہیں، گویا ان میں زندگی ہے۔ اس نے محسوس کیا، کہ وہ ان سے نظریں ہٹانے کے ناقابل ہے، آخر اس نے بھی تنگ آ کر آنکھیں بند کر لیں۔

(۶)

پھر اس نے دل سے کہا:" یہ بزدلی ہے، میں اسے اپنی بند آنکھوں میں سے بھی دیکھ رہا ہوں"۔ اس نے پھر آنکھیں کھول دیں اور یکایک چیخکر ایک زخمی بارہ سنگھا کیطرح زمین سے اچھلا، کیونکہ جنگل اور اس کے لالہ اور کنول کے پھول سب کے سب غائب ہو چکے تھے اور اس کی جگہ اس کے سامنے ایک جنگل تھا، جس کے درختوں کے سرسبز پتے سورج کی روشنی میں چمک رہے تھے۔ اور اس کے سامنے ایک چھوٹی سی کٹیا تھی، جو مالتی کے بیل سے ڈھکی تھی، اور اس کے دروازے میں ایک برہمنی سر پر گاگر رکھے کھڑی تھی، وہ اس کی طرف دیکھکر مسکرائی اور اس نے دیکھا، کہ وہ عورت نٹ کھٹ ہو گئی ہے، اسے ایسا محسوس ہوا کہ وہ اپنی مرضی کے خلاف کھڑا ہو گیا، اور اس کی طرف کھنچتا چلا گیا، اور اس کے قریب ہو گیا۔ جب وہ قریب پہنچا، اس بیل سے خوشبو کی لپٹیں آنے لگیں۔ جو یاسمین سے ملتی تھی، اور اس قدر دلآویز تھی، کہ اس کی آتما میں اترتی چلی گئی، اس نے وہ گاگر اپنے سر سے اتار دی اور زمین پر رکھ دی، اور اسے ہاتھ سے پکڑ کر کٹیا کے اندر کھینچنے لگی، اندر پہنچکر وہ اس کی آغوش میں گر پڑی، اور اس کے کان میں سرگوشی کے انداز میں کہنے لگی:" میرا پتا باہر ہے اور ہم تنہا ہیں اور سارا دن ہمارا ہے، آؤ! اور بتاؤ کہ میں تمہیں خوش کرنے کیلئے کیا کروں؟" اس نے دوڑ کر دروازہ بند کر دیا اور پھر ایک صندوق سے نہایت فاخرہ پوشاک قیمتی جواہرات نکال کر پہننے لگی۔ اور کہنے لگی"دیکھو! کیا میں تمہاری رانی بننے کے لائق نہیں؟" وہ حیرت سے اس کا منہ تکنے لگا۔ گویا وہ خواب دیکھ رہا ہو۔ اس عرصہ میں وہ اپنی ابروؤں کی خمدار کمان سے نینوں کے بانوں سے ہلاک کرنے کی کوشش کرتی رہی، آخر وہ آہستہ سے اس کے قریب آئی اور اسی انداز میں کھڑی ہو گئی، جس میں اس نے پہلے پہل اسے شکستہ دیوار پر دیکھا تھا، اس نے ایک ہاتھ کولے پر رکھ کر اور مسکرا کر کہا:" لو اب مورتی پجاری کی سیوا میں حاضر ہے"۔ اس لمحہ دروازہ کھلا اور ایک برہمن داخل ہوا اور کہنے لگا۔

"اے پتری تم اس راہگیر کے پریم میں اپنا فرض بھول گئی ہو اس لئے میں تمہیں سراپ دیتا ہوں، کہ تم یہاں سے بہت دور ایک ویران مندر کی دیوار پر پتھر کی ایک مورتی بن جاؤ، اور اے راہگیر تم ایک اور جنم لو اور اپنی معشوقہ سے جدا ہو جاؤ"!

پھر آج نے اور کچھ نہ سنا، دنیا اس کی آنکھوں تلے اندھیر ہو گئی، اس کی آتما پریشان ہو گئی اور وہ ایک چیخ مار کر بے ہوش ہو گیا اور زمین پر گر پڑا۔

جب اسے ہوش آیا تو وہ پھر اسی لالہ کے پھولوں والے جنگل میں زمین پر لیٹا تھا۔ اور نٹ بھرو گتی مشتاق آنکھوں سے اس کے اوپر جھکی تھی، معاً وہ چونکا اور اپنی تلوار پکڑ کر کھڑا ہو گیا۔ اور حیرت زدہ اسکی طرف دیکھنے اور دل سے کہنے لگا: "کیا میں مر گیا ہوں، یا خواب دیکھ رہا ہوں؟ اس کا مطلب کیا ہے؟ کیا یہ برہما کا کوئی جھیل ہے یا صحرا کا سراب، جس سے میں نے ابھی تک رہائی نہیں پائی؟ ہاں بے شک میں ابھی تک تپتے میدان میں سفر کر رہا ہوں، اور مر رہا ہوں۔ اور موت کے بھوت مجھے تنگ کر رہے ہیں"۔

وہ اسی طرح پریشان کھڑا تھا۔ کہ نٹ بھرو گتی نے پریم بھری آنکھوں سے اس کی طرف دیکھ کر کہا: "تم بیمار ہو، تم مجھ سے بھاگتے کیوں ہو؟ کیا میں کوئی چڑیل ہوں؟ میں تو صرف یہ چاہتی ہوں۔ کہ ساری زندگی تمہاری سیوا کرتی رہوں، کیونکہ ابھی ابھی تم نے آنکھیں بند کی تھیں اور ایک چیخ ماری تھی، اور میں نے تمہیں گرتے گرتے سنبھال لیا تھا، اور میں اس بڑے سے پتے کے ساتھ پنکھا کر کے تمہیں ہوش میں لائی تھی"۔

اس نے وہ پتا اسکے سامنے رکھ دیا اور خاموشی سے اس کی طرف دیکھتی رہی، اور آہستہ سے اپنے دل سے کہنے لگی: "کیا اسے اپنا پہلا جنم یاد آ گیا ہے، اور کیا یہی وجہ ہے کہ وہ میری طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھ رہا ہے، گویا وہ اپنی خیالی تصویر سے میرا مقابلہ کر رہا ہے؟" پھر کہنے لگی: "میری جان تم بیمار ہو، اور تمہیں دارو کی ضرورت ہے۔ جو صرف میں تمہیں دے سکتی ہوں، تم مجھ پر کیوں اعتبار نہیں کرتے؟ میں ایک لائق وئید ہوں، اور دھنونتری سے زیادہ ہر جڑی بوٹی کی خاصیت سے واقف ہوں، میں ہر قسم کی بیماری کا علاج جانتی ہوں، میں نے ہر قسم کی خوشبوئیں سونگھی ہیں اور عطر بنائے ہیں، یہاں تک کہ میں خود عورت کے شریر میں مجسم عطر بن گئی ہوں، کیا تمہیں اس میں شک ہے؟ آزما کر دیکھ لو میں تمہیں جو کہتی ہوں کر کے دکھا سکتی ہوں، میں اپنا نازک ہاتھ پھیر کر تمہارے سب غم غلط کر سکتی ہوں، اور تمہیں ایک میٹھی نیند سلا سکتی ہوں، میں تمہیں رسیلے گیت سنا کر مدہوش کر دونگی، یہ لو اسے سونگھو، تم نے اس سے بہتر پھول کبھی نہ دیکھا ہوگا"۔

اس نے اپنی ہتھیلی کے کنول میں ایک ننھا سا پھول پکڑ کر اسکی طرف بڑھایا، اج نے اسکی طرف دیکھا۔ اس میں سے ایک تیز خوشبو نکلی جو اسکی آتما میں سرایت کر گئی، اور وہ اپنے دل سے کہنے لگا: "آہا! یہ پھول مجھے کس چیز کی یاد دلا رہا ہے۔ اور میں حیران ہوں کہ میں نے یہ دلآویز خوشبو کہاں سونگھی تھی"۔ معاً وہ چھوٹی سی کٹیا اسکی نظروں کے سامنے پھرنے لگی، اور وہ کہنے لگا: "آہ! یہ اس کٹیا کی بیل کی خوشبو ہے"۔ یکایک وہ خوفزدہ ہو گیا، اور اس کے سر کے بال کھڑے ہو گئے۔ اس نے نٹ بھرو گتی کیطرف دیکھا اور کہنے لگا: "اے اجنبی سندری تم کون ہو؟ اور تم کیا چاہتی ہو؟ اور ان بھیدوں کا کیا مطلب ہے جنہیں دیکھ کر میری عقل مجھے جواب دے رہی ہے، اور میں پھر بے ہوش ہونے لگا ہوں؟"

(۸)

پھر وہ ہنس کر کہنے لگی: "سندر بالک! میں صرف ایک بس بھرا امرت یعنی استری ہوں، اور میں وہی کچھ چاہتی ہوں، جو ایک عورت چاہ سکتی ہے یعنی وہ مرد جس سے مجھے پریم ہے۔ ہاں تو تم پوچھتے ہو کہ میں کون ہوں؟ اور کیا ہوں؟ تو سنو! میں تمہیں بتاتی ہوں میں ایک شہد کی مکھی ہوں جو دوسری مکھیوں کیطرح ایک پھول سے دوسرے پھول پر نہیں بیٹھتی۔ بلکہ صرف ایک کی ہو کر رہتی ہے۔ میں ایک نسیم ہوں جو ادھر ادھر نہیں بھٹکتی، بلکہ ملایا سے خوشبو لا کر سیدھی تمہارے قدموں پر نثار ہونے کو آتی ہے۔ میں صرف ایک گونج ہوں اور سورج کا عکس ہوں، میں اس دیوتا کا نصف حصہ ہوں جس کا مکٹ چندرماں ہے میں رتی ہوں، اور اپنے پتی کو دوبارہ ملنے پر مسرور ہوں۔ اور تم کام دیو ہو، جو پھر زندہ ہو کر میرے پاس آ گئے ہو، میں سمندر ہوں، لیکن اس کی طرح میرے اندر بے شمار موتی نہیں، بلکہ صرف ایک موتی ہے جو تم ہو، میں ایک شمع ہوں جو تمہارے شعلے سے پگھل رہی ہے..... ایک بانسری کی موسیقی کیطرح میں رسیلے تانوں سے لبریز ہوں، وہ بانسری جس کا رسیلا پن اس کے بجانے والے پر موقوف ہے۔ اور وہ تم ہو، کیا تم غمگین ہو، اگر ہو تو میں بھی ہوں۔ کیا تم مسرور ہو، اگر ہو تو میں ہوں میری آتما بھٹک رہی ہے اور تمہاری مسکراہٹ یا آہ کی منتظر ہے، جس

طرح کوئی مجرم کسی منصف کے حکم کا منتظر ہو۔ میں بلور کیطرح بے رنگ سا ہوں۔ لیکن تمہارا ہر رنگ قبول کرنے کو تیار ہوں، میری طرف دیکھو تمہیں معلوم ہو جائے گا۔ کہ تم میرے چہرے کے آئینہ میں اپنے ہر خیال کا عکس دیکھ رہے ہو۔ آہ! تم مجھ سے پوچھ رہے ہو کہ میں کون ہوں؟ افسوس! میں رس بھرے تیروں کا نشانہ ہوں جو کامدیو تمہارے رُوپ میں مجھ پر چھوڑ آتا ہے، میں ایک سوکھا درخت ہوں، جو تمہارے رُوپ میں بسنت رت آنے سے پھر ہرا بھرا ہو گیا ہے۔ لیکن تم مجھے جو صرف تمہارے لئے زندہ ہوں، ایک موذی ناگن کیوں سمجھتے ہو۔ اور خود کو ایک خوف زدہ ہرن؟ تم مجھے باز رکھنے کی بے سود کوشش کرتے ہو کیونکہ میں ہرگز باز نہیں رہ سکتی میں اپنے پریم کی آگ سے تمہاری نفرت کی سرد مہری کو بھڑکا دوں گی اور تمہیں اس کے شعلوں میں غرق کر دوں گی، اور تمہیں تمہاری ضد کی چٹان سے ہٹا دونگی، یہاں تک کہ تم اس کی تاریک گہرائیوں میں ہمیشہ کے لئے گم ہو جاؤ گے"

آج اس کے الفاظ کو جو اس کے منہ سے ایک سیلاب کی طرح نکل رہے تھے، سنتا رہا۔ یکایک اس نے تالی بجائی اور کہا "آہا! اے ضدی بالک کیا میں تمہیں بتا دوں۔ کہ تمہیں اس طرح کھڑے دیکھکر مجھے کیا یاد آیا ہے؟ سنو مدت ہوئی اس ملک کا ایک راجہ تھا جسکی کئی بیویاں تھیں۔ ایکدن وہ اپنی بیویوں کے ساتھ جنگل کی سیر کو گیا، کچھ عرصہ شکار کرنے کے بعد وہ تھک گیا۔ اور دن کی گرمی سے تنگ آ کر آرام کرنے لیٹ گیا۔ اور سو گیا۔ تب اس کی ساری رانیاں اسے اسیطرح چھوڑ کر جنگل میں ادھر ادھر گھومنے لگیں، ان کی حالت ایسی تھی، جیسے وہ رنگا رنگ کے پھول ہوں اور اپنے پودوں سے جدا ہو گئے ہوں، وہ اسی طرح گھوم رہی تھیں، کہ انہوں نے ایک بوڑھے رشی کو دیکھا، جو کھڑا تھا اور اس کے جسم سے چیونٹیاں لپٹی تھیں، جنہیں اسکی لٹوں نے آدھا ڈھانپ رکھا تھا، وہ سندر ناریاں بڑے اشتیاق سے اس کے گرد کھڑی ہو کر اس عجیب و غریب نظارے پر حیران ہونے لگیں، اور سوچنے لگیں، کہ یہ کون ہے؟ رشی چونکا، اور جس طرح اس وقت تمہاری حالت ہے، حیرت زدہ ہو کر ان کا منہ تکنے لگا، اور خیال کرنے لگا، کہ اندر آکاش کی ساری پریاں اس کا گیان دھیان برباد کرنے کو بھیجی ہیں، اے سندر رمنی جوان، مجھ میں وہ کونسی خوفناک بات ہے، جس کی وجہ سے تم میرے قریب نہیں آتے"!

(۹)

آج چونکا، اسے ایسا محسوس ہوا، کہ وہ کسی خواب سے بیدار ہو رہا ہے، وہ دل سے کہنے لگا" ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں اس سندر ناری کے جادو کا شکار ہو رہا ہوں، اگر میں نے ہمت نہ کی تو میں اس کے اثر سے کبھی نہیں بچ سکتا" پھر اس نے ہمت کر کے کہا "سندری! تم نے اپنا مقابلہ کئی رانیوں سے کر کے اپنے ساتھ انصاف نہیں کیا، کیونکہ تم اپنی جنس کے سارے گنوں کی مورتی ہو۔ لیکن تمہارا حسن میرے لئے بیکار ہے، اور تمہارے تیر مجھ پر اثر نہیں کر سکتے، کیونکہ جیسا کہ میں تمہیں پہلے بتا چکا ہوں، اور جس طرح وہ بوڑھا رشی اپنے راستہ سے نہیں بھٹکا تھا، میں بھی نہیں بھٹکوں گا"

نٹ بھرو گتی مسکرائی، اور اپنی انگلی ہلا کر کہنے لگی "ضدی بالک ہشیار ہو جاؤ، اپنی ضد پر اتنا مان نہ کرو، اور نہ اپنی عقل پر اتراؤ، اور پریم کا اپمان نہ کرو، ایسا نہ ہو کہ کامدیو تم سے بدلہ لے۔ اور غصہ میں آکر تم سے وہ منتر استری بھی چھین لے، جسکی وجہ سے تم مجھے اتنا حقیر جان رہے ہو، کیا تمہیں پورا یقین ہے کہ صرف تم ہی اس استری کے پریمی ہو؟ کیا تمہارا خیال ہے، کہ وہ تم کو دھوکا نہیں دے رہی، اور یہ کہ تم ان پریمیوں میں سے ایک نہیں ہو جن کے ساتھ وہ پل بھر کھیل کر بے پروائی سے پرے پھینک دیتی ہے؟ کیا تمہیں پورا یقین ہے کہ اس سے پہلے اس کا کوئی پریمی نہ تھا" یہ سنکر آج چونکا، اسے بوڑھے راجہ کی باتیں یاد آ گئیں۔ نٹ بھرو گتی تاڑ گئی اور کہنے لگی "افسوس غمزدہ بالک! تمہیں معلوم ہو گیا کہ جوانی کے نشہ اور ناتجربہ کاری نے تمہیں اس حقیقت کو دیکھنے کا موقع نہیں دیا، تم تریا چلتر کا مقابلہ نہیں کر سکتے"

اس پر آج نے غصہ سے کہا "یہ جھوٹ ہے، وہ سچی ہے"

نٹ بھرو گتی نے آرام سے جواب دیا "غصہ تھوک دو، میں نے اس کے پریم پر شک نہیں کیا، کیونکہ اگر اس نے پریم نہیں کیا تو وہ بے وقوف ہے۔ لیکن سنو اور یاد رکھو، کہ پریم جگ کا استاد ہے اور استری اس کی شاگرد، ہر استری خواہ وہ تمہاری طرح سادہ لوح ہی کیوں نہ ہو جیسے

ہی پریم میں گرفتار ہوتی ہے، تو وہ چالاکی اور عیاری کی مورتی بن جاتی ہے بے وقوف بالک! میں تمہیں بتاتی ہوں کہ وہ عورت از حد پریم کرتی ہے خواہ وہ سونے کیطرح خالص، برف کی طرح پاک، اور ہیرے کی طرح بے عیب ہو، چالبازی کے سمندر کی عمیق گہرائیوں میں غوطہ ضرور لگاتی ہے۔

سنو! مدت ہوئی بنارس میں ایک خود مختار استری رہتی تھی، جس کا نام کشنی تھا، جو اتنی حسین تھی کہ جسطرح بسنت رُت میں بھونرے پھولوں کے گرد چکر لگاتے ہیں، اسی طرح پریمی اس کے پیچھے مارے مارے پھرتے تھے۔ اگرچہ وہ خود مختار تھی، لیکن ایک پریمی بھی ایک لمحہ کے لئے اس کے دل کو مٹھی میں نہ لے سکا، وہ ایک ایسی شمع کی مانند زندگی بسر کرتی تھی جس کے گرد پروانوں کی لاشوں کا ڈھیر لگا ہو، جو اس کے شعلوں میں پیچ و تاب کھاکر جل مرے ہوں، آخر ایک دن تمہارے جیسا ایک بلند قامت راجپوت نوجوان بنارس میں آیا اور کشنی نے اسے اپنی کھڑکی میں سے شہر میں داخل ہوتے دیکھ لیا، اور جسطرح ایک خالی گھڑا یکایک گنگا میں ڈالا جائے، اس کا دل کامدیو کے پوتر امرت کی لہروں سے یکایک بھر گیا اور وہ اپنے دل سے کہنے لگی: "شہر میں سب سے پہلے وہ میری بابت سُنیگا اور دوسروں کیطرح وہ بھی فوراً مجھ سے ملنے آئے گا، اور اسی گھڑی میں شرم کے مارے اپنا شریر چھوڑ دونگی، کیونکہ خواہ میرا حسن اسے اپنی طرف کھینچ لے، تاہم اسے معلوم ہو جائے گا، کہ اس سے پہلے بھی میرے بہت سے پریمی ہیں۔ اس لئے وہ دل میں مجھ سے نفرت کرے گا اور یہ بات موت سے بدتر ہوگی، لیکن اس کے بغیر میرا جسم بیکار ہے": وہ بھیس بدل کر نکلی، اور اس نے کافی روپیہ خرچ کرکے اپنے قد اور عمر کی ایک عورت کا جسم خریدا، جو اسی دن مری تھی، اور رات کو خفیہ طریقہ سے گھر میں لاکر اسے اپنا لباس پہنا دیا، اور اسے جلا دیا۔ یہاں تک کہ اس کا پہچاننا مشکل ہو گیا، پھر اس نے اپنا گھر جلا دیا، اور خود عقبی دروازے سے باہر نکل گئی اور اپنے جسم کے جواہرات کے سوا باقی ساری دولت وہیں چھوڑ گئی تاکہ اپنے خواب کو پورا ہوتے دیکھے۔ اسی لمحہ وہ راجپوت اس کے حُسن کی تعریف سے کھنچکر شہر کے چند لوگوں کے ساتھ اسے ملنے آیا، اور اس نے اس کے گھر سے شعلے نکلتے دیکھے، اور انہوں نے جلے ہوئے جسم کو دیکھا، کشنی کے سارے پریمی اس آگ میں ستی ہو گئے، تاکہ دوسری دنیا میں اس سے مل سکیں، لیکن وہ راجپوت ناامید ہونے کے باوجود آگ میں نہ کودا، اس عرصہ میں کشنی کو ایک جعلی سادھو ملا، اس نے اسے اپنے جواہرات رشوت دیکر اور اپنی شخصیت چھپا کر چند ہدایات دیں، اس سادھو نے راجپوت سے یارانہ گانٹھا، اور اپنے آپکو خزانوں کا بھید بتانے والا ظاہر کیا۔ اور کہنے لگا: "تم ابھی اجینی کو چلے جاؤ اور ماگھ کے مہینے میں چاند کی پچھلی تاریخوں میں شہر سے باہر شمشان بھومی کا شمال مشرقی کونہ کھود دو، وہاں تمہیں ایک خزانہ ملے گا۔ یہ تم لے لینا، کیونکہ میرے جیسے آدمی کو ان خزانوں کی کیا ضرورت ہے۔ یہ سنکر وہ راجپوت نوجوان چل دیا، اور کشنی یہ دیکھ کر کہ تیر نشانے پر بیٹھا، اس سے پہلے ہی وہاں پہنچ گئی، جب وہ راجپوت وہاں پہنچا اور سادھو کے کہنے کے مطابق وہ کونہ کھودا، تو اسے کچھ نہ ملا۔ وہ اپنے تئیں کوستا صبح سویرے شمشان بھومی سے باہر نکلا، یکایک اس نے کشنی کو دیکھا، جو راستہ کے کنارے ایک درخت کے نیچے بیٹھی رو رہی تھی، اس نے نہایت عمدہ لباس اور زیورات پہن رکھے تھے۔ اور خود کو ہر طرح سے آراستہ کر رکھا تھا راجپوت کو ایسا محسوس ہوا، کہ اسے صحرا میں پانی کا چشمہ مل گیا ہے۔ وہ کہنے لگی: "راجکمار میری مدد کرو، میرا اس دنیا میں کوئی نہیں رہا:" اور جب اس نے پوچھا کہ کیا ہوا، تو وہ کہنے لگی: "میں ایک امیر سوداگر کی بیٹی تھی ہم دکن کیطرف سفر کر رہے تھے، کہ راستہ میں ہم پر ٹھگوں نے حملہ کر دیا، اور میرے سوا سب کو قتل کرکے وہ سب کے سب سو گئے لیکن آدھی رات کے وقت میں تھوڑی دور جاکر ایک درخت کے کھوکھلے تنے میں چھپ گئی اور صبح سویرے ان بدمعاشوں نے پہلے پہل تو میری تلاش کی، پھر اس خوف سے کہ کہیں پکڑے نہ جائیں بھاگ گئے میں کانپتی ہوئی وہاں سے باہر نکلی، اور یہاں تک آ پہنچی ہوں، اب میرا اس دنیا میں کوئی نہیں": وہ راجپوت دل میں کہنے لگا: "آہا! آخر مجھے میرا خزانہ مل ہی گیا، وہ سادھو واقعی کوئی اوتار تھا" پھر کہنے لگا: "سندری! میں اچھے خاندان کا چشم و چراغ ہوں، اگر تم مجھ سے بیاہ کر لو، تو شاید تمہارا وہ نقصان پورا ہو جائے، جو سوداگر اور تمہارے رشتہ داروں کے مرنے سے ہوا، پہلے پہل تو وہ روئی، پھر آنسو پونچھ کر راضی ہو گئی، اور راجپوت خوشی سے دیوانہ ہو گیا۔ ایکدن اس نے اسے بنارس اور کشنی کے

جل جانے کی داستان سنائی، وہ اس کی طرف دیکھ کر ہنسی اور کہنے لگی "میرے پتی! میں تمہارے اس نقصان کی جو کشتی کے مرنے سے ہوا تلافی کروں گی۔ کیونکہ میں بھی اسی کی طرح سندر ہوں"

(۱۰)

داستان ختم کر کے نٹ بھرو گتی آگے جھکی۔ اور آج کو پریم بھری نظروں سے دیکھنے لگی، وہ شرما گیا، اور جس طرح شمع کا شعلہ ہوا سے کانپتا ہے، وہ بھی اس کے سامنے کانپنے لگا۔ اس کا حسن اسے تڑپا رہا تھا اور اس کی پرفریب داستان نے اس کے دل میں شک کا بیج بو دیا تھا، وہ دل میں کہنے لگا "کیا میں راجہ کی پتری کے پریمیوں میں سے آخری ہوں" نٹ بھرو گتی اسے بغور دیکھ رہی تھی۔ آخر وہ بولی "سندر بالک تم بہت کم سن اور بھولے بھالے ہو۔ اور عورتوں سے نپٹ نہیں سکتے جنہیں برہما نے صرف دھوکا دینے کے لئے پیدا کیا ہے" آج غصے سے کہنے لگا "تم بھی تو عورت ہو اور مجھے دھوکا دینا چاہتی ہو، باقی رہا عمر کا سوال تو تم مجھ سے چھوٹی ہو"

وہ کہنے لگی "نہیں نہیں! میں بڑی ہوں، کیونکہ میں تم سے دانا ہوں، کیونکہ جیسے ہی میں نے اپنے پتی کو دیکھا۔ میں نے جھٹ پہچان لیا، لیکن مجھے تم بالکل بھول گئے ہو، جو تمہاری حقیقی بیوی ہوں، آہ! بے وقوف تم بھول گئے! تم ایک ایسے شخص کی مانند ہو جو ایک سے لی کانچ کے ٹکڑے کے لئے جو لاعلمی کی روشنی سے چمک رہا ہو اور ہر شخص کے پاؤں تلے روندا جا چکا ہو، ایک قیمتی ہیرے کو پرے پھینک دے؟ کیا میں تمہارا حافظہ درست کرنے کیلئے کچھ نہیں کر سکتی؟ میری طرف غور سے دیکھو! خوب دیکھو! شاید میری کوئی بات تمہاری آتما کے تاروں کو چھیڑ دے"

وہ اس کے قریب ہو گئی۔ یہاں تک کہ اس کی بدن کی خوشبو اور حرارت اسے مدہوش کرنے لگیں۔ اس نے ہاتھ باندھ کر اپنی آنکھیں اس کے چہرے پر گاڑ دیں اور کہنے لگی "کیا واقعی تم سب کچھ بھول چکے ہو؟" آج نے اسکی طرف بغور دیکھا۔ دو بڑے بڑے بلوریں قطرے اسکی آنکھوں میں آ گئے، اور تھوڑی دیر وہاں ٹھہر کر اس کی لمبی سیاہ پلکوں کے جال میں گر پڑے اور وہ کہنے لگی "تم کہتے ہو کہ میں تمہیں دھوکا دینا چاہتی ہوں؟ کیا یہ خود تم نہیں جو اس معاملے میں مجھے دھوکا دے رہے؟ کیا یہ میرا قصور ہے، کہ کسی اور نے تمہارے دل پر قبضہ کر لیا ہے؟ کیا یہ میرا قصور ہے کہ تمہارا حسن پہلے جنم کی طرح مجھے بیقرار کر رہا ہے اور کیا تم مجھ پر الزام دیتے کہ میں مجرم ہوں؟ اے میرے سیاہ بھنورے، یہ کیا بات ہے کہ تم اپنے سرخ مسکین کنول سے جو تم سے دلی پریم رکھتا ہے لڑائی مول لے رہے ہو؟ آہ! لیکن اس بات کے باوجود میں تمہیں چاہتی ہوں، تم چاہو یا نہ چاہو، آہ! میں تمہیں یاد کرنے پر مجبور کروں گی، اور تمہارے دل کی تہہ تک پہنچنے کے لئے ہر قسم کی رکاوٹ کو زبردستی دور کر دوں گی، کیا تمہیں وہ دن یاد نہیں، جب میرا حسن تمہارے لئے ایک بے پایاں مسرت تھی۔ اور میری آنکھیں ہیروں سے زیادہ قیمتی تھیں، اور یہ دونوں بازو تمہاری گردن کی زنجیر تھے، اور یہ پرجوش سینہ تمہارا سرہانہ تھا۔ جس پر تم سر رکھ کر سوتے تھے، اور میں اپنی آواز کی موسیقی سے تمہیں سلایا کرتی تھی، کیا تم اپنی نہ بجھنے والی پیاس کو بھلا بیٹھے ہو؟ تو کیا ہوا میں تمہیں نہیں بھلا سکتی کیا تم پہلے جنم کی ان آوازوں کو نہیں سن سکتے؟"

(۱۱)

آج ان باتوں کو سنکر مسحور ہو گیا۔ اور بت بنکر اسکی طرف دیکھتا رہا۔ یکایک وہ آگے بڑھی اور اپنے داہنے ہاتھ سے اس کا بایاں ہاتھ اپنی طرف کھینچا۔ اور آج کو ایسا محسوس ہوا، کہ وہ آوازیں سن رہا ہے: جو سمندر کی سرگوشیوں سے مشابہ تھیں، جن میں ایک قسم کی موسیقی بھی ملی ہوئی تھی اور جو دنیا کے اس سرے سے آتی ہوئی محسوس ہوتی تھی اس کے جسم میں ایک کپکپی سی دوڑنے لگی اور وہ اس کی طرف پلٹی، اور نہایت شیریں لہجہ میں کہنے لگی "کیا تم ان آوازوں کو سن رہے ہو جو دوسرے کنارے سے تمہیں بلا رہی ہیں؟ کیونکہ یہ سمندر جدائی کا سمندر ہے۔ اور اس کا دوسرا کنارا ہمارا پہلا جنم ہے، دور فاصلے پر ہماری محبت کی بستی پوشیدہ ہے اور میں تمہیں اس گھنے جنگل سے نکال کر وہاں لیجا سکتی ہوں، صرف میں ہی تمہیں اس پہاڑی کے پار لے جا سکتی ہوں، جس کے پیچھے سورج غروب ہو رہا ہے اور جہاں ہماری محبت مردہ لیٹی ہے۔ اس سمندر پر سے جہاں بلائیں ہیں اور

جس کی اتھاہ گہرائیوں میں موتی پیدا ہوتے ہیں، میں تمہیں گذرے ہوئے زمانے کے دیس میں لے جا سکتی ہوں، کوئی جہاز اپنے ریشمی بادبانوں کے ساتھ تمہیں ان لہروں کے پار نہیں لے جا سکتا، جس طرح میں تم سینے پر بٹھا کر تمہیں لے جا سکتی ہوں۔ آہ! کیا تم کبھی خواب میں بھی اپنی اس چھوٹی سی کٹیا کی جنت کو نہیں دیکھو گے؟ کیا وہ برہمی جسکا چہرہ ہوبہو میری طرح تھا، پھر تمہارے پاس کبھی نہ آئے گی، وہ جسکے ہونٹ غنچوں کیطرح کھلتے تھے جسکی آنکھیں چمکتی تھیں اور جس کے بالوں میں پھول ہوتے تھے بولو کیا تم کبھی اس کا خواب نہ دیکھو گے؟ آہ! اپنی جادو کی نیند سے جاگ اور اس پردے کو پھاڑ دے جس نے تیری اندھی آتما سے مجھے چھپا رکھا ہے! میں تمہیں ضرور جگاؤں گی، مجھے بھلایا نہیں جا سکتا:" یہ کہکر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی، اور وہ لڑکھڑاتی اور سسکیاں بھرتی اس کے سینہ کے ساتھ لگ گئی۔

اج کو ایسا محسوس ہوا کہ وہ کسی غار میں لڑھکتا جا رہا ہو، جیسے ہی وہ اس کے سینہ سے لگی، اس کے اعضا میں ایک مرتبہ پھر بجلی سی کوند گئی، اس کے صبر کا جام پارہ پارہ ہو گیا، اور اس نے اپنا ایک بازو جو آزاد تھا، اسکی کمر کے گرد ڈال دیا، اور آنکھوں میں آنسو بھر کر یہ جانے بغیر کہ وہ کیا کہہ رہا ہے، رک رک کر کہنا شروع کیا:" افسوس! میں نے تم پر بڑا ظلم کیا۔ اے سندری ایسا رونا بند کر دے، آہ! میں تم سے ایک دن پہلے کیوں نہ ملا؟"

(۱۲)

یکایک سے اپنے پیچھے کسی کی آہ سنائی دی، وہ مڑا جنگل، لالہ کے پھول اور سب کچھ اسکی آنکھوں سے غائب ہو گئے، ایک مرتبہ وہ پھر شہر کی فصیل پر کھڑا تھا۔ اور اس کے سامنے راجہ کی بیٹری موجود تھی۔ وہ اس دروازہ میں کھڑی تھی، جس میں سے گزر کر وہ فصیل پر آیا تھا وہ دروازے کا سہارا لئے تھی، اور زرد ہو رہی تھی، اس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھیں پتھرا گئی تھیں اور ان میں غم اور ناامیدی کی آگ چمک رہی تھی، وہ جنگ کی بیٹری معلوم ہوتی تھی جسے رگھو کے گھرانے کے آقا نے ٹھکرا دیا تھا۔ یا آکاش کی دیوی اروشی جسے پروروس نے چھوڑ دیا تھا، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اسے دیکھتے ہی اس کے گرد و پیش کا سنا

طلسم فوراً ٹوٹ گیا تھا۔ یکایک اج کو ایک پل کے اندر سب کچھ یاد آنے لگا۔ اور وہ ایک جادو کے خواب سے جاگا، اور اسی وقت ایک تلوار سی اس کے دل میں لگی۔ اور ایک چیخ مار کر اس نے اپنے سینہ کا بوجھ ایک گھاس کے تنکے کیطرح پرے پھینک دیا، اس نے یہ بھی نہ دیکھا کہ وہ کہاں گرا، اور سیدھا راجہ کی بیٹری کیطرف بھاگا، لیکن وہ اسے اپنی طرف آتے دیکھ کر چلائی، اور کہنے لگی:" دور رہو! مجھے مت چھوؤ، بلکہ تلوار میرے سینے میں گھونپ دو!"

اج نے کانپ کر اپنی تلوار دیوار کے کنارے پھینک دی، اور دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پکڑ لیا۔ اور ایک زخمی شیر کیطرح غرا کر کہنے لگا:" آہ! بہتر ہوتا، اگر میں صحرا ہی میں مر جاتا!" وہ غضب سے مغلوب ہو کر نٹ بھرو گتی کی طرف پلٹا اور کہنے لگا" یہ ہے تمہاری کرنی اے بدمعاش جادوگرنی! اب میں ہوش میں ہوں، اور تمہیں تمہاری کرنی کا پھل دیتا ہوں!"

لیکن یہ کہتے ہوئے اس کے الفاظ اس کے ہونٹوں پر ہی مر گئے اور وہ ایک دیوار کی تصویر کی طرح خاموش کھڑا ہو گیا اور حیرت سے اپنے سامنے دیکھنے لگا۔ نٹ بھرو گتی خاموش کھڑی تھی سیدھی زمین میں کھڑی ہوئی برچھی کی مانند، اور اس کا حسن پہلے سے دو چند ہو گیا تھا۔ اس کی محبت کا امرت اب مار دینے والے بس میں تبدیل ہو چکا تھا۔ اور ایک غیر فانی نفرت اس کی آنکھوں میں چمک رہی تھی، جو درد اور مسرت کے ساتھ راجہ کی بیٹری کے چہرہ پر گڑی تھیں۔ اج کا دل بیٹھ گیا۔ اور اس کی رگوں میں خون منجمد ہونے لگا، کیونکہ نٹ بھرو گتی کی آنکھیں حرکت کر رہی تھیں اور ہر لمحہ اپنا رنگ بدل رہی تھیں اور اس کے نیلے نیلے ہونٹوں پر ایک خوفناک تبسم کھیل رہا تھا۔ وہ دبلی معلوم ہوتی تھی، کیونکہ اس کے دونوں بازو پہلوؤں پر لٹک رہے تھے اور اس کی انگلیاں خود بخود کبھی آہستہ کھلتی اور کبھی بند ہو جاتی تھیں۔

تھوڑی دیر بعد وہ اج کیطرف پلٹی اور ایک ایسی آواز میں جو ناگن کی پھنکار سے ملتی تھی، اج کو مخاطب کر کے کہنے لگی:" بے وقوف! تم نے وہ نیلا پھول قبول نہ کیا جو میں نے تمہیں پیش کیا تھا، اسکی خوشبو

تمہیں دونوں جہانوں میں کہیں بھی نصیب نہیں ہو سکتی۔ اب میں ایک اور راستہ اختیار کرتی ہوں"

وہ اسے غور سے دیکھتا رہا۔ وہ جا چکی تھی، اور اس کے سامنے شہر کی خالی فصیل کے سوا کچھ نہ تھا۔

اسے اپنی آنکھوں پر اعتبار نہ آیا۔ وہ وہیں کھڑا رہا۔ اتنے میں اس نے راجہ کی پتری کی ایک تیز چیخ سنی، وہ مڑا اور دیکھا کہ شیوودتی زمین پر گر رہی ہے۔ اسی لمحہ نٹ بھروگتی پھر اس کے سامنے آن کھڑی ہوئی اور عجیب نظروں سے دیکھ کر کہنے لگی "اب جاؤ اور اپنی پتنی کے حسن کی بہار لوٹو۔ لیکن اس سے پہلے کہ میں رخصت ہوں میں تمہیں بوسہ دینا چاہتی ہوں"

اج نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں اور یکایک بجلی کی سی تیزی سے وہ سب کچھ سمجھ گیا۔ اس نے سر پیٹ کر کہا "آہ! اب میں سمجھا، تم وہی عورت ہو جو راجہ کی پتری کے حسن سے جلتی تھیں، تم نے مجھے بے وقوف بنایا۔ اور میں امتحان میں ناکام رہا"

اج نے غصہ سے دانت پیسے اور کہا "افسوس! میں نے تلوار پھینک دی، پروا نہیں اب جیسا کہ اس نے کہا میں دوسرا راستہ اختیار کرتا ہوں"

اس نے اس کی طرف دیکھا اور دونوں ہاتھ پھیلا کر کہنے لگا "تو آؤ"

نٹ بھروگتی نے اپنا چہرہ اس کے چہرے کے قریب کر دیا، اس نے اس کے نازک گردن کو دونوں ہاتھوں سے موت کی سی گرفت سے دبوچ لیا۔

پھر وہ غائب ہو گئی اور اس کی جگہ اج کے ہاتھوں میں ایک خوفناک زرد ناگن رہ گئی جس نے اسکے ہونٹوں کو دو تین مرتبہ ڈسا۔ یہ تھا ناگوں کے راجہ کی پتری ناگ دیوی کا انتقام!

تیسرا باب

مہلک بوسہ

تب آہستہ آہستہ رات ختم ہو گئی، سورج اپنے مشرقی پہاڑوں کے محل میں سے طلوع ہوا اور تیزی سے آسمان میں بلند ہونے لگا یکایک راجہ کے محل میں زبردست غلغلہ بپا ہونے لگے۔

عورتیں ادھر ادھر دوڑنے اور چیخنے لگیں "ہائے! ہائے! راجہ کی پتری غائب ہو گئی"

انہوں نے سب جگہ تلاش کیا۔ لیکن وہ کہیں نہ ملی، انہوں نے جا کر راجہ سے سارا ماجرا بیان کیا۔ وہ یہ سنتے ہی شب خوابی کے لباس میں عورتوں کے ساتھ دوڑنے اور ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ انہوں نے کونہ کونہ چھان مارا۔ لیکن انکی ساری کوششیں بے نتیجہ ثابت ہوئیں، آخر وہ ہار کر بیٹھ گیا اور کہنے لگا "ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے پریمی کے پیچھے شہر کی فصیل پر چلی گئی ہو، اور اس کے انجام میں شریک ہو گئی ہو۔ بے شک یہ پریمی بھی دستور کے مطابق واپس نہیں آیگا"

وہ سب شہر کی فصیل کی طرف گئے راجہ سب سے آگے تھا۔ فصیل پر پہنچا اور یکایک ایک دل دوز چیخ کے ساتھ وہ زمین پر گر پڑا، اور گرتے ہی مر گیا۔

ساری عورتیں خوفزدہ ہو گئیں اور حسرت بھری نگاہوں سے ایک دوسرے کا منہ تکنے لگیں اور بہت سی کھڑی رہیں۔ لیکن آخر کار ایک دوسری کا سہارا دے آگے بڑھ کر دیکھنے لگیں اور انہوں نے دیکھا کہ راجہ اپنی پتری کے جسم پر لیٹا ہے اور ان سے تھوڑی دور ہٹ کر اج منہ کے بل پڑا ہے

انہوں نے تینوں لاشوں کو اٹھا کر غور سے دیکھا اور کچھ دیر کے بعد کہا "راجہ کا دل اپنی پتری کو مردہ دیکھ کر ٹوٹ گیا اور مر گیا لیکن باقی دونوں یعنی اج اور شیوودتی کو یقیناً ایک ناگن نے ڈسا ہے، تاہم یہ ایک عجیب بات ہے کہ شیوودتی کے تو پاؤں پر ڈسا ہے اور اس کے پریمی کے ہونٹوں کو! کیا بات ہے کیا اس نے اس ناگن کا بوسہ لینا چاہا تھا جو اس نے اس کے ہونٹوں کو ڈسا؟ کیونکہ یہ کس طرح ممکن ہے کہ ایک ناگن اس لمبے راجپوت نوجوان کے ہونٹوں تک جا پہنچے!

پھر وہ سب کہنے لگیں "آخر ناگ دیوی بازی جیت گئی"

منجانب چوہدری برکت علی منیجنگ پروپرائٹر پنجاب بکڈپو ایجوکیشنل پبلشرز لاہور

جنوری ۱۹۴۹ء   مکرم بندہ تسلیم   آپ کو معلوم ہوگا کہ پنجاب بکڈپو کی اس وقت تک کئی ایک کتب محکمۂ تعلیم صوبہ سرحد۔ پنجاب۔ بلوچستان۔ ریاست کشمیر۔ پٹیالہ۔ بہاولپور اور کئی ایک مقامات پر داخل نصاب ہیں اور انکی ہر جگہ تعریف کی جا رہی ہے اگر آپ ان سب کے اسباق پر نگاہ ڈالینگے تو آپ کو یہ تسلیم کرنا پڑیگا کہ یہ کتابیں طلبا کے لئے مفید۔ جدید معلومات سے پُر اور زمانہ حال کے ماحول کے مطابق ہیں۔ اسلئے ہیڈ ماسٹر صاحبان اور دیگر تعلیمی افسران کو چاہیئے کہ وہ داخل نصاب کریں یا اپنے بچوں کو ان سے مستفید ہونے کا موقع دیں +

ان کے علاوہ ہم ہر قسم کی درسی و لائبریری کتب۔ سامان سٹیشنری نقشہ جات، رجسٹر، کاپیاں۔ امتحانی کاپیاں۔ گلوب چاک بکس۔ سامان جیومیٹری۔ سکولوں کے فارم۔ چارٹ وغیرہ بھی سپلائی کئے جاتے ہیں۔

زیادہ کتب یا سامان خریدنے کی صورت میں کمیشن بھی دی جائے گی اور نمونہ مفت +

کتب برائے پرائمری کلاسنز

شجاع اُردو ریڈرز

مصنفہ خانصاحب حکیم احمد شجاع بی۔اے۔ علیگ۔ ڈپٹی سیکرٹری پنجاب لیجسلیٹو اسمبلی۔ اس سلسلہ کتب کی ترتیب سے ہمارا صرف یہ مقصد ہے کہ ہمارے طلبا اپنے مطالب کا اظہار سیدھی سادھی۔ با محاورہ اور صحیح اردو زبان میں کر سکیں۔ ان کتب میں ایسی زبان اور مضمون شامل کئے گئے ہیں جن سے روزمرہ کی ضروریات کے متعلق واقفیت بڑھے۔ دنیا کے کاروبار کی مفید اور کارآمد معلومات بہم پہنچیں جرأت اخلاقی اور حوصلہ پیدا ہو۔ محنت۔ صفائی۔ کفایت شعاری۔ ذہانت۔ محبت اور خودداری کی عادات پیدا ہوں۔ نیز بچوں کی دلچسپی کے لئے مزاحیہ حصہ بھی شامل کیا گیا ہے۔ یہ سلسلہ کتب محکمہ تعلیم صوبہ بلوچستان کے لئے منظور ہو چکا ہے۔

قیمت قاعدہ برائے پہلی جماعت ۸/ حصہ دوم برائے دوسری جماعت ۹/ حصہ سوم تیسری جماعت کے لئے ۱۰/ حصہ چہارم چوتھی جماعت کے لئے ۱۰/۶ پائی۔

دیہاتی حساب

مصنفہ ناظر حسن قدوسی۔ بی۔اے (آنرز) بی۔ٹی۔ تجربہ اس بات کا شاہد ہے کہ حساب کے لئے مشق کرانے سے زیادہ کوئی تدبیر کارگر نہیں ہوتی۔ پھر یہ کہ تحریری حساب سے پہلے تقریری حساب ہونا لازمی ہے۔ ان حساب کی کتب میں ۵۰ زبانی سوالات کی نمبری ہر قاعدے سے پہلے دی گئی ہے۔ اس طرح مشقی سوالات کا کافی ذخیرہ بہم پہنچایا گیا ہے۔ تمام کورس کے اعادہ کے لئے متفرق سوالات بھی دیئے گئے ہیں جوابات بعد پڑتال کئے گئے ہیں یہ سلسلہ حساب متواتر چار سال سے ریاست کشمیر میں منظور رہا ہے۔ ریاست پٹیالہ میں بھی محکمہ تعلیم نے اس سلسلہ کو منظور کر لیا ہے۔ صوبہ بلوچستان کے محکمہ تعلیم نے بھی تمام سکولوں کے لئے منظور فرمایا۔

قیمت حصہ اول دوسری جماعت ۷/ حصہ دوم تیسری جماعت ۸/ حصہ سوم چوتھی جماعت ۹/

جدید سلسلہ سرحدی حساب

مصنفہ مولوی محمد عزیز اللہ۔ ان کتب میں حسب ذیل موٹی موٹی خوبیاں ہیں (۱) ہر ایک قاعدہ کی تشریح نہایت مکمل اور ساتھ ہی مختصر طریق سے کی گئی ہے (۲) ہر ایک قاعدے کے شروع میں قریباً سب طرزوں کا ایک ایک سوال طلبہ کی رہنمائی کے لئے حل کر دیا گیا ہے (۳) ہر ایک قاعدے میں تحریری سوالات سے پہلے تقریری

پنجاب بک ڈپو لاہور

سوالات کا کافی ذخیرہ بہم پہنچایا گیا ہے (۲۴ سوالات میں بازاری چیزوں کے نرخ حتی الوسع صحیح لکھے گئے ہیں تاکہ طلباء کو بازاری اشیاء کی خرید و فروخت میں آسانی ہو۔ اور جوابات مشرح طور

برہان القواعد | یہ کتاب کئی ایک تجربہ کار ریٹائرڈ ہیڈ ماسٹروں کے مشورہ سے تیار کی گئی ہے۔
اس میں گرامر کے صرف وہی قاعدے درج ہیں۔ جو چوتھی جماعت کے سلیبس کے مطابق ہیں۔ طلباء کی استعداد علمی کو ملحوظ نظر رکھتے ہوئے زبان عام فہم استعمال کی گئی ہے۔ مثالیں ایسی منتخب کی گئی ہیں جو ہر بچے کی واقفیت عامہ میں اضافہ کریں۔ اگر ان کتب کو اچھی طرح سمجھ لیا جائے۔ تو مضامین نویسی میں مہارت عامہ حاصل ہو سکتی ہے۔ قیمت حصہ اول ۳؍

زرینہ حساب | مصنفہ چوہدری محمد اکبر بی۔اے۔ بی۔ٹی | یہ سلسلہ حساب صوبہ پنجاب کے محکمہ تعلیم کی طرف سے منظور ہے۔ قیمت حصہ دوم ۳؍ ۳ پائی حصہ سوم ۳؍ ۹ پائی۔ حصہ چہارم ۴؍ ۹ پائی۔

ہمارا صوبہ | مصنفہ میاں عبد الحکیم ہیڈ ماسٹر اسلامیہ ہائی سکول بھاٹی گیٹ لاہور۔ صوبہ پنجاب اور شمال مغربی سرحدی صوبہ کے جغرافائی حالات کے واقفیت کرانے کے لئے بہترین کتاب ہے۔ قیمت ۱۰؍ ۹ پائی۔

حساب کی کتاب | مصنفہ شیخ محمد حسین بی۔اے۔ بی۔ٹی | مجموعہ۔ یہ سلسلہ کتب بچوں کے لئے اس قدر مفید ہے۔ کہ مارکیٹ میں ایک کتاب بھی اس کا مقابلہ نہیں کرتی۔ قیمت حصہ دوم ۶؍ حصہ سوم ۷؍ حصہ چہارم ۸؍ حصہ پنجم ۹؍

جدید زمانہ حساب | ان کتب میں لڑکیوں کے ماحول کے مطابق سوالات درج ہیں۔ نیز یہ کتاب محکمہ تعلیم ریاست جموں و کشمیر میں سول ٹیکسٹ بک کے طور پر منظور ہے۔ اس کا ترجمہ ہندی اور گورمکھی میں بھی چھاپا گیا ہے۔ قیمت حصہ دوم ۴؍، سوم ۴؍، چہارم ۶؍، پنجم ۶؍

امتحانی حساب | جو طلباء مقابلے کے امتحان کی تیاری کرتے ہوں اُن کیلئے بے نظیر کتاب ہے قیمت ۴؍

پر صحیح درج ہیں۔ یہ سلسلہ کتب شمال مغربی سرحدی صوبہ اور بلوچستان کے محکمہ ہائے تعلیم کی طرف سے منظور ہو چکا ہے۔
قیمت حصہ اول دوم ۵؍ حصہ سوم ۵؍ حصہ چہارم ۶؍

کاپی زبانی حساب | مصنفہ سید غلام مصطفےٰ شاہ (مرحوم) قیمت ۳؍

املا کی کتاب | تمام منظور شدہ محکمہ ہائے تعلیم کے کورسوں کے مشکل الفاظ جمع کئے گئے ہیں۔ قیمت ۳؍ آنے

پیام صحت و زندگی | حفظ صحت متعلق بمعہ تصاویر ہدایات درج کی گئی ہیں۔ قیمت ۶؍ آنے

رہنمائے املا | اس میں طلباء کو امتحان وظیفہ کے لئے تیار کرنے کے لئے کافی سے زیادہ ذخیرہ جمع کیا گیا ہے۔ قیمت ۱؍

مڈل کی جماعتوں کے لئے کتب

پاپولر انگلش کمپوزیشن اینڈ گرائمر

مصنفہ چوہدری طفیل محمد بی۔اے (آنرز) بی۔ٹی۔ یہ کتاب انگریزی گریمر۔ مضامین کہانیوں اور خطوط پر مشتمل ہیں۔ انگریزی بالکل سلیس اور صحیح استعمال کی گئی ہے۔ گریمر کے ہر قاعدے کو مکمل مگر مختصر الفاظ میں واضح کیا گیا ہے۔ تمام سلسلہ کتب میں مشکل الفاظ کے معانی اردو میں دیئے گئے ہیں۔ تاکہ کمزور سے کمزور طالب علم بھی اس سے فائدہ اُٹھا سکیں۔ ہمارا دعوےٰ ہے کہ ابھی تک مارکیٹ میں اس سے اچھی گریمر کی کتب نہیں آئیں۔ اس سلسلہ کتب کا ہر حصہ ہر جماعت کے سلیبس کے مطابق ترتیب دیا گیا ہے ریاست بہاولپور میں سول ٹیکسٹ بک منظور ہو چکی ہے۔ قیمت حصہ اول۔ برائے جماعت پنجم ۵؍ حصہ دوم برائے چھٹی جماعت ۸؍ حصہ سوم برائے ساتویں جماعت ۱۲؍ حصہ چہارم برائے آٹھویں جماعت قیمت ۱۴؍

مفتاح العلوم (اردو) — شرح مثنوی مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ

فارسی کے ادیب اول حضرت مولانا روم کی معرکۃ الآرا کتاب مثنوی مولانا روم سے شاید ہی کوئی لکھا پڑھا انسان ہوگا جو واقف نہ ہو۔ یہ وہ کتاب ہے کہ جسے فارسی زبان کا قرآن کہا جاتا ہے۔ فارسی ادب کے لحاظ سے تمام کتابوں سے ممتاز۔ شریعت و طریقت کے بیان کرنے میں دوسری تمام کتابوں پر فائق فارسی علم و ادب کے شائق اسے پڑھکر زبان فارسی پر عبور حاصل کرتے ہیں۔ صوفی لوگ اس کی صوفیانہ کلام سے فیض اٹھاتے ہیں عالم اور واعظ اسکے اشعار کو پڑھ پڑھ کر مجالس واعظ کو گرم کرتے ہیں۔ مضمون نگار بھی اس کتاب کے اشعار کو اپنے مضامین کی دلچسپی بڑھانے کیلئے استعمال کرتے ہیں غرضیکہ یہ وہ کتاب ہے کہ مسلمانوں کے علاوہ ہر مذہب و ملت کے آدمی اسے پڑھنے کا شوق رکھتے ہیں پس ایسی اعلیٰ قدر و منزلت کی کتاب کی شرح کو ہم نے بزبان اردو بصرف زر کثیر شائع کیا ہے۔ جسمیں اول مثنوی کا شعر جلی قلم سے نہایت خوشخط اعراب دیکر لکھا گیا ہے۔ پھر مشکل الفاظ کی لغت اور صرفی نحوی ترکیب درج کرکے ایسی طرز سے سلیس اردو میں ترجمہ کیا ہے کہ جو تحت لفظی بھی ہے اور بامحاورہ بھی اسکے بعد شعر کا مطلب قرآن و حدیث و اقوال ائمہ کے حوالہ سے نہایت تفصیل سے بیان کیا ہے ہندوستان کے تمام اخبارات اور بزرگان قوم کا اس شرح کے متعلق متفقہ فیصلہ ہے کہ یہ شرح قدیم و جدید کی تمام شرحوں سے اعلیٰ اور بہترین ہے۔

قیمت۔ حصہ اول ۸ر حصہ دوم ۸ر حصہ سوم ۸ر حصہ چہارم ۸ر حصہ پنجم ۸ر حصہ ششم ۸ر حصہ ہفتم ۸ر حصہ ہشتم ۸ر حصہ نہم ۸ر حصہ دہم ۸ر۔ مجلد فی حصہ تین روپے چار آنے۔ دو دو حصے یکجا مجلد فی جلد چھ روپے تمام حصوں کے خریدار کو سوانح مولانا روم از مولانا شبلی مفت دیجائیگی۔ محصولڈاک بذمہ خریدار وعدہ۔ کتاب اگر مطابق اشتہار نہ ہو تو واپس بھیج کر قیمت منگالیں۔

اسرار العلوم ترجمہ اردو احیاء العلوم

حضرت امام غزالی کی مشہور کتاب احیاء العلوم کا ترجمہ نظم میں مثنوی کے طرز پر نہایت آسان اردو میں کیا گیا ہے۔ لکچراروں واعظوں اور عام لوگوں کے لئے بہترین کتاب قیمت دو روپے رعایتی ایکروپیہ آٹھ آنے۔

سوانح سلطان صلاح الدین

باتصویر۔ صلیبی جنگوں کی خونی داستان عیسائیوں کے مسلمانوں پر بیرحمانہ ظلم اور وحشیانہ سلوک بیت المقدس پر عیسائیوں کا قبضہ سلطان صلاح الدین غازی کے کارنامے تمام یورپ کے عیسائی بادشاہوں کی لاتعداد فوج ایک طرف اور غازی صلاح مع چند بہادر مجاہدوں کے ایک طرف صلیب و ہلال کا معرکہ جس میں مسلمانوں کو فتح اور عیسائیوں کو ذلت آمیز شکست۔ کتاب کو مطالعہ کیجئے تو جنگ کا نقشہ سامنے آجاتا ہے۔ قیمت دو روپے رعایتی ایکروپیہ آٹھ آنے۔ علاوہ محصول ڈاک۔

خالدہ ادیب خانم

حکومت انگورہ ترکیہ کی سابقہ وزیر تعلیم جو ترکوں میں حریت و آزادی کی روح پھونکنے والی مشہور محب قوم خاتون کے [illegible] حالات رزم و بزم میں [illegible] پرجوش سرگرمیاں نہایت [illegible] میں۔ قیمت صرف آٹھ آنے (۸ر)

[illegible] کمال پاشا دنیا کی نظر میں

[illegible] کتاب ان مضامین کا مجموعہ ہے [illegible] مصطفیٰ کمال پاشا کے متعلق لکھے۔ قیمت آٹھ آنے (۸ر)

تاریخ مدینہ منورہ

مدینہ منورہ کی ابتدائی تاریخ۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے تشریف لانے اور آپکے عہد مبارک کے حالات کے علاوہ صحابہ کرام کے عہد مبارک کے مفصل حالات۔ حرم نبی یعنی مسجد نبوی اور روضہ مقدس کے مکمل اور مفصل حالات کہ ابتدا میں وہ کیسے تھے اور بعد ازاں کس کس خلیفہ یا سلطان کے عہد میں ان میں کیا کیا زیادتی یا تبدیلی ہوئی۔ روضۃ النبی اور مسجد کے خادموں کی فہرست اور ان کا خرچ۔ ترکوں کے عہد میں مسجد النبی کی حالت۔ تمام شہر کے اندر و باہر جس قدر قابل زیارت مقامات ہیں انکا نام اور انکے تاریخی حالات غرضیکہ مدینہ شریف کی مکمل تاریخ اور گائیڈ ہے۔ جو لوگ حج کے موقع پر اسے ساتھ لے جائینگے وہ اسکی مدد سے بغیر کسی کے دریافت کئے مدینہ شریف کی تمام زیارتوں سے مستفیض ہو سکتے ہیں۔ کتاب میں مدینہ منورہ کا عکسی فوٹو اور روضہ مبارک۔ غلاف مبارک کا نقشہ مع عکسی نقشہ کے شامل ہے۔ قیمت ایک روپیہ (عہ)

تاریخ مکہ معظمہ

اس کتاب میں ابتدائے آفرینش اور تعمیر کعبہ سے لیکر آج تک کی مفصل تاریخ اور اس مقدس شہر کے فضائل از روئے قرآن و حدیث دور جاہلیت کا ذکر ابتدائے اسلام میں خانہ کعبہ کے حالات حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے وجود مسعود کی برکت سے اس شہر کی رونق اور عظمت خلفائے راشدین سے لیکر آج تک جن جن مسلمان سلاطین یا امراء نے اس شہر اور خانہ کعبہ کی رونق میں حصہ لیا ہے انکا ذکر قابل زیارت مقامات کے نقشے اور انکی تاریخ مختلف ممالک سے مکہ معظمہ کو جانیکے راستے حج اور عمرہ کے ارکان کا ذکر اور ہر ایک حاجی کے کام آنیوالی باتیں [illegible] رہبر کا کام دے سکتی ہے۔ قیمت ایکروپیہ چار آنے (عہ)

ملنے کا پتہ:۔ منیجر قریشی برادرز بک ایجنسی کشمیری بازار لاہور


KING CYCLE

صحرا نورد کے خطوط

وادیٔ نیل کی ساحر جمیل کا مہیب رومان

سرزمین مارت مارت کی ہیبتناک داستان

مظلوم سرفروش کا انقلاب انگیز افسانہ وطن پرستی

(اور پھر)

غلام ملکوں کی آزادی کے راستے میں تحیرزا قربانیاں

(یہ سب کچھ موجود ہے)

میرزا ادیب کے زندہ جاوید کارنامہ

"صحرا نورد کے خطوط" میں

ادب لطیف کے مستقل خریداروں کو سالنامہ اور افسانہ کے علاوہ یہ بیش قیمت مجموعہ نصف قیمت پر دیا جائیگا

جو حضرات ادب لطیف کے خریدار نہیں وہ ساڑھے چار روپے بھیجکر اس زریں نسخہ سے فائدہ اٹھائیں

پتہ: مکتبہ اردو لاہور

A.S.K

رعائت کی حد ہوگئی

ایکروپیہ میں ڈیڑھ روپیہ کا مال

وسمہ مہندی کا تیل سفید بالوں کو ایک منٹ میں بغیر تکلیف کے قدرتی سیاہ کرتا ہے بڑے بالوں پر ایک ماہ تک اثر رہتا ہے۔ اور خشخاشی بالوں پر ایک ہفتے کے بعد لگایا جاتا ہے۔ اسکی اعلیٰ خوشبو سے دل و دماغ پر ایک خاص اثر پیدا ہوتا ہے۔ لاکھوں معززین استعمال کر چکے ہیں۔ ہزارہا اسناد موجود ہیں۔ آپ بھی آزمایئے۔ اگر اشتہار کے مطابق نہ ہو۔ تو قیمت واپس۔ قیمت فی بکس ایکروپیہ علاوہ محصولڈاک۔ یہ بکس درمیانے بالوں کیلئے تین چار ماہ تک کام دے سکتا ہے۔ ہمارا تیار کردہ جوہر وسمہ مہندی رجسٹرڈ بھی ایک نایاب تحفہ ثابت ہو چکا ہے۔ امسال ہم نے موٹر کار کا انعام رکھا تھا۔ انعامی ٹکٹ کا نمبر ۱۵۰ تھا۔ جو جناب فتح محمد خانصاحب تحصیلدار لواں شہر جالندھر کے نام نکلا تھا۔ اب تینوں چیزوں کے خریدار کو ایک روپیہ کی رعائت کی جاتی ہے۔

تینوں اشیاء کے خریدار سے بجائے تین روپلے کے دو روپلے وصول کئے جاتے ہیں۔

طلاء اعظم رجسٹرڈ۔ مردہ اور بے حس رگوں میں بجلی کی طرح تیزی اور پیدا کرتا ہے۔ جلوق اور کثرت جماع کے مریضوں کے لئے جوش جوانی اکسیر ثابت ہو چکا ہے۔ یہی سستی اور لاغری کا بے مثل علاج ہے۔ بوڑھے اور جوان یکساں فائدہ اٹھا رہے ہیں اسکے استعمال سے تمام نقائص رفع ہو جاتے ہیں۔ اور بالکل بے ضرر ہے قیمت ایکروپیہ علاوہ محصولڈاک۔

محصولڈاک بذمہ خریدار۔ تندرستی کی حالت میں طلاء اور گولیوں کا استعمال طاقت سے دوبالا کرتا ہے۔

ممسک گولیاں رجسٹرڈ۔ نوجوانوں کو جریان۔ سرعت اور انزال جو کسی وجہ سے پیدا ہو چکا ہو۔ اور جوہر حیات پانی کی طرح گرنے سے صحت خراب ہو چکی ہو۔ ہمارا دعوے ہے کہ ان گولیوں کے استعمال سے رفع ہو جاتی ہیں۔ بوقت ضرورت شرمندہ ہونا نہیں پڑتا۔ بارہ گولیاں۔ ایکروپیہ میں دیجاتی ہیں۔ علاوہ محصولڈاک۔

(ایجنٹوں کی ہر جگہ ضرورت ہے)
کمیشن معقول دیجاتی ہے

ملنے کا پتہ
صوفی اینڈ کو رجسٹرڈ
راولپنڈی

صدیق عباسی کاتب

ناظرین ادب لطیف کے لئے ایک نادر تحفہ

اپنے جیون کی پریم ہٹی

طاقت کا ایک عجیب و غریب لاثانی تحفہ

ناظرین :- میں ایک زمیندار کا لاڈلا لڑکا ہوں۔ بری صحبت کے باعث جریان۔ احتلام کے خطرناک امراض میں مبتلا ہوگیا۔ پہلے میں نے ایک دو سال شرم وحیا ننگ و ناموس کی وجہ سے اپنا حال چھپائے رکھا۔ مگر کچھ عرصہ بعد بیماری نے خطرناک صورت اختیار کر لی تب میری آنکھیں کھلیں۔ اور میں نے علاج معالجہ شروع کیا۔ روپیہ کی افراط تھی بس بڑے بڑے ڈاکٹروں ویدوں حکیموں اور نامی دواخانوں سے دوائیں بقول شخصے مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی۔ آخر نوبت یہاں تک آپہنچی کہ میں اپنی زندگی سے بیزار ہوگیا اور خودکشی کے منصوبے باندھنے لگا۔ ہمارے گاؤں کے پاس ایک میل فاصلہ پر اینٹوں کا ایک اونچا کھیڑا ہے۔ اس کھیڑے پر کبھی کبھی کوئی سادھو مہاتما آگذرتے ہیں۔ اتفاق سے ہی اسی کھیڑے پر کاٹھیاواڑ کے ایک فقیر آگزرے اور ایک جھاڑی میں آسن لگا کر بیٹھ گئے۔ گاؤں کے لڑکوں نے جب انہیں دیکھا تو انہوں نے گاؤں میں شہرت پھیلا دی کہ کھیڑے پر ایک کامل بزرگ آئے ہوئے ہیں چنانچہ شہرت سنکر لوگ جوق در جوق انکے دیدار اور قدمبوسی کو آنے لگے۔ رفتہ رفتہ انکی شہرت سارے علاقے میں پھیل گئی۔ انکی اسقدر شہرت سنکر میرے جیسا مایوس و ناامید آدمی بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ آخر چاروناچار بادل ناخواستہ انکی خدمت میں حاضر ہوا۔ انکی نورانی صورت دیکھکر میں حیران سا رہ گیا۔ اور دل ہی دل میں اپنی حماقت پر پچھتانے لگا۔ مگر جونہی میں نے انکے چہرے کے جمال کو دیکھا دل باغ باغ ہوگیا۔ لیکن یہ حالت بہت دیر تک قائم نہ رہ سکی۔ جب انہوں نے نظر اٹھا کر میری جانب دیکھا۔ تو میں مارے شرم کے زمین میں گڑنے لگا۔ مگر مہاتما جی میرے دلی جذبات بھانپ گئے۔ اور اس طرح گویا ہوئے۔ "بیٹا تم بڑے کمزور اور دکھی معلوم ہوتے ہو۔ طبیعت کیسی ہے" یہ الفاظ مجھ پر جادو کی طرح اثر کر گئے یہ سنتے ہی بے ساختہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ انہوں نے نہایت شفقت سے دلاسا دیا اور کہا "بیٹا فقیر تمہارے لئے جو کچھ کر سکتا ہے کرے گا۔" اس پر میں نے بیماری کا حال بلا تامل کہہ سنایا۔ چنانچہ انہوں نے مجھے تسلی دیتے ہوئے نہایت شفقت سے ایک نسخہ تجویز کرکے دیا جو میں نے بناکر استعمال کیا۔ اور اب بالکل تندرست و توانا ہوں۔

نسخہ :- ترپھلا کا چورن ۵ تولہ۔ اصلی سونچ تاپی سلاجیت ½ ۲ تولہ۔ اصلی بھنگ بھسم ۶ ماشے۔ اصلی سونچ چھاپ کیسر ۶ ماشہ۔ اصلی عقرقرحا ۶ ماشہ۔ اصلی نیپالی کستوری (تولی) ان سب ادویات کو کوٹ چھانکر کھرل میں ڈالکر اوپر سے شیشن چینی کا تیل ۲۰ بوند صندل آئیل ڈالکر تازہ برہمی کے عرق میں ۱۲ گھنٹہ کھرل کرکے (گھونٹ کر) جھربیری کے بیر کے برابر گولیاں بنا کر سایہ میں سکھالیں بس دوائی تیار ہے۔

ترکیب استعمال :- ایک گولی صبح ایک گولی شام کو کھاکر پاؤ بھر دودھ میں شکر ڈالکر پی لیں۔ اس دوا کے استعمال سے میں چالیس روز میں بالکل تندرست ہوگیا۔ یہاں تک کہ ایک مدت گذر گئی ہے۔ پھر کوئی شکایت نہیں ہوئی۔ اور اس قادر مطلق خدا کی مہربانی سے اب میرے تین بچے ہیں جو بالکل تندرست ہیں اس وقت سے میں یہی نسخہ بناکر دور و نزدیک کے لوگوں کو دام کے دام پہ دے رہا ہوں جس سے سینکڑوں ناامیدوں کی امیدیں برآئیں۔ اور کئی ناامید فیضیاب ہوئے۔ دیکھ کر ان لوگوں نے جنکو اس دوا سے امید سے زیادہ فائدہ ہوا۔ میری توجہ اس فرمان کی طرف مبذول کرائی۔ جو اسکا سنیاسی نے نسخہ دیتے ہوئے میرے ذمہ کیا تھا کہ اگر میں تندرست ہوگیا۔ تو رفاہ عام کے لئے اس کو اخبارات میں مشتہر کر دوں گا تاکہ ہر ایک آدمی اس سے فیضیاب ہو سکے۔ اس لئے میں اعلان کرتا ہوں کہ تمام لوگ اس سے فائدہ اٹھائیں۔ نسخہ اوپر درج کیا گیا ہے۔ ناظرین بناکر فائدہ اٹھائیں۔ یہ دوا منی کے پتلاپن۔ بیسیوں قسم کے جریان احتلام۔ پیشاب کے ساتھ چونے کی طرح دھات کا خارج ہونا۔ پاخانہ کے وقت دھات کا گرنا۔ خواب میں دھات کا چل جانا۔ سوزاک کمزوری۔ ذیابیطس۔ جوانی میں بڑھاپے کی سی حالت۔ اصلی طاقت کی کمی معلوم ہونا۔ سوچنے کی طاقت کا کم ہونا وغیرہ نامردی کو دور کرکے انتہائی طاقت پیدا کرتی ہے۔ اور رگ رگ میں جوانی کا مزہ بجلی کی طرح پیدا کرتی ہے۔ اس لئے جو بھائی بنانا چاہیں نسخہ اوپر درج ہے بناکر فائدہ اٹھائیں۔ مگر جن کو کچھ دقت معلوم ہو یا بوجہ عدیم الفرصتی یا اصلی دوائی نہ ملنے کے باعث دقت محسوس کرتے ہوں۔ اور اس کے حیرت انگیز معجزے دیکھنا چاہیں وہ ہم سے بنی بنائی منگا کر اس کے معجزے دیکھیں۔ اور ہماری محنت کی داد دیں۔

چالیس روز کے واسطے پوری خوراک اسی ۸۰ گولی کی قیمت چار روپے۔ محصول ڈاک معاف

پتہ :- بابو شیام لال مینیجر پریم ہٹی آفس نمبر ۴۳۳ بازار کچہری ضلع اٹاوہ (یو۔ پی)

کایا پلٹ

بوڑھے نے تین شادیاں کیں

بوڑھے گوالے نے جب یوگی راج شری رتناجی مہاراج کی دی ہوئی دوائی کی چھ خوراکیں غلطی سے ایک ہی دفعہ استعمال کر ڈالیں تو اسکی جو حالت ہوئی اس کا پورا احوال بیان کرنیکی تہذیب اجازت نہیں دیتی قصہ مختصر اس بوڑھے گوالے نے تین شادیاں کیں اور ان شادیوں سے یکے بعد دیگرے جیتے جاگتے دو مست اور خوبصورت بچے حاصل کئے یہ خبر آناً فاناً چاروں طرف پھیل گئی۔ راجہ مہاراجہ نواب و غیرہ طرح طرح کی خوشامد کرکے مہاتماجی سے اس نسخہ کو حاصل کرنیکی کوشش کرنے لگے۔ نواب بھاولپور کے سسر حاجی حیات محمد خاں صاحب کی کوششیں بارآور ہوئیں اور بابا مہاتماجی نے عجیب و غریب دوائی کا نسخہ ان کو بتا دیا حاجی صاحب موصوف سے یہ نسخہ امرت دھارا کے موجد کوی راج پنڈت ٹھاکر دت جی شرما کے ہاتھ لگا جنہوں نے اپنے دوا اور مجنوں کیساتھ اس نسخہ کو اپنے طبی اخبار "دیش اپکارک" میں شائع کرکے اس سے بہتر نسخہ بنانیوالے کو ایک ہزار روپیہ نقد انعام دینے کا اعلان کیا۔ اس اعلان کو شائع ہوئے سولہ سال گزر چکے ہیں لیکن آجتک کوئی وید یا حکیم اس انعام کو حاصل کرنیکی جرأت نہ کر سکا پھر متھرا کے مشہور و معروف وید بابو ہری داس جی نے اس نسخہ کو اپنی طبی کتاب چکتسا چندر لودے میں شائع کر دیا۔ جہاں سے لیکر ہم نے اسے تیار کرکے ہزاروں نامردی جریان۔ احتلام وغیرہ کے مایوس مریضوں پر اسکی آزمائش کی اسکے حیرت انگیز کرشمے دیکھکر خدا کی قدرت یاد آتی ہے چند روز کے استعمال سے ہی انکے چہروں پر سرخی دوڑنے لگی۔ بھوک حیرت انگیز طور پر بڑھ گئی اور چالیس روز کے مکمل استعمال سے یہ گئے گذرے مریض قابل فخر مرد بن گئے جو صاحبان موذی امراض کی بدولت زندگی سے تنگ آگئے ہوں اور دوائیوں سے جنکا اعتقاد بالکل اٹھ چکا ہو وہ مندرجہ ذیل نسخہ کو خود بناکر استعمال کریں۔

اصل نسخہ حسب ذیل ہے

شدھ برادہ فولاد ۲۰ تولہ۔ خالص سنکھیا سفید ایکتولہ خالص کافور ۱/۲ ماشہ ان سبھی چیزوں کو دو گھنٹہ تک گھیکوار کے گودے میں گھوٹ کر مٹی کے کوزے میں بند کرکے ۵ سیر اپلوں کی آنچ میں پھونکیں۔ ٹھنڈا ہونے پر ایکتولہ ہڑتال ورقی اور ۱/۲ ماشہ کافور کے ساتھ تیسری بار ایک تولہ گندھک آملہ سار اور ۱/۲ ماشہ کافور کے ساتھ پھونکیں اور چوتھی بار ایکتولہ شدھ منکلت پارہ اور ۱/۲ ماشہ کپور کے ساتھ پھونکیں اسی طرح سے سولہ آنچ دیکر برابر وزن میں بیربہوٹی ڈالکر لوہے کی کڑاہی میں ڈالیں اور نیچے آنچ دیکر راکھ کر ڈالیں اور بعد ازاں یہ راکھ پیپل کے پتوں کے ساتھ اور میں۔ اب یہ مقویات کی سرتاج دوائی بلا رد شکتی دانا تیار ہے۔ خوراک نصف رتی صبح اور نصف رتی شام کو ملائی یا مکھن کے ہمراہ کھاکر اوپر سے دودھ پی لیں گرم اور ترش اشیاء سے پرہیز کریں۔

اس دوائی کی تعریف میں متھرا کے بابو ہری داس جی لکھتے ہیں کہ ایک ہفتہ کے استعمال سے ایک مریض کا وزن چار پونڈ بڑھ گیا! اور اسکے چہرے پر سرخی جھلکنے لگی بھوپال کے وید راج بالکوشن جی شرما نے اسے ۵۰۴ مریضوں پر استعمال کیا اور امید سے بھی بڑھ کر مفید پایا۔ رتناکر کے ایڈیٹر آیور ویدک آچاریہ چھوٹے لال جی جین نے اپنی مشہور کتاب گرہ چکتسا پرپردرشک میں لکھا ہے کہ ہم نے آجتک اتنا تیر بہدف اور مقوی نسخہ نہیں دیکھا۔ "مستر" کے ایڈیٹر وید بھوشن شری شیام بہاری لال جی وید کی رائے ہے کہ اس دوائی کے چالیس روزہ استعمال کے بعد ۵۰ سال تک بڑھاپا پاس نہیں پھٹکتا۔ ہمارا اپنا تجربہ ہے کہ اسکے سات روزہ استعمال سے جسم میں تازہ خون دوڑنے لگتا ہے ۱۴ دن میں چہرہ کندن کی طرح دمکنے لگتا ہے اور چالیس روز کے بعد نامرد سے نامرد اور مایوس سے مایوس مریض بھی صحیح معنوں میں مرد بن جاتا ہے زیادہ تعریف فضول ہے عورتوں کی تمام امراض ہسٹیریا جریان الرحم یا ایام حیض کی خرابی کیلئے بھی نہایت اکسیر ثابت ہوئی ہے۔ دمہ ذیابیطس جیسے موذی امراض کیلئے اس سے بہتر دوائی دستیاب نہیں ہو سکتی۔

ہم نے واضح طور پر اسکا نسخہ اور ترکیب درج کر دی ہے۔ جو صاحب کسی وجہ سے اسے خود نہ تیار کر سکیں وہ بلاتکلف ہم سے دام کے دام پر منگالیں۔ چالیس روز کی خوراک ۸۰ پانچ روپیہ آنے (دو شیشی) میں معہ خرچہ محصولڈاک روانہ کر دیجائیگی۔

نیازمند

ویدرتن ستیہ دیو گپتا روپ بلاس رسائن شالا نمبر ۳۳۴ کنج نوسی اماوہ (دہلی)

ادیب شہیر جناب ایم اسلم کی مقبول عام اور شہرہ آفاق کتابیں

جن کا ہر لفظ دلچسپ، ہر سطر پُراثر ہر صفحہ تاثیر انگیز اور ہر پلاٹ نتیجہ خیز ہے۔ اگر آپ نے اب تک یہ افسانے نہیں پڑھے تو ضرور پڑھیئے۔ اور اگر پڑھے ہیں۔ تو اس قابل مصنف کے مندرجہ ذیل جدید افسانے (جو حال ہی میں نہایت دیدہ زیب طبع ہوئے ہیں)۔ پتہ ذیل سے طلب فرما کر اور پڑھیئے گا

کارزارِ حیات یہ قابل مصنف کے چالیس افسانوں کا دوسرا مجموعہ ہے۔ جس کا ہر افسانہ ایسا دلچسپ ہے۔ کہ بار بار پڑھنے کو جی چاہتا ہے۔ ہمارا دعویٰ ہے کہ اس شان کی اور ایسی نتیجہ خیز کوئی کتاب آج تک طبع نہیں ہوئی حجم تقریباً سات سو صفحات۔ کاغذ چکنا ولائیتی کتابت و طباعت نہایت صاف۔ جلد خوبصورت۔ قیمت ۔ ۔ ۔ ۸؍۱ مجلد

تفسیرِ حیات یہ بھی قابل مصنف کے چالیس افسانوں کا پہلا مجموعہ ہے۔ جن پر قابل مصنف کو پنجاب یونیورسٹی سے ساڑھے سات سو روپے کا انعام ملا ہے۔ دوسرے حصہ سے زیادہ دلچسپ ہے۔ جلد خوبصورت۔ قیمت ۸؍۱

ثمرِ گناہ چھ نہایت عبرت ناک اور بے حد پُرسوز افسانوں کا مجموعہ۔ ہر افسانہ عورت کی بیکسی اور مظلومی کی المناک داستان پیش کرتا ہے۔ اور اُردو زبان میں ایسے دلچسپ افسانے آج تک نہیں لکھے گئے۔ قیمت ایک روپیہ۔ عہ

سرابِ ہستی یا دھرم پتنی ایک نوجوان ہندو عورت اور نوجوان سادھو کی محبت کی نہایت حیرت انگیز بے حد دلچسپ اور رومان خیز داستان ہے۔ سادھو محبت کی خاطر مذہب کی زنجیریں توڑتا ہے۔ اور عورت مذہب کی خاطر محبت کو قربان کر دیتی ہے۔ جلد خوبصورت۔ قیمت ۔ ۔ ۔ ۔ ۸؍

آشوبِ زمانہ یہ مجموعہ ہے۔ ایک مرد اور ایک عورت کے چند خطوط محبت کا جن میں مصنف نے اپنے وسعت مشاہدہ اور رنگین عبارت سے جذبات و محبت کا فلسفہ بیان کیا ہے۔ مجلد خوبصورت قیمت۔ عہ

مرزا جی حصہ اوّل و دوم اگر آپ مزاحیہ افسانے اور مذاقیہ مضامین پڑھنے کے شائق ہیں۔ تو مرزا جی منگا کر پڑھیئے۔ ہمارا دعوےٰ ہے۔ کہ اُردو زبان میں اس سے زیادہ سنجیدہ ظرافت اور اچھوتے مذاق کی کوئی کتاب آج تک شائع نہیں ہوئی۔ مجلد خوبصورت حصہ اول ۱۲؍ ۔ حصہ دوم ۸؍۱

گناہ کی راتیں یہ کتاب اپنے اچھوتے مضامین کے باعث اس قدر مقبول ہو چکی ہے کہ اس کا چوتھا ایڈیشن ہم نے طبع کیا ہے۔ جس میں انسان کی سیاہ کاریوں کے وہ سات افسانے درج ہیں۔ جو نہایت دلچسپ اور سبق آموز ثابت ہوئے ہیں۔ مجلد خوبصورت۔ قیمت ۔ ۔ ۔ عہ

بقاءِ دوام اس میں روح کے متعلق وہ عام معلومات درج ہیں۔ جن کے معلوم کرنے کی ہر شخص کو طبعاً خواہش ہے۔ مثلاً روح کیا ہے۔ مرنے کے بعد کہاں جاتی ہے۔ انسان دنیا سے سفر کرنے کے بعد بھی پھر اس دنیا میں آسکتا ہے۔ یا نہیں۔ وغیرہ۔ جلد خوبصورت۔ قیمت ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ عہ